اُردو کا واحد حوالہ جاتی مجلّہ

عالمی اردو ادب

سردار جعفری نمبر

مدیر

نند کشور وِکرم

جلد نمبر ۱۹ ۲۰۰۱ قیمت: ۲۵۰ روپے

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز جے۔٦ کرشن نگر، دہلی 110051

عالمی اردو ادب میں شامل تحریریں تحقیق وحوالہ کی غرض سے شامل کی گئی ہیں ان میں ظاہر کی گئی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

خط و کتابت کا پتہ

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز

جے۔۶ کرشن نگر، دہلی

۱۱۰۰۵۱

ٹیلیفون ۲۲۴۷۶۱۹۰

ALAMI URDU ADAB

(Sardar jafri Number)

J-6 Krishan Nagar, Delhi-110051.

آئے ہم غالب و اقبال کے نغمات کے بعد
مصحفِ عشق و جنوں، حسن کی آیات کے بعد

اے وطن، خاکِ وطن، وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد

نارِ نمرود یہی اور یہی گلزارِ خلیل
کوئی آتش نہیں آتش کدۂ ذات کے بعد

رام و گوتم کی زمیں، حرمتِ انساں کی امیں
بانجھ ہو جائے گی کیا خون کی برسات کے بعد؟

ہم کو معلوم ہے وعدوں کی حقیقت کیا ہے
بارشِ سنگِ ستم جامِ مدارات کے بعد

تشنگی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی سردار
بڑھ گئی کوثر و تسنیم کی سوغات کے بعد

سردار جعفری

ترتیب

☆☆☆

پیش لفظ

یکم اگست ۲۰۰۰ء کو اُردو کے ممتاز و نامور شاعر اور ترقی پسند تحریک کے سالار علی سردار جعفری کے انتقال کے بعد جب مَیں نے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے اُن کے "فن و شخصیت" پر عالمی اُردو ادب کا خصوصی نمبر پیش کرنے کا اعلان کیا تھا تو اس وقت یہ احساس نہیں تھا کہ اس میں مجھے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بہر حال مَیں نے بالآخر یہ شمارہ پیش کر کے عالمی اُردو ادب کی جانب سے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا فریضہ انجام دے دیا ہے اور اب یہ فیصلہ اہلِ اُردو نے کرنا ہے کہ مَیں اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔

عام طور پر علی سردار جعفری کی شہرت ایک ممتاز شاعر کی حیثیت سے ہی رہی ہے حالانکہ وہ ایک نامور شاعر ہونے کے علاوہ ایک جانے مانے نثر نگار، صحافی، محقق، خطیب، فلم ساز و ہدایت کار بھی تھے اور ان کی ہشت پہلو شخصیت نے کئی میدانوں میں اپنی کارکردگی کے جوہر دکھائے تھے۔

سردار جعفری نے اپنا ادبی سفر ایک مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ اس کا کارن یہ تھا کہ انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایک ایسا ماحول تھا جہاں بچے پیدا ہوتے ہی مجلسوں میں شرکت کرنے لگتے ہیں اور مرثیوں کی آواز اُن کے کانوں میں گونجتے ہی نہیں لگتی بلکہ وہ انہیں گنگنانے بھی لگتے ہیں۔ ایسے ماحول میں جہاں بچے کے کان میں کلمہ اور تکبیر کے بعد انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں کی آواز کان میں پڑتی ہو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اس کے اثرات سے بچ سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچپن میں ہی جب وہ پانچ چھ برس کے تھے تو منبر پر بیٹھ کر مرثیے پڑھنے لگے۔ اور مرثیوں اور سلام کے علاوہ انہیں متعدد اشعار بھی یاد ہو گئے۔ ابتدا میں وہ انیسؔ کے مرثیے پڑھتے تھے لیکن جب وہ پندرہ سولہ برس کے ہوئے تو خود بھی انیسؔ کے لب و لہجہ میں مرثیے کہنے لگے۔ اور بہت جلد وہ اپنے حلقے میں ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ بقول ان کے:

> "مَیں نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دئے تھے اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے، اُن کی زبان، تشبیہ استعارے، ترتیب ہر چیز انیسؔ کی تھی۔ میرا اپنا کچھ نہیں تھا۔ مَیں ساٹھ ساٹھ، ستر ستر بند لکھ جاتا تھا لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا۔ ویسے مجلس میں پڑھنے کے لئے یہ بند کافی تھے۔ جب میں نے پہلا مرثیہ کہا۔

اپنی جلو میں فوج صداقت لئے ہوئے
آتا ہے کون شمع امامت لئے ہوئے

اور اسے منبر پر بیٹھ کر پڑھا تو والد اور چچا نے بہت گلے لگایا اور ماں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں میرے بچا بار بار مرثیے کے آخری دو مصرعوں کو پڑھتے تھے اور روتے تھے۔

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں بٹھاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی"

لیکن شاعری کا یہ دور وقتی طور پر ختم ہو گیا اور انہوں نے اسکول کے زمانے میں شاعری کے بجائے افسانہ نگاری شروع کر دی اور وہ اپنی فرصت کے اوقات میں "آتشیں قمیض" اور "لالۂ صحرائی" ایسے افسانے لکھنے لگے۔ اور اُن کا پہلا افسانہ "تین پاؤ گندھا آٹا" کے عنوان سے ان کے بڑے بھائی ظفر عباس کے ہفتہ وار رسالے "ہمصفیر" میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ افسانہ نویسی کا یہ سلسلہ چند سال تک محیط رہا اور ۱۹۳۸ء میں اُن کے افسانوں کا مجموعہ "منزل" بھی اشاعت پذیر ہوا جو اُن کے پانچ افسانوں (منزل، بارہ آنے، باپ، مسجد کے زیرِ سایہ اور آدم زاد) اور ایک ڈرامے "سپاہی کی موت" پر مشتمل تھا۔ کتاب میں شامل مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ ایک قابلِ ذکر افسانہ "چہرو مانجھی" اُن کی کتاب "لکھنو کی پانچ راتیں" میں بھی شامل تھا۔ جو جنگ کے دوران کی ایک یادداشت ہے لیکن جس میں بنگال کے ساحلی علاقوں کی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ اُس علاقے کی بستی کی ایک لڑکی چہرو مانجھی کی داستان بھی قلمبند کی گئی ہے اور جو دلچسپ ہی نہیں بلکہ اُس دور کے ناگفتہ بہ حالات پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ ان کے کچھ اور افسانے بھی شائع ہوئے ہوں گے لیکن چند سال کی گرمجوشی کے بعد انہوں نے اس صنف کو خیرباد کہہ دیا اور پھر شاعری کی جانب منعطف ہوئے اور بڑی سنجیدگی سے انہوں نے اپنے آپ کو شاعری کے تئیں وقف کر دیا اور جلد ہی وہ بطور شاعر دنیائے ادب میں مشہور ہو گئے اور لوگ بھول گئے کہ وہ کبھی افسانے بھی لکھا کرتے تھے۔

علی سردار جعفری کی شاعری کو ناقدین عام طور پر دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں پہلے دور میں وہ اپنی سیاسی سوچ اور کمٹمنٹ سے اس قدر مغلوب ہیں کہ وہ اس کے حصار سے باہر نکل ہی نہیں پائے اور نتیجتاً ان کی شاعری اُن کے سیاسی نظریات کی تبلیغ کا ذریعہ بن کر رہ گئی لیکن دوسرے دور میں وہ آہستہ آہستہ اس حصار کو توڑ کر باہر نکل آئے اور پھر ایسا دور آیا جبکہ اُن کی شاعری سیاسی پراپیگنڈہ کے الزام سے بری ہو گئی اور اُن کی فکر و سوچ میں بتدریج وسعت پیدا ہوتی گئی اور انہوں نے ایسے منظوم فن پارے تخلیق کیے جنہیں اُردو شاعری میں قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

سردار جعفری کے اولین دور کی شاعری میں جوش ملیح آبادی کا رنگ صاف صاف جھلکتا ہے اور وہ اُن سے اس قدر متاثر نظر آتے ہیں کہ بعض مقامات پر اُن کی شاعری صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ اُن کی نظم "بغاوت" ایک ایسی ہی مثال ہے، جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا
بغاوت سرسوتی سے، لکشمی سے بھیم وارجن سے
بغاوت دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدن سے

اُن کی شاعری کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اپنی شاعری کے اس ابتدائی دور میں وہ سیاسیات اور اشتراکی نظریات کے اتنے زیر اثر تھے کہ ان کی نظموں پر اس کا گہرا اثر صاف دکھائی پڑتا ہے۔ انہوں نے سیاسی خبروں، واقعات، اخباری اداریوں تک کو اپنی نظموں کا موضوع بنالیا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ ان اثرات سے آزاد ہوتے گئے اور آزادی کے چند برس بعد اُن میں بتدریج کمی آتی گئی اور بالآخر ان کی شاعری بہتر سے بہتر ہوتی گئی۔ اور اس کا اقرار بہت سے ناقدین و محققین نے کیا ہے۔ جیسے نامور نقاد وارث علوی نے اپنے ایک حالیہ مقالے میں اس تبدیلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"ایک خواب اور' اور اُس کے بعد کے مجموعوں میں نظم کے فارم کی طرف سردار کا رویہ زیادہ ذمہ دارانہ اور باشعور بن گیا ہے۔ غالب شعری رویہ پابند نظموں کی طرف ہے اور آزاد نظمیں بھی بیجا پھیلاؤ سے محترز اور اختصار اور کفایت کی طرف مائل ہیں۔ اسلوب استعاراتی اور علامتی اور خوبصورت فارسی تراکیب اور بندشوں سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ سبک، سجل اور برجستہ ہے۔ زبان سادگی میں سپاٹ نہیں بنتی اور ترصیع میں اغراق پیدا نہیں کرتی۔ صرفی اور نحوی در و بست میں سلاست اور روانی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ آہنگ بلند لیکن پُر وقار ہے اور کبھی بے قابو ہوکر چیخ و پکار یا اصوات کا جھمیلا نہیں بنتا۔"

(علی سردار جعفری کی شاعری مطبوعہ سہ ماہی اُردو ادب نئی دہلی۔ جنوری مارچ ۲۰۰۰ء ص۔ ۴۸)

اسی طرح پاکستان کے ممتاز ترقی پسند نقاد محمد علی صدیقی نے بھی سردار جعفری کی شاعری میں وقوعہ پذیر ہونے والی اس تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مقالے میں تحریر کیا ہے

علی سردار جعفری نے "لہو پکارتا ہے" میں شامل ۱۹۶۵ء کی شاعری کے بعد ہی جوش کے اثرات سے نکلنے کی کامیاب کوشش کی۔ یہی وہ موڑ ہے جب اُن کے یہاں تشبیہ کے مقابلے میں استعارہ اور ادعایت کے مقابلے میں ایمائیت کے لئے شیفتگی کا مظاہرہ شروع ہوجاتا ہے۔ "نومبر میرا گہوارہ" جو غالباً ابھی تک نا تمام ہے اس دائرہ کی تکمیل

کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سردار جعفری نے اس عرصہ میں پابلو نرودا اور بھگتی تحریک کے شاعروں کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا ہے۔"

سردار جعفری کی شاعری سے ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ کلاسیکی مزاج رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود سائنسی اور صنعتی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور انہوں نے دوسرے شعراء کے برعکس عوامی زبان کا استعمال بھی کیا اور سائنسی اور صنعتی ماحول سے متاثر ہو کر نئے نئے شعری پیکر ڈھالنے کی کوشش کی اور ایسے الفاظ کا استعمال کیا جو عموماً ہماری شاعری میں متروک ہیں یا جنہیں استعمال کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا جیسا کہ انہوں نے اپنے ایک خط میں اپنی اہلیہ سلطانہ جعفری کو لکھا تھا:

"اب سکون ہے اور سناٹا۔ نئے نئے شعری پیکر ڈھل رہے ہیں جن سے ہماری شعری روایت بالکل بیگانہ ہے۔ شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر، رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام، گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں۔ بارود کا کاجل، فولاد کے ہونٹ، سیسے کی زباں اُردو کی نازک مزاجی اس اندازِ بیاں کو کیسے برداشت کر سکے گی یہ خمِ شمشیر، تیرِ نگاہ اور پیکانِ یار سے کس قدر مختلف ہے۔ اُردو والوں کو میری شاعری سے مانوس ہونے میں وقت لگے گا۔ لندن والوں نے تو اب تک اقبال کو بھی قبول نہیں کیا ہے جس کی ساری شعری روایات کلاسیکی ہیں۔

(گفتگو، ترقی پسند ادب نمبر، جلد اول ۱۹۸۰ء)

لیکن لاتعداد یادگار اور بلند پایہ منظوم تخلیقات پیش کرنے کے باوجود ابھی تک سردار جعفری کی شاعری کی قدر و اہمیت کو صحیح ڈھنگ سے آنکا نہیں گیا اور بعض نقادوں نے تو گروہ بندی، ادبی چشمک اور ذاتی تعصب کی بنا پر اُن کی شاعری کے بارے میں ایسی ایسی گل افشانیاں کی ہیں کہ اُن کی تنقیدی رائے پر اظہار افسوس کرنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں نقاد اور شاعر خلیل الرحمن اعظمی نے اُن کی شاعری پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے صرف اُن کی اولین دور کی شاعری کو ہی غالباً مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھا کہ۔

"انہوں نے اپنے مواد عام طور پر "قومی جنگ" میں شائع ہونے والی خبروں اور اداریوں، سیاسی جماعتوں کے سالانہ کانفرنس کی تقریروں اور قراردادوں، عوامی لیڈروں کے بیانات اور آخر آخر میں پابلو نرودا۔ پال ایلیو، اور مائیکافسکی کی نظموں کے تراجم سے حاصل کئے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں وجدان اور تخلیقی عناصر کی کمی شروع ہی سے کھٹکتی رہی"

(اردو میں ترقی پسند تحریک ص ۱۴۳)

اور ابھی حال ہی میں سردار جعفری کی شاعری پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے مشہور ترقی پسند نقاد

پروفیسر محمد حسن نے اُن کی تمام شاعری کو نکارتے ہوئے انہیں صرف تین نظموں اور تین شعروں کا شاعر کہہ کر اہل اُردو کو انگشت بدنداں کر دیا ہے۔ انہوں نے دہلی کے ماہنامہ ایوانِ اُردو کے ستمبر ۲۰۰۰ء کے علی سردار جعفری نمبر میں شامل اپنے مضمون "سردار جعفری کو آخری سلام" میں لکھا ہے کہ جبلو نرودا ہی کی ایک نظم سے متاثر ہو کر ان کی نظم "میرا سفر" لکھی گئی جو بعض اضافے اور ترمیموں کے باوجود نرودا کی نظم ہی کا چربہ تھی مگر اُردو میں بے حد مقبول ہوئی۔ آج بھی ذاتی طور پر میرے لیے سردار جعفری غزل کے تین اشعار اور تین نظموں کے شاعر ہیں جن میں بلاشبہ "تین شرابی" اور "میرا سفر" نظمیں شامل ہیں اور غزل کے دو تین شعر جن میں وہ بے پناہ مصرعہ بھی شامل ہے۔۔۔ راستے بند ہیں کوچہ قاتل کے سوا۔"

اسی طرح ہمارے ترقی پسند شاعر معین احسن جذبی نے تو انہیں سرے سے شاعر ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ۔

" وہ ایک اچھا نثر نگار تو ہو سکتا ہے لیکن ایک اچھا شاعر نہیں۔ نہ تو وہ فطری شاعر ہے اور نہ ہی اس کے یہاں کوئی شعریت ہے میں نے اپنے کئی انٹرویو میں یہ بات کہی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو گھسیٹ گھسیٹ کر کسی طرح نظم کرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ میں اسے شاعر تسلیم نہیں کرتا۔"

حالانکہ دیکھا جائے تو جذبی صاحب کی بات میں کوئی وزن دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اصل فیصلہ شاعر کی زندگی میں کم اور موت کے بعد بہتر ڈھنگ سے کیا جاتا ہے اور سردار جعفری کی وفات کے بعد اُن پر نقادوں، محققوں اور ادیبوں نے ان سے متعلق جو متعدد مضامین لکھے ہیں، اُن میں سے زیادہ تر اُن کی شاعری سے ہی متعلق ہیں جن میں اُن کی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زندگی میں تو شاعر اور ادیب جوڑ توڑ کر کے بھی اپنے بارے میں مضامین لکھوا سکتے ہیں لیکن موت کے بعد نہیں۔ اتنے سارے مضامین اور خصوصی شمارے ان کی شاعری کی عظمت کا اعتراف نہیں تو اور کیا ہے؟ اور یہ شرف کسی اہم اور جینوئن شاعر کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ کیا کہتے ہیں علماء دین بیچ اس مسئلے کے؟

لیکن کیا وجہ ہے کہ سردار جعفری کے زیادہ تر معترضین وہ حضرات ہیں جو کبھی اُن کے قریبی ساتھی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن رہے ہیں؟ شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ سجاد ظہیر کے پاکستان چلے جانے کے بعد ترقی پسند تحریک کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں آگئی اور تنظیم کو چلانے سے متعلق اُن کے طریقہ کار سے اُن کا اپنے بعض قریبی ساتھیوں سے اختلاف ہو گیا اور انہوں نے تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی اور بتدریج ایسی شدت اختیار کی جس سے تحریک کو نقصان پہنچا اور اس کے ساتھ ہی سردار جعفری کے طریقہ کار سے انجمن پر اُن کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی اور پھر ایمرجنسی کے دوران تو اُن کے نقطہ نظر نے اُن کے بہت سے ساتھیوں کو اُن سے مایوس ہی نہیں بلکہ دور بھی کر دیا اور وہ تحریک جو جنگ آزادی کے حصول میں پیش پیش ہی نہیں رہی بلکہ ملک میں فرقہ وارانہ قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ، مزدوروں، کسانوں اور ملک کے غریب طبقے کے حق میں بھی آواز بلند کرنے میں سب سے

آ گے تھی۔ مرو بہ تنزل ہوگئی اور بالآخر یہ ملک گیر تنظیم صرف کا غذوں پر ہی رہ گئی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچائی ہے کہ جہاں ترقی پسند تحریک کمزور پڑتی گئی وہاں سردار جعفری کی شاعری بتدریج بلندیوں کی جانب رواں رہی اور انہوں نے شاعری میں ایک منفرد مقام حاصل کر لیا۔ معلوم نہیں تحریک سے اختلاف اور ذاتی اختلاف و رنجش کو اُن کی شاعری سے کیوں وابستہ کیا گیا۔؟

بہر حال سردار جعفری کی شاعری پر حرف گیری کرنے اور اسے کمتر بتانے کا سلسلہ اُردو میں کوئی نئی بات ہے بھی نہیں ۔ ایسا اُردو کے کئی بڑے بڑے شاعروں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ خود غالبؔ اور اقبالؔ ایسے عظیم شاعر بھی اس طرح کے حملوں سے نہیں بچ سکے اور ان کی شاعری بھی تضحیک و مذاق کا نشانہ بنائی گئی۔ غالبؔ کی شاعری کا مذاق اُڑاتے ہوئے "پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال" ایسے مہمل اور مضحکہ خیز اشعار کو اُن سے منسوب کر کے اُن کا مذاق اُڑایا گیا اور پھر بھری محفل میں انہیں مخاطب کر کے کہا گیا ۔

زبانِ میرؔ سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھیں

اس طرح شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی شاعری کے معترضین کی بھی کمی نہیں تھی اُن کی خامیوں کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا گیا اور ان خامیوں کو 'جراح' نامی فرضی مصنف کے نام سے کتابی صورت میں شائع بھی کیا گیا۔ یہی نہیں لکھنؤ کے بزرگ شاعر پیارے صاحب رشیدؔ نے تو اُن کے کلام کو اُردو شاعری ماننے ہی سے انکار کر دیا تھا لیکن ان تبصروں اور رائیوں کے باوجود آج غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعرانہ عظمت کے سبھی قائل ہیں لہذا سردار جعفری کے بارے میں بھی مذکورہ بالا رائیوں کو اُردو اہل الرائے ادبی چشمک اور ذاتی معاملہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

سردار جعفری ایک عظیم المرتبت شاعر تھے۔ ان کی شاعری ترقی پسند نظریات، انسان دوستی، کلاسیکی اقدار، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور عالمی بھائی چارے کا ایک ایسا امتزاج ہے جس نے انہیں اس دور کا ایک ایسا آفاقی شاعر بنا دیا ہے جسے اُردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔

نند کشور وکرم

(نند کشور وکرم)

جے۔ ۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

سردار جعفری

زندگی کا مختصر سفرنامہ

(خود نوشت)

پیدائش: بلرام پور (ضلع گونڈہ۔ اودھ) ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء

نام: علی سردار۔ نام کا سجع والد کے ایک دوست نے کہا تھا:

بجائے احمدِ مرسل ہوئے علی سردار

میرا نام اس اعتبار سے غیر معمولی ہے کہ آج تک اس نام کا دوسرا آدمی نہیں ملا۔ ہاں سردار علی کسی قدر عام ہے۔ حافظ شیرازی کے ایک قصیدے میں علی سردار اس طرح استعمال ہوا ہے کہ میرے نام کا سجع بن جاتا ہے۔ میرے والد کے کتب خانہ میں جو نسخہ تھا اس میں یہ قصیدہ شامل تھا۔ [illegible] زمانے میں [illegible] نا قاضی سجاد حسین صاحب نے نئی دہلی سے جو نسخہ ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اُس میں یہ قصیدہ شامل ہے میرے نام کا شعر یوں ہے:

علی امام و علی ایمن و علی ایماں

علی امین و علی سرور و علی سردار

معلوم نہیں یہ شعر والد کی نظر سے گزرا تھا یا نہیں لیکن ہم قافیہ نام میرے ایک چچازاد بھائی کا تھا جو مجھ سے چند سال بڑے تھے۔ علی جرار۔

میرے والد اور چچا کے نام بھی اسی طرح غیر معمولی تھے سید جعفر طیار جعفری، سید حیدر کرار جعفری، سید احمد مختار جعفری۔ معلوم نہیں میرے بڑے بھائی ظفر عباس کا نام ان قافیوں سے الگ کیوں تھا؟ مَیں نے اپنے بچپن کی ایک رباعی میں ان ناموں کو یکجا کرلیا ہے:

نور نظر احمد مختار ہوں مَیں لختِ جگر حیدر کرار ہوں مَیں
ہیں فتح وظفر قوت بازو سردار یعنی پسرِ جعفر طیار ہوں مَیں

میرے والد اور چچا کے ناموں کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے۔ کسی نے میرے دادا سے پوچھا۔ ''مہدی حسن تم نے اپنے بیٹوں کے نام جعفر طیار، حیدر کرار اور احمد مختار رکھے ہیں، اب چوتھا بیٹا ہوگا تو کیا نام رکھوگے؟'' میرے دادا نے برجستہ جواب دیا۔ ''پاک پروردگار''۔ والد کے ایک دوست نے میری پیدائش پر ایک شعر کہا تھا:

دیا حق نے جعفر کو ثانی پسر
مبارک خوش اقبال، پیدا ہوا''

تعلیم

سب سے پہلے گھر پر بہار کے ایک مولوی صاحب نے اُردو، فارسی اور قرآن کی تعلیم دی۔ وہ رات کو قصص الانبیاء سناتے تھے۔ اس کے بعد دینی تعلیم کے لئے سلطان المدارس لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ وہاں جی نہیں لگا۔ ایک مولوی صاحب کے گھر پر قیام تھا۔ وہاں بھی جی نہیں لگا اور مَیں فرار ہوکر بلرام پور واپس چلا گیا۔ بلرام پور کے انگریزی اسکول لائل کالجیٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ کھلی فضا تھی، اچھے اُستاد تھے ہم عمر لڑکوں سے دوستیاں تھیں۔ صبح ناشتہ کر کے گھر سے اسکول جانا اور شام کو چار بجے

متن سردار جعفری، بیگم سلطانہ جعفری، علی ناظم جعفری (فرزند)
ور دانہ جعفری (دختر) اور علی حکمت جعفری (فرزند) کے ساتھ

سردار جعفری احمد فراز اور جگن ناتھ آزاد

پھر واپس آکر ناشتہ کرنا۔اور میل ڈیڑھ میل دور ایک پریڈ گراؤنڈ میں پیدل جاکر دو گھنٹے کرکٹ ،ہاکی کھیلنا۔روز کا معمول تھا۔

اُسی زمانے میں انیس کے زیرِ اثر شاعری شروع کی۔۱۹۳۳ء میں بیس سال کی عمر میں ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا(ابتدائی تعلیم کے چند سال ضائع ہوگئے تھے)۔یہ ایک طوفانی زمانہ تھا جب تحریکِ آزادی اپنے شباب پر تھی۔اس عہد کے علی گڑھ نے اُردو زبان کو اختر حسین رائے پوری،سبطِ حسن،منٹو،مجاز،جاں نثار اختر۔خواجہ احمد عباس،جلیل قدوائی، اختر انصاری،شکیل بدایونی،عصمت چغتائی اور ۱۹۴۰ء کے آس پاس اختر الایما ن کا تحفہ دیا۔

وہاں خواجہ منظور حسین ،ڈاکٹر عبدالعلیم،ڈاکٹر رشید جہاں،ڈاکٹر محمد اشرف وغیرہ سے تعارف ہوا اور جن کی صحبت اور فیض نے ذوقِ ادب اور آزادی کے جذبے کو جلا عطا کی۔جدید عہد کے اُردو ادب میں تقریباً ۷۵ فی صد علی گڑھ اور ترقی پسند تحریک کی عطا ہے۔

ایک ہڑتال میں حصہ لینے کی وجہ سے مسلم یونیورسٹی کو خیر باد کہنا پڑا اور دہلی جاکر اینگلو عربک کالج میں داخلہ لیا۔یہ وہ تاریخی کالج تھا جو دہلی کالج کے نام سے ایک بڑا تعلیمی کردار ادا کر چکا تھا۔وہاں داخلہ دلوانے میں جلیل قدوائی اور اختر انصاری نے مدد کی۔اس واقعہ کے پچاس سال بعد ۱۹۸۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈی لٹ(D.Litt.) کی اعزازی ڈگری سے عزت افزائی کی۔یہ میرے لیے اس اعتبار سے بھی بڑا اعزاز تھا کہ مجھ سے پہلے یہ اعزازی ڈگری شعراء کی فہرست میں علامہ اقبالؔ،مسز سروجنی نائیڈو اور حضرت جگرؔ مرادآبادی کو عطا کی گئی تھی۔

جواہر لال نہرو سے اسی زمانے میں ملاقات ہوئی اور ملاقات کا یہ شرف آخر دن تک قائم رہا۔ اُن کے انتقال سے دو ماہ قبل تین مورتی ہاؤس میں اندرا گاندھی نے ایک چھوٹا سا مشاعرہ پنڈت جی کی تفریح طبع کے لئے کیا تھا جس میں فراقؔ، سکندر علی وجدؔ اور مخدوم محی الدین بھی شامل تھے۔ مَیں نے اپنی نظم "میرا سفر" فرمائش پر سنائی تھی۔

دہلی سے بی اے کرنے کے بعد مَیں لکھنؤ آگیا۔ پہلے مجازؔ کے ساتھ قانون کی تعلیم کے لیے ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ ایک سال بعد اس کو چھوڑ کر انگریزی ادب کی تعلیم کے لیے ایم اے میں داخلہ لیا لیکن آخری سال کے امتحان سے پہلے جنگ کی مخالفت اور انقلابی شاعری کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل اور بنارس سنٹرل جیل میں تقریباً آٹھ ماہ قید رہا اور پھر بلرام پور اپنے وطن میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ نظر بندی دسمبر ۱۹۴۱ء میں ختم ہوئی۔

لکھنؤ میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر احمد وغیرہ کی صحبت رہی۔ وہیں پہلی بار ڈاکٹر ملک راج آنند سے ملاقات ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر شانتی نکیتن جا کر ٹیگور سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہیں بلراج ساہنی سے ملاقات ہوئی جو ہندی پڑھاتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں لکھنؤ ریڈیو نے ایک مشاعرہ منعقد کیا جو سارے ہندوستان میں بڑے ذوق وشوق سے سنا گیا۔ اس کا نام تھا 'نو وارد شعراء کا مشاعرہ' جوشؔ نے صدارت کی لیکن کلام نہیں سنایا۔ فیضؔ، مخدومؔ۔ مجازؔ، جذبیؔ اور جاں نثار اخترؔ نے میرے ساتھ اس مشاعرے میں شرکت کی۔

ن م راشد کسی وجہ سے نہیں آسکے۔ یہ نئی ترقی پسند اُردو شاعری کے سات سیارے تھے جن کی تابناک گردش کا نغمہ آج بھی گونج رہا ہے۔
اختر الایمان نے اس کے بعد شاعری شروع کی لیکن ساحؔر اور مجروحؔ بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سکندر علی وجدؔ ہمارے احباب میں تھے۔ لیکن حیدرآباد کی سیول سروس کی وجہ سے اس طرح کے مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ اُن کی دو نظمیں 'اجنتا' اور 'ایلورا' اُردو شاعری کے شاہکاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ جوشؔ۔ جگرؔ، فانیؔ اصغرؔ، یگانہؔ، حسرتؔ موہانی کی شاعری کے ڈنکے بج رہے تھے۔ فراقؔ کا شمار ابھی بڑے شاعروں میں نہیں ہوا تھا۔ وہ عمر میں جوشؔ اور جگرؔ کے ہم عصر تھے لیکن شاعری میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر عروج حاصل کیا۔ اُن کی زیادہ شہرت ۱۹۴۷ء کے بعد ہوئی۔ ویسے اُن کا شمار بہت اچھے شعراء میں پہلے سے تھا۔

۱۹۴۲ء میں بمبئی میں آنا ہوا۔ سجاد ظہیر کے ساتھ کیمونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار ''قومی جنگ'' میں صحافتی فرائض انجام دیتا رہا۔ اس محفل میں بعد کو سبطِ حسن۔ مجازؔ۔ کیفیؔ، محمد مہدیٔ وغیرہ شامل ہوئے۔ آہستہ آہستہ بمبئی اُردو ادب کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۴۶ء کے بعد بمبئی میں جوشؔ، ساغرؔ نظامی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، میراؔ جی، اخترؔ الایمان، سجاد ظہیر، ساحرؔ، کیفیؔ، مجروحؔ، حمید اختر اور بہت سارے سربرآوردہ ادیب جمع ہوگئے۔ اُس زمانے کی انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں نے پوری اُردو دنیا میں دھوم مچا رکھی تھی۔ باہر سے آنے والے ادیب ان اجلاس میں بڑی مسرت سے شریک ہوتے تھے۔ پطرس

بخاری سے میری ملاقات پہلی بار بمبئی میں ہوئی۔اُن کے بھائی ذوالفقار بخاری ریڈیو کے ڈائرکٹر تھے اور اُن سے بہت اچھے مراسم تھے۔میری طویل تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' اُس دور کی تخلیق ہے۔ذوالفقار بخاری اس نظم کو ریڈیو پر ڈرامے کی انداز سے پیش کرنا چاہتے تھے لیکن ملک کی تقسیم کے ساتھ وہ یہاں سے چلے گئے۔

اس عہد کی عظیم فلمی شخصیتیں ہمارے حلقہءاحباب میں شامل تھیں۔مثلاً کے ایل سہگل، پرتھوی راج کپور، کے این سنگھ، وغیرہ۔بعد کو راجکپور، نرگس،اور دوسرے فلمی ستارے اس دائرے میں آگئے۔کیا اُن کی خوبصورت داستانیں لکھنے کا موقع آئے گا؟ یہ سب ترقی پسند ادب کے دلدادہ تھے۔

اودے شنکر کا گروپ جب الموڑہ میں ختم ہوا تو اُس کے فنکار بمبئی آگئے اور انڈین پیوپلز تھیٹر میں شریک ہوگئے۔اودے شنکر نے بمبئی آکر رقص کے ذریعے سے رامائن کا ایک پروگرام مزدوروں کے لیے پردے پر پرچھائیوں کی شکل میں پیش کیا۔اُن کے بھائی روی شنکر نے ''سارے جہاں سے اچھا'' کی دھن بنائی۔اس خوبصورت دور پر پھر کبھی تفصیل سے لکھا جائے گا۔

۱۹۴۱ء میں جو ہندوستانی سیاست کا ہیجانی دور تھا اور کیمونسٹ پارٹی کی انتہا پسندی اپنے شباب پر تھی، حکومت ہند کی طرف سے پارٹی پر پابندی عائد کردی گئی۔پورے ملک میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہوئیں مَیں بمبئی میں دوبار گرفتار کیا گیا۔پہلی بار پندرہ دن کے لیے۔دوسری بار ڈیڑھ سال کے لیے۔یہ زمانہ بمبئی کے آرتھر روڈ جیل اور ناسک کی

سنٹرل جیل میں گزارا۔ ۱۹۵۰ء میں یکایک رہا کر دیا گیا۔ وہ عید کی شام تھی۔ دوسرے دن صبح ہی صبح بمبئی آکر گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ عید کا دن تھا۔

ادبی تخلیقات

نظم

۱۔ پرواز (مجموعہ) ۱۹۴۳ء

۲۔ نئی دنیا کو سلام (طویل تمثیلی نظم) ۱۹۴۸

۳۔ خون کی لکیر (مجموعہ "پرواز" کے انتخاب کے ساتھ) ۱۹۴۹ء

۴۔ امن کا ستارہ (دو طویل نظمیں) ۱۹۵۰ء

۵۔ ایشیا جاگ اُٹھا (طویل نظم) ۱۹۵۱ء

۶۔ پتھر کی دیوار (مجموعہ) ۱۹۵۳ء

۷۔ ایک خواب اور (مجموعہ) ۱۹۶۴ء

۸۔ پیراہنِ شرر (مجموعہ) ۱۹۶۵ء

۹۔ لہو پکارتا ہے (مجموعہ) ۱۹۶۸ء

نثر

۱۔ منزل (افسانے) ۱۹۳۸ء

۲۔ یہ خون کس کا ہے؟ (ڈرامہ) ۱۹۴۳ء

۳ پیکار (ڈرامہ) ۱۹۴۴ء

۴۔ ترقی پسند ادب ۱۹۵۳ء

۵۔ لکھنو کی پانچ راتیں ۱۹۶۵ء

اقبال شناسی ۱۹۶۹ء

پیغمبران سخن (کبیر، میر، اقبال)

فنی تخلیقات

بولو اے سنت کبیر (ڈاکومنٹری فلم کا مسودہ) ڈائرکٹر خواجہ احمد عباس

۲۔ ہندوستان ہمارا (ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تہذیب پر ڈاکومنٹری مسودہ) ڈائرکٹر خواجہ احمد عباس

۳۔ لٹریری اسٹارم (The Literary Storm) انگریزی میں ڈاکومنٹری فلم۔ موضوع: تحریکِ آزادی میں ادب کا حصہ۔ مسودہ اور ڈائرکشن۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء۔ آسامی، بنگالی، اُڑیہ، ہندی، اُردو اور انگریزی (تین حصوں میں۔ ۱۸۵۷ سے ۱۹۰۵ء تک، ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۰ء تک اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک)

۴۔ ٹیلی ویژن سیریل "کہکشاں" جدید اُردو شعراء کی زندگی اور شاعری۔ حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، اسرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین (ڈائرکٹر: جلال آغا۔ تحریر: علی سردار جعفری)

۵۔ روشنی اور آواز۔ لال قلعہ شاجہاں سے ہندوستان کی آزادی تک

۶۔ روشنی اور آواز: شالیمار باغ سری نگر، جہاں گیر اور نور جہاں سے آج کے عہد تک۔ اس باغ میں لیلیٰ مجنوں کی کہانی پھولوں اور پودوں کی زبانی کہی گئی ہے۔ باغ میں بہتی ہوئی نہر وقت کا استعارہ ہے۔ پانی پر تیرتے ہوئے پھول لیلیٰ کا استعارہ ہیں اور نہر کے دونوں طرف سے جھکی ہوئی بید مجنوں کی شاخیں پھولوں کو چھو نہیں سکتیں، مجنوں کا استعارہ ہیں۔ نہر کے دونوں طرف کیاریوں میں لیمو اور سنترے کے دو دو پودے جنت میں لیلیٰ مجنوں کی یکجائی کی علامت ہیں۔ ناقہء لیلیٰ کی علامت اب باقی

نہیں رہ گئی ہے۔ یہ علامت سبز گھاس کے قطعات پر بیلوں کی شکل میں تھی جن پر گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔

کشمیری کہانی بھونرا اور نرگس تحریک آزادی کی کہانی سناتی ہے۔ جس میں بھونرا مجاہد کی علامت ہے اور نرگس (محبوبہ) آزادی کی علامت۔ جاڑے کی برف پگھل جانے کے بعد جب زنبور بہار گنگناتا ہوا نرگس سے ہم آغوش ہوجاتا ہے تو آزادی کی بہار آتی ہے۔

تین رنگ کے کشمیری کنول کے پھول برہما، وشنو اور مہیش کی علامت کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ سرخ کنول صبحِ ازل کا طلوعِ آفتاب ہے۔ نیلا کنول کائنات کی دوپہر ہے اور سفید کنول موت کی علامت ہے جو تجدیدِ حیات کی آئینہ دار ہے

۷۔ روشنی اور آواز: تین مورتی نواس۔ جواہر لال نہرو کی آزادی کے بعد کی کہانی۔

۸۔ سابرمتی آشرم: مہاتما گاندھی کی کہانی ہے جو ڈانڈی مارچ اور نمک ستیہ گرہ پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے بعد گاندھی جی احمد آباد منتقل ہو گئے۔

اکابرین عالم جن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا:

۱۔ ٹیگور ۲۔ مہاتما گاندھی ۳۔ جواہر لال نہرو ۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۵۔ ستیہ جیت رے ۶۔ پابلو نرودا ۷۔ ناظم حکمت ۸۔ ایالیہ ابرن برگ ۹۔ شالوخوف ۱۰۔ پاستر ناک ۱۱۔ فرانسیسی شاعر لوئی آراگان ۱۲۔ جیولو کیوری (سائنس) ۱۳۔ خروشچیوف ۱۴۔ پال روبسن۔

سیر و سیاحت

پاکستان، تاجکستان، ازبکستان، آذربائجان، روس، سائی بیریا عراق، یمن، مصر، یونان، بلغاریہ، برلن (مشرقی) برلن (مغربی) فرانس، چیکوسلواکیہ، ڈنمارک، سویڈن، ناروے، فن لینڈ، انگلستان، امریکہ اور کینیڈا۔

اعزاز و اکرام (۱)

۱۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ (شعری مجموعہ ایک خواب اور) ۱۹۶۵ء

۲۔ پدم شری (صدر مملکت ڈاکٹر رادھا کرشنن) شاعری کے لیے ۱۹۶۷ء

۳۔ جواہر لال نہرو فیلوشپ ۱۹۶۸ء۔ ۱۹۶۹ء

۴۔ سجاد ظہیر ایوارڈ (شاعری کے لیے) نہرو کلچرل ایسوسی ایشن لکھنؤ ۱۹۷۴ء

۵۔ اُتر پردیش اُردو اکیڈمی ایوارڈ (اقبال شناسی کے لیے) ۱۹۷۷

۶۔ اقبال میڈل (تمغۂ امتیاز) حکومتِ پاکستان ۱۹۷۸ء

۷۔ اُتر پردیش اُردو اکیڈمی ایوارڈ (شعری مجموعہ "لہو پکارتا ہے") ۱۹۷۹ء

۸۔ مخدوم ایوارڈ۔ آندھرا پردیش اُردو اکیڈمی (شاعری کے لیے) ۱۹۸۰ء

۹۔ میر تقی میر ایوارڈ۔ مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی بھوپال (شاعری کے لیے) ۱۹۸۲ء

۱۰۔ کمارن آشن ایوارڈ (ملیالی زبان کی طرف سے) تریونڈرم (طویل نغمہ "ایشیا جاگ اُٹھا" کے لیے) ۱۹۸۲ء

۱۱۔ خصوصی تمغہ، ماسکو (ستر سالہ جشن پیدائش پر) ۱۹۸۴ء

۱۲۔ اقبال سمان۔ مدھیہ پردیش حکومت بھوپال کی طرف سے (شاعری کے لیے) ۱۹۸۶ء

۱۳۔ ڈی لٹ (اعزازی دکتورادب) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۸۶ء

۱۴۔ بین الاقوامی اُردو ایوارڈ (شاعری کے لیے) اکیڈمی آف اُردو لٹریچر ٹورنٹو۔ کینیڈا ۱۹۸۸ء

۱۵۔ گنگادھر مہر ایوارڈ، سمبلپور یونیورسٹی (شاعری کے لیے) ۱۹۹۴ء

۱۶۔ میر ایوارڈ میر اکیڈمی لکھنؤ (شاعری کے لیے) ۱۹۹۲ء

۱۷۔ مولانا آزاد ایوارڈ۔ اُتر پردیش اُردو اکیڈمی لکھنؤ (شاعری کے لیے) ۱۹۹۴ء

۱۸۔ خصوصی Emiritus فیلوشپ ڈیپارٹمنٹ آف کلچر، حکومت ہند، نئی دہلی۔

۱۹۔ ظ۔ انصاری ایوارڈ، مہاراشٹر ریاست اُردو اکیڈمی ممبئی ۱۹۹۵ء

۲۰۔ گیان پیٹھ ایوارڈ ۱۹۹۷ء

اعزاز و اکرام (۲)

۱۔ ممبر سینٹ (Member Of The Senate) بمبئی یونیورسٹی (دوبار)

۲۔ پروڈیوسر ایمریٹس ریڈیو اور ٹیلی ویژن ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء تک

۳۔ صدر کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اُردو) ۱۹۷۷ء تا ستمبر ۱۹۹۰

۴۔ جنرل سکریٹری کل ہند صد سالہ جشن اقبال کمیٹی ۱۹۷۰ء

۵۔ وزیٹنگ پروفیسر جموں یونیورسٹی اکتوبر سے دسمبر ۱۹۸۳ء تک

۶۔ صدر کمیٹی برائے جائزہ سفارشات گجرال کمیشن (اُردو) مارچ سے ستمبر ۱۹۹۰ء تک

۷۔ نائب صدر مہاراشٹر اُردو اکیڈمی، بمبئی۔ جنوری ۱۹۹۴ء تک

۸۔ صدر فلم رائٹرس ایسوسی ایشن، بمبئی ۱۹۹۲ء

۹۔ کورٹ ممبر جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی۔

۱۰۔ ٹرسٹی نیشنل بک ٹرسٹ (ہند) نئی دہلی

سجع

مجھے ہے بلبل شیراز سے جو نسبتِ خاص
عطا ہوا ہے نہ ہوگا کسی کو یہ وقار
ہر ایک لفظ ہے پروردگارِ موسمِ گل
ہر ایک حرف ہے گہوارۂ نسیمِ بہار
صریرِ خامۂ معجز رقم نوائے سروش
سرودِ خامشیِ گل بانگِ گلشنِ اسرار
ہے شعرِ حافظؔ شیریں بھی سخن ترانۂ جاں
ہے جس میں اسم علی مثلِ گوہرِ شہوار
"علی امام و علی ایمن و علی ایماں
علی امین و علی سرور و علی سردار"

(مجلہ مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، دسمبر ۱۹۹۸ء)

سردار جعفری

خود نوشت

بچپن اور جوانی کے حالات

مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، اُن کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ اُن کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ وہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرشِ بریں سے وحی والہام لے کر کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کاغذوں کو دنیا نظم اور افسانہ، مقالہ اور کتاب کہہ کر آنکھوں سے لگاتی ہے اور ان سے روحانی تسکین حاصل کرتی ہے۔

انسان کے تسلسل میں حیاتیاتی عمل کارفرما ہے جو باپ سے بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن انسانیت کا تسلسل ہاتھوں کی تخلیق کا رہینِ منت ہے۔ یہ تخلیق بظاہر بے جان ہوتی ہے لیکن جانداروں سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔ ہاتھوں کے بغیر نہ جنگ ممکن ہے نہ امن، نہ محبت ممکن ہے نہ نفرت۔ یہی ہاتھ گلے میں حمائل ہوتے ہیں اور یہی ایک دوسرے کو چھوڑ کر دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتے ہیں، ساز میں سوئے ہوئے نغمے ان ہاتھوں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ہم آغوشی کے لیے پہلے یہی آگے بڑھتے ہیں اور رخصت کے وقت یہی سب کے بعد پیچھے ہٹتے ہیں۔ یہ وصال اور فراق کی حسین علامتیں ہیں۔ جس طرح ذہن اپنے آپ کو خیال میں تبدیل کر کے اس کو اپنے وجود سے الگ کر دیتا ہے اور وہ خیال ذہنِ انسانی سے بھی زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے، اسی طرح ہاتھ اپنے آپ کو قلم اور تلوار مشین اور اوزار میں تبدیل کر کے انہیں اپنے وجود سے الگ کر دیتے ہیں۔ اور وہ چیزیں ہاتھ سے بھی زیادہ طاقتور اور خلاق بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے ہمیشہ قلم کو ہاتھوں کا تقدس، ذہن کی عظمت، اور قلبِ انسانی کی وسعت سمجھا ہے اور قلم کے بنائے ہوئے ہر نقش کو سجدہ کیا ہے۔ اس لیے جب قلم جھوٹ بولتا ہے یا چوری کرتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ گندے ہو گئے ہیں۔ مَیں ہر ادیب سے توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنے قلم کا احترام کرے کیونکہ اس کے نفس کی عزت اور شرافت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے۔

مَیں بچپن میں ایک تختی لکھا کرتا تھا جس پر ہزاروں بار نہیں تو سینکڑوں بار اس شعر کی مشق کی ہے۔

قلم گوید کہ من شاہ جہانم   قلم کش را بدولت می رسانم

ممکن ہے کسی کے لیے یہ دولت چاندی سونا ہوں کیونکہ دنیا میں ضمیر فروشوں کی بھی کمی کبھی نہیں رہی ہے لیکن میرے لیے یہ علم، ہنر، خلوص اور صداقت کی دولت ہے۔ اور قلم کے احترام کے معنی اس دولت کا احترام ہے اور احترام کا جذبہ ہی بار بار میرے قلم کو روک رہا ہے۔

کیا میرا قلم صداقت کو پیش کر سکے گا؟ صداقت کوئی سپاٹ حقیقت نہیں ہے۔ ایک ایسا ہیرا ہے جو برابر تراشا جا رہا ہے اور رنگ و عمل کی جلا اس میں نیا نور، نیا رنگ پیدا کر رہی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ صداقت بدل جاتی ہے۔ دراصل اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اچھے شعر اور اعلیٰ فن کی طرح صداقت بھی تہہ در تہہ ہوتی ہے اس لیے کبھی کوئی تنہا انسان، کوئی تنہا قوم، کوئی تنہا نسل اس کا احاطہ نہیں کر سکی ہے۔ اور نہ کوئی تنہا نظریہ اس پر حاوی ہو سکا ہے۔ ناتمامی اس کی خصوصیت رہی ہے اور اس ناتمامی میں بلا کا حسن ہے۔

اس سے بھی زیادہ مشکل اس صداقت کو پیش کرنا ہے جس کا تعلق اپنی ذات سے ہو۔ انسان اپنے دل سے جتنے جھوٹ بولتا ہے اتنے دنیا کے سامنے نہیں بولتا۔ اور اپنے جھوٹ کو سچ کی شکل دینے کے لیے وہ کبھی جادوگری سے کام لیتا ہے اور کبھی فریب کاری سے۔ دنیا سے جھوٹ بولنے کے لیے پہلے اپنے دل سے جھوٹ بولنا ضروری ہے اس لیے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اور بھی ڈرتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں کن شخصیات اور واقعات نے متاثر کیا۔

وقت کے ساتھ بجھی ہوئی یادوں کے نقوش بدل جاتے ہیں۔ ایک نقش دوسرے نقش میں مل جاتا ہے اور تصویریں مسخ ہو جاتی ہیں۔ تعبیروں کے تپتے ہوئے میدانوں سے خوابوں کی ٹھنڈی اور سکون بخش چھاؤں دکھائی نہیں دیتی اور ہم اکثر نئے خواب تخلیق کر کے انہیں پرانے خوابوں کا نام دے دیتے ہیں۔۔ عمر کے چوالیس سالوں میں ہزروں دنوں اور ہزاروں راتوں ں کی شکنیں پڑی ہیں اور ہر شکن میں لاکھوں لمحے سو رہے ہیں۔ ان کو جگانے کی ہمت کس میں ہے؟ قہقہوں کے مرجھائے ہوئے پھول، آنسوؤں کے جمے ہوئے موتی، ابروؤں کی ٹوٹی ہوئی کمانیں، رخساروں کی بجھی ہوئی شمعیں، کتابوں کے پھٹے ہوئے ورق، علم شعور، رشک، حسد، محبت، نفرت، حماقت، رعونت سب ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں۔ آج یہ بتانا مشکل ہے کہ کس نے کیا سکھایا ہے؟ کس نے کیا اثر ڈالا ہے؟ شعوری اثرات اور غیر شعوری اثرات کے درمیان لکیر کھینچنا مشکل ہے۔

میری یادوں میں ایک کھنڈر اُبھر رہا ہے۔

کھنڈر کبھی کسی کھوئی ہوئی عظمت کا پتہ دیتے ہیں اور کبھی عظمت کے بغیر بھی انحطاط کی داستان سناتے ہیں۔ ہر کھنڈر کے لیے قدیم ہونا ضروری ہے۔ ایسے کھنڈر بھی ملتے ہیں جن کی ہر اینٹ سلامت ہوتی ہے۔ ہر دروازہ کھلتا ہے اور ہر دیوار کھڑی ہوتی ہے۔ پھر بھی عمارت کو دیکھ کر اس پر کھنڈر کا گمان گزرتا ہے۔ دیواروں پر بغیر حروف کی ایک کہانی

لکھی ہوتی ہے۔ دروازے بغیر زبان کا ایک افسانہ سُنا رہے ہیں اور اردگرد کی ہواؤں سے بوسیدگی کی بارش آ رہی ہے۔ مَیں جس کھنڈر کا ذکر کر رہا ہوں وہ ایسا ہی ہے، اُس کو دیکھتے ہی دل میں ویرانگی کا احساس ہوتا ہے۔

بمبئی سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور شمال میں ہمالیہ کی ترائی کا دامن جہاں سے پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں، پندرہ بیس ہزار کی آبادی کا ایک چھوٹا سا قصبہ بلرام پور ایک تعلقہ داری کی راجدھانی۔ تعلقہ داری کو ریاست کہتے ہیں اور تعلقہ دار کو مہاراجہ۔ اس قصبے کی ایک پتلی سی گرد آلود سڑک کے کنارے ایک اصطبل جس میں گھوڑوں کے لیے چھ تھان ہیں۔ سائیسوں کے لیے دو کوٹھریاں اور موٹروں اور گاڑیوں کے لیے تین گیرج۔ میرے بچپن میں ہر تھان پر گھوڑے تھے۔ ہر کوٹھری میں سائیس اور ہر گیرج میں موٹر یا بگھی۔ اب ایک گیرج میں ایک پرانا تانگا ہے اور دوسرے میں ایک بوسیدہ ٹم ٹم اور دو تھانوں پر دو مریل سے گھوڑے جنھیں دیکھ کر اُن کے مالکوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اصطبل کے باقی حصے میں لینڈی کتے رہتے ہیں، محلے کی کتیاں بچے جنتی ہیں اور قصبے بھر کے جانور گرمی، برسات اور جاڑوں کی صعوبتوں سے بچنے کے لیے آ کر پناہ لیتے ہیں۔

اصطبل کے برابر ہاتھی کا کھلا ہوا تھان ہے جہاں رام پیاری ہتھنی گنے کھایا کرتی تھی۔ جب وہ مری ہے تو اُس کی لاش کلہاڑیوں سے کاٹی گئی تھی اور ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُٹھائی گئی تھیں۔ پرانے ساجوں کا جنازہ بھی اس شان سے نکلتا تھا۔

اور تھان کے سامنے جو تلپٹ کے ہرے پتوں اور نیلے پھولوں سے ڈھکا ہوا تالاب ہے اُس کا پانی کبھی صاف شفاف تھا اور اپنی بڑی رہو مچھلیوں کے لیے مشہور تھا۔ اس کے کنارے امرودوں کا ایک باغ تھا اور ایک کبڑی پیٹھ کا بوڑھا اور اُس کی بیوہ بیٹی امرود بیچا کرتی تھی۔ پکنے سے پہلے ہی گدر امرود بک جاتے تھے۔ اب باغ اُجڑ چکا ہے اور ہاتھی کا تھان گھوڑے کے اصطبل کے نیچے دب چکا ہے اور اکثر سبزی مائل نیلے کانٹے دار پودوں کے زرد زرد پھولوں میں دو چار گدھے کھڑے نظر آتے ہیں۔

تھان کے پاس لگا ہوا برگد کا بوڑھا درخت اب بھی پھلتا اور چڑیاں اُس کے سرخ رنگ کے پھلوں کو کتر کتر کر زمین پر پھینکتی رہتی ہیں اور اس کی ٹہنیوں پر لال چونچ کے طوطے ٹائیں ٹائیں کرتے رہتے ہیں۔ پریاں اب بھی برگد کے پھول چرا کے لے جاتی ہیں لیکن اب اس بات میں کوئی رومانی کیفیت باقی نہیں ہے۔ اس خیال میں کوئی حیرت کا لطف نہیں ہے۔ مَیں اپنے بچپن میں جب کبھی ان پریوں کا تصور کرتا تھا تو میری بڑی آپا اور اماں کے چہرے مسکرانے لگتے تھے اور مَیں اس بات کا کوئی جواب نہیں سوچ پاتا تھا کہ وہ برگد کے پھول کیوں چرا لے جاتی ہیں؟ میری ماں اور بڑی آپا اب منوں خاک کے نیچے سو رہی ہیں اور برگد کے پیڑ کی موٹی موٹی لمبی لمبی جٹائیں زمین میں اپنے لیے جڑیں تلاش کرنے شاخوں سے نیچے اُتر آئی ہیں۔ بچپن کی پریاں کھو گئیں اور جن شاخوں سے پھولوں کا تصور وابستہ تھا وہ بہت ناک ہوتی

ہیں۔

سڑک کی دوسری طرف سرخ اینٹوں کی قد آدم دیوار کا ایک چوکور احاطہ ہے۔ اس کے دو کونوں پر پرلوہے کے پھاٹک لگے ہوئے ہیں جن کو کبھی سرخ بجری کی لہرائی ہوئی روش نے ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا۔ اب چولوں میں اتنا زنگ لگ چکا ہے کہ پھاٹکوں کا بند کرنا مشکل ہے۔ احاطے کے اندر ایک ٹینس کورٹ تھا اور اس کے چاروں طرف ہری ہری دوب بچھی ہوئی تھی۔ عشق پیچاں کی بیلیں باریک تاروں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ گلاب، بیلے اور چمپا کے پودے لگے ہوئے تھے اور مہندی کی باڑھ لگی ہوئی تھی جو بجری کی لال روش کے کنارے کنارے دوڑتی تھی۔ دو کونوں پر گل مہر کے دو پیڑ تھے جو اپنے پھولوں سے لد کر لال بھبھوکا ہو جاتے تھے۔ ان سب کی حفاظت کے لیے دو مالی تھے جو ذرا سی کوتاہی پر پیٹ دیے جاتے تھے۔ اگر غلطی سے اس باغ میں کوئی گائے بیل گھس آئے تو اُسے پکڑ کر میونسپلٹی کے "کانجی ہوز" میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اور مالیوں پر اتنی گالیاں پڑتی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ مَیں نے بچپن میں اس باغ سے بے شمار تتلیاں پکڑی ہیں اور گل مہر کی ہری ہری کلیوں سے فالیں نکالی ہیں۔

اب مہندی کی باڑھ، گلاب، بیلے اور چمپا کے پودے، عشق پیچاں کی سرخ پھولوں سی بھری ہوئی سبز بیلیں اور ہری ہری دوب سب سوکھ چکی ہے۔ باغ ایک میدان میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور اب سانڈ وہاں آپس میں لڑتے ہیں اور گدھے رینکتے ہیں اور کھجلیے کتے اپنی پچھلی ٹانگوں میں اپنی دم دبائے ہوئے ٹہلتے رہتے ہیں۔ گل مہر کے پیڑ اب بھی ہیں لیکن وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان میں پھول نہیں آتے۔ کبھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی کلی جھانکتی ہے۔ ورنہ بس شاخوں کے سوکھے ہوئے ہاتھ ہوا میں پھیلے ہوئے ہیں ... بھوکے بھکاریوں کے ہاتھوں کی طرح جنہیں کوئی بھیک نہیں دیتا۔ یہ خشک ہاتھ ٹھنڈی اور گرم ہواؤں سے خشک اور تر موسموں سے اپنی پتیوں اور پھولوں کی بھیک مانگتے مانگتے تھک جائیں گے اور پھر ایک ایک کرکے گرتے جائیں گے۔ انہوں نے شکست کھا جانے کے بعد بھی اب تک شکست کا اعتراف نہیں کیا۔ انہیں یہ خبر نہیں کہ جب جڑیں سوکھ جاتی ہیں تو شاخوں میں برگ و بار نہیں آتے۔ موسم بہار بھی ان کے لیے بہار کا پیغام نہیں لائے گا یہی ضد سماجی نظاموں میں تشدد کی پرورش کرتی ہے۔

احاطے کے اندر بجری کی لال روش کے موڑ پر ایک بڑا پھاٹک ہے۔ اس کی محراب اتنی بلند ہے کہ اس کے نیچے سے ہاتھی گزر سکتا ہے۔ اس کے اندر اینٹوں کا ایک بڑا آنگن ہے اور بیچ میں ایک چبوترے پر اس قصبے کا سب سے اُونچا نیم کا درخت کھڑا ہوا ہے۔ اس کی عمر کوئی سو برس کے قریب ہوگی۔ اس کا سایہ اب بھی ٹھنڈا اور صحت بخش ہے۔ لیکن پھننگیوں پر چیلوں اور کوؤں نے گھونسلے بنا لیے ہیں اور ان کی بیٹ نیم کے نیچے کسی کو نہیں بیٹھنے دیتی۔ پکی ہوئی خوشبودار نبولیاں سال میں ایک بار ٹپکتی ہیں۔ نیم کی ہری پتیاں سنہری ہو کر سال میں ایک بار ہواؤں میں اپنا سونا بکھیرتی ہیں لیکن چیلوں اور کوؤں کی بیٹ بارہ مہینے ٹپکتی رہتی ہے۔

اس کے چاروں طرف کئی مکانات ہیں۔ ہر مکان میں ایک گھرانہ آباد ہے۔ انہیں میں ایک میرا گھر بھی تھا۔ بڑے صحن، وسیع دالان، اور کوٹھے کی دو کھلی چھتوں کا گھر، اس کی پورب کی دیوار کی طرف سے ایک مندر کا خوبصورت کلس اور شیشم کا ایک بلند قامت درخت اندر جھانکتا تھا اور پیڑ کے پیچھے سے صبح کا سورج اور چودھویں کا چاند نکلتا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب پلنگ بچھ جاتے تھے تو یہ آنگن چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ اور جاڑوں کی راتوں میں اتنا لمبا کہ میں اکثر دوڑ کر اس آنگن سے گزرا کرتا تھا۔ اس آنگن میں مَیں نے پہلی بار اپنی رگوں میں جوانی کا خون محسوس کیا۔ گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں دیوار کے سائے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کا پسینے سے بھیگا ہوا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ غافل سو رہی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مَیں نے اُس سے زیادہ حسین چیز نہیں دیکھی ہے۔ وہ چہرہ آج نظروں سے اوجھل ہو کر اور زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔

اس سارے ساز و سامان میں جس کا مَیں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ہمارے چھوٹے سے گھر کے سوا اپنا اور کچھ نہیں تھا۔ ہر چیز ریاست کی تھی جو میرے والد اور چچا کی ملازمت کے سلسلے میں استعمال کے لیے ملی تھی۔ میرے چچا بڑے عہدے پر تھے اور والد چھوٹے عہدے پر لیکن رعب پورے خاندان کا تھا۔ چچا سید صاحب کہلواتے تھے اور والد بڑے بھیا کے نام سے مشہور تھے۔ میری ماں کو سارا قصبہ بڑی بہو کہتا تھا۔

خاندان میں بڑا اطمینان تھا۔ بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہیں بچے پیدا ہوتے تھے، جوان ہوتے تھے۔ بلرام پور کے اسکول کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہو جاتی تھی اور ریاست میں ملازمت مل جاتی تھی۔

خاندان کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں ورنہ دن ہنسی خوشی گزر جاتا تھا۔ اور رات کو سب بہن بھائی بستروں پر لیٹ جاتے تھے۔ کوئی ایک بہن شرلک ہومز کی کہانیاں، راشد الخیری کے ناول، عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی، اس سے تھک جانے کے بعد جناتوں کے قصے شروع ہوتے جو انتہائی دلچسپ ہونے کے بعد بھی دل میں دہشت پیدا کر دیتے۔ میری ایک پھپھو کو اصرار تھا کہ گھر میں جو کالا کتا آتا ہے وہ جن ہے اور اسے اُنہوں نے بلی اور گدھے میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ بڑا ایماندار مذہب کا پابند اور پرہیزگار خاندان تھا اسی لیے مجھے چھوٹی عمر میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا کہ مولوی بن جاؤں گا تو خاندان کی عاقبت سدھر جائے گی۔ لیکن طبیعت کی آزادہ روی نے اس سعادت سے محروم کر دیا۔ اور مَیں لکھنؤ سے تین بار بھاگا۔

میرے والد اور چچا نے کبھی رشوت نہیں لی اور دولت مندی کی شہرت کے باوجود صبر و قناعت کے ساتھ زندگی گزار دی۔ میری ماں کے سارے زیور بک گئے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ گھر میں افلاس ہے۔ وہ بڑے خلوص

سے ملازمت کرتے تھے اور ہر موقع پر نمک حلال ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ عام طور سے کالی کالی ٹوپیاں پہنتے تھے جو نہ جانے کیوں ایرانی ٹوپیاں کہلاتی تھیں۔ لیکن دسہرے کے موقع پر جو ریاست میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا، رنگین صافے باندھ کر جلوس کے ہاتھیوں پر بیٹھتے تھے اور مہاراج اور مہارانی کو نذر دیتے جاتے تھے۔ عید بقرعید، بارہ رجب اور عید غدیر بڑی شان سے مناتے تھے اور دیوالی پر ریاست کے دیئے ہوئے تیل کے دیوں سے گھر کی دیواریں سجاتے تھے۔ ریاست کے کام کے علاوہ ہمارے خاندان کو اخراجات کے لیے جو گاؤں ٹھیکے پر ملے تھے، اُن کا انتظام کرتے تھے اور سال بھر نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے، شعبان کے مہینے میں بارھویں امام کا یومِ ولادت مناتے اور عریضے ڈالنے جاتے تھے اور محرم بڑے جوش وخروش سے مناتے تھے اور انتقال سے کچھ پہلے جب میرے والد بستر سے اُٹھنے کے قابل نہیں تھے تو اُن کی چارپائی محرم کی مجلسوں کے لیے عزاء خانے میں لاکر رکھ دی جاتی تھی اور وہ لیٹے لیٹے مجلس سنتے تھے۔

چاندرات کو عورتیں چوڑیاں توڑ دیتی تھیں اور زیور اُتار کر رکھ دیتی تھیں اور سب لوگ کالے کپڑے پہن لیتے تھے اور باہر کوٹھی کے سب سے بڑے کمرے میں ضریح رکھی جاتی تھی اور علم کھڑے کیے جاتے تھے۔ چھتوں میں جھاڑ فانوس لگائے جاتے تھے۔ چاندی اور سونے کے پنجے اور سنہری کام کے سبز، زرد، سرخ اور سیندوری پٹکے مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو مہندی اُٹھتی تھی اور مجھے علی بند پہنایا جاتا تھا۔ آٹھویں کو حضرت عباس کا علم نکلتا تھا اور شب عاشور اعزاخانہ سجادیا جاتا تھا اور فانوس جگمگا اُٹھتے تھے۔ قصبے اور گرد ونواح کے لوگ زیارت کرنے کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔ عورتیں ٹولیاں بنا کر دیہاتی مرثیے گاتے ہوئی آتی تھیں اور حضرت صغریٰ کے قاصد کے نام پر جوان لڑکے پیک بن کر آتے تھے۔ ان کی کمر میں ایک پٹکے کے ساتھ ایک گھنٹا بندھا ہوتا تھا۔ سر پر پگڑیوں میں مور کے پَر لگے ہوتے تھے اور ہاتھوں میں مورچھل رہتے تھے۔ پیکوں کی ٹولیاں اپنے گھنٹے بجاتی ہوئی آتیں اور عزا خانے میں مرثیے گا گا کر ناچتی تھیں۔ اُن کے قدم ''حامی اللہ'' کے بول پر اُٹھتے۔ دس دن مسلسل مجلسیں ہوتی تھیں اور پڑھنے کے لیے لکھنؤ سے ذاکر آتے تھے۔ عشرے کے دن سارے قصبے کی فاقہ کشائی ہمارے گھر ہوتی تھی۔

سال کے اور مہینوں میں بھی مجلسیں اور محفلیں ہوتی تھیں جن کی بدولت مَیں نے اس عہد کے تمام بڑے ذاکروں کو سنا ہے اور تمام بڑے علماء اور مجتہدین کے ہاتھوں کو بوسے دیئے ہیں۔ مولانا سبطِ حسن کی خطابت بے پناہ تھی۔ فصاحت اور بلاغت کا دریا موجیں مارتا تھا اور اشاروں اور کنایوں کا تیکھاپن تڑپادیتا تھا۔ دولہا صاحب کو مَیں نے اس عالم میں دیکھا ہے کہ وہ منبر کے نیچے تقریباً دوہرے ہوکر بیٹھتے تھے۔ دو آدمیوں نے سہارا دے کر منبر پر بٹھایا۔ مگر انہوں نے ہاتھ میں لیا، ایک بار سنبھلے اور پڑھنا شروع کردیا تو دوسری ہی چیز ہوگئے۔

نام مرا ... کا رقم بازو پر تلوار کی ہے

سردار جعفری اور فیض احمد فیضؔ

سردار جعفری اور اختر الایمان

اس کے علا، انیس کے مرثیوں کا چرچا تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کی سنی ہے۔ میں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا۔ سلام اور مرثیوں کے علاوہ ویسے بھی مجھے بے شمار اشعار یاد تھے۔

شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دئے تھے اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے۔ ان کی زبان تشبیہ، استعارے، ترتیب ہر چیز انیس کی تھی، میرا اپنا کچھ نہیں تھا۔ میں ساٹھ ساٹھ، ستر ستر بند لکھ جاتا تھا لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا۔ ویسے مجلس میں پڑھنے کے لیے یہ بند کافی تھے۔

جب میں نے پہلا مرثیہ کہا۔

آتا ہے کون شمع امامت لئے ہوئے
اپنی جلو میں فوج صداقت لیے ہوئے

اللہ رے حسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذروں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

اور اسے منبر پر بیٹھ کر پڑھا تو والد اور چچا نے بہت گلے لگایا اور ماں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ میرے چچا بار بار مرثیے کے آخری دو مصرعوں کو پڑھتے تھے اور روتے تھے۔

اکبر کو اپنے پہلوے غم میں سلادوں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

اس کامیابی سے ہمت بہت بڑھی اور میں نے پندرہ بیس دن میں ایک اور مرثیہ کہہ لیا۔ وہ اس طرح شروع ہوتا تھا۔

آتا ہے ابن فاتح خیبر جلال میں
ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں
اک تہلکہ ہے وادی و دشت و جبال میں
بھاگا ہے آفتاب بھی برج زوال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمیں درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

مجھے اب تک یاد ہے کہ آخری مصرعے کی بہت داد دی ملی لیکن کچھ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ مَیں کسی سے لکھوا کر پڑھتا ہوں۔ یہ بات مجھے اتنی ناگوار گزری کہ مَیں نے نیا مرثیہ ان مصرعوں سے شروع کیا:

اے بلبلِ ریاضِ بیاں نغمہ بار ہو
اے نو عروسِ طبعِ جواں ہم کنار ہو
اے خامۂ شگفتہ زباں لالہ کار ہو
اے حاسدِ دریدہ دہاں شرمسار ہو

کیا اس میں مجھ سے ہیچمداں کا قصور ہے
یہ تو عطائے رحمتِ ربِ غفور ہے

اس میں مَیں نے یہ بھی لکھا تھا۔

اک خوشہ چیں ہوں باغِ جنابِ انیسؔ کا

پھر ایک اور مرثیہ کہا جس کے دو مصرعے یاد رہ گئے ہیں۔

عرش تک اوس کے قطروں کی چمک جانے لگی
چلی ٹھنڈی جو ہوا تاروں کو نیند آنے لگی

یہ مرثیے اب تک بلرام پور میں محفوظ ہیں اور محرم کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔

کربلا کے قافلے میں مجھے امام حسین کے بعد سب سے زیادہ عقیدت حضرت عباس اور حضرت زینب سے تھی اور انیسؔ کے مرثیوں نے اس عقیدت پر جلا کر دی تھی۔

میرے والد کے پاس مذہبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ قرآن بچپن میں بہار کے ایک مولوی صاحب سے پڑھا تھا۔ وہ دن میں بیدوں سے مارتے تھے اور رات کو پیغمبروں کی کہانیاں سناتے تھے۔ والد کی کتابوں سے مَیں نے تمام پیغمبروں اور چودہ معصومین کے حالات پڑھ لئے تھے اور چونکہ مَیں اس عمر میں مرثیہ خوانی کے علاوہ حدیث خوانی بھی کرنے لگا تھا اس لئے وہ حالات اور قرآن کی بہت سی آیتیں زبانی یاد تھیں اور ان سب کا مجموعی اثر مجھ پر تھا کہ حق اور صداقت کے لئے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ مَیں نے حق اور صداقت کو ہمیشہ زمین کی چیز سمجھا۔ نمرود و خلیل کی داستاں سے لے کر شہادتِ حسین تک کے واقعات نے میرے خون میں حرارت پیدا کر دی تھی اور مَیں اقبال کے یہ اشعار لہک لہک کر پڑھا کرتا تھا:

آن امامِ عاشقان پورِ بتول
سروِ آزادے زبستانِ رسولؐ

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر
دشمنان چوں ریگ صحرا لاتعداد
دوستان بالفظ یزدان ہم عدد
رمز قرآن از حسین آموختیم
ز آتش از شعلہ ہا اندوختیم
ایں دو قوت از حیات آمد پدید
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
شوکت شام و فر بغداد رفت
سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزان ہنوز
تازہ از تکبیر از ایمان ہنوز

اس زمانے میں چند سوالات نے مجھے بے چین کر دیا اور چند واقعات نے میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ یہ دنیا کیا ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ لیکن اس سوال نے ہمیشہ پریشان رکھا کہ یہ دنیا ایسی کیوں ہے؟ اور اس کی ابتدا میرے بچپن میں ہو گئی تھی۔

مَیں نے انتہائی افلاس کے بدترین نمونے دیکھے ہیں۔ ریاست کے گاؤوں میں پہلے اور اپنے گھر میں بعد کو۔ مجھے شکار اور گھوڑے کی سواری کا بے انتہا شوق تھا۔ اور مَیں بندوق لیے گاؤں گاؤں اور جنگل جنگل گھومتا تھا۔ اور ریاست کی تحصیلوں اور اور ذیلداروں میں ٹھہرتا تھا۔ اس طرح میں اودھ کی دیہات کی زندگی سے آشنا ہوا۔ یہ خوبصورت گیتوں اور دھان اور گیہوں کے کھیتوں اور انتہائی افلاس کی زمین ہے۔ اس میں اتنی پگڈنڈیاں نہیں ہوں گی جتنے خون کے دھارے اس کے جسم میں جذب ہو چکے ہیں۔ میری یاد میں اس کی انتہائی بھیانک تصویریں محفوظ ہیں۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جھکے ہوئے کسان جن کے پیٹوں پر اینٹیں لدی ہوئی ہیں۔ پیڑوں کی شاخوں میں بالوں سے لٹکی ہوئی عورتیں پتلی پتلی سوکھی ٹانگیں اور باہر نکلے ہوئے پیٹوں کے بچے۔ بڑی بڑی سیاہ مگر بجھی ہوئی آنکھیں۔ ایک بار میرے سامنے ایک کسان عورت ننگی کر دی گئی۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار تصویریں ہیں جو اگر کوئی مصور پردے پر بنا دے تو دنیا چیخ اُٹھے۔ ان دیہاتوں میں جا کر مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ لاکھوں آدمی چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار کھانا کھاتے ہیں۔

اودھ کی دوسری تعلقہ داریوں کی طرح بلرام پور میں بھی ہرواہی کا رواج تھا۔

خود ہمارے گاؤں میں ہرواہے اور ہرواہیاں تھیں۔ اُن کے پاس اپنی زمین اور اپنا گھر نہیں ہوتا تھا۔ یہ زمینداروں اور ٹھیکیداروں کے کھیتوں پر کام کرتے تھے اور فصل کٹنے کے بعد موٹے اناج کی شکل میں اُن کو مزدوری دی جاتی تھی جس سے اُن کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ اور یہ قرض لینے پر مجبور ہو جاتے تھے جسے نہ وہ خود زندگی بھر ادا کر سکتے تھے اور نہ اُن کی آنے والی نسلیں۔ اس لیے ان کی نسلوں کی نسلیں زمینداروں اور ٹھیکیداروں کے کھیتوں کے ساتھ بندھی ہوتی تھیں وہ ایک طرح کے نیم غلام تھے اور اُن کی جان اور مال اور عزت و آبرو پر زمیندار کا پورا پورا حق تھا۔ اُن سے زیادہ تباہ حال مخلوق مَیں نے کبھی نہیں دیکھی ہے۔ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس ہرواہی کے عذاب سے بچنے کے لیے یہ لوگ بمبئی اور کلکتہ کے شہروں کی طرف بھاگتے تھے کیونکہ اودھ کے کسی ضلع یا گاؤں میں اُن کے لیے پناہ لینا ناممکن تھا۔ قدیم عہد کے غلاموں کی طرح یہ اپنے مالک کی ملکیت تھے اور دوسرا مالک انہیں زبردستی پکڑ کر واپس کر دیتا تھا۔

ایک بار ایک ہرواہی ہمارے گھر میں اناج صاف کرنے آئی تھی۔ وہ چاول صاف کرتی جاتی تھی اور ایک مٹھی کچے چاول اپنے منہ میں ڈال لیتی تھی۔ یکایک میرے بہنوئی کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے ڈانٹ کر پوچھا کہ منہ میں کیا ہے؟ ہرواہی گھبرا کر جلدی جلدی کچے چاول چبانے لگی۔ میرے بہنوئی نے لپک کر اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ ہرواہی نے خون کی ایک کلی کے ساتھ کچے چاول تھوک دیئے۔ وہ غریب کئی دن کی بھوکی تھی۔

افلاس کچھ مضحکہ خیز تصویریں بھی بناتا ہے لیکن وہ حقیقتاً بڑی دردناک ہوتی ہیں۔ مجھے اپنے اسکول ماسٹروں کی یاد اسی طرح آتی ہے۔ ان میں ایک منشی بدری پرشاد چھوٹے سے قد کے بوڑھے آدمی تھے۔ دھوتی باندھتے تھے اور ایک میلا سا کوٹ پہنے رہتے تھے۔ مشین سے کٹے ہوئے خشخشی بالوں کے سر پر فیلٹ کی کالے رنگ کی میلی چیکٹ ٹوپی چھوٹے سے تنگ ماتھے پر جھکی رہتی تھی۔ گردن کوتاہ تھی اور کندھے اوپر کو اُٹھے رہتے تھے۔ اور وہ چلتے بھی تھے ذرا جھک کے۔ تیسرے سے چھٹے درجے تک حساب پڑھاتے تھے اور بیچ بیچ میں کھنکارتے جاتے تھے۔ منشی جی اپنی چھوٹی سی پرانے فریم کی عینک لگا کر حاضری لیتے اور پھر پڑھانے کھڑے ہو جاتے، پھر سوال پوچھتے جو بچہ سوال کا ٹھیک جواب نہ دے پاتا اُس کی شامت آ جاتی۔ تین چار بید مارنے کے بعد منشی جی کھنکارتے اور طالب علم کے دماغ کو کمزور قرار دے کر اُسے تیل لگانے کی ہدایت دیتے تاکہ دماغ روشن ہو جائے۔ اور حساب سیکھنے میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔ کہتے کہتے وہ جیب سے تیل کی شیشی نکال لیتے اور طالب علم کے ہاتھ بیچ دیتے۔ معلوم نہیں وہ یہ تیل خود بناتے تھے یا خرید کر لاتے تھے۔ ایک بار مَیں نے بھی اُن کا تیل خریدا اور اس یقین کے ساتھ سر میں لگایا کہ اس کی ہر بوند کے ساتھ دماغ اس طرح روشن ہو جائے گا جیسے مٹی کے تیل سے لالٹین جل اُٹھتی ہے۔ لیکن صبح روشن دماغی کے سلسلے میں اپنی ماں کا یہ فقرہ سنا کہ چھچھوندر کے تیل کی بو کہاں سے آ رہی ہے؟

آج منشی بدری پرشاد کا خیال آتا ہے تو مجھے اُن پر بے حد پیار آنے لگتا ہے۔ حالانکہ بچپن میں اُن کے بید کھا

کر میں نے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح درختوں کے پیچھے چھپ کر اُن پر آوازیں لگائی ہیں۔ لیکن منشی جی نے کبھی لڑکوں کے فقروں پر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گردن جھکائے آتے تھے اور گردن جھکائے چلے جاتے تھے۔ مَیں اُن کے گھر کبھی نہیں گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اُن کی زندگی میں کیسی کیسی ناکامیاں اور حسرتیں تھیں۔ شاید خواہشوں کا گلا وہ بہت پہلے گھونٹ چکے ہوں گے اور تیل صرف اس لیے بیچتے ہوں گے کہ اُن کی قلیل سی تنخواہ اُن کے لیے ناکافی ہوگی اور اُن کی دال گھی سے محروم رہتی ہوگی۔ اب اگر مجھے منشی بدری پرشاد مل جائیں تو مَیں اُن کے پیر چھو کر اپنی گستاخیوں کی معافی مانگوں جن کا غالبًا انہیں علم بھی نہ ہوگا اور اُن کے تیل کی شیشیاں خریدنے کے لیے تمام عمر بید کھاتا رہوں اور اُف بھی نہ کروں۔

ایک میر بق چوں چوں تھے۔ جن کے ہاتھ پیر کو لقوہ نے بے کار کر دیا تھا۔ لوگ انہیں چونی چپت کہہ کر چڑھاتے تھے۔ اُن کا منہ کالا کیا گیا۔ انہیں گدھے پر بٹھایا گیا اور ایک بوڑھی مہترانی سے اُن کی فرضی شادی رچا دی گئی اور یہ سب صرف اس جرم میں کہ وہ بے بس اور اپاہج تھے۔ اور بھی اس قسم کے درجنوں کردار ہیں۔ سب ٹوٹے پھوٹے چہروں کے لوگ لیکن دکھی دلوں کے مالک۔

میں سوچتا ہوں یہ مخلوق کہاں سے آئی ہے؟ یہ مظالم کیوں ہو رہے ہیں؟ ان پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کرتا؟ میرا خاندان اس پر قانع تھا کہ سب کچھ خدا کی دین ہے۔ امیر اور غریب ہمیشہ سے ہیں، ظلم و استبداد ہمیشہ سے ہیں۔

اُس زمانے میں مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ اسلام میں زمین کی ملکیت کا کوئی تصور نہیں تھا اور مَیں نے پہلی بار اپنے والد اور چچا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ سماجی زندگی اور ذاتی عقائد کی زندگی کے درمیان ایک اونچی دیوار ہے اور جو سوالات مجھے پریشان کر رہے ہیں وہ دوسروں کو پریشان نہیں کرتے۔ مَیں نے قرآن اور حدیث کی مدد سے استدلال کرنے کی کوشش کی خدا کے دیئے ہوئے رزق سے کھاؤ، پیو اور زمین پر فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔ اس سے مَیں نے یہ نتیجہ نکالا کہ فتنہ و فساد برپا کرنے والے صاحبانِ اقتدار ہیں جن کے ملازم میرے والد اور چچا ہیں، جنہیں اس کا اندازہ نہیں کہ وہ خود کتنے پسے ہوئے اور دبے ہوئے ہیں لیکن عام تصور یہ تھا کہ فتنہ و فساد کے ذمہ دار کسان ہیں۔ اگر وہ بیگار سے انکار نہ کریں اور لگان ادا کریں اور موٹا جھوٹا پہن کر اور آدھے پیٹ کھا کر خدا کا شکر کیا کریں تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔

مجھے یاد نہیں ہے لیکن ایک مرتبہ یہ ہوا کہ گاؤں کے کسانوں نے بغاوت کر دی۔ ریاست کی فوج نے جواب میں سارے گاؤں میں آگ لگا دی اور کسان عورتوں کو بے عزت کیا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا، اخباروں میں خبریں چھپیں اور کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اس معاملہ کی تحقیقات کرنے آئے۔ ریاست کے عملے نے انہیں گاؤں

تک جانے سے روک دیا اور راستے کی پکی سڑک میں جابجا گڈھے کھود دیئے گئے تاکہ پنڈت نہرو کی کار وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

غالباً غدیر کا دن تھا یا یوں ہی ہمارے گھر میں کوئی محفل تھی۔ مَیں اس محفل میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے اس عام جلسے میں چلا گیا جہاں پنڈت نہرو نے جاگیرداری ظلم و استبداد کے خلاف تقریر کی۔ جلسے کے بعد مَیں واپس آیا تو گھر کے لوگ مجھ سے خفا تھے اور مَیں ساری کائنات سے بیزار۔ ظلم اور افلاس کے سماجی اسباب کے پہلے علم نے میرے دل میں چراغ جلا دیئے تھے۔

اُسی زمانے میں مَیں نے دو نہایت اہم کتابیں پڑھیں جنھوں نے میری زندگی بالکل بدل کر رکھ دی۔ ایک مہاتما گاندھی کی کتاب "تلاشِ حق" اور پلوٹارک کی "مشاہیرِ یونان و روما"۔ گاندھی جی کی کتاب مَیں پوری طرح نہ سمجھ سکا اس لیئے کہ وہ انگریزی میں تھی اور میری انگریزی کی استعداد اتنی نہیں تھی۔ کتاب میرے چچا کی تھی جنھوں نے خود اُسے بڑے شوق سے پڑھا تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُن سے اس کے مطالب دریافت کروں، خود ہی اس کی سیاہ چھپی ہوئی سطروں میں نور اور روشنی کی جستجو کرتا رہا۔ پلوٹارک کی کتاب انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد نے چھاپی تھی اور غالباً اس کا ترجمہ ہاشمی فرید آبادی نے کیا تھا۔ اس کا اثر زیادہ گہرا پڑا کیونکہ مَیں اسے آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ خاص طور سے کرٹس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کی کون سی ادا مجھے بھائی تھی۔

لیکن ان کتابوں نے میرے سوالات حل کرنے کے بجائے میرے دل میں اور آگ لگا دی۔۔ اس آگ کو کون بجھائے؟ نہ گھر میں کوئی میرا جواب دینے والا ہے اور نہ اسکول میں۔ نہ کتابیں نہ رسالے، نہ اخبار۔ میرے والد اور چچا مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، اس لیے اُن کو میرے سوالات دیوانگی معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی شفقت میرے دل کی آگ کو نہ بجھا سکی۔ ایک واقعے نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایک اور گاؤں میں بغاوت ہوگئی اور ایک کسان نے ریاست کے تحصیلدار کو جان سے مار دیا۔ میرے بہنوئی جو زیلدار تھے بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگ آئے۔ سب کی ہمدردیاں میرے بہنوئی اور مرے ہوئے تحصیلدار کے ساتھ تھیں۔ میری ہمدردیاں کسانوں کے ساتھ۔

اب مجھے ہر اس چیز سے نفرت ہوگئی جس سے امارت کی ذرا سی بھی بو آتی ہو۔ میرا ردِ عمل صرف جذباتی تھا اور عقل کو جذبات کی تنظیم کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس عالم میں میں نے ایک نظم کہی کہ خدا نہ تو غرناطہ و بغداد کے ایوانوں میں ہے نہ امیروں کے محلوں میں۔ خدا جو کی روٹی میں ہے، پیوندوں کی چادر میں ہے اور کربلا میں چمکنے والی حسین ابن علی کی تلوار میں۔ اب اس کا ایک مصرعہ بھی یاد نہیں ہے لیکن یہ نظم مَیں نے کئی مجلسوں میں پڑھی اور اس کی داد بھی ملی اور تو کسی نے اس نظم کو نہیں سمجھا لیکن والد اور چچا کے ملنے والے ایک گورنمنٹ کے تحصیلدار التجا حسین صاحب تھے، وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے، اُن کے کان کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے نظم کی تعریف کی اور پھر مجھ سے پوچھا۔ "تم خدا کو مانتے ہو؟" وہ

مجھے اسی طرف لے جانا چاہتے تھے کہ امیر و غریب سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں لیکن گفتگو میں بات یہاں تک پہنچ گئی کہ میں نے کہا کہ "میں خدا کو اس لیے مانتا ہوں کہ رسولؐ کو مانتا ہوں" بزرگوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن میں اس وقت اُن کے سامنے گستاخ ہو گیا تھا میں یہاں تک کہہ گیا کہ "آپ کے پاس خدا کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن میرے پاس ہے کہ "رسولؐ نے کہا ہے کہ خدا ہے۔" میں وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا اور دیر تک بانگِ درا پڑھتا رہا اور جب شکوہ کے اس بند پر پہنچا:

تھی تو موجود ازل ہی سے تیری ذات قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمت تیرے محبوب کی دیوانی تھی

تو خوشی سے میری باچھیں کھل اُٹھیں کہ میں اپنے بزرگوں کے سامنے اقبال کی دلیل پیش کر کے آیا ہوں۔

اب خاندان میں میرا تھوڑا سا احترام بھی کیا جاتا تھا اور لوگ میرے نام پر زیرِ لب مسکرا بھی دیتے تھے۔

میں نے اچھی چیزیں کھانا چھوڑ دیں تھیں۔ ٹینس کھیلنا اور شکار کھیلنا بھی تقریباً ترک کر دیا تھا۔ زیادہ تر کتابیں پڑھنے میں وقت گزارتا تھا لیکن کام کی کتابیں کم تھیں۔ سب سے اچھی کتاب "بانگِ درا" تھی جو زبانی یاد ہو گئی تھی۔ اسی دوران "نگار" کے کچھ پرچے کہیں سے مل گئے۔ غالباً ۱۹۲۴ء کی فائلیں تھیں۔ اُن میں پہلی بار غالباً نیاز فتحپوری کی کسی تحریر میں انقلابِ روس کا ذکر مل گیا اور میں نے اقبال کی خضرِ راہ کو اس کے ساتھ ملا کر اپنے خیالوں کی دنیا تعمیر کرنا شروع کر دی۔

ماں باپ میری حالت پر کڑھتے تھے اور بہنیں مجھے حیرت سے دیکھتی تھیں۔ ایک رشتہ کی بہن تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ پسندیدگی کی چمک تھی اور اُس کی یہ چمک مجھے اس پر آمادہ کرتی تھی کہ میں اُس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کروں۔ میں اُس سے مفلسی اور امارت، ظلم اور انصاف کی باتیں کرتا رہتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ ہمارے درمیان کچھ نازک اور لطیف رشتے پیدا ہو گئے ہیں اور میرے دل میں ایک نور سا بکھر گیا۔ برسوں بعد میری شادی کا سوال اُٹھا تو میں نے والدین کو اُس لڑکی کا نام بتا دیا لیکن لڑکی کے باپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اول جلول آوارہ گرد ٹھہرا، نہ رہنے کا ٹھکانہ ہو گا نہ کھانے کا۔ لڑکی کہاں بھاڑ جھونکے گی؟

یہ غالباً ۱۹۳۰ء کے آس پاس کی بات ہے کہ میں نے طے کر لیا کہ میں بلرام پور سے نکل جاؤں گا۔ اتفاق سے یہ

خبر معلوم ہوئی کہ جہاز رانی کی ٹریننگ کے لیے اب ہندوستانی بھی لیے جائیں گے۔ کچھ ذوقِ آوارگی اور کچھ بلرام پور سے نکل جانے کا شوق۔ میں نے والد سے جہاز رانی میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ میں مہینوں امتحان کی تیاری کرتا رہا۔ اور پھر لکھنؤ جا کر امتحان دیا اور اُس میں کامیاب ہو گیا۔ بمبئی سے بلاوا آ گیا۔ میں بے انتہا خوش تھا اور سفر کی تیاریاں کرنے لگا تھا کہ یکا یک ایسا واقعہ ہوا جس نے سارے خوابوں کو خاک میں ملا دیا۔

ایک مجتہد صاحب ہر سال تشریف لاتے تھے۔ میں جانے کی تیاری میں تھا کہ وہ آ گئے۔ جب میرے والد نے ان کے سامنے ذکر کیا تو کچھ شبہات کا اظہار بھی ہوا۔ کس طرف سے؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا معلوم ہے کہ مجھے اُن کے سامنے بلایا گیا اور پھر میرے سامنے استخارہ دیکھا گیا اور استخارہ منع آ گیا۔ میں نے اُس وقت ذرا سی جھنجھلاہٹ محسوس کی۔ پھر یہ تاویل کی۔ چلو اچھا ہوا میں خواہ مخواہ انگریزوں کی ملازمت کرنے جا رہا تھا لیکن جب ۱۹۴۶ء میں میری آنکھوں کے سامنے بمبئی کے جہازیوں نے بغاوت کی تو میرا دل اس خیال سے تڑپ اُٹھا کہ میں اس بغاوت میں شریک نہ ہو سکا۔ اسے ایک طرح کی رومانیت کہہ لیجئے لیکن یہی رومانیت تو زندگی میں رس پیدا کرتی ہے۔

اب پھر بلرام پور کا کنواں تھا اور میں۔ عمل کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذہنی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں بے بس تھا اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

اسی ذہنی کیفیت میں ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ پہنچا۔ اُس وقت میری عمر بیس برس کی تھی۔ چونکہ میں نے ابتدائی چند سال عربی اور فارسی کی تعلیم میں گزارے تھے اور تب انگریزی اسکول میں داخلہ لیا تھا، اس لیے میں عمر کے اعتبار سے تعلیم میں پچھڑا ہوا تھا۔ جب انٹرمیڈیٹ میں پہنچا تو میرے ہم عمر بی اے اور ایم اے کے طالب علم تھے۔

یہ زمانہ جتنا ہندوستان کی تاریخ میں اہم ہے اُتنا ہی اُردو ادب اور علی گڑھ کی تاریخ میں بھی۔ علی گڑھ تحریک نے انیسویں صدی میں اُردو ادب کے دھارے کو موڑا تھا اور بیسویں صدی کی ابتدا میں غزل کی اصلاح کا سہرا بھی علی گڑھ کے ہی ایک سپوت مولانا حسرت موہانی کے سر پر ہے۔۔ دوسری دہائی میں وہاں کی رومانی تحریک میں علی گڑھ کا اچھا خاصہ حصہ ہے اور تیسری دہائی میں جب ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب کو نیا رخ دیا تو یہاں بھی علی گڑھ پیچھے نہیں رہا۔

جس زمانے میں میں وہاں پہنچا، نئی تحریک کے اولین نقوش بن رہے تھے اور ادب اور سیاست مل کر ایک ہو رہے تھے۔ اختر حسین رائے پوری، سبطِ حسن، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، مجاز، جاں نثار اختر، آل احمد سرور سب وہاں کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر عبدالعلیم اُستادوں میں تھے۔ بعد کو عصمت چغتائی بھی وہاں پہنچ گئیں اور جذبی بھی۔ اور یہ سب جدید اُردو ادب کے نہایت اہم اور ہوش مند معمار ہیں۔

میں جس ذہنی کیفیت میں گیا تھا، اُس کا تقاضا یہ تھا کہ میں سیدھا لائبریری کا رخ کروں۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ علی گڑھ میں کون کون ہے؟ اور کس قسم کے طوفان پرورش پا رہے ہیں؟ میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ذہنی الجھنوں کو

دور کرنے کے لیے علم بہت ضروری ہے جس سے مَیں اب تک بُری طرح محروم تھا۔

بغیر ترتیب کے میرا ہاتھ جس کتاب پر پڑا، اُسے پڑھ ڈالا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا ہاتھ کسی سیاسی کتاب پر نہیں پڑھا؟ عام طور سے مَیں ادبی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ اُن کے زیر اثر بلرام پور میں پیدا ہونے والے سوالات کچھ عرصے کے لیے دب گئے اور مَیں آسکر وائلڈ میں کھو گیا جس کی سالومی کے زیر اثر میں نے نہایت بے سرو پا ڈرامہ لکھا۔ غالبًا اس کا نام "دیوانے" تھا اور وہ علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا۔ اس کی نہ جانے کیوں میرے محترم اُستاد رشید احمد صدیقی صاحب نے تعریف کی اور بھی کچھ لوگوں نے اُسے سراہا۔ مَیں اس وقت تو خوش ہوا اور جب ذرا ہوش آیا تو حیران ہو گیا اور آج بھی حیران ہوں کیونکہ اس پر کسی قسم کے سیاسی اور سماجی شعور کی پرچھائیں بھی نہیں ہے۔ صرف لفاظی ہے اور وہ بھی انتہائی مصنوعی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ چند سال بعد رشید صاحب نے اپنی کتاب مجھے دستخط کر کے بھیجی اور اس پر میرے لیے لکھا کہ "جن کے بارے میں میری وہی رائے ہے جو میر کی غالبؔ کے بارے میں تھی۔" اس پر مَیں چونکا اور مجھے "دیوانے" کے مہمل ہونے کا یقین آ گیا۔ غالبؔ کی منزل تو نصیب نہیں ہوئی لیکن ہوش ضرور آ گیا۔

مَیں آسکر وائلڈ کی گرفت سے بہت پہلے نکل چکا تھا۔ جس زمانے میں مَیں اُس کی سوانح عمری پڑھ رہا تھا تو گوئٹے کا "ورتھر" میرے ہاتھ لگ گیا۔ اس سے مَیں گوئٹے کی طرف مائل ہوا اور جب مَیں نے اُس کا شاہکار "فاؤسٹ" پڑھا تو مجھے ادب کی حقیقی بلندی کا احساس ہوا۔

دل میں سوئے ہوئے سوالات پھر جاگنے لگے اور ایک روز محض اتفاق سے ایک واقعے نے مجھے ایک نئی راہ میں ڈال دیا۔ تقریریں کرنے کا مجھے بھی شوق تھا اور میرے دوست فرحت اللہ انصاری کو بھی۔ وہ چونکہ انگریزی میں تقریر کرتے تھے اور وہ زمانہ یورپ میں فاشزم کے عروج کا زمانہ تھا اور ہندوستان میں تحریکِ آزادی کی لہریں اُونچی اُٹھ رہی تھیں اس لیے احمد عباس کی طرح اُن کی تقریروں میں بھی سیاسی الفاظ کی بہتات ہوتی تھی ایک دن میں نے فرحت کی زبان سے بورژوا کا لفظ سنا اور اُن سے اس کے معنی پوچھے۔ جواب دینے کے بجائے وہ ہنسنے لگے۔ مَیں پھر لائبریری کی طرف بھاگا اور اس بار جب مَیں واپس آیا تو میری بغل میں لینن کی سوانح عمری تھی۔ مجھے اب یہ بالکل یاد نہیں کہ وہ کس کی لکھی ہوئی تھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ جو دروازے گاندھی جی کی کتاب پڑھ کر اور نہرو کی تقریریں سُن کر ذرا ذرا سے کھلے تھے اور پھر بند ہو گئے تھے اس بار پورے کھل گئے تھے۔ اور مجھے پیڑوں پر لٹکی ہوئی کسان عورتوں کو نیچے اُتار کر اُن کا کھویا ہوا وقار واپس دینے کا طریقہ معلوم ہو گیا تھا۔ مَیں فرحت کا شکر گزار ہوں کہ اُن کی ہنسی نے کتنے ہونٹوں کی کھوئی ہوئی ہنسی واپس دلا دی۔

اسی زمانے میں مجازؔ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہنس مکھ اور تندرست تھا اور اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ اُنہ بھی بہت کم کھلتا تھا لیکن ترنم کا جادو اپنے شباب پر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۶ء کی ایک شام مجازؔ رشید جہاں کے

گھر پر اپنی کوئی نظم سنا رہا تھا۔ محمود الظفر اور شوکت عمر اور خواجہ منظور حسین بھی وہاں تھے۔ دو بچیاں بھی وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بچی نے کچھ کہا تو دوسری بچی نے یہ کہہ کر اُسے خاموش کر دیا "چپ رہو باجا بج رہا ہے"۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ مجازؔ شاعر ہیں۔ ہم ایک ہی کورٹ پر ٹینس کھیلتے تھے۔ ایک روز مجاز کھیل کر واپس جا رہا تھا کہ اُس کی پتلون تار میں پھنس کر پھٹ گئی۔ غوث محمد نے ہنس کر کہا۔ شاعر صاحب کی پتلون پھٹ گئی۔ اور مَیں نے مڑ کر دیکھا کہ یہ کون شاعر ہے۔ اُسی رات کو یونین کے مشاعرے میں مجازؔ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کی نظم اور ترنم دونوں میں جادو تھا۔ نظم "انقلاب" تھی اور اس کے ہر مصرعے میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن محسوس ہوئی۔ اُس دن سے ہم دونوں دوست ہو گئے۔ دوستی بائیس سال تک اتنی ہی بے لوث اور خوبصورت رہی جتنی پہلے دن تھی۔

اس مشاعرے میں مَیں نے اپنی نظم "سماج" پڑھی جو اِن شعروں پر ختم ہوتی تھی:

تمناؤں میں کب تک زندگی اُلجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے اُبلنے کو
زمانہ کس قدر بےتاب ہے کروٹ بدلنے کو

جب مَیں مشاعرے کے بعد باہر نکلا تو ایک ذہین آنکھوں اور بیمار چہرے والا طالب علم مجھے اپنے کمرے میں یہ کہہ کر لے گیا کہ "مَیں بھی انقلابی ہوں"۔ اُس کے کمرے میں وکٹر ہیوگو کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی اور میز پر چند دوستوں کے ساتھ اُس کی اپنی تصویر تھی جس کی پشت پر گورکی کا ایک اقتباس لکھا ہوا تھا۔ یہ سعادت حسن منٹو تھا۔ اُس نے مجھے بھگت سنگھ پر مضامین پڑھنے کے لیے دیے۔ وکٹر ہیوگو اور گورکی سے آشنا کیا۔ مَیں جب اپنی تعلیم ختم کر کے لکھنؤ چلا گیا اور منٹو بمبئی تو اُس نے مجھے کئی بار بمبئی بلایا۔ جب مَیں کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار میں کام کرنے کے لیے ۱۹۴۲ء میں بمبئی پہنچا تو میرے اور منٹو کے درمیان ادبی اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہو چکی تھی لیکن ہماری ذاتی دوستی میں فرق نہیں آیا۔ ویسے تلخ لمحات بھی آئے اور تیز و تند کیفیت بھی پیدا ہوئی۔ اُس رات منٹو بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا اور ہم دونوں نے مل کر ایک رسالہ نکالنے کی اسکیم تیار کی۔ شاہد لطیف نے اس کا نام "نیا ادب" تجویز کیا۔ یہ رسالہ پانچ چھ برس بعد لکھنؤ سے نکلا لیکن منٹو اور شاہد لطیف کے بجائے مجازؔ اور سبطِ حسن میرے ساتھ تھے۔

(ماہنامہ افکار کراچی سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء)

ستارہ جعفری

سردار بھائی

سردار بھائی پانچ بہنوں اور ایک بھائی کے بعد [illegible] کو بلرام پور میں پیدا ہوئے۔ والدین سے سنا ہے کہ پیدائش کے وقت بہت گورے اور تندرست تھے۔

ہمارے خاندان کا دستور تھا کہ بچے کو نہلانے دھلانے کے بعد سب سے پہلے اُس کے ایک کان میں اذان اور دوسرے میں اقامت سنائی جاتی تھی۔ یہ کام کوئی مولوی یا کوئی بے حد عبادت گزار شخص کرتا تھا اور ساتویں دن عقیقہ ہوتا تھا۔ سب لوگ اس تقریب میں شریک ہوتے تھے لہذا سب کو دعوت نامہ بھیجا گیا۔ جب سب جمع ہوئے تو ہماری کوٹھی میں ایک صاحب رہتے تھے۔ ان کے کوئی عزیز نہیں تھا۔ والد اور چچا ہی حقیقی رشتہ داروں کے تھے۔ جب اُن کو یہ بتایا گیا کہ بچے کا نام علی سردار ہے تو باوجود شاعر نہ ہونے کے انہوں نے مندرجہ ذیل سجع کہا۔

بجائے احمدِ مرسل ہوئے علی سردار

ہمارے ابا جان کے ایک بے حد قریبی دوست فرخ حسن تھے جو فرخ بھیا کہلاتے تھے، انہوں نے تاریخ پیدائش نکالی۔

دیا حق نے جعفر کو ثانی پسر	ہر ایک دیکھ کر جس کو شیدا ہوا
کہی دل نے تاریخ اس دم مرے	مبارک خوش اقبال پیدا ہوا

یہ سنانے کے بعد فرخ حسن نے ابا جان کو مبارک باد دی اور فرمایا۔ ''یہ بچہ بلند اقبال ہوگا اور دنیا میں نام روشن کرے گا۔'' آج میرے والدین اور اُن کے دوست تو اس دنیا میں نہیں ہیں، منوں مٹی کے نیچے محوِ خواب ہیں لیکن اُن کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ پرستاروں اور شیدائیوں کا تو کوئی اندازہ نہیں اور نام کتنا روشن ہے۔ اس بات کا اندازہ پڑھنے والوں کو خود ہوگا۔ مَیں چھوٹی بہن ہوں اپنی زبان سے کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہاں اپنے ہونہار بھائی پر ناز ضرور ہے۔

شاید لوگوں کو یقین نہ آئے لیکن ہمارے بزرگ بتاتے تھے کہ انہوں نے شاعری کی ابتدا دو سال کی عمر سے کر دی تھی۔ سردار بھائی کی پیدائش کے دو سال بعد ایک اور بہن پیدا ہوئی تھی۔ اس کے پیدا ہونے کے بعد سردار

بھائی سے ماں کی گود چھوٹ گئی۔ یہ سب سے بڑی بہن آپا زبیدہ کے سپرد کر دیے گئے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی آپا کے ساتھ سوتے تھے۔ سردار بھائی کو اپنی ماں سے علیحدگی بہت ناگوار ہوئی۔ ہر وقت کہتے رہتے تھے۔

اُوپر سے گری ٹھیکری بادام چھوارا

اس مُنّی نے بھابھی کی گود سے نکالا

(اوپر والا مصرعہ نامعلوم کس کا ہے؟ نیچے سردار بھائی کا خیال ہے)

بھابھی اماں کو کہتے تھے۔ اُس مُنّی نے بڑی جلدی اپنے بھائی کے لیے ماں کی شفقت بھری گود خالی کر دی۔ کچھ برسوں کے بعد ہم دو چھوٹی بہنوں نے پھر ماں کی گود پر قبضہ کر لیا۔ میں چونکہ سب سے چھوٹی ہوں اس لیے آخر وقت تک قبضہ رہا۔ ہمارا خاندان آگرہ کا ہے لیکن ہمارے کوئی بزرگ ملازمت کے سلسلے میں ریاست بلرام پور آ گئے تھے۔ بلرام پور کوہ ہمالیہ کے دامن میں آباد ہے۔ وہاں کے جنگلات اور ندیاں بہت خوبصورت ہیں۔ جب برسات کے موسم میں گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں تو بارش کے بعد ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں بادلوں کے کناروں پر ستاروں کی طرح جھلملاتی ہیں۔ اُس وقت کے جو جاگیردار تھے، اُن کو ہمارے بزرگ نے مہاراجہ بلرام پور کا خطاب دلوایا تھا۔ پہلے زمانے میں تو چھوٹی سی بات کا بہت بڑا احسان مانا جاتا تھا لہٰذا مہاراجہ نے انہیں ریاست کا منیجر بنا دیا اور رہنے کے لیے ایک بڑی سی کوٹھی دی۔ جس کو خاندانی حیثیت مل گئی۔ درمیان میں بڑا سا ہال ہے اور اس کے گرد کئی کمرے اور غسلخانے وغیرہ ہیں۔ ان کے چاروں طرف نہایت کشادہ برآمدے ہیں۔ اس وقت ایک برآمدے کے سامنے بڑا سا چبوترا بنا ہوا تھا۔ اُس کے قریب پانی کا ایک کنواں اور دو حوض تھے۔ قریب ہی پپیتے کے درخت لگے ہوئے تھے اُن کے درمیان میں گلاب، موگرے اور دوسرے خوشبودار پھولوں کی روشیں بنی ہوئی تھیں اور درمیان میں ہری ہری دوب لگی ہوئی تھی جو دیکھنے میں مخمل کا فرش معلوم ہوتی تھی۔ باقی کے چاروں برآمدے پھولوں کے گملوں سے سجے رہتے تھے۔ جس برآمدے سے باہر جانے کا راستہ تھا، اُس کے سامنے بہت بڑا آنگن تھا۔ آنگن کے درمیان میں نیم کا ایک درخت لگا ہوا تھا۔ اس کے گرد اینٹوں کا گول دائرہ بنا کر پھولوں کے گملوں سے آراستہ کر دیا تھا۔ نیم کا درخت اتنا اُونچا اور گھنا تھا کہ سارے آنگن اور کوٹھی کی چھت تک چھایا ہوا تھا۔ یہ اب تک موجود ہے۔ اس کی وجہ سے گرمیوں میں بڑی ٹھنڈک رہتی تھی۔ اس کے بعد کوٹھی میں داخل ہونے کا پھاٹک تھا جو اتنا بلند تھا کہ اس کے نیچے سے ہاتھی گزر سکتا تھا۔ پھر بہت بڑا دالان تھا۔ اس کے چاروں طرف سرخ اینٹوں کی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ اس میں لوہے کے دو پھاٹک لگے ہوئے تھے۔ کوٹھی کے پھاٹک سے لان کے پھاٹک تک سرخ رنگ کی بجری کی سڑک بنی ہوئی تھی۔ اس سڑک اور لان کو مہندی کی باڑ لگا کر تقسیم کیا گیا تھا۔ لان میں ٹینس کورٹ بنا ہوا تھا۔ لان کے پھاٹک کے دونوں طرف گل مہر کے درخت لگے ہوئے تھے۔ باقی حصہ موسمی پھولوں کی کیاریوں سے

سجا رہتا تھا۔ اس کی نگہداشت کے لیے ریاست کی طرف سے دو مالی تھے اور موسم کے پھول لگوانے کا کام میرے چھوٹے چچا کے سپرد تھا۔ کوٹھی کے اطراف میں مکان بنے ہوئے تھے۔ ہمارا گھر ذاتی ہے۔ ان مکانات میں میرے دو چچا اور چند قریبی عزیز رہتے تھے۔ چونکہ ہمارے خاندان میں پردے کا رواج تھا۔ نو برس کے بعد لڑکی پردہ کرنے لگتی تھی۔ پھر باہر نہیں نکل سکتی تھی، اس لیے عورتیں اور لڑکیاں گھروں کے اندر رہتی تھیں اور کوٹھی مردوں کے استعمال میں رہتی تھی اور جو کوئی مہمان آتا تھا، وہ ٹھہرتا تھا۔

ہمارے دادا کو ریاست کی جانب سے چار گاؤں ملے تھے۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز پیدا ہوتی تھی۔ اور باغات تھے۔ ان میں آم، لیچی اور دوسرے پھل بکثرت پیدا ہوتے تھے۔ سال تمام ہونے کے بعد کچھ رقم ریاست کے خزانے میں داخل کر دی جاتی تھی۔ دادا کے انتقال کے بعد میرے والد ریاست بلرام پور کے اسلحہ خانہ اور توشہ خانہ کے آفیسر ہو گئے۔ منجھلے چچا اسسٹنٹ منیجر اور آنریری مجسٹریٹ تھے۔ اس کے علاوہ گرلس ہائی اسکول کے لائف پریزیڈنٹ تھے۔ ابا جان اسکول کے ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر تھے۔ چھوٹے چچا اس وقت کے بہترین فوٹوگرافر اور مہاراجہ بلرام پور کے ولی عہد کے اتالیق تھے۔

گاؤں کی حفاظت کے لیے دو منشی رہتے تھے جن کا نام رضا علی اور امام علی تھا۔ کوٹھی کی صفائی اور فرنیچر وغیرہ کی حفاظت کے لیے ایک خاندان رہتا تھا جس کو سب مکان دار کہتے تھے۔ اس کے علاوہ سات آٹھ مرد ملازم اور تھے۔ گھروں میں کھانا پکانے کے لیے ملازمہ رہتی تھی۔ ہر گھر میں ایک نو عمر لڑکا رہتا تھا جو اُوپر کا کام کرنے کے علاوہ گھر کی ضروریات کی چیزیں لانے کے لیے باہر کے مرد ملازم سے جا کر کہتا تھا کیونکہ خواتین اور لڑکیوں کی آواز تک کا پردہ تھا۔

ہمارا خاندان بڑا مذہبی اور ایماندار تھا۔ کسی نے رشوت کا ایک پیسہ نہیں لیا لہٰذا مہاراجہ سے لے کر بلرام پور کے لوگ عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب کبھی دوسرے خاندانوں میں جائیداد پر جھگڑا ہوتا تھا تو میرے والد اور چچا جاتے تھے اور اُن کے فیصلے کو سب مان لیتے تھے۔

شام کے سات بجے گارد آ جاتی تھی۔ اُن میں خاکی وردی پہنے ہوئے چھ سپاہی اور ایک حوالدار ہوتا تھا۔ سپاہی خاکی رنگ کی ٹوپی پہنتے تھے اور حوالدار کے سر پر پگڑی بندھی ہوتی تھی جس میں مور کے پَر لگے رہتے تھے۔ نیم کے نیچے سپاہیوں کے رہنے کے لیے تین دروازوں کا ایک دالان بنا ہوا تھا۔ بھری ہوئی بندوقوں سے وہ تمام رات پہرہ دیتے تھے۔ دس بجے شب کو کوٹھی کے پھاٹک میں تالا ڈال دیا جاتا تھا۔ اُس کی کنجی حوالدار کے پاس رہتی تھی۔ پھر بغیر اجازت کے کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ ابا جان اور چچا جان کے آفس کے لیے بگھی تھی جس میں دو گھوڑے جوتے جاتے تھے۔ کوچوان کے علاوہ دو آدمی بگھی کے پیچھے کھڑے ہوتے تھے تب وہ روانہ ہوتی

تھی۔ تانگہ، ٹم ٹم اور ہاتھی بھی تھا۔ ہاتھی تو ہم بچوں کے استعمال میں رہتا تھا۔ دیوالی پر تین دن تک پوری کوٹھی پر چراغاں ہوتا تھا۔ یہ تمام لوازمات ریاست کی جانب سے تھے۔ موٹر چچا جانے شوقیہ خرید لی تھی۔

سردار بھائی نے اس ماحول میں پرورش پائی۔ اُس وقت ہماری کوٹھی میں بڑے اور بچے ملا کر ایک سو آدمی رہتے تھے۔ کبھی کبھی خاندان کی عورتوں میں جھگڑا ہو جاتا تھا لیکن جلد ہی صلح ہو جاتی تھی۔ نفرت یا کینہ کسی کے دل میں نہیں رہتا تھا۔ لڑکیوں کو تعلیم دینے ایک اُستانی صاحبہ آتی تھیں جو قرآن شریف، دینیات اور اُردو پڑھاتی تھیں۔ آپا زبیدہ کو تو باقاعدہ فارسی کی تعلیم ملی تھی۔ لڑکے اسکول میں پڑھتے تھے۔ اُن کو قرآن شریف اور دینیات پڑھانے ایک صاحب آتے تھے جن کو سب میاں جی کہتے تھے جو حساب اور انگلش پڑھاتے تھے وہ ہندو منشی جی کہلاتے تھے۔ لڑکے میٹرک کرنے کے بعد علی گڑھ بھیج دیے جاتے تھے۔ میرے چچازاد بھائی علی جرار جعفری نے لندن سے بی ایس سی ایگری کلچرل کالج سے پاس کیا اور میرے ایک چچا نے لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اماں اور بڑی بہنوں سے سنا ہے سردار بھائی کی عادتیں بچپن سے بھائی جان اور اپنے ہم عمر لڑکوں سے الگ تھیں۔ کوٹھی کے پیچھے کے حصے میں جو برآمدہ تھا، اُسی کے قریب ایک امرود کا درخت لگا ہوا تھا۔ جب منشی جی پڑھانے آتے تھے تو سب لڑکے اُن کے قریب بیٹھ کر پڑھتے تھے اور یہ امرود کے پیڑ کی کسی شاخ پر بیٹھ کر اپنا کام کرتے۔ بیچارے ہندو منشی جی چلاتے۔ ''ارے تم ہمرے کپار پر کاہے چڑھے ہو؟ نیچے اُترو۔'' یہ وہیں سے جواب دیتے۔ ''جناب! تازی ہوا میں حساب کے سوال جلد حل ہو جاتے ہیں۔'' حاضر جوابی اور سرکشی بچپن سے مزاج میں تھی لیکن بات چیت نہایت تمیز سے کرتے تھے۔

شام کو جب ابا جان اور چچا آفس سے واپس آتے تھے۔ تب نماز اور ناشتے کے بعد گرمیوں میں اس چبوترے پر جو چاروں طرف سے پھولوں سے گھرا رہتا تھا اور ملکہ شب کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیلی رہتی تھی۔ اُس کے درمیان میں سبز گھاس پر ایک میز اور اس کے گرد کرسیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ ابا جان اور چچا اور خاندان کے بزرگ وہاں بیٹھتے تھے اور سب دوست احباب ملنے کو آتے تھے۔ پھر مغرب کی نماز کے وقت یہ محفل برخاست ہو جاتی تھی۔ موسم سرما میں آتش دان کے سامنے ڈرائنگ روم میں یہ محفل جمتی تھی۔

ایک روز سردار بھائی اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہے تھے۔ اُس وقت ایک صاحب جو عربی اور فارسی زبان کے عالم سمجھے جاتے تھے اور ابا جان اور چچا کے خاص دوستوں میں شمار ہوتے تھے تشریف لائے۔ ہمارے خاندان کے یہ آداب تھے کو بزرگوں کو آتا دیکھ کر بچے کھیل بند کر دیتے تھے لہذا سب بچوں نے کھیل بند کر دیا اور اُن کے قریب جا کر سلام کیا۔ انہوں نے جواب میں بچوں کو دعائیں دیں۔ سردار بھائی نے اپنی جگہ سے کہا۔ ''آداب عرض ہے جناب!''

مولانا نے فرمایا۔" تم نے پاس آکر سلام کیوں نہیں کیا۔" انہوں نے برجستہ جواب دیا۔

محروم میں نہیں ہوں سلام حضور سے　　　پاس ادب یہی ہے کہ مجرا ہو دور سے

مولانا یہ جواب سن کر خاموشی سے اندر چلے گئے اور ابا جان سے کہا۔" ماشاء اللہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسا حاضر جواب ہے کہ میں لاجواب ہو گیا۔" پھر پورا واقعہ سنایا۔ ابا جان بتایا کرتے تھے کہ چھ سات سال کی عمر میں اُن کو پانچ سو اشعار زبانی یاد تھے۔ اماموں کی شان میں لکھی ہوئی رباعیاں اور قصیدے بھی ازبر تھے۔ کوئی شخص کسی قسم کا سوال کرتا تو اس کا جواب زیادہ تر شعر میں دیتے۔ حاضر جوابی، اعلیٰ دماغی اور کسی سے مرعوب نہ ہونا اُن کو ورثہ میں ملا تھا۔ چونکہ اپنے ہم عمروں میں یہ غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے اس لیے اُن کو سب ہی پیار کرتے تھے۔ ہماری کوٹھی کے قریب گرلز اسکول ہے، اُس وقت اس کی ہیڈ مسٹریس ایک کرسچین خاتون مس برچ تھیں۔ وہ اُن کو بہت پیار کرتی تھیں۔ اُن کی صحبت میں رہ کر یہ پڑھنے سے پہلے انگریزی بولنا سیکھ گئے تھے۔

ریاست بلرام پور میں ہر سال دسہرہ اور دیوالی سے قبل نئے کپڑوں اور زیورات وغیرہ کی خریداری ہوتی تھی۔ ہندوستانی تاجر اس موقع پر طرح طرح کا سامان لے کر آجاتے تھے مگر انگریز تاجر نہیں آتے تھے لہذا اس سامان کو خریدنے کے لیے ابا جان کو مختلف شہروں میں جانا پڑتا تھا اور جس شہر کی جو چیز عمدہ اور خوبصورت ہوتی تھی اس کے لیے آرڈر دے دیا جاتا تھا۔ مجھے یاد نہیں اُس زمانے میں دربھنگہ کی کیا خاص چیز تھی جس کے لینے کے لیے ابا جان وہاں گئے تھے۔ سردار بھائی کی بے پناہ تیزی کو دیکھتے ہوئے ابا جان زیادہ سے زیادہ وقت اُن کو اپنے پاس رکھتے تھے لہذا دربھنگہ اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں جس دکان سے سامان خریدنا تھا، اُس کا مالک انگریز تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا اور معاملہ طے نہیں ہو رہا تھا۔ ایک روز وہ انگریز ابا جان کے پاس آیا تو سردار بھائی نے پوچھا۔" یہ صاحب کون ہیں؟" ابا جان نے فوراً جواب دیا۔ انہیں سے سامان خریدنا ہے۔ سردار بھائی فوراً اُس سے انگریزی میں مخاطب ہوئے۔" مجھے اپنی　بہت یاد آرہی ہے جلدی معاملہ طے کیجیے۔" اُس زمانے میں اتنے چھوٹے بچے کا انگریزی بولنا تعجب خیز بات تھی۔ انگریز نے ابا جان سے دریافت کیا۔" یہ آپ کا کون ہے؟" ابا جان نے جواب دیا" یہ میرا بیٹا ہے" اب ان کو اپنی ماں اور　یاد آرہا ہے۔" اُس انگریز نے دو چار سوال کیے۔ اُن کا جواب بھی انہوں نے انگلش میں دیا۔ وہ ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ ابا جان سے کہا۔" بہت ذہین اور ہوشیار بچہ ہے۔" فوراً معاملہ طے کر دیا۔ سردار بھائی سے کہا۔" اب تم اپنی ماں کے پاس جا سکتے ہو۔" ابا جان پہلی ٹرین سے بلرام پور واپس آگئے۔

سردار بھائی کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے بزرگوں نے یہ طے کیا کہ ان کو سند اجتہاد حاصل کرنے کے لیے مذہبی تعلیم دی جائے۔ غالباً سات آٹھ سال کی عمر میں لکھنؤ سلطان المدارس میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں عربی

اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر کچھ برسوں کے بعد عراق بھیج دیا جاتا تھا۔ وہاں سے باقاعدہ سند حاصل کر کے مجتہد بن جاتے تھے۔ کیونکہ خیال تھا کہ اگر خاندان میں ایک شخص مجتہد بن جائے تو پورے خاندان کی عاقبت سنور جاتی ہے۔ لیکن اُن کے سرکش مزاج نے اُس ماحول کو قبول نہیں کیا۔ یہ دو مرتبہ اکیلے بلرام پور سے واپس آگئے۔ دونوں مرتبہ سمجھا بجھا کر کسی کے ساتھ لکھنو واپس بھیج دیا گیا۔ جب تیسری مرتبہ یہ لکھنو سے واپس آگئے تو ابا جان نے ان پر کوئی سختی نہیں کی بلکہ بڑے پیار سے پوچھا۔ ''تم کیا پڑھنا چاہتے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا۔ ''جناب مَیں انگریزی پڑھوں گا، وہاں میرا دل نہیں لگتا۔'' ان کے رائے سن کر ابا جان نے اسی دن سے بلرام پور میں انگریزی پڑھنے کے لیے ایک اُستاد کے سپرد کر دیا۔ اُن کا نام بشیر تھا۔ اُن کا ایک جنرل اسٹور تھا۔ یہ شام کو وہاں پڑھنے جاتے تھے۔ اس وقت یہ طریقہ تھا کہ جب تک تیسری کلاس تک کا حساب اور انگریزی بچے کو نہ آجائے، اسکول میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ ماسٹر بشیر ان کو بڑی محبت سے پڑھاتے تھے اور ابا جان سے ان کی ذہانت کی تعریف کرتے تھے کہ بڑی جلدی سبق یاد کر لیتا ہے۔ لیکن بات بات پر بحث کرتا ہے۔ لیکن تمیز اور ادب سے ہمارے مجتہد صاحب بات کرتے ہیں۔ (لکھنو سے واپسی کے بعد سب لوگ انہیں مجتہد صاحب کہنے لگے تھے۔ وہاں کچھ وقت گزارنے کی وجہ سے تعلیم میں اپنے ہم عمروں سے پیچھے رہ گئے تھے)

جس وقت مَیں نے ہوش سنبھالا اس وقت بھائی جان کانپور کے اگری کلچرل کالج سے بی ایس سی کر رہے تھے۔ وہ گرمیوں اور دسمبر میں گھر آتے تھے تو ہم بہن بھاؤں کے لیے طرح طرح کے تحفے لاتے تھے سردار بھائی اُن دنوں بلرام پور اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ اسکول کے بعد جو فرصت کا وقت ملتا تھا اس میں گھوڑا دوڑانا اور درختوں پر چڑھنا ان کا بہترین شغل تھا۔ کئی بار چوٹیں بھی کھائیں اور ہاتھ پیروں میں موچ بھی آئی۔ اماں کو ہر وقت یہ فکر لگی رہتی تھی کہ کہیں ہاتھ پیر کی ہڈی نہ ٹوٹ جائے مگر یہ تو اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔

سردار بھائی نے اپنے پڑھنے لکھنے کے لیے الگ کمرہ لے لیا تھا۔ مجھے یاد ہے یہ بہت خوش مذاق، نفاست پسند اور خوبصورت چیزوں کے دلدادہ تھے۔ اپنی کوئی چیز بے ترتیب نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی دیواروں کا رنگ ہلکا فیروزی تھا۔ اس پر سرخ رنگ کی پنسل سے چاروں طرف اقبالؔ اور دوسرے پسندیدہ شاعروں کی نظمیں اور غزلیں لکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کی دیواروں میں جیسے پہلے زمانے میں الماریاں بنائی جاتی تھیں۔ ایسی دو الماریاں تھیں۔ ان کے تختوں پر یہ اپنی ادبی کتابیں رکھا کرتے تھے۔ اور ان کے کناروں پر زرد رنگ کی ریشمی بیل کی جھالر بنوا کر الماری کے تختوں کے کناروں پر لگاتے تھے۔ کھڑکی کے قریب ان کے لکھنے پڑھنے کی میز اور کرسی رکھی رہتی تھی۔ کھڑکی پر سفید جالی کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ اسکول جاتے وقت اپنے کمرے کے دروازے میں تالہ ڈال جایا کرتے تھے تاکہ اُن کے کمرے کی چیزیں کوئی خراب نہ کرے۔ کھانے میں بھی ان کے بڑے نخرے

تھے۔ گوشت کے علاوہ گنی چنی سبزیاں کھاتے تھے۔ شلغم اور مولی کی سبزی پکتی تھی تو یہ پہلے ہی کہہ دیتے تھے کہ اس کا چمچہ الگ رکھا جائے۔ اگر رکابی میں گوشت کی بوٹی ٹوٹ جائے تو فوراً اپنے سامنے سے ہٹا دیتے تھے۔ کباب کے کوفتے، پسندے اور مسلم کے بہت شوقین تھے۔ ہمارے یہاں تخت پر دسترخوان بچھا کر کھانے کا طریقہ ہے۔ اگر دسترخوان پر دھبہ پڑ جاتا تھا تو پھر اس کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ کپڑا بھی قیمتی اور خوبصورت پہنتے تھے۔ اس وقت باہر کی بنی ہوئی سلک آتی تھی جو بوسکی کہلاتی تھی اور روپیہ گز ملتی تھی۔ تب یہ کپڑا بہت قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ سردیوں کے موسم میں بوسکی کی قمیض، سوٹ اور ٹائی استعمال کرتے تھے۔ اماں ان کی ہر بات کا خیال کرتی تھیں۔ یہ ہی نفاست اور صفائی ہمارے والدین میں بھی تھی۔ وہ ہر موسم میں استعمال کرنے کا عطر بھی رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ رات کو بستر میں بھی عطر لگایا جاتا تھا۔

رمضان میں سردار بھائی بھی سب کے ساتھ روزے رکھتے تھے۔ سحری کھانے کے بعد اماں اور بڑی بہنیں دعائے سحر، دوسری دعائیں اور نماز پڑھنے میں مشغول ہو جاتی تھیں اور یہ بلند آواز میں پڑھنا شروع کر دیتے تھے:

نازاں تو ایک جام پہ ہے اپنے ساقیا! چودہ پلانے والے ہیں پروا مجھے ہے کیا؟
بتلائے دیتا ہوں تجھے میخانوں کا پتہ بطحا و کاظمین و خراساں و سامرہ
برج شرف سرا اور یکتا صدف میں ہے اک کربلا میں ایک مرا ساقی نجف میں ہے

اماں چلاتیں۔ ''تمہاری شعر و شاعری رات میں بھی شروع ہو جاتی ہے میں نماز بھول جا رہی ہوں''
یہ جواب دیتے ''ارے بھابھی ہم شعر تھوڑی پڑھ رہے ہیں۔ بیٹے ہم پنجتن پاک کے نام یاد کر رہے ہیں:

مشہور شش جہت میں شرف پنجتن کا ہے پہلے تو نام پاک رسول زمن کا ہے
پھر اس کے بعد خسرو خیبر شکن کا ہے اور اسم بھی بتول اسیر محن کا ہے

. . .

چوتھے جوان جو ہیں حسن سبز فام ہیں اور پانچویں حسین علیہ السلام ہیں

اماں اور سردار بھائی کی آوازوں سے میری آنکھ کھل جاتی۔ سچ پوچھیے تو ان کی زبانی یہ اشعار سنتے سنتے مجھے بھی ازبر ہو گئے اور آج تک یاد ہیں۔

ابا جان کے پاس مذہبی کتابوں کا ذخیرہ تھا اور میرے منجھلے چاچا کے پاس جن کو ہم سب چاچا کہتے تھے، ادبی کتابیں تھیں۔ لہٰذا ہم سب بھائی بہنوں کے دل میں بچپن سے ادبی رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ آپا کے نام ''تہذیب نسواں'' اور ''عصمت'' آتا تھا۔ یہ اس زمانے میں عورتوں کے رسالے تھے۔ اس کے علاوہ ہم بھائی بہنوں کو جو جیب خرچ ملتا تھا، اُس سے کتابیں منگوائی جاتی تھیں۔ مثلاً اختر النسا، گدڑی کے لعل، روشنک بیگم، صفیہ

بیگم، راشد الخیری اور شرلاک ہومز وغیرہ کی کتابیں بھی آتی تھیں۔ مجھے بچپن میں راشد الخیری کی کتابیں پسند نہیں تھیں۔ ان کی ہیروئین نہایت کمزور اور انتہائی بزدل نظر آتی تھی۔ ہاں گدڑی کے لعل کی ثریا مجھے بہت پسند تھی۔ مَیں سوچتی تھی مَیں بھی ثریا جیسی بنوں گی۔

اسی زمانے میں سردار بھائی نے افسانے لکھنے کی ابتدا کی۔ اسکول سے واپس آ کر افسانے لکھتے تھے۔ ایک روز افسانہ نامکمل چھوڑ کر یہ گھر میں چائے پینے آ گئے۔ مَیں اس تلاش میں کہ شاید اسکول کی لائبریری سے کوئی نئی کتاب لائے ہوں۔ ان کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک افسانہ "آتشیں قمیص" میز پر رکھا ہوا ہے۔ جلدی جلدی الٹ پلٹ کر دیکھا تو جو کتابیں ہم لوگوں کے پاس تھیں، اُن سے بالکل الگ تھا۔ مَیں اس وقت چھپی ہوئی کتابیں تو آسانی سے پڑھ لیتی تھی لیکن ہاتھ کا لکھا ہوا پڑھنے میں دشواری ہوتی تھی۔ مَیں فوراً بھاگ کر سردار بھائی کے پاس آئی اور کہا "آتشیں قمیص" پڑھنے کو دے دیجیے"۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا "تم نے کہاں دیکھا؟"

"آپ کی میز پر رکھا ہوا ہے۔"

انہوں نے بڑے رعب سے جواب دیا۔ "وہ تمہارے پڑھنے کی چیز نہیں ہے۔" پھر بہت خوشامد اور ڈھیر ساری چیزوں کی فرمائش کرنے کا وعدہ لے کر دوسرے دن پڑھنے کو دے دیا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ ابا اور اماں کو معلوم نہ ہو۔ میں اس کو لے کر اپنی چچازاد بہن قدسیہ باجی کے پاس گئی۔ وہ عمر میں تو ہم سے بڑی تھیں لیکن برتاؤ ہم عمروں کا سا تھا۔ قدسیہ باجی نے پڑھ کر سنایا۔ مَیں نے اور میری بڑی بہن رباب جعفری نے بڑے غور سے سنا۔ اب ہمیں سردار بھائی کی لکھی ہوئی چیزوں کا چسکا لگ گیا تھا۔ دوسرے تیسرے دن ان کی میز کی تلاشی لیتے۔ ایک دن دوسرا افسانہ مل گیا۔ اس کا نام تھا "لالۂ صحرائی"۔ اس کا کچھ حصہ میرے حافظہ میں اب بھی محفوظ ہے۔ کہانی یہ تھی۔ جاوید ایک شہری لڑکا شکار کھیلنے جنگل میں جاتا ہے۔ وہاں ایک خوبصورت دیہاتی لڑکی کو دیکھتا ہے اور اس کا نام "لالۂ صحرائی" رکھ دیتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں لیکن سماجی بندشیں درمیان میں حائل ہو جاتی ہیں لیکن یہ ان کو توڑ دیتے ہیں۔

یہ افسانہ ہمارے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ ابھی تک تو راشد الخیری کی روتی پیٹتی عورتیں دیکھی تھیں یا اختر النساء جیسی لڑکی جس کی داستان سن کر سارا گھر روتا تھا اور اس کی مظلومیت کی داد دی جاتی تھی۔ لالۂ صحرائی کو ہم بہنوں نے کئی مرتبہ پڑھا اور ہر بار ایک نیا لطف آیا۔ تیسرا افسانہ ہجوم وتنہائی تھا۔ اس میں عورت کی جرأت اور ہمت دکھائی تھی۔ افسانوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے نظمیں بھی لکھنی شروع کر دی تھیں۔ پہلی نظم کا ایک بند یوں تھا۔

نکال دوں تمہیں اس طرح دل کے گوشے سے

کہ جیسے کھلتا ہوا پھول توڑ لے کوئی

میری حسین ثریا! یہ ہو نہیں سکتا

انہیں گرمیوں میں بھائی جان ایگریکلچرل کالج کانپور سے بی ایس سی کر کے آ گئے۔ انہوں نے ہفتہ وار اخبار "ہمصفیر" کے نام سے نکالنا شروع کر دیا۔ ایڈیٹر خود بھائی جان تھے۔ اب ان کے نام سے نیرنگ خیال، ساقی جیسے رسالے آنے لگے۔ سب سے پہلا افسانہ "تین پاؤ گندھا ہوا آٹا" چھپا جو بہت پسند کیا گیا۔

ابا جان کے ایک دوست التجا صاحب تھے جو بے حد مذہبی اور قابل شخص تھے۔ وہ "ہمصفیر" کا مطالعہ بڑی پابندی سے کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے ابا جان سے کہا۔ آپ نے غور کیا کہ سردار کے مضامین سے موجودہ حکومت کے خلاف بغاوت کی بو آتی ہے۔ ابھی عمر بہت کم ہے۔ ان کے خیالات ادھر سے ہٹا کر مذہبی راستے پر لانا چاہیے۔ خدانخواستہ کوئی بات ہوگئی تو خاندان کی بدنامی ہوگی۔ اس وقت چاچا برٹش گورنمنٹ کی اسمبلی کے ممبر تھے اور کئی طلائی تمغے وغیرہ حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ ابا جان، چاچا اور چند قریبی دوست مل کر بیٹھے اور اس مسئلے کا حل تلاش کرنا شروع کیا۔ ہمارے یہاں محرم، تیرہ رجب، پندرہ شعبان، چودہ رمضان، اکیس رمضان اور عید غدیر بڑے شاندار طریقے سے منائی جاتی تھی۔ ان میں شرکت کے لیے ہندوستان بھر کے بہترین ذاکر بلائے جاتے تھے جو مرثیے، حدیث اور قصیدے اماموں کی شان میں پڑھتے تھے۔ چودہ معصومین کی ولادت اور وفات کے دن میلاد اور مجلس منعقد ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر شب جمعہ مجلس ہوتی تھی جس میں مقامی ذاکر پڑھتے تھے لہٰذا ان سب نے مل کر یہ سوچا کہ سردار بھائی کو یہ مشورہ دیا جائے کہ تم شب جمعہ والی مجلس میں حدیث پڑھو۔ یہ حدیث پڑھنے کو تیار ہو گئے۔ انہوں نے پہلی حدیث جوش صاحب کے ان بندوں سے شروع کی اور بڑے جوش و خروش سے مجلس پڑھی:

جو جوان بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسین

جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسین

ان کی حدیث خوانی کو سب نے بے حد پسند کیا اور پھر ہر شب جمعہ سردار بھائی مجلس پڑھنے لگے۔ خاندان کے بزرگ اپنی کامیابی پر بہت نازاں تھے۔ پہلے التجا حسین صاحب بھی ذاکری فرماتے تھے، وہ اس فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اس سال تیرہ رجب کا جشن منانے کے لیے باہر سے شعراء بلائے گئے۔ اس زمانے میں ایک مشہور شاعر تاباںؔ بدایونی تھے جو مدح اہل بیت میں قصیدے بھی لکھتے تھے۔ وہ بھی اس جشن میں شرکت کے لیے مدعو کیے گئے۔ سب سے پہلے سردار بھائی کو منبر پر بٹھایا گیا۔ انہوں نے اپنی ایک نئی رباعی جو اس موقع پر کہی تھی پیش کی۔

کعبہ کی رات کتنی نشاط آفریں ہے آج صحن حرم نمونہ خلد بریں ہے آج
ملتا نہیں دماغ دعائے خلیل کا رونق فروز اپنے مکاں میں مکیں ہے آج

یہ رباعی پڑھ کر جیسے ہی سردار بھائی منبر سے اُترے، تاباںؔ صاحب نے فوراً گلے سے لگا لیا اور فرمایا۔ "ابھی تک مَیں سمجھتا تھا میرا فن میرے ساتھ دفن ہو جائے گا لیکن آج مجھے ایسا قابل لڑکا ملا ہے جس کے سینے میں مَیں اپنا سارا علم بھر دوں گا۔ میرے بعد یہ اس کو زندہ رکھے گا۔" (تاباںؔ مرحوم اپنا کلام چھپواتے نہیں تھے)۔ تیرہ رجب کے بعد دو تین دن تاباںؔ صاحب نے قیام فرمایا۔ سردارؔ بھائی کے اسکول سے آنے کے بعد اپنے سامنے بٹھا کر پڑھتے تھے جو سردار بھائی کو یاد بھی ہو جاتا تھا۔ پھر وہ "ہمصفیر" میں بھی شائع کرا دیتے تھے۔

سردارؔ بھائی نے حدیث پڑھتے پڑھتے مرثیے اور قصیدے بھی کہنے شروع کر دیے۔ محرم کی مجلس میں انہوں نے اپنا پہلا مرثیہ پڑھا۔ اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے سردار بھائی لکھ چکے ہیں۔ ابا جان، چاچا اور ان کے دوستوں نے بہت داد دی۔ خصوصاً التجا حسین صاحب نے تو بے حد ہمت افزائی کی۔ مجلس تمام ہونے کے بعد چاچا اماں کے پاس آئے اور کہا۔ ہمارا سردار تو ماشاء اللہ انیسؔ اور دبیرؔ کے مقابلے کے مرثیے لکھے گا۔ یہ بند چاچا بار بار پڑھ کر روتے تھے۔

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

دوسرا بند بھی بہت پسند کیا گیا:

پیارے بہتوں کے ہیں ماؤں کے دلارے یہ ہیں گوز میں پر ہیں مگر عرش کے تارے یہ ہیں

بلرام پور کے کچھ افراد ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ اتنے کم عمر لڑکے کے مرثیوں میں یہ فصاحت و بلاغت کیسے آ سکتی ہے۔ یہ انیس کے مرثیوں میں رد و بدل کر کے اپنے نام سے پڑھ دیتے ہیں یہ بات ان کے کانوں تک بھی پہنچی۔ انہوں نے دو تین مرثیے اور لکھ کر مجالس میں پڑھے لیکن افسوس کہ اختشام تک نہیں پہنچے۔ وہ ابھی تک موجود ہیں۔

انہیں افراد کے یہاں ایک صاحب لکھنؤ سے تشریف لائے۔ وہ اپنے وقت کے عالم و فاضل سمجھے جاتے تھے۔ سردار بھائی نے اپنا مرثیہ ان کے سامنے پڑھا۔ جب مجلس ختم ہوئی تو ان صاحب نے دریافت کیا۔ میاں صاحبزادے آپ کا اسم گرامی! یہ سنتے ہی سردار بھائی اُٹھ کر منبر پر بیٹھے اور جواب دیا:

نور نظر احمد مختار ہوں میں لخت جگر حیدر کرار ہوں میں
ہے فتح و ظفر قوت بازو میرے یعنی پسر جعفر طیار ہوں میں

احمد مختار چھوٹے چاچا کا نام، حیدر کرار منجھلے چاچا کا نام، ظفر عباس بھائی جان کا نام اور جعفر طیار والد کا نام۔ یہ سن کر واہ واہ کا ایسا شور بلند ہوا کہ پورا ہال گونج اُٹھا۔

ابا جان کے ایک دوست اقبال حسین صاحب نے جن کا شمار بلرام پور کے بڑے شعراء میں ہوتا تھا، انہوں نے بڑھ کر منبر پر سے اُٹھا لیا اور گلے لگا کر ابا جان سے کہا۔ بھائی جان! آج سے ہم سردار کو بڑا شاعر مان گئے۔ واللہ کیا جواب دیا ہے کہ سب لاجواب ہو گئے۔

اس کے بعد عید غدیر آئی۔ اس کا جشن دو روز تک منایا جاتا رہا۔ اس میں پڑھنے کے بعد سردار بھائی نے نیا قصیدہ لکھا تھا لیکن عین وقت پر سردار بھائی غائب تھے۔ چاروں طرف نوکر دوڑائے گئے۔ آخرکار ایک نوکر نے آ کر خبر سنائی کہ سردار بھیا تو جواہر لال نہرو کے جلسے میں بولتے ہیں اور کہتے ہیں انگریز سفید ہاتھی ہے، ان کو نکال دو۔ ہمارے گھر کے پیچھے ایک مندر ہے اس کا آنگن اتنا بڑا ہے جس میں تین چار سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ وہاں پنڈت نہرو کی تقریر تھی۔ اس میں یہ بھی شریک ہو گئے۔ میلاد کا جشن ختم ہو گیا تب گھر واپس آئے۔ نوکروں سے یہ بات سب عزیزوں میں پھیل گئی۔ کچھ بزرگ بہت خفا ہوئے اور ابا جان سے کہا۔ ابھی سے نہیں روکا تو لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ابا جان ان کی شکایت سن کر مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی معاملے میں ان پر سختی یا جبر نہیں کیا۔ ہاں جو بات ناگوار گزرتی تھی وہ سردار بھائی کی غیر موجودگی میں اماں اور ہم بہنوں کے سامنے کہہ دیتے تھے۔

لکھنؤ سے ایک شیعہ اخبار ''سرفراز'' شائع ہوتا تھا اور دوسرا شیعہ اخبار ''الناصر'' آگرہ سے نکلتا تھا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں ان دونوں میں سے کسی ایک اخبار میں مولوی مبارک علی صاحب نے عقد بیوگاں کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا۔ بیاس کو پڑھ کر بھڑک گئے۔ اور فوراً اُس کے خلاف مضمون بھیج دیا۔ بحث بہت دن تک چلتی رہی۔ اخیر مبارک علی صاحب نے ان سے ملاقات کرنا چاہی اور پتہ دریافت کیا۔ انہوں نے کوٹھی کا پتہ دے دیا۔ ایک دن وہ اچانک تشریف لے آئے۔ ابا جان، چچا سے مولانا کی واقفیت تھی کیونکہ مولوی صاحب آگرہ میں پیش امام تھے۔ ابا جان نے سمجھا شاید کسی چندے وغیرہ کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں لیکن بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ سردار بھائی سے ملنے آئے ہیں۔ ابا جان نے سردار بھائی کو بلا کر ان سے تعارف کرایا۔ مولوی صاحب تعجب سے دیکھنے لگے، پھر ابا جان سے فرمایا میں اس لڑکے سے نہیں بلکہ حضرت علی سردار جعفری صاحب سے شرف ملاقات حاصل کرنے آیا ہوں۔ ابا جان نے جواب دیا۔ یہی میرا بیٹا علی سردار جعفری ہے۔ مولانا نے فرمایا میں تو ان کو بہت سن رسیدہ سمجھتا تھا۔ کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟ چچا نے جواب دیا۔ جناب مولوی صاحب ہم لوگ آپ سے مذاق کرنے کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں؟ یہی سردار جعفری ہے جو اخبار میں آپ سے بحث کرتا تھا۔ اُن کو یہ بات سن کر بے حد حیرت ہوئی۔ فرمایا اتنی کمسنی میں عقد بیوگاں پر ایسی بحث کہ میں ملاقات کے لیے مجبور ہو گیا۔ سوچا اتنی قابل اور بزرگ ہستی سے مل کر زبانی بات چیت کرنی چاہیے۔ کمال ہے صاحب! کیا اعلیٰ دماغ پایا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے، اپنے وقت پر تو خدا جانے کیا ہوگا؟ یہ سن کر تو اور بھی

خوشی ہوئی کہ یہ آپ کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

سردار بھائی کے مزاج میں تبدیلی آ چکی تھی لیکن خاندان والوں پر ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ بلرام پور میں ایک شگر مل ہے۔ اس میں ہمارے گاؤں سے بھی گنا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ گاڑی پر سے گنا اُتارنے والے مزدوروں نے اپنی اجرت بڑھانے کے لیے کہا۔ چھوٹے چاچا اس کے خلاف تھے۔ مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ ہڑتال کو توڑنے کے لیے پولیس بلائی گئی۔ یہ بات سردار بھائی کو معلوم ہوئی تو شام کو بغیر کسی کو بتائے ہوئے شگر مل چلے گئے۔ اُن کی حمایت میں تقریر کی اور مزدوروں سے کہا۔ جب تک تمہارا حق نہ ملے، ہرگز گنا مت اُتارنا اور نہ پولیس سے ڈرنا۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

ایک مزدور نے جواب دیا "ہم کا کری؟ چچا آوت ہیں تو کہت ہیں ایک ڈبل بھی نہیں بڑھاب اور بھیّا کہت ہیں جب تک پیسہ نہ بڑھے تو گنا نہ اُتارو" آخرکار مزدوروں کی فتح ہوئی اور چھوٹے چاچا کو اجرت بڑھانی پڑی۔

برسات شروع ہونے پر کھیتوں میں دھان کی بوائی کا کام شروع ہوتا ہے۔ اُس وقت گھر کا کوئی آدمی جاتا تھا۔ حالانکہ منشی امام علی وہاں دیکھ بھال کرنے کے لیے دن رات رہتے تھے (منشی امام علی آج تک گاؤں کا کام سنبھالے ہوئے ہیں) ایک سال ابا جان نے سردار بھائی سے کہا۔ تم وہاں جا کر اپنے سامنے سب کام کرا دو۔ یہ چلے گئے لیکن وہاں جا کر سب کھیت مزدوروں کی تنخواہ بڑھا دی اور پرانے قرضے معاف کر کے واپس آ گئے۔ منشی جی نے ابا جان کو خط لکھا۔ چھوٹے میاں تو گاؤں کا خرچ بہت بڑھا گئے۔ اور سب باتیں تفصیل سے لکھیں۔

گرمیوں کی تعطیل میں بہت مزہ آتا تھا۔ ہمارے پھوپھی اور ماموں زاد بھائی بہن اور جو عزیز علی گڑھ کالج میں پڑھتے اور کام کرتے تھے سب آ جاتے تھے۔ پھر روز نئے نئے پروگرام بنتے تھے۔ چھوٹے چاچا شکار کے بہت شوقین تھے اور ان سب کو بھی شوق تھا لہٰذا چھوٹے چاچا کی نگرانی میں سب لوگ شکار کھیلتے تھے۔ بلرام پور کے جنگلات میں ہرن، شیر، نیل گائے اور ہاتھی تک پائے جاتے تھے۔ جس روز ہرن کا شکار لاتے، اُس دن خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا تھا۔ کباب مسلّم اور طرح طرح کے کھانے پکتے تھے۔ چاندنی راتوں میں آئس کریم جمائی جاتی تھی اور پورا خاندان اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ دوپہر میں شعر و شاعری کا دور چلتا۔ ہمارے سب سے بڑے پھوپھی زاد بھائی جن کا نام آل مرتضیٰ ہے ہم سب اُن کو بڑے بھائی جان کہتے ہیں۔ وہ اُن کی ذہانت اور تیزی سے بہت متاثر تھے۔ بڑے بھائی جان سردار بھائی سے ڈاکٹر اقبالؔ کا شکوہ اور جواب شکوہ کی فرمائش کرتے۔ ان کو اقبالؔ کی بانگِ درا زبانی حفظ تھی۔ بڑے بھائی جان کو ان کی زبان سے اقبالؔ کی یہ نظم سننے میں بہت لطف آتا تھا:

چمن میں چار سو بکھری پڑی ہے داستاں میری — اُٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گُل نے

بھائی جان بار بار اصرار کر کے یہ پڑھواتے۔ غرض کہ پوری دوپہر اس شغل میں گزر جاتی۔ بڑے

بھائی جان اور دو میرے بھائی بہن آج بھی کراچی میں مقیم ہیں۔ اللہ کیا خوبصورت زمانہ تھا جس کی یاد آج بھی دل میں تازگی پیدا کر دیتی ہے۔ وقت گزر جاتا ہے لیکن یادوں کے نقوش اور بھی گہرے ہو جاتے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں سردار بھائی نے میٹرک پاس کر لیا۔ پھر علی گڑھ میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ ابا جان کی دلی خواہش تھی کہ یہ ڈاکٹر یا بیرسٹر بنیں۔ ساڑھے تین سال علی گڑھ میں پڑھنے کے بعد ایک روز اچانک یہ رامپور واپس آگئے۔ ابا جان کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے اماں سے کہا ضرور کالج میں کچھ کر کے آئے ہیں۔ علی گڑھ کالج کے وائس چانسلر سر ضیاء الدین صاحب جو چاچا کے کلاس فیلو و دوست بھی تھے۔ دوسرے روز چاچا کے نام ان کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ سردار نے برٹش گورنمنٹ کے خلاف اور کانگریس کی حمایت میں رات کو بارہ بجے پندرہ منٹ کی تقریر میں ہمارے کئی ہزار لڑکوں کے خیالات بدل دیے ہیں اور اس جرم میں تین سال کے لیے ان کو کالج سے نکال دیا گیا ہے حالانکہ اتنے ذہین اور قابل لڑکے کو نکالتے ہوئے مجھے دلی تکلیف ہوئی ہے۔

علی گڑھ سے واپس آنے کے بعد ابا جان نے انہیں عربک کالج دہلی میں داخل کرا دیا لیکن وہاں بھی ان کی تقریروں کا شوق جاری رہا۔ کالج کے تقریری مقابلوں میں کئی بار فرسٹ آئے۔ سونے کے کئی میڈل اور گنگا جمنا چاندی کی بنی ہوئی دہلی کی جامع مسجد حاصل کی۔ یہ سب چیزیں لے کر جب رامپور آئے تو والدین اور سب عزیز بے حد خوش ہوئے لیکن کچھ روز کے بعد اپنے ایک دوست کی مالی امداد کرنے کے سلسلے میں وہ تمغے اور چاندی کی مسجد فروخت کر دی۔

دہلی سے بی اے کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ابا جان کی خواہش تھی کہ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کر لیں۔ ایک سال قانون پڑھنے کے بعد یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میرا دل اس مضمون میں نہیں لگتا اور ایم اے میں داخلہ لے لیا۔

جس زمانے میں یہ لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے دوسری جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کی تحریک بھی شباب پر تھی۔ اسی زمانے میں ترقی پسند ادب کی بنیاد پڑی۔ اس گروپ میں قاضی عبدالغفار، جوش ملیح آبادی، سردار بھائی، سجاد ظہیر، مجاز، جاں نثار اختر، سبط حسن، مخدوم علی جواد زیدی، حیات اللہ انصاری اور ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ وغیرہ ترقی پسند مصنفین میں شامل تھے۔ اور ادب برائے زندگی پر بڑے جوش و خروش سے نظمیں اور افسانے لکھے جا رہے تھے۔ سردار بھائی سبط حسن (جن کو میں سبط بھائی کہتی ہوں) اور مجاز ان لوگوں نے مل کر ایک رسالہ "نیا ادب" اور ایک اخبار "نیا پرچم" کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ یہ دونوں لکھنؤ سے ان لوگوں کی سرپرستی میں شائع ہوتے تھے۔ میرے نام باقاعدہ "نیا ادب" اور "پرچم" آتا تھا۔ ابا جان بھی ان کو پڑھتے تھے اور اپنے لاڈلے بیٹے کے خیالات سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ اس وقت سردار بھائی کا

طریقہ یہ تھا کہ کہ ہر سنیچر کی شام کو بلرامپور آجاتے تھے اور اتوار کا دن گزار کر رات کی ٹرین سے واپس چلے جاتے تھے۔ علی گڑھ اور دہلی کے دوران تعلیم میں جب چھٹیوں میں گھر آتے تھے تو مختلف قسم کے تحفے ہم سب کے لیے لاتے تھے۔ لیکن لکھنؤ سے یہ ہم بہنوں کے لیے نئی نئی کتابیں لاتے تھے۔ مثلاً گاندھی جی اور جواہرلال کی سوانح عمری اور پھانسی کے سائے وغیرہ۔ ہم سب کو بھی ان کتابوں سے زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ کچھ کتابیں ایسی ہوتی تھیں جن کو پڑھنے کے بعد واپس لے جاتے تھے۔ ابا جان وہ بھی دیکھتے لیکن اپنی زبان سے ان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ جب وہ واپس چلے جاتے تب مجھ سے کہتے تھے۔ تمہارا بھائی جس راستے پر چل رہا ہے وہ مَیں سمجھ گیا ہوں۔ اب تمہیں بھی اسی راستے پر چلانا چاہتا ہے۔ سردار بھائی اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے بڑے چہیتے تھے اور جواب میں یہ بھی ویسی محبت ہم سب سے کرتے تھے۔ مَیں سمجھتی ہوں اس محبت نے ہی ہمیشہ ابا جان کو خاموش رکھا۔

اتوار کی شب خواہ گرمی ہو یا سردی ہم لوگ آدھی رات سے زیادہ جاگ کر گزارتے تھے۔ اماں اور ابا جان اُوپر کے حصے میں سوتے تھے۔ نیچے ہم بھائی بہنوں بھابھی جان کی محفل جمتی تھی۔ سردار بھائی ہفتہ بھر کی رپورٹ ہم سب کو سناتے تھے کہ کس طرح ہم لوگ آزادی حاصل کرنے کے لیے کام کررہے ہیں۔ اب جلدی ہندوستان کے گلے سے غلامی کا طوق اُتر جائے گا۔ ہمارے درمیان کسی قسم کا تکلف یا رکاوٹ نہیں تھی۔ ایک دوسرے پر بے حد بھروسہ تھا۔ یہ سب باتیں سن کر مجھے بلرام پور کے ماحول میں گھٹن محسوس ہوتی تھی لیکن مجبوری تھی۔ ہمارے یہاں تو درمیان میں پردہ حائل تھا۔

ان کو تو بہترین کپڑا پہننے کی عادت تھی۔ ایک مرتبہ لکھنؤ سے آئے تو اپنے ساتھ ہاتھ کا بنا ہوا کھدر لائے جو بیحد موٹا اور کھردرا تھا۔ مجھ سے کہا تم اس کے پاجامے سی دو۔ کرتے تو درزی سے ہم نے لکھنؤ میں سلوا لیے ہیں۔ مَیں نے پوچھا۔ "کون پہنے گا؟" کہا۔ "ہم پہنیں گے مگر بھابھی کو مت بتانا۔" مجھے تب تک پاجامے کاٹنے نہیں آتے تھے۔ بھابھی جان نے اس کپڑے کے پاجامے کاٹے۔ مَیں نے اور میری بہن رباب جعفری نے مل کر مشین سے سیئے۔ واقعی وہ اتنا سخت کپڑا تھا کہ کاٹنے اور سینے میں ہم لوگوں کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ اماں کی نظر بھی اس کپڑے پر پڑ گئی تو بھابھی جان سے پوچھا۔ "دلہن! کیا بچوں کے لیے ایسے موٹے کپڑے کی تم نے بچھونا بنائی ہے؟"

بھابھی جان خاموش رہیں۔ پھر ہم سے پوچھا۔ "یہ آیا کہاں سے؟" کیونکہ ہمارے گھر پر بزاز آکر کپڑے دے جاتا تھا۔ ہم نے جواب دیا۔ "سردار بھائی لکھنؤ سے لائے ہیں۔ اپنے کسی دوست کے لیے سلوا رہے ہیں۔" اماں نے کہا۔ "ایسا ہے جو پہنے گا اس کا تو بدن چھل جائے گا۔" اماں کو کیا خبر تھی کہ یہ اتنا موٹا اور سخت کھدر اُن کا لاڈلا بیٹا پہنے گا۔

"نیا ادب" اور "پرچم" کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی سبط حسن نے مجھے خط لکھا۔ "تمہارا خاندان ماشاء اللہ بہت بڑا ہے اگر ایک ایک روپیہ بھی چندہ جمع کروگی تو ہمارے لیے کافی سرمایہ جمع ہو جائے گا۔" میری بہن رباب جعفری اور مَیں نے جب خاندان والوں سے چندہ مانگا تو کسی نے خاموشی سے اور کسی نے خوشی کے ساتھ دے دیا اور کسی نے کہا "ہم جن انگریزوں کا نمک کھا رہے ہیں ان کے ساتھ نمک حرامی نہیں کریں گے۔" مجھے یہ بات بہت ناگوار گزری، بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ "انگریز تو ہمارا نمک کھا رہے ہیں اور ہمارا حق چھین رہے ہیں۔" بس پھر کیا تھا خوب ڈانٹ پڑی۔ ابا جان اماں سے میری شکایت کی گئی۔ شکایت سننے کے بعد ابا جان نے مجھے بلایا اور صرف اتنا کہا۔ "سردار جو کتابیں لاتا ہے ان سب کو علیحدہ کر کے تالا ڈال دو۔ اور "نیا ادب" اور "پرچم" بھی وہیں رکھا کرو۔" بہر حال کچھ دن کی کوشش کے بعد تھوڑی سی رقم جمع ہوگئی اور ہم نے وہ بذریعہ منی آرڈر سبط بھائی کو بھیج دی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ جواب میں لکھا کہ جس طرح تم سردار کی بہن ہو، میری بھی بہن ہو۔ اب ہم لوگوں نے الگ کمرہ لے لیا ہے۔ تم اور رباب ہمارے ساتھ آ کر کام کرو۔ یہاں تمہارا سیاسی اور ادبی شعور پختہ ہوگا۔ ہمیں خود بڑا شوق تھا سردار بھائی کے ساتھ رہنے کا اور وہاں جا کر کام کرنے کا۔ ہمارے اختیار میں ہوتا تو ضرور چلے جاتے لیکن ہمارے یہاں لڑکیوں کو یہ آزادی میسر نہیں تھی۔ مَیں نے وہ خط ابا جان کو دکھایا پڑھ کر ہنسنے لگے اور کہا۔ تم ان کو لکھ دو۔ پہلے آپ لوگ اپنی تعلیم پوری کر لیجیے پھر ہم آئیں گے۔

انہی دنوں ایک کتاب آزادی کی نظمیں چھپی۔ حسبِ معمول سردار بھائی سنیچر کی شام کو لکھنؤ سے آئے تو وہ کتاب ہمیں دے گئے۔ اس میں جوشؔ صاحب کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام"۔ سردار بھائی کی نظم "فوجی بھرتی" اور دوسرے شعراء کا کلام تھا۔ "فوجی بھرتی" کے کچھ شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں جو اس جگہ پیش کر رہی ہوں:

سڑک کے اس کنارے اک سیہ لکڑی کے تختے پر — جلی حرفوں میں لکھا ہے یہ بھرتی کا دفتر ہے
پکارا جا رہا ہے ہند کے بھوکے کسانوں کو — بجھا سا آج اخلاقِ شہنشاہی کا تیور ہے
حکومت ہو تمہاری اور ہم توپوں کا ایندھن ہوں — یہ دیوانے کا اک خوابِ جنوں اے بندہ پرور ہے
ہمارے خون سے شہزادیوں کا روپ نکھرا ہے — ہماری ہڈیوں کے ہار سے ملکہ کا زیور ہے
ستارے کی طرح سے ٹوٹ کے گرنے ہی والا ہے — وہ ہیرا جس کی ضو سے تاجِ انگلستاں منور ہے

ہم بہنوں اور بھابھی جان کو یہ کتاب اس قدر پسند آئی کہ سب نے دو دو تین تین نظمیں زبانی یاد کر لیں۔ اس وقت بھابھی جان کا کوئی بچہ چھوٹا سا تھا۔ اس کو ہم سب سوتے وقت یہ لوری سنایا کرتے تھے جو آزادی کی نظموں میں تھی۔ اب تو کچھ شعر یاد رہ گئے ہیں۔ ورنہ اس وقت تو پوری پوری ازبر تھی:

کبھی تو رحم پر آمادہ یہ بے رحم آسماں ہوگا — کبھی تو یہ جفا پیشہ مقدر مہرباں ہوگا
کبھی تو سر پہ ابرِ رحمتِ حق گل فشاں ہوگا — مسرت کا سماں ہوگا مرا ننھا جواں ہوگا
مرا ننھا ایک دن ہتھیار اٹھائے گا — سپاہی بن کے سوئے عرصہ گاہ رزم جائے گا
وطن کے دشمنوں کی خون کی ندی بہائے گا — اور آخر کامراں ہوگا مرا ننھا جواں ہوگا

جس زمانے میں ''آزادی کی نظمیں'' شائع ہوئی، اسی زمانے میں سردار بھائی کی کہانیوں کا مجموعہ ''منزل'' شائع ہوا۔ ''آزادی کی نظمیں'' کی اشاعت کے چند دنوں بعد اخبار سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب برطانوی حکومت نے ضبط کر لی ہے اور جتنی کاپیاں ملیں وہ جلا دی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ قابلِ اعتراض نظم جوش صاحب کی ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' اور سردار بھائی کی ''فوجی بھرتی'' تھی۔

اُسی دن بلرام پور کے انسپکٹر پولیس ہماری کوٹھی پر آئے۔ ان کی ملاقات ہمارے رشتہ کے دادا سے ہوئی۔ انسپکٹر نے دریافت کیا۔ ''یہاں ستارہ جعفری نام کی لڑکی کس گھر میں رہتی ہے؟'' ہمارے دادا کو سن کر بہت غصہ آیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ جناب! آپ ہمارے خاندان کی توہین کر رہے ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہیے۔ ہمارے خاندان کی عورتوں اور لڑکیوں تک کے نام کا پردہ ہے۔ ان کے خطوط پر والد اور ہمشیرہ کر کے لکھا جاتا ہے۔ یہ نیا نام کس نے بتایا؟ میرے دادا کو اس قدر برہم دیکھ کر بے چارہ انسپکٹر پولیس جو تحقیقات کرنے آیا تھا معافی مانگ کر چلا گیا۔

دراصل سردار بھائی نے اس فرسودہ روایات کو توڑ دیا تھا۔ وہ لفافہ پر ستارہ جعفری لکھا کرتے تھے۔ جب یہ واقعہ چاچا کو معلوم ہوا تو مجھے آکر سنایا اور کہا تم نے آج کا اخبار بھی دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پاس ایسی بہت سی غیر قانونی کتابیں ہیں۔ اب کسی بھی وقت پولیس تلاشی کے لیے آسکتی ہے۔ تم ابھی میرے سامنے وہ سب کتابیں لاکر جلا دو۔ ورنہ پولیس کے ہاتھ لگ گئیں تو پورے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی اور تمہیں وہ جیل میں ڈال دیں گے۔

میرا دل کتابیں جلانے کو بالکل نہیں چاہا۔ مَیں نے فوراً سوچا اور چاچا سے کہا۔ ''ابھی لا رہی ہوں'' چاچا دالان میں تخت پر بیٹھے تھے۔ میں اندر اسباب کے کمرے میں گئی۔ وہیں میری کتابوں کی الماری رکھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مَیں نے واپس آکر کہا'' چاچا! اس وقت الماری کی کنجی نہیں مل رہی ہے۔ مَیں تلاش کروں گی۔ جیسے ہی ملی سب کتابیں جلا دوں گی۔ چاچا مطمئن ہو کر چلے گئے۔

مَیں نے سوچا اگر تلاشی ہوگی تو صرف ہمارے گھر کی ہوگی لہٰذا سب کتابیں اور اخبار ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ کر چاچا کے گھر چلی گئی۔ چاچا کی منجھلی لڑکی شکیلہ میری ہم عمر ہے۔ ہم دونوں میں دوستی بھی بہت ہے۔ مَیں نے اس کو سب قصہ سنایا اور کہا تم ان کتابوں کو جس میں مہمانوں کے لیے لحاف رکھے ہوئے ہیں، اس

میں سب سے نیچے چھپا دو۔ کسی کو خبر نہیں پڑے گی۔ شکیلہ نے میرے کہنے کے مطابق سب کتابیں رکھ کر صندوق میں تالہ ڈال دیا۔ پھر میں فوراً گھر واپس آئی۔ کچھ ردی اخبار اور دفتی کے ٹکڑے جمع کر کے ان کو آنگن کے ایک کونے میں نذرِ آتش کر دیا جب بالکل جل گئے تب پیروں سے مسل کر ان پر پانی ڈال دیا۔

شام کو چاچا دوبارہ آئے۔ پوچھا "کنجی مل گئی؟"

"جی ہاں مل گئی اور سب کتابیں اور اخبار جلا دیئے"

"کہاں جلائیں؟"

مَیں نے لے جا کر وہ جگہ دکھائی اور کہا "ابھی اس کو باہر کوڑے میں پھنکوا دوں گی۔"

چاچا نے بڑے غور سے وہ جلے ہوئے کاغذ دیکھے پھر کہا "اپنی الماری دکھاؤ" مَیں نے الماری دکھا دی جو خالی پڑی تھی۔ الماری دیکھ کر چاچا کو اطمینان ہو گیا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "شاباش سمجھدار لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔" مَیں نے کہا "چاچا! کتابیں تو جلا دیں۔ اپنے دماغ کو کیسے جلاؤں؟"

"کیا مطلب تمہارا؟" چاچا نے حیرت سے پوچھا

"مجھے یہ نظمیں زبانی یاد ہیں۔"

"اچھا سناؤ۔"

مَیں نے جوش صاحب کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" اور سردار بھائی کی نظم پوری سنا دی۔ سن کر مسکرائے اور چلے گئے۔ تب مجھے اپنے چاچا پر بہت پیار آیا۔ بیچارے بزرگ بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں۔ ان کو کیا خبر کہ سب کتابیں اُن کے گھر میں رکھی ہوئی ہیں کیونکہ یہ راز میرے اور شکیلہ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ شروع دسمبر میں صبح پانیر اخبار میں سردار بھائی کی تصویر اور گرفتاری کی خبر آ گئی۔ ہمارے گھر میں کانگریسی اخبار بھی آتا تھا جس نے پہلے صفحے پر سردار بھائی اور ان کے دوست کی تصویر چھاپی تھی جس کے نیچے یہ مصرعہ لکھا ہوا تھا۔

خاک پہ بیٹھے جیل میں جا کر آج ہماری عزت والے

ابا جان نے نہایت ضبط کے ساتھ یہ خبر اماں کو سنائی۔ ہماری اماں بڑی خوبصورت تھیں اور رنگ بہت گورا تھا۔ اس خبر کو سنتے ہی پہلے اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا پھر بلک بلک کر رونے لگیں۔ باقی تمام گھر تصویرِ حیرت تھا۔

اُسی وقت کی ڈاک سے مجھے سبطے بھائی کا خط ملا۔ لکھا تھا۔ کل یونیورسٹی سے پولیس سردار کو گرفتار کر کے لے گئی۔ اپنے اور تمہارے خاندان کی پرانی روایت سے میں بخوبی واقف ہوں۔ دیکھو ستارہ! سردار بڑا اچھا، پیارا اور قابلِ فخر بھائی ہے۔ اس کی گرفتاری کی خبر سے والدین پریشان اور خاندان کے لوگ خفا ہوں

گے۔لیکن تم اپنے پیارے بھائی کی گرفتاری سے شرمسار نہیں ہونا بلکہ والدین کو تسلی دینا اور دوسروں کے حملے سے بچانا۔ ہاں! ایک مشورہ اور دے رہا ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے تم جلد والدین کے ساتھ اس سے ملنے کے لیے لکھنؤ آ جاؤ۔ اُس سے سردار کے دل کو بہت سکون ملے گا۔

سبط بھائی کا یہ پیارا خط میں نے ابا جان کو دکھایا۔ وہ پہلی ٹرین سے لکھنؤ چلنے کو تیار ہو گئے۔ ابا جان، چاچا اور میرے دادا کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ سردار بھائی کی رہائی کے لیے گورنمنٹ سے معافی نہیں منگوائیں گے۔ باقی خاندان کے افراد کہہ رہے تھے کہ معافی نامہ پیش کر کے جیل سے چھڑا لو۔ اگر کالے پانی بھیج دیا تو کیا ہو گا؟ یہ چار دن کے لونڈے بھلا ہندوستان آزاد کرا سکتے ہیں؟ غرض کہ مختلف لوگوں کی مختلف رائے تھی لیکن ابا جان اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ انہوں نے اس دن کی اپنی ڈائری میں لکھا تھا: "آج کے اخبارات اور سبط حسن کے خط سے معلوم ہوا کہ سردار جیل چلا گیا ہے لیکن میں اس سے معافی منگوا کر اس کی بے عزتی نہیں کراؤں گا۔ نیچے ایک شعر درج تھا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

سردیوں کا موسم تھا۔ سردار بھائی انڈے کا حلوہ بہت شوق سے کھاتے تھے۔ بھابھی جان اور رباب جعفری نے جلدی جلدی حلوہ تیار کیا۔ اماں نے ان کے استعمال کے لیے گرم کپڑے اور گرم بستر ساتھ میں لیا۔ پھر گیارہ بجے دن کی ٹرین سے ابا، چاچا، اماں، ہمارے دادا اور میں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

اس وقت ہمارے ایک عزیز وزیر حسن روڈ پر قیام پذیر تھے۔ اُن کے گھر جا کر ہم لوگ ٹھہرے۔ اتفاق سے اس وقت لکھنؤ سینٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ چاچا کے کلاس فیلو دوست کرنل جعفری تھے۔ ہم لوگ شام کو لکھنؤ پہنچے۔ اسی رات چاچا کرنل جعفری سے ملنے گئے۔ دوسرے دن اتوار تھا لیکن چاچا کرنل جعفری سے جیلر کے نام ملاقات کا اجازت نامہ لے آئے۔ صبح ہم لوگ ملاقات کے لیے جانے کو تیار ہوئے تو کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ معافی نامہ لکھوا لینا چاہیے۔ کل جیل سے چھوٹ جائے گا۔ پھر آئی سی ایس کے امتحان میں بٹھال دینا، زندگی سنور جائے گی۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کرنا چاہیے۔ ابا جان خاموش رہے۔ چاچا نے جواب دیا۔ "ہم معافی منگوا کر سردار کی زندگی خراب نہیں کریں گے۔ اب تو جو بھی ہو گا، دیکھا جائے گا۔"

ہم لوگ گیارہ بجے سینٹرل جیل پہنچ گئے۔ جیلر صاحب نے سختی سے کہا "آج اتوار کے دن ملاقات نہیں ہو سکتی۔" چاچا نے کرنل جعفری کا اجازت نامہ دکھایا۔ دیکھتے ہی جیلر صاحب ریشہ خطمی ہو گئے۔ فوراً ملاقات کا انتظام کر دیا۔ پہلے ابا جان، چاچا اور میرے دادا گئے۔ یہ لوگ واپس آ گئے تب مجھے اور اماں کو اندر جانے دیا گیا۔ جیل کے آہنی پھاٹک میں اتنا ہی بڑا تالہ پڑا ہوا تھا۔ ایک کھڑکی پھاٹک میں تھی، اُسی سے اندر آتے جاتے

تھے۔ اندر داخل ہونے پر دیکھا کہ کچھ فاصلے پر دوسرا پھاٹک تھا اور اس میں بھی تالہ پڑا ہوا تھا۔ دونوں پھاٹکوں کے درمیان دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک کوٹھری کے اندر جانے کا جیلر نے اشارہ کیا۔ میرے، اماں کے ہاتھ میں حلوہ اور دوسرا سامان تھا اور ہم دونوں نے برقعے پہن رکھے تھے۔ جیسے ہی بڑے پھاٹک سے داخل ہوئے جیلر نے ہمارے ہاتھ سے سامان کی باسکیٹ لے لی۔ مَیں نے کہا ہم خود دیں گے۔ آپ باہر سب چیزیں دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اُن کی تو نیت خراب تھی۔ کہا۔ "ہمارے یہاں ملزم کو اس کے عزیز سامان دیں اس کی اجازت نہیں۔ آپ فکر نہ کریں، مَیں سب چیزیں دے دوں گا۔ سگریٹ کے پیکٹ مَیں نے برقعے میں چھپا رکھے تھے، وہ بچ گئے۔ ہمیں جا کر ایک کوٹھری میں بیٹھا دیا گیا جس کی کرسیاں تک ٹوٹی ہوئے تھیں۔ ہمارا خیال تھا سردار بھائی موجود ہوں گے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا پھاٹک کھلا اور ہم نے سردار بھائی کو آتے دیکھا۔ اماں نے اس جگہ بڑی ہمت اور برداشت کا ثبوت دیا۔ مجھ سے کہا۔ "دیکھو رونا نہیں ورنہ سردار کا دل چھوٹا ہوگا۔" حالاں کہ خود اُن کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اماں نے بڑھ کر گلے سے لگایا۔ بظاہر ہم تینوں ہنس رہے تھے لیکن دلوں پر جو گزر رہی تھی وہ خدا ہی جانتا ہے۔ ہم دونوں کے چہروں پر نقابیں پڑی ہوئی تھیں۔ شاید اسی لیے جیلر ہمارے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔ پھر ہم لوگ نقاب الٹ کر اطمینان سے باتیں کرنے لگے۔ جیلر صاحب نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ ہم لوگوں کو ملاقات کے لیے آدھا گھنٹہ دے دیا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا تو جیلر صاحب نے کہا۔ اب ملاقات کا ٹائم ختم ہوگیا۔ یہ الفاظ مجھے اس وقت بڑے تکلیف دہ معلوم ہوئے۔ اللہ کی شان! آج ہم بہن بھائی کی بھی ملاقات کا ٹائم مقرر ہے۔ ہم تینوں پھر گلے ملے اور اسی دوران میں سگریٹ کے پیکٹ سردار بھائی کو دے دیے۔ جیلر کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔

جب ہم باہر نکلے تو دیکھا ایک سیاہ گھونگھریالے بالوں والا اور سرخ و سفید رنگت کا لڑکا کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنے اس پر نہرو کٹ گرم جیکٹ اور ہلکی رضائی اوڑھے اباجان، چچا سے باتوں میں مصروف ہے۔ راستے میں اباجان نے بتایا کہ یہی سبط حسن ہیں جن کے تمہارے نام خط آتے ہیں۔ ان لڑکوں کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اچھے اچھے خاندان کے چشم و چراغ ہوتے ہیں مگر یہ حالت بنائی ہے۔ یہ معلوم ہوا سبط بھائی کو بخار چڑھا ہوا تھا اور اسی حالت میں ملنے آئے تھے۔ (تیس سال بعد) ۱۹۷۰ء میں سبط بھائی اور ان کی بیگم سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی۔ میری نگاہوں میں ان کی ۱۹۴۰ء والی شکل تھی۔ جب میرے بھانجے مسعود نے ملایا کہ یہ سبط ماموں ہیں تو مَیں حیرت زدہ رہ گئی۔ مَیں نے کہا۔ سبط بھائی اگر آپ کے گھر کے علاوہ کہیں اور ملاقات ہوتی تو مَیں ہرگز نہیں پہچان سکتی تھی۔ آپ تو بالکل بدل گئے۔ میری بات پر ہنس پڑے اور کہا۔ بی بی! تغیر زمانہ انسان کی شکل بھی بدل دیتا ہے۔ سوچئے ۱۹۴۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان کتنا فاصلہ ہے اور کیا کیا برداشت کیا ہے۔ پھر دونوں نے میری خاطر سگی بہنوں کی طرح کی۔

کرنل جعفری کی وجہ سے ہم لوگوں کو بڑی سہولت تھی۔ تیسرے دن ملاقات کی اجازت مل جاتی تھی۔ ایک روز اماں اور میں جیل سے باہر آئے تو دیکھا موٹر کے قریب ایک سن رسیدہ نہایت شاندار خاتون کھڑی ہوئی ہیں اور ابا جان، چاچا سے باتیں کر رہی ہیں۔ ابا جان نے اُن سے ہمارا تعارف کرایا اور بتایا۔ یہ لیڈی وزیر حسن ہیں۔ وزیر حسن اور اُن کے بڑے بھائی جج اصغر حسن سے ابا جان کی بہت دوستی تھی۔ ابا جان، چاچا سے باتیں کرتے وقت تو اُن کے چہرے پر کچھ جھنجلاہٹ بھی تھی لیکن ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ آگے بڑھ کر اماں کے گلے ملیں۔ پھر مجھے گلے لگا کر دعائیں دینے لگیں۔ اور ابا جان سے کہا، آپ جیسے چاہیں، گھر جائیں۔ یہ دونوں میرے ساتھ جائیں گی۔ ہم دونوں کو اپنے برابر موٹر میں بیٹھال لیا۔ اُن کے ہمراہ دو تین آدمی اور بھی تھے۔ راستے میں اماں سے کہا۔ آپ بہوت قسمت والی ہیں جو ایسا پوت ملا۔ گھبرانے کی کوئی بات نائیں ہے۔ ارے ہمرا کلیجہ دیکھو، دودئی دودئی پوت اسی جیل ما بیٹھے ہیں ایک بیٹا اور دوسرے ان کے بڑے بھیا۔ غرض کہ راستے بھر اماں کو تسلی دیتی رہیں کہ آپ کو دیکھ کر ہمرا دل بھی بڑا ہو گیا۔ پھر اکثر ملاقات ہوتی رہی۔

اب ہم لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقدمہ ضرور چلے گا اور گورنمنٹ غیر قانونی کام کرنے کے سلسلے میں جو بھی سزا چاہے دے سکتی ہے۔ عجب افراتفری کا وقت تھا۔ گھر سنسان اور جیلیں آباد ہو رہی تھیں۔ ابا جان، چاچا اس کوشش میں تھے کہ قید کی مدت کم ہو اور سزا میں نرمی برتی جائے۔ ساتھ میں یہ کوشش بھی جاری تھی کہ A یا B کلاس دیا جائے۔ والدین اور چاچا نے ہزاروں دعائیں اور نمازیں ان کے لیے پڑھ ڈالیں۔ ہم لوگ ایک ماہ لکھنؤ میں رہے اور آخر کار سردار بھائی کے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ چھ ماہ کی قید کی سزا کا حکم سنا کر بنارس جیل بھیجا تھا اور بی کلاس دیا تھا۔ بنارس روانہ ہونے سے ایک روز قبل ہم لوگ ملنے گئے۔ آگرہ سے میرے بھائی ارشد آ گئے تھے اور کچھ سردار بھائی کے دوست تھے۔ اس دن ملاقات کرنے والے آٹھ آدمی جمع ہو گئے۔ جیلر نے پانچ پانچ منٹ کا وقت سب کو دیا۔ اماں اور مجھے ایک گھنٹے کا وقت دیا۔ ہم اس روز پھر انڈے کا حلوہ اور ضرورت کی چیزیں لے گئے تھے لیکن سب برقعے کے اندر رکھیں۔ جیلر صاحب بھی اس روز ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر اس دن ہمارے پاس باتیں کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ اسی دوران میں ہر پانچ منٹ کے لیے ایک آدمی آتا تھا اور ملاقات کر کے چلا جاتا تھا۔ وقت ختم ہونے پر اماں نے ان کے بازو پر امام ضامن باندھا۔ سر اور بازو پر ہاتھ رکھ رکھ کر کچھ دعائیں دم کیں اور گلے لگا کر آنسو چھپانے کے لیے جلدی سے نقاب ڈال لی۔ جب سردار بھائی نے مجھے گلے لگایا تو کچھ کاغذات برقعے کے اندر میرے ہاتھ میں دے دیے۔ میرے بھی بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ سردار بھائی کا چہرہ سرخ تھا مگر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم میری بڑی بہادر بہن ہو دیکھو اماں اور ابا جان کو سمجھاتی رہنا۔ میں خط پابندی سے لکھتا رہا کروں گا۔ نہ جانے جیلر کو کیا شک ہوا۔ آ کر ہمارے قریب کھڑا ہو گیا اور بار بار

کہہ رہا تھا۔ ملاقات کا ٹائم ختم ہو گیا۔ ہم تینوں کمرے سے ساتھ نکلے۔ سردآر بھائی نے کہا۔ ایک مرتبہ تم اور اماں چہرے پر سے نقاب ہٹا دو۔ ہم نے نقاب الٹ دی تھی لیکن آنسو ضبط نہ کر سکے۔ ایک دوسرے کو مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ جیلر نے پہلے سردآر بھائی کو پھاٹک سے اندر بھیج کر تالا ڈال دیا پھر اسی کھڑکی کے راستے ہم دونوں باہر نکلے۔ ابا جان، چچا چچا دادا اور میرے بھائی ارشد خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ سبھی اپنے دلی جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اُس روز پہلی مرتبہ مَیں نے چاچا کی زبان سے برٹش گورنمنٹ کی بُرائی سنی۔ راستے میں کہنے لگے اس بدمعاش حکومت کے قول و فعل کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کہتی کچھ ہے کرتی کچھ اور ہے۔ ابھی دو تین روز قبل مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ سردآر کو لکھنؤ جیل میں رکھیں گے اور اُسے کلاس دیں گے۔ خدا جانے اب سردآر کو دیکھ سکیں گے یا نہیں؟

اماں نے گھبرا کر کہا۔ جس وقت کی گاڑی سے پولیس سردآر کو بنارس لے جائے اس وقت اسٹیشن چلو۔

چاچا نے جواب دیا: ''کیا وہ بدمعاش ہمیں وقت بتائیں گے؟''

سبط بھائی نے وہ سامان جو یونیورسٹی میں سردار بھائی چھوڑ گئے تھے، ہمارے پاس بھجوا دیا۔

سردار بھائی کے بنارس جانے کے دوسرے دن ہم سب بھی بلرام پور واپس آ گئے۔ گھر آ کر مَیں نے وہ لفافہ کھولا تو کئی دوستوں کے نام خط اور ان کے پتے تھے۔ مَیں نے سب خط سپرد ڈاک کر دیے۔

سردآر بھائی پر بنارس جیل میں حکومت نے یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ مہینے میں اگر دو ملاقات کریں گے تو خط نہیں لکھ سکتے۔ اور اگر خط لکھیں گے تو ملاقات کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس پابندی کے باوجود ہمارے پاس مہینے میں ایک دو خط آ جاتے تھے۔ ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں ہماری بڑی بہنیں آپا منجو، صادقہ باجی، بجو باجی، رباب جعفری، بھائی جان اور بھابھی جان دو دو افراد کر کے مل آتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم لوگ پابندی سے خط بھی لکھتے تھے جو زیادہ تر غائب ہو جاتے تھے۔ ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ میری بہن صادقہ باجی اور ان کے شوہر مجھو جان بھائی سے ملنے کو گئے تو اپنے ساتھ مسلّم پکا کر لے گئے۔ لیکن صادقہ باجی کے ساتھ میں ان کا ڈھائی سال کا بیٹا افضال تھا۔ جیلر نے مسلّم لے لیا اور کہا یہ بچہ اندر نہیں جا سکتا۔ افضال بے حد غصہ ور تھا۔ وہ جیلر سے لپٹ گیا۔ خوب نوچا اور کاٹا۔ کہا آپ نے مسلّم بھی رکھ لیا اور مجھے بھی روک رہے ہیں۔ جیلر تکلیف سے ساری شیخی بھول گئے۔ گھبرا کر میری بہن سے کہا۔ آپ دونوں اسے اندر لے جائیے۔

سردار بھائی کے ایک دوست بنارس میں رہتے تھے۔ وہ بڑی پابندی سے خیریت کا خط بھیجا کرتے تھے۔ جس سے ایک حد تک تسکین ہو جاتی تھی۔ بنارس جیل سے کے ایک خط کی نقل یہاں کر رہی ہوں:

بنارس سینٹرل جیل ۲ / ۲ مارچ ۱۹۴۱ء

پیاری بہن ستارہ خوش رہو، گزشتہ ہفتہ تمہیں بھائی جان، بھابھی جان سے میری خیریت معلوم ہوگئی ہوگی۔ یہاں میرے پاس کھانے، سونے کتابیں پڑھنے اور باتیں کرنے کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔ انہیں چاروں چیزوں میں دن کٹ جاتا ہے۔ آج پورے تین ماہ گزر گئے۔ اب تین ساڑھے تین مہینے اور باقی ہیں وہ بھی اتنی ہی جلدی گزر جائیں گے۔ چھ مہینے ختم ہونے کے بعد جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا دن کتنی جلدی گزر گئے۔ مگر اس کا کب یقین ہے کہ ایسے دن پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے؟ جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا۔ جیل خانے آباد رہیں گے۔۔۔ پھر تمہارا خیال آیا اور مَیں بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ میری جیل کی زندگی اور تمہاری گھر کی زندگی میں کیا فرق ہے جتنی پابندیاں مجھ پر ہیں، اس سے کچھ کم پابندیاں تم پر نہیں ہیں؟ مگر تمہیں بچپن سے اس کی عادت ڈال دی گئی ہے کہ گھر کی چہار دیواری میں بند رہو۔ اس لیے اسے تم محسوس نہیں کرتی ہو۔ تمہارے لیے ایک نظم شروع کی تھی جو ابھی تک پوری نہیں کر سکا ہوں۔ اس میں اس خیال کو نظم کرنا چاہتا ہوں

دور تم سب کی نگاہوں سے، بہت دور ہوں مَیں
دور ہو میری نگاہوں سے، بہت دور ہو تم
تم سمجھتی ہو یہاں جیل میں مجبور ہوں میں
مَیں سمجھتا ہوں میری طرح سے مجبور ہو تم
ہاں یہاں قید ہے آلام ہیں زنجیریں ہیں
اور وہاں جسم پہ جذبات پہ تعزیریں ہیں

افسوس کہ اس خط کا دوسرا حصہ گم ہوگیا۔ مارچ میں جب بھائی جان اور بھابھی جان ملنے گئے تھے تو انہوں نے آ کر بتایا تھا کہ بنارس میں گرمی شروع ہوگئی ہے اور سردار کو ابھی باہر سونے کی اجازت نہیں ملی ہے۔ اسی دن سے اماں اور ابا جان نے پنکھے کے نیچے دوپہر کو لیٹنا چھوڑ دیا۔ کہتے تھے میرا بیٹا جس کو ہم نے نازوں سے پالا وہ گرمی کی شدت برداشت کرے اور ہم دوپہر کو پنکھے کے نیچے آرام کریں؟ سردار بھائی نے ایک خط میں لکھ دیا تھا کہ ہمیں کھانے میں سبزی اور دال ملتی ہے۔ اماں نے اس دن سے گوشت کھانا بالکل چھوڑ دیا تھا حالانکہ وہ سبزی بالکل نہیں کھاتی تھیں۔ جب یہ جیل سے چھوٹ کر آ گئے تب گوشت کھانا شروع کیا۔

جون ۱۹۴۱ء میں ایک دن ان کا تار ملا کہ اب مجھے رہا کر دیا گیا ہے۔ مَیں کل دوپہر کی ٹرین سے بلرام پور پہنچوں گا۔ اس خبر سے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اماں نے فوراً مٹھائی منگوا کر نیاز دلائی۔ ہم سب کو تو

وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ والدین کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔ دونوں نے نمازِ شکرانہ ادا کی۔ خدا خدا کر کے وہ رات گزری، دوسرے روز خاندان کے افراد گاڑی لے کر اسٹیشن لینے کو گئے، وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تین چار سو آدمی جمع ہیں اور ایک پلیٹ فارم کیلے کے پتوں اور گیندے کے پھولوں سے سجا کھڑا ہے۔ جیسے ہی ٹرین آئی مجمع نے زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ پورا اسٹیشن علی سردار زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ ہمارے گھر والوں کو جلوس والوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ موٹر میں نہیں ہم یکہ میں بٹھا کر سردار جعفری کا جلوس نکالیں گے۔ (اس وقت بدیسی چیزوں کا بائیکاٹ کیا جا رہا تھا لہٰذا موٹر انگریزوں کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے گھر کے لوگ جلدی واپس آ گئے۔ اماں نے گھبرا کر پوچھا "سردار کہاں ہے؟" معلوم ہوا جلوس کے ساتھ آئیں گے؟ ہمارا گھر اسٹیشن سے کئی میل دور ہے۔ جون کی اس چلچلاتی دھوپ، دوپہر میں جلوس والوں نے یکے سے گھوڑا نکال دیا تھا اور خود گھسیٹ کر لائے تھے۔

اُس روز اماں نے سب کھانے ان کی پسند کے پکوائے تھے اور جس نفاست سے یہ کھانا کھاتے تھے ویسا ہی انتظام کیا گیا تھا۔

سردار بھائی کی آمد اور ان کے گرم جوش استقبال کی خبر ساری ریاست میں جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی۔ اس زمانے میں ریاست کا منیجر انگریز تھا۔ وہ بہت گھبرایا۔ شام کو چاچا کو فون کیا کہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ چاچا نے کہا ضرور تشریف لائیے۔ وہ آیا اور کہا۔ آج کی پوری رپورٹ مجھے مل گئی ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کا آرڈر بھی میرے پاس آ گیا ہے۔ سردار جعفری ایک سال تک بلرام پور سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ پابندی اس شرط پر ختم ہو سکتی ہے کہ مَیں سردار کو گورنمنٹ کے خرچے پر پڑھنے کے لیے لندن بھیج دوں یا وہ منظور کریں تو بلرام پور اسٹیٹ میں بڑی سے بڑی ملازمت دے سکتا ہوں۔

چاچا نے جواب دیا۔ "مَیں اس بارے میں سوچ کر آپ کو جواب دوں گا۔"

منیجر کو رخصت کر کے چاچا گھر میں آئے اور اماں سے کہا۔ یہ روپیہ کا لالچ دے کر ہمارے بیٹے کو خریدنا چاہتے ہیں مجھے تو منظور نہیں ہے، آپ سب کی کیا رائے ہے؟ والدین اور سردار بھائی نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ دوبارہ اس نے سردار بھائی کو اپنی کوٹھی پر بلایا اور یہی بات کہی۔ انہوں نے جواب دیا پہلے آپ اپنی فوجیں واپس بھیج دیجئے۔

ابا جان اور چاچا نے کوشش کر کے نظر بندی کی مدت چھ ماہ کرا دی تا کہ یہ ایم اے کا امتحان دے دیں۔ سردار بھائی پھر لکھنؤ چلے گئے۔ چند ماہ بعد ایک روز بلرام پور آئے اور ابا جان اور اماں سے کہا۔ مَیں ننے بھائی کے ساتھ بمبئی جا رہا ہوں۔ وہاں ہم لوگ کام کریں گے لیکن جب رات کو والدین اُوپر سونے کے لیے چلے گئے تو

انہوں نے ہم بہنوں اور بھابھی کو بتایا کہ ہم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں کام کرنے لگے ہیں اور اس سلسلے میں ہمارا گروپ بمبئی جارہا ہے۔ یہ ہم سب سے اپنی کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ کچھ دن رہنے کے بعد سردار بھائی بمبئی چلے گئے۔

والدین اس خیال سے مطمئن تھے کہ بنے بھائی کی شادی ہو چکی تھی لہذا اُن پر اور رضیہ آپا پر بڑا اعتماد تھا۔ بمبئی سے جب کبھی ان کے خط میں دیر ہوتی تھی تو اماں بنے بھائی کو تار دیتی تھیں ۔ ۔ ۔ وہ مرحوم جواب دے کر تسلی بخش جواب دے دیا کرتے تھے۔ بمبئی سے یہ سال بھر بعد بلرام پور آیا کرتے تھے اور ہم سب کے لیے نئی نئی کتابیں لایا کرتے تھے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "پرواز" کے نام سے چھپ چکا تھا۔ مجاز کی "آہنگ" اور دوسرے شعراء کی کتابیں بھی منظر عام پر آ گئی تھیں۔ کرشن چندر کی کتابیں بھی میں نے اُسی زمانے میں پڑھی تھیں۔

ایک سال سردار بھائی بلرامپور آئے تو کہا۔ میں کشمیر جارہا ہوں۔ وہاں میرے ساتھ ستارہ کو بھی بھیج دیجئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد یہ کچھ دن بمبئی میں رضیہ آپا کے ساتھ رہ لیں گی۔ ابا جان نے اجازت دے دی لیکن میری بدقسمتی سے دوسرے روز پورے ہندوستان میں ریلوے ہڑتال ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں جگہ جگہ ہنگامے ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں شدت پیدا ہو گئی تھی لہذا کشمیر جانا ملتوی ہو گیا۔ کچھ روز بعد سردار بھائی بمبئی واپس چلے گئے۔ آئندہ سال جب بمبئی سے آئے تو اپنے ساتھ اپنی نئی کتاب "نئی دنیا کو سلام" لائے۔ دوپہر کو پوری کتاب ہم سب کو پڑھ کر سنائی۔ اس میں ایک مصرعہ تھا۔

ستاروں سے آنچل سجائیں گے ہم

میں نے پوچھا "کیا واقعی ایسا ہوگا؟" انہوں نے بڑے یقین سے کہا۔ "ہاں آزادی مل جانے دو پھر تم دیکھنا۔" لیکن میں سوچتی ہوں آزادی کے جو سنہرے خواب ہم نے دیکھے تھے وہ ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں۔

اس عرصہ میں چاچا کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمہ کا ابا جان کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں آزادی مل تو گئی لیکن خون کی ہولی کھیلنے کے بعد۔ اس میں ہمارے ایک ماموں قتل کر دیے گئے۔

آپا زبیدہ بلرام پور میں رہتی تھیں۔ ایک روز ابا جان نے آپا جان کو بلا کر کہا۔ "ہم دونوں کی صحت روز بروز گرتی جارہی ہے، ہماری اب آخری عمر ہے۔ اس خوشی کو تو دیکھ لیں۔ تم اپنے بھائی سے دریافت کرو کہ وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آپا نے سردار بھائی کو خط لکھا۔ اب تو خاندان میں بہت سے لوگ اپنی لڑکیوں کی شادی کرنے کے خواہشمند تھے۔ آپا نے اُن سب کے نام لکھے اور ان کی پسند دریافت کی۔ اس خط کے جواب میں بھائی نے لکھا کہ یہاں ایک لڑکی سلطانہ بیگم ہیں۔ میں ان سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر ایک بات ہے کہ وہ سنی ہیں۔ کیا والدین ان سے شادی کی اجازت دیں گے؟

آپا نے وہ خط ابا جان کو سنایا۔ یہ خط سن کر ابا جان نے کہا۔ تم لکھ دو ہماری طرف سے اجازت ہے۔

کیونکہ زندگی تمہیں اس کے ساتھ گزارنی ہے۔ جب خاندان والوں کو علم ہوا تو سب نے اس شادی کی مخالفت کی لیکن ابا جان، اماں نے ایک ہی جواب دیا کہ ہمیں اپنے بیٹے کی خوشی زیادہ منظور ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ شادی کہاں سے ہوگی۔ سردار بھائی نے لکھا۔ ہم بہت سادہ طریقے سے بمبئی میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ شادی کے بعد مَیں سلطانہ کو لے کر بلرام پور آؤں گا۔ والدین نے اس رائے کو بھی قبول کرلیا۔

۱۹۴۸ء میں ابا جان اور آپا بہت سخت بیمار ہوگئے۔ ابا جان کے مثانے میں پتھری پڑ گئی تھی جس کے لیے ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ بغیر آپریشن کے نہیں نکل سکتی۔ ابا جان بے حد مذہبی خیالات کے تھے۔ ہم لوگوں کی کوشش کے باوجود آپریشن پر تیار نہیں ہوئے۔ کہتے تھے ڈاکٹر برانڈی استعمال کریں گے۔ اب آخر عمر میں یہ گناہ نہیں کروں گا۔ ہاں سردار کو لکھو وہ جلد شادی کرلیں۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ جب شادی کی خبر عام ہوئی تو سلطانہ بھابھی کے ایک چچا بلرام پور میں رہتے تھے، وہ تشریف لائے اور ابا جان سے کہا "یہ شادی کس طرح ہوسکتی ہے؟ ہمارا قریشی خاندان ہے اور آپ لوگ جعفری ہیں۔" ابا جان نے جواب دیا۔ "مَیں تو اب بستر مرگ پر ہوں۔ لڑکے کا روکنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ سلطانہ کے چچا ہیں۔ اپنی لڑکی کو روک لیجئے۔" اس جواب کو سن کر وہ ناراض ہوگئے اور ایسے گئے کہ پھر کبھی ہمارے گھر نہیں آئے۔

شادی سے ایک ماہ قبل سردار بھائی بلرام پور آئے۔ اس وقت اپنے خاندان کے رواج کے مطابق اماں نے کچھ زیور اور کپڑے بنا کر دیے لیکن انہوں نے لے جانے سے انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا۔ سلطانہ بڑی سادہ زندگی گزارتی ہیں۔ ان کو ایسے کپڑے اور زیور کا شوق نہیں ہے۔ اماں نے کہا۔ "میرے دل کو وہم آتا ہے۔ تم ایک سرخ رنگ کا دلہن کا جوڑا لیتے جاؤ۔" سب کے کہنے سے وہ لے گئے۔

سردار بھائی نے شادی کی اطلاع ہم لوگوں کو تار سے دے دی۔ پھر خط لکھا کہ مَیں چند ماہ بعد سلطانہ کے ساتھ بلرام پور آؤں گا۔ والدین کو نئی بہو دیکھنے کا بہت شوق تھا اور ہم بہنیں بھی دوسری بھابھی دیکھنے کے لیے بیتاب تھیں۔ سردار بھائی جون میں بھابھی کو لے کر آئے۔ ابا جان نے اپنے ہاتھ سے بھابھی کے گلے میں ۔ ۔ نے کا نکلس پہنایا۔ بڑی بہنوں اور بھابھی جان نے رونمائی میں سونے کا زیور اور روپیہ دیا۔ رباب جعفری اور مَیں نے باہر کا بنا۔ واکٹ ورک کا نیلے رنگ کا گلدان دیا۔ اماں ۔ نے کپڑے بنائے، وہ بھابھی نے پسند نہیں کئے کیونکہ اس وقت وہ یہ شوخ رنگ نہیں پہنتی تھیں۔ دلہن والا جوڑا بھی واپس کردیا۔ صرف ایک جوڑا سبز رنگ کی سلک کا لیا۔ چھوٹے چچا اور میرے چچا زاد بھائی جرار بھائی نے شادی کی دعوت کی۔ تین دن رہ کر یہ دونوں چلے گئے۔

بلرام پور سے واپسی کے چند ماہ بعد پھر سردار بھائی کی گرفتاری کی خبر آئی لیکن پندرہ روز بعد رہا کر

دیا گیا۔ پھر کچھ ماہ گزرے ہوں گے کہ گورنمنٹ نے کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ سردار بھائی کو گرفتار کر کے ناسک جیل بھیج دیا اور باقی ساتھی انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ بنے بھائی اور سبط بھائی پاکستان چلے گئے۔ اس وقت تک ویزا اور پاسپورٹ کی پابندی نہیں تھی۔ ناسک جیل سے سردار بھائی بڑی پابندی سے خط لکھتے تھے اور بمبئی سے بھابھی خط لکھا کرتی تھیں۔

ایک خط میں سردار بھائی نے لکھا کہ سلطانہ کے یہاں بچہ ہونے والا ہے۔ اس خبر سے ہم سب کو بہت خوشی ہوئی، اماں نے دستور کے مطابق بچے کے کپڑے اور ضروریات کی دوسری چیزیں تیار کر کے بھابھی کے میکے علی گڑھ بھیج دیں۔ ہم سب نے وہ سامان بڑے شوق سے تیار کیا تھا حالانکہ گرمیوں کا زمانہ تھا لیکن جاڑوں تک کے سویٹر وغیرہ اور رضائی تھیں۔

۶ رمئی ۱۹۴۹ء کو بھابھی کا تار ملا۔ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اس وقت ہمارے گھر میں میلاد ہو رہی تھی۔ اس خبر سے سب کو از حد خوشی ہوئی۔ اماں نے پاؤ پاؤ بھر کے لڈو بنوا کر تقسیم کیے۔ پھر کچھ عرصہ بعد بھابھی نے بچے کی تصویر بھیجی۔ وہ بائیس دن کی عمر کا تھا۔ ہم سب اُسے پپو کہتے تھے (اصل نام علی ناظم ہے) جس دن پپو کی تصویر ملی ہے۔ اُس وقت ہماری بڑی بہن آپا کا آخری وقت تھا۔ پوچھا کس کی تصویر ہے؟ اماں نے بتایا سردار کے بیٹے کی ہے۔ آپا نے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھا اور اس کو چوم کر اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔ ابا جان تو پپو کی تصویر اپنے سرہانے رکھتے تھے اور تکیے کے نیچے سے دن میں ایک دو بار نکال کر دیکھ لیتے تھے۔ پھر کہتے تھے سردار کے بیٹے کا ہمیں بڑا ارمان تھا۔ آج خدا نے وہ خواہش پوری کر دی۔ پروردگار سردار کو جلد جیل سے رہائی دے تاکہ ہم بچے کو دیکھ سکیں۔ جب سردار بھائی کو پپو کی پیدائش کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے لکھا تم ابا جان، اماں کو تسلی دے دینا۔ مَیں جیل سے رہا ہوتے ہی سلطانہ اور پپو کو لے کر بلرام پور آؤں گا۔ سلطانہ بھابھی اپنی علالت کی وجہ سے سیدھی علی گڑھ چلی گئی تھیں۔

سردار بھائی نے جب جیل میں اپنے بیٹے کو پہلی بار دیکھا اور رہا ہوئے۔ اس وقت تک کی پپو کی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی تفصیل سے لکھا کرتے تھے۔ (وہ سب خطوط آج بھی میرے پاس موجود ہیں) جب پپو سوا سال کے ہوئے تب سردار بھائی جیل سے رہا ہوئے اور فوراً بھابھی اور پپو کو لے کر بلرام پور آئے۔ اُس وقت پپو ایک گڈا معلوم ہوتا تھا۔ پورا گھر انہیں دیکھ کر نہال ہو گیا۔ تین چار روز رہنے کے بعد بھابھی واپس چلی گئیں۔

پورے دو سال بعد سردار بھائی کے دوسرا بیٹا ہوا جس کو پیار میں سب چمو کہتے ہیں۔ اصل نام علی حکمت جعفری ہے۔ اس عرصہ میں ابا جان کا مرض بہت بڑھ گیا۔ اب تو وہ بالکل مجبور ہو گئے تھے لیکن چمو کو دیکھنے کی بے حد خواہش تھی۔ باقی بڑی بہنیں اپنے سسرال والوں کے ساتھ پاکستان جا چکی تھیں۔ گھر میں صرف میری

بڑی بہن رباب جعفری اور میں تھے۔ ابا جان کی نازک حالت کو دیکھتے ہوئے بھابھی جان اپنے گھر سے ہمارے پاس آ گئی تھیں۔

بھائی اور جواں بیٹیوں کی موت پھر سردار بھائی کے بار بار جیل جانے کا دکھ۔ اس نے اماں کو بھی بالکل بے کار اور کمزور کر دیا تھا۔ لیکن دونوں کو بیٹے کے دیکھنے کا شوق تھا۔ ابا جان مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے۔ تم سردار کے دوسرے بیٹے کو بھی دیکھو گی اور اپنے بھائی کا عروج بھی دیکھو گی مگر ہم نہیں ہوں گے۔ اب جب سردار بھائی کو ایوارڈ ملتا ہے اور ان کی مقبولیت کا چرچا ہوتا ہے تو میرے کانوں میں ابا جان کے الفاظ گونج جاتے ہیں۔ وہ بہت پہلے یہ پیشین گوئی کر گئے تھے۔ پدم ایوارڈ ملنے پر بھی مجھے ابا جان بہت یاد آئے۔ اور واقعی میں نے سردار بھائی کا دوسرا بیٹا کیا بلکہ ناظم عرف پپو کی دلہن اور سردار بھائی کے پوتے اقبال کو دیکھ لیا۔

سات سال بیمار رہنے کے بعد فروری ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹروں نے ابا جان کو جواب دے دیا۔ بھائی جان نے فوراً سردار بھائی کو تار کر دیا۔ جواب میں انہوں نے بھی تار دیا کہ میں آرہا ہوں۔ جس وقت سردار بھائی کی آمد کا تار ملا ہے۔ ابا جان کا آخری وقت تھا۔ ربو باجی پانی پلا رہی تھیں اور میں سرد با رہی تھی۔ ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھا اور پوچھا۔ کیا سردار آ گیا ہے؟ کسی نے کہا۔ ہاں آ گیا ہے۔ بس آنکھیں بند کر لیں۔ میرے چچا قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے جھک کر دیکھا۔ پھر ہم دونوں سے کہا۔ "بیٹی اب تمہاری خدمت کا وقت ختم ہو گیا ہے اور لحاف سے چہرہ ڈھک دیا۔ ابا جان کی خالہ نے سورہ یسین پڑھنی شروع کر دی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ ابا جان ہمیشہ کے لیے ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔

سردار بھائی دوسرے دن شام کی ٹرین سے پہنچے۔ تب تک ابا جان سپردِ خاک کر دیے گئے تھے۔ ابا جان کے چہلم کے دن اماں بھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان دونوں کے انتقال کے بعد سردار بھائی نے ہم بہنوں سے کہا۔ رباب تم سات سال کی تیمارداری سے تھک گئی ہو۔ یہاں رہو گی تو ہر وقت وہی سب خیال آتا رہے گا۔ تم دونوں بمبئی میرے پاس چل کر رہو۔ سلطانہ کی بھی یہی رائے ہے۔

نومبر ۱۹۵۳ء میں ہم دونوں بہنیں بمبئی آ گئیں اور اب تک بمبئی میں سردار بھائی کے ساتھ ہیں۔ وہ ادبی شعور جو بلرام پور میں اُبھرا تھا، سردار بھائی کے سائے میں رہ کر نکھر گیا۔

سردار بھائی کی بلند اخلاقی، کسی بھی مصیبت کے وقت ہمت نہ ہارنا، سب کے بُرے وقت میں کام آنا، چاہے اپنے پاس پیسہ نہ ہو لیکن ضرورت مندوں کی مدد کرنا، یہ خاص صفات ہیں۔ پڑوسی تو کہتے ہیں اس بلڈنگ میں ایک دیوتا رہتا ہے۔ بھگوان کی طرح کس کے ساتھ کے بھلائی کرتا ہے، اور کیا دیتا ہے، یہ معلوم نہیں ہوتا ورنہ لوگ تو ایک پیسہ بھی کسی کو دیتے ہیں، تو بتاتے ہیں۔ مزاج میں قناعت پسندی اور بھی زیادہ آ گئی

ہے۔ شاید اسی لیے حوصلہ زیادہ بلند ہے۔ لیکن اب جب میں نظر ڈالتی ہوں تو یہاں کے سردار بھائی اور بلرام پور کے سردار بھائی میں زمین وآسماں کا فرق نظر آتا ہے۔ وہ جو کوئی بات اپنے مزاج کے خلاف برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ آج اُن کی قوتِ برداشت ہمالیہ پہاڑ کی طرح پائیدار ہے۔ جو صدیوں کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ اٹل ہے۔ حالات و زمانہ انسان کو کتنا بدل دیتا ہے۔

[illegible] بلرام پور میں ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی صابر و شاکر ہیں۔ دولت کی ہوس سے بے نیاز۔ خدا کی ذات پر بھروسہ ہے۔

پروردگار میرے بھائیوں اور بہنوں کے کردار کو ایسا ہی بلند رکھے، آمین۔

گلزارِ والدین کے یہ گل کھلے رہیں۔

[illegible] ۔میں نے بزرگوں سے یہی تاریخ پیدائش سنی ہے جو لکھی ہے۔ اماں سالگرہ بھی ۲۶ بقرعید کو کرتی تھیں۔ لیکن سردار بھائی کو ۲۹ رنومبر یاد ہے۔ تاریخ پیدائش کا قطعہ موجود ہے جو حضرات اس سے تاریخ نکالنا جانتے ہیں، وہ معلوم کرسکتے ہیں۔ [illegible] ۔افسوس تین سال قبل بھائی جان اور سبطِ بھائی کی رحلت ہوگئی۔

(علی سردار جعفری اپنی بہنوں کی نظر میں، ۱۹۸۰ء
رسالہ نخلستان، بے پور سردار جعفری نمبر جولائی تا دسمبر ۲۰۰۰ء
مجلہ مجلس فروغ اردو دوحہ، قطر ۱۹۹۸ء)

سبطِ حسن

سردار جعفری

چند یادیں

ادیب، خطیب، شاعر، افسانہ نویس، ڈراما نگار، نقاد، فلم ساز اور پھر ہمارے دوست علی سردار جعفری سلامت رہیں۔ اُن کے فن پر تبصرہ کرنے کی صلاحیت تو مجھ میں نہیں ہے البتہ جو شب و روز ہم نے کبھی سردار کی سنگت میں گزارے تھے، اُن کی یادوں کے چراغ ذہن کے اُفق پر کہکشاں کی مانند ہنوز روشن ہیں۔ یادش بخیر وہ بھی کیا دن تھے۔ اور کتنے خوش قسمت ہیں ہم لوگ جنھوں نے اُس تاریخ ساز دَور کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اُس دَور کی سرگرمیوں میں شریک ہوئے اور اُن سے کسبِ فیض کیا۔ اُن دنوں یوں محسوس ہوتا تھا گویا نئی دنیا اور نیا آدم بنانے کی نئی اُمنگ نئے سرے سے جوان ہوئی ہے۔ ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا یہ زمانہ ہر چند کہ بہت مختصر تھا لیکن اُس نے ہم کو ایک نیا ذہن، ایک نیا آہنگِ فکر و نظر۔ ایک نیا جمالیاتی ذوق، اور تجربات اور احساسات کو فنی سانچوں میں ڈھالنے کا نیا سلیقہ عطا کیا۔ وہ ایک ایسا موڑ تھا جہاں سے ہمارے ادب نے، رقص و موسیقی نے، گیت گانوں، فلموں اور تصویروں نے نئے سفر کا آغاز کیا۔

سردار جعفری اُسی مردم خیز عہد کی پیداوار ہیں۔ وہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں ہی میں نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنی حسی ریاضتوں سے ترقی پسند ادب کے معیار کو بلند کیا ہے۔ اُس میں نئے معنی اور نئی جہتیں پیدا کی ہیں۔

سردار جعفری سے ہماری خط و کتابت اُس وقت سے ہے جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد اینگلو عربک کالج دہلی میں زیرِ تعلیم تھے۔ یہ درسگاہ ابتداء میں روایتی طرز کا ایک مدرسہ تھی جس کو ۱۷۹۲ء میں نظام الملک آصف جاہ کے بیٹے نواب غازی الدین حیدر نے قائم کیا تھا۔ دہلی میں جب ایسٹ انڈیا کا عمل دخل ہوا تو ۱۸۲۵ء میں مدرسے کو کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ وہی تاریخی کالج ہے جس میں اب سے ڈیڑھ سو سال پیشتر طلباء کو مغربی علوم پہلی بار اردو زبان میں پڑھانے کی طرح ڈالی گئی۔ اِس کالج سے اُردو کے بڑے بڑے نامور ادیب وابستہ رہ چکے ہیں۔ شیخ امام بخش صہبائی، ماسٹر رام چندر، غالبؔ کے دوست ماسٹر پیارے لال، شمس العلماء مولوی ذکا اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد

حسین آزاد اور میر ناصر علی ایڈیٹر صلائے عام... سب نے اس دار العلوم سے فیض حاصل کیا ہے۔ موجودہ دور میں اس کے سپوت فرزند علی سردار جعفری اور معین احسن جذبی ہیں۔

سردار جعفری سے ہماری پہلی ملاقات ۱۹۳۸ء میں الہ آباد میں ہوئی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ مَیں دکن سے وطن جاتے وقت لکھنؤ میں رُکا اور اپنے پرانے دوست اسرار الحق مجازؔ سے ملنے گیا تو وہ کسی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے الہ آباد جا رہے تھے۔ کہنے لگے تم بھی کیوں نہیں چلتے؟ بنے بھائی (سجاد ظہیر) اور ڈاکٹر اشرف تم کو اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔ الہ آباد میں اُن دنوں پنڈت جواہر لال نہرو کی وجہ سے بائیں بازو کے بھی چوٹی کے دانشوروں کا جمگھٹا تھا۔ ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر زیڈ احمد، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور سجاد ظہیر سب وہیں براجمان تھے۔ مجازؔ نے بتایا کہ سردار جعفری بھی مشاعرے کے لیے الہ آباد گئے ہوئے ہیں۔ اُن کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ سردار جعفری لکھنؤ میں رہتے ہیں اور مجازؔ کے ساتھ مل کر کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ چنانچہ مجازؔ کا مجموعہ "آہنگ" سردار جعفری کی کہانیوں کا مجموعہ "منزل" اور حیات اللہ انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ "انوکھی مصیبت" چھاپ چکے ہیں۔ مَیں نے سردار جعفری کی چند نظمیں تو پڑھی تھیں لیکن اُس وقت تک یہ خبر نہ تھی کہ وہ افسانے بھی لکھتے ہیں۔

الہ آباد میں ہم ڈاکٹر اشرف کے ساتھ ٹھہرے۔ رات کے وقت تو خیر ڈاکٹر اشرف سے باتیں ہوتی رہیں البتہ صبح نو بجے کے قریب مَیں اور مجازؔ سردار جعفری کی تلاش میں نکلے۔ مجازؔ کو صرف اتنا پتہ تھا کہ سردارؔ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں اپنے کسی دوست کے ساتھ مقیم ہیں۔ اُن صاحب سے مل کر سردارؔ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے برآمدے میں بچھی ہوئی ایک چارپائی کی طرف اشارہ کر دیا جس پر کوئی شخص سبز رنگ کی شالی چادر تانے سو رہا تھا۔ حالانکہ اُس وقت دن کے دس بجے تھے۔ مجازؔ نے سرہانے کھڑے ہو کر کئی بار پکارا۔ تب چادر میں جنبش ہوئی اور سردارؔ نے سر باہر نکالا... یہ تھی سردار جعفری سے ہماری پہلی مڈبھیڑ۔

انہوں نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا نکالی، ہم لوگوں کی طرف بڑھائی۔ اپنی سگریٹ جلائی اور کش پر کش لینے لگے۔ اِدھر مَیں حیران کہ یہ کس قماش کا انسان ہے؟ جو منہ ہاتھ دھوئے بغیر خالی پیٹ سگریٹ پی رہا ہے۔ سردار بولتے جا رہے تھے اور مَیں اُن کی صورت دیکھتا، 'ہاں' 'نہیں' میں جواب دے رہا تھا۔ دراصل اُن کی انوکھی شخصیت نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ گندمی رنگ بھرا بھرا کتابی چہرہ، سر پر ریشم کے سے ملائم بالوں کا ڈھیر۔ اُنگلیوں کا رنگ تمباکو نوشی کی کثرت سے سیاہی مائل زرد، آنکھیں منگولوں کی سی غلافی مگر بڑی بڑی اور اُن میں چمک ایسی گویا دیے روشن ہوں اور پھر اُن کی گرجدار آواز جس میں بلا کی خود اعتمادی تھی مجازؔ جتنے کم سخن بلکہ شرمیلے تھے سردار اُتنے ہی تیز طرار اور جلد بے تکلف ہو جانے والے۔ وہ بولتے تو یوں محسوس ہوتا گویا جلسہ عام میں تقریر کر رہے ہوں۔

رات کے وقت یونیورسٹی میں مشاعرہ تھا۔ وہاں سردار جعفری نے اپنی نظم "بغاوت" بڑے گھن گرج سے

پڑھی۔ اُن دنوں وہ شعر ترنم سے پڑھتے تھے ترنم کیا لٹھ گھماتے تھے۔ مگر اُن کی پاٹ دار آواز سے ہال کے در و دیوار لرز رہے تھے۔ نظم طلبا کی ذہنی کیفیت کے عین مطابق تھی لہٰذا شاعر کو ہر شعر پر بھرپور داد مل رہی تھی۔

سردار نے مجھ کو دو ہی دن میں لکھنؤ کی سیاسی اور ادبی زندگی کے تمام خشک و رنگیں پہلوؤں سے آگاہ کر دیا۔ کون وزیر کتنا با اثر ہے؟ کس لیڈر کے خیالات ترقی پسندانہ ہیں کون جماعت کتنی سرگرم عمل ہے۔ ادبی ماحول کیا ہے؟ ادیبوں کا کیا حال ہے؟۔ دانش ور کیا سوچ رہے ہیں؟ طلباء کی تحریک کس سمت جا رہی ہے؟ لالہ رخان لکھنؤ کی بزم جمال کہاں کہاں آراستہ ہوتی ہیں اور ان میں کن کن احباب کو باریابی کا شرف حاصل ہے؟ اور یہ ساری داستاں سنانے کے بعد سردار نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ لکھنؤ کیوں نہیں آجاتے؟ بلکہ کہا تو یہ کہ تم لکھنؤ کب منتقل ہو رہے ہو؟ گویا انہوں نے اپنی جگہ طے کر لیا تھا کہ مجھ کو لکھنؤ بہر صورت آنا ہی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم سر پر کھڑی تھی۔ جس وقت مجازؔ، سردارؔ جعفری اور مَیں نے مل کر ماہنامہ ''نیا ادب'' اور ہفت روزہ ''پرچم'' لکھنؤ سے جاری کیا، اسپین میں جمہوریت کا پرچم سرنگوں ہو چکا تھا۔ جنرل فرانکو نے ہٹلر اور میسولینی کی فوجی مدد سے اپنی فاشسٹ حکومت قائم کر لی تھی۔ برطانیہ اور فرانس کی فاشسٹ نواز حکومتوں نے چیکوسلواکیہ کو ہٹلر کے حوالے کر دیا تھا اور ابھی مغربی طاقتوں کی کوشش تھی کہ نازی لشیروں کا رخ کسی صورت سوویت یونین کی جانب پھیر دیا جائے۔ اُنہیں دنوں کسی رسالے میں ایک جمہوریت پسند مجاہد خاتون کی تصویر چھپی۔ شانوں پر بکھرے ہوئے بال، جسم پر فوجی وردی، ہاتھ میں رائفل، چہرے پر عزم و جلال کی چھوٹیں، اور تیور ایسے کہ شیر افگنوں کے دل دہل جائیں۔ سردار جعفری کو یہ تصویر اتنی اچھی لگی کہ انہوں نے بڑے سائز پر اُس کا فوٹو بنوایا اور فریم کروا کر ''نیا ادب'' کے دفتر میں لگا دیا۔ جو آتا تصویر کی تعریف کرتا۔ البتہ ایک دن قبلہ، رندانِ جہاں جوشؔ صاحب تشریف لائے تو انہوں نے تصویر کو اپنے ہاتھ سے اُلٹ دیا۔ اور فرمایا۔ صاحبو! عورت کی یہ سپاہیانہ سج دھج مجھ کو ہرگز گوارا نہیں۔ وہ تو پیار و محبت کا سرچشمہ ہے۔ وردی پہن کر تلوار بندوق چلانا اُس کا منصب نہیں۔ سردارؔ نے جوشؔ صاحب کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ یہ تصویر بمبئی میں میں بھی سردارؔ کے پاس تھی۔ معلوم نہیں اب اُن کے کمرے کی زینت ہے یا نہیں۔

''نیا ادب'' انجمن ترقی پسند مصنفین کا ترجمان تھا۔ اس مختصر سے رسالے نے جلد ہی ادبی حلقوں میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، مجنوںؔ گورکھپوری، منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، مخدوم محی الدین، سجاد ظہیر، احتشام حسین، خواجہ احمد عباس، غرضیکہ بھی ترقی پسند ادیبوں نے اس پرچے کو اپنی تحریروں سے نوازا۔ منشی پریم چند کا ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا خطبۂ صدارت، اُن کی مشہور کہانی ''کفن'' اور سجاد ظہیر کے نام اُن کے خطوط پہلی بار ''نیا ادب'' ہی میں چھپے۔ منٹو کی کہانی ''نیا قانون'' بھی اسی رسالے میں شائع ہوئی۔ ایک روز الہ آباد سے ایک کہانی موصول ہوئی جس کا عنوان تھا ''پھسلن'' موضوع ہم جنسی تجربے تھے اور مصنف تھے محمد حسن عسکری۔ ہم لوگ کئی ہفتے اس شش و پنج

میں رہے کہ کہانی کو چھاپیں یا نہ چھاپیں۔ بات یہ تھی کہ اُن دنوں قدامت پرست ادیب اور انگریزی سرکار کے گماشتے دونوں پنجے جھاڑ کر ترقی پسند ادیبوں کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور اُن پر فحش نگاری اور عریاں نویسی کی تہمتیں دھر رہے تھے لہذا ہم لوگ ہچکچا رہے تھے۔ مبادہ دشمنوں کو نیا حربہ ہاتھ آجائے۔ مگر ایک دن سردار جعفری نے مشہور انگریزی ناولسٹ ڈی۔ ایچ لارنس کا ایک مضمون دکھایا جس میں لارنس نے فحاشی پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا۔ لارنس کا کہنا تھا کہ جنسی تجربوں کا تذکرہ یا جنسی واردات سے لذت یابی کا اظہار ہرگز فحاشی نہیں بشرطیکہ اس کے تذکرے سے جنس (عورت) کی تضحیک اور توہین مقصود نہ ہو یا مرد کی فتح و کامرانی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ یہ سند ملی تو کہانی شائع کردی گئی مگر کسی جانب سے احتجاج یا اعتراض کی آواز نہ اُٹھی۔

محمد حسن عسکری نے اس کہانی کے بعد اپنی ادبی زندگی میں کئی روپ بدلے۔ کبھی ترقی پسندوں کی حمایت کی، کبھی شدت سے مخالفت، کبھی روشن خیال بنے اور کبھی روشن خیالی کا جانی دشمن اور آخر عمر میں تو یہاں تک بہک گئے تھے کہ مغرب نے علوم و فنون میں ارسطو سے لے کر آج تک جتنی ترقی کی ہے، سب کو ہمارے لیے زہر ہلاہل اور گمراہ کن تصور کرنے لگے اور مولوی اشرف علی تھانوی مصنف ''بہشتی زیور'' کے مرید ہو گئے۔

حضرت جوش ملیح آبادی کی نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' ''نیا ادب'' ہی میں شائع ہوئی تھی۔ وہ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا تھا اور انگریزی فوجیں ہر محاذ پر پسپا ہو رہی تھیں۔ ایسے میں یہ نظم چھپی تو ''ایوان اقتدار'' میں تہلکہ مچ گیا۔ ''نیا ادب'' کے دفتر کی تلاشی ہوئی اور وہ شمارہ جس میں یہ نظم شائع ہوئی تھی، بحکم سرکار ضبط کر لیا گیا مگر تیر ترکش سے نکل چکا تھا اور ہر طرف اس نظم کا چرچا تھا لہذا اس کی ضبطی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ۱۹۴۲ء میں ''ہندوستان چھوڑو'' کی ملک گیر تحریک چلی تو یہ نظم ہزاروں کی تعداد میں غیر قانونی طور پر چھپی اور ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم ہوئی۔

''نیا ادب'' کی مجلس ادارت میں یوں تو مجاز بھی تھے اور میرا نام بھی شامل تھا مگر پرچے کے روح رواں دراصل سردار جعفری تھے۔ انہیں کی لگن اور انتھک محنت سے یہ پرچہ چلتا تھا۔ لکھائی چھپائی کا بندوبست، کاغذ کی فراہمی، ادیبوں سے خط و کتابت، آمدنی اور خرچ کا حساب سب کا بوجھ انہیں کے کندھوں پر تھا۔

اُن کو بحث مباحثے کا بھی بڑا چسکا تھا۔ کالج کے زمانے میں طلبا کے مباحثوں میں انہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے اور انعام پائے تھے۔ لیکن نہ مجاز اس میدان کے مرد تھے نہ میں۔ مگر شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ ادب ہو یا سیاست یا کوئی اور موضوع ہو، کوئی شخص اُن سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا۔ ایک بزرگ امین سلونوی تھے جو رہتے نظیر آباد میں تھے اور کام کرتے تھے منشی نول کشور کے اودھ اخبار میں۔ بدقسمتی سے ہمارا فلیٹ اُن کے راستے میں پڑتا تھا چنانچہ وہ دفتر جاتے وقت روزانہ صبح صبح آن دھمکتے اور ہم کو اپنا اداریہ سناتے۔ سردار تو دیر تک سونے کے عادی تھے لہذا اُن کو خبر نہ ہوتی البتہ مجاز اور میں امین سلونوی صاحب کی صحافتی نثر کا شکار ہوتے۔ آخر تنگ آکر ہم نے سردار سے فریاد کی

کہ یار اس موذی سے ہمارا پیچھا چھڑاؤ۔ سردار نے کہا اچھا کل جب وہ آئیں تو مجھے جگا دینا۔ خیر صاحب امین سلونوی صاحب حسب معمول وارد ہوئے تو ہم نے مولے کو شہباز کے سپرد کر دیا۔ سردار نے اُن کے اداریے کے وہ بخیے ادھیڑے کہ امین سلونوی نے پھر کبھی ہمارے فلیٹ کا رخ نہیں کیا۔

ایک شام ہم تینوں فرنگی محل جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ ارادہ یہ تھا کہ امین آباد تک پیدل چلیں گے اور وہاں سے ایک ایک آنے میں یکہ کر لیں گے۔ امین آباد پہنچے تو صدیق بک ڈپو کے مالک صدیق صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ صدیق صاحب بڑے مجلسی اور ادب نواز شخص تھے اور کیا مجال جو کوئی اہل قلم اُن سے ملے بغیر امین آباد سے گزر جائے۔ وہ ہم لوگوں کو لے کر دکان کے سامنے پارک میں جو بنچ پڑی تھی، اُس پر بیٹھ گئے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب گفتگو نے رفتہ رفتہ مناظرے کی شکل اختیار کر لی تو مجاز نے مجھ کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں چپکے سے اُٹھے، پارک سے نکل کر یکے پر بیٹھے اور فرنگی محل چل دیے۔ وہاں فرحت اللہ انصاری مرحوم کی مہمان نوازیوں سے شکم سیر ہو کر جب ہم دس بجے رات کے وقت صدیق بک ڈپو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بحث بدستور جاری ہے۔ سردار نے بس اتنا پوچھا کہ تم لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ مجاز نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''کہیں نہیں ذرا پان کھانے''۔

سردار جعفری نے ادب کو زندگی کے تقاضوں سے کبھی جدا نہیں سمجھا۔ اُن کی مشق سخن بھی جاری رہی اور سیاسی سرگرمیاں بھی۔ وہ لکھنو یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کر رہے تھے۔ طلبا کی تحریک سے اُن کی آشنائی بہت پرانی تھی۔ اس گناہ بے گناہی کے کارن وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نکالے بھی گئے تھے لہٰذا تجدید وفا میں اُن کو دیر نہ لگی۔ انہوں نے اپنی لیاقت اور ذہانت سے یونیورسٹی میں اپنی دھاک بٹھالی۔ اُن کی ہر دلعزیزی کے پیش نظر بائیں بازو کے طلبا نے اُن کو یونین کے الیکشن میں سیکرٹری شپ کے لیے نامزد کیا۔ وہ الیکشن کیا جیتے کہ یونین اُن کا اوڑھنا بچھونا ہو گئی۔ البتہ نزلہ ''نیا ادب'' پر گرا کیونکہ انتظامی صلاحیت نہ مجاز میں تھی نہ مجھ میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرچا ایک مہینے چھپا تو دو مہینے ناغہ۔ مگر طلبا کی سرگرمیاں سردار کی شاعری کو بہت راس آئیں۔ وہ نئے جوش اور ولولے سے شعر کہنے لگے۔

اسی اثنا میں سامراجی جنگ کے خلاف شورش نے شدت اختیار کی۔ جلسوں جلوسوں کا موسم آیا اور پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ طلبا اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ سردار جعفری کب نچلے بیٹھنے والے تھے۔ چنانچہ ایک تقریر کی پاداش میں گرفتار کر لیے گئے۔ اُس وقت تک امتناعی نظر بندیوں کی ریت نہیں پڑی تھی بلکہ سیاسی قیدیوں پر بھی عدالت میں مقدمہ چلتا تھا اور معینہ عرصہ کے لیے سزا دی جاتی تھی۔ سردار کے خلاف فرد جرم اتنی پھسپھسی تھی کہ وہ مقدمہ لڑتے تو یقیناً بری ہو جاتے مگر انہوں نے ملک کی دیرینہ سیاسی روایت کا احترام کرتے ہوئے بھری عدالت میں کہہ دیا کہ ہم نہ اس عدالت کو تسلیم کرتے ہیں نہ اس کے قانون کو لہٰذا صفائی پیش کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اُن کو چھ ماہ قید سخت کی سزا ہو گئی۔ وہ کچھ دن لکھنو جیل میں رہے پھر بنارس بھیج دیے گئے۔ ''نیا ادب'' نے اپنے اداریے میں یہ کہہ کر دل کا اغبار نکالا کہ

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ شوق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیا؟
ہیں اسیرانِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

سردار رہا ہو کر آئے تو لکھنؤ میں جو مجلس انہوں نے جمائی اور جو محفل سجائی تھی وہ درہم برہم ہو چکی تھی۔ سوویت یونین پر ہٹلر کے حملے کی وجہ سے عالمی جنگ کی نوعیت بدل گئی تھی۔ جاپانی فوجیں ملایا برما کو روندتی ہوئی آسام کی سرحد تک آ پہنچی تھیں بلکہ کلکتہ پر ہوائی بمباری بھی ہو چکی تھی۔ یہ وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا نہ تھا۔ چنانچہ لکھنؤ میں جب گوریلا دستوں کی مشق شروع ہوئی تو سردار بھی اُس میں شامل ہو گئے اور ریڈیو کے لیے فاشسٹ دشمن ڈرامے اور تقریریں لکھنے لگے۔ ان ہی دنوں ریڈیو اسٹیشن میں وہ مشاعرہ ہوا جس کا ذکر سردار جعفری نے اپنی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں کیا ہے۔

فیض احمد فیض سے ہم لوگوں کی پہلی ملاقات اسی مشاعرے کے دوران ڈاکٹر رشید جہاں کے مکان پر ہوئی تھی۔ رشیدہ آپا ڈاکٹر ہونے کے علاوہ بڑی نڈر افسانہ نگار بھی تھیں۔ اُن کے والد شیخ عبداللہ وہ بہادر مصلحِ قوم تھے جنہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں میں تعلیمِ نسواں کی مہم چلائی اور علی گڑھ میں گرلز کالج قائم کیا حالانکہ سرسید بھی اس حق میں نہ تھے۔ رشیدہ آپا کے افسانے "انگارے" میں شائع ہوئے تو تنگ نظر ملاؤں میں مل چل مچ گئی۔ اُن کو اغوا اور قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں مگر وہ ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والی خاتون نہ تھیں۔ یہ فتنہ مدت ہوئی فرد ہو چکا تھا بلکہ اب مولوی حضرات اپنی پردہ دار خواتین کے علاج کے لیے ان کے مطب میں آنے میں بھی کوئی باک محسوس نہ کرتے تھے۔ اُن کی بیٹھک ترقی پسند ادیبوں اور سیاسی کارکنوں کی کھلی پناہ گاہ تھی چنانچہ ادبی مجلسیں بھی اکثر وہیں ہوتی تھیں۔ رشیدہ آپا ہی کی تحریک پر پیپلز تھیٹر کے نام سے ایک چھوٹی سی ناٹک منڈلی بھی بن گئی تھی۔ اتفاق سے اودے شنکر تھیٹر کی مشہور فنکارہ زہرہ بیگم اُن دنوں لکھنؤ میں مقیم تھیں لہذا ناٹک کھیلنے کا منصوبہ بنایا گیا اور منشی پریم چند کی کہانی "کفن" اور رشیدہ آپا کے شوہر صاحبزادہ محمود الظفر کا ڈرامہ "امیری کی بو" اسٹیج ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہوگی کہ ان کھیلوں کے ہدایت کار سردار جعفری تھے اور مکالمے بھی انہیں نے لکھے تھے۔

پھر سردار جعفری کو بمبئی بلا لیا گیا اور وہ کمیونسٹ پارٹی کے کُل وقتی کارکن بن کر ہفت روزہ "قومی جنگ" سے وابستہ ہو گئے۔ تقریباً چھ ماہ بعد میں جب بمبئی پہنچا تو سردار جعفری کی جولانیٔ طبع پورے شباب پر تھی۔ اُن کی بے قرار روح اور بے چین طبیعت کو پہلی بار اظہارِ ذات کے تمام مواقع حاصل ہوئے تھے۔ لہذا اُن کی تخلیقی صلاحیتیں خوب چمکیں۔ وہ دن بھر پارٹی آفس میں کام کرتے اور رات میں اپنے فاشسٹ دشمن ڈرامے "یہ کس کا خون ہے؟" کی ریہرسل

کرواتے۔ یہ ڈراما تانا انسٹی ٹیوٹ بائی کلہ کے ہال میں آٹھ نو روز کھیلا گیا اور بہت مقبول ہوا بالخصوص مزدوروں میں۔

مگر پارٹی کی جفاکش زندگی کے باوصف سردار جعفری کی عادتوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بمبئی اپنے دوست شاکر علی کے ساتھ رہتے تھے۔ شاکر اُن دنوں جے جے اسکول آف آرٹس میں پڑھتے تھے۔ اُن کا فلیٹ بائی کلہ کی نہایت چلتی سڑک پر واقع تھا جہاں شوروغل سے کان پڑی آواز بھی مشکل سے سنائی دیتی تھی لیکن سردار جعفری پر اس شوروغل کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ لکھنؤ کی طرح یہاں بھی رات میں دیر تک جاگتے اور صبح دیر سے اُٹھتے۔ وقیانوسی ٹرامیں کھڑکھڑاتیں ان کے سر کے پاس سے گزر جاتیں مگر سردار کی نیند میں مطلق خلل نہ پڑتا۔ پارٹی آفس میں کھانا ٹھیک نو بجے ملتا مگر سردار جعفری کو گرم گرم دال روٹی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اُن کا کھانا الگ ڈھک کر رکھ دیا جاتا اور دس ساڑھے دس بجے آ کر ٹھنڈا کھانا مزے سے کھا لیتے۔ پچھلی بار کراچی میں دیر سویرے اُٹھنے کی بات نکلی تو بڑی حسرت سے بولے یار اب تو آنکھ صبح چار بجے کھل جاتی ہے۔ دس بجے تک سونے کو ترس گئے۔ سحر خیزی کی یہ نئی عادت نہ جانے سلطانہ بیگم کی صحبت کا اثر ہے یا عمر کا تقاضہ؟

سردار جعفری کی ایک اور ہدایت کاری کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔ جنوری کی ایک شام کو ہم لوگ بنے بھائی کے فلیٹ میں بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں غالبؔ کا ذکر آ گیا جن کی وفات فروری میں ہوئی تھی۔ بنے بھائی کہنے لگے۔ ”یارو کیوں نہ یوم غالبؔ منایا جائے؟“ اس تجویز سے کسی کو کیا اختلاف ہو سکتا تھا۔ چنانچہ فوراً پروگرام بن گیا اور دوسرے دن سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ قاضی عبدالغفار مصنف ”لیلےٰ کے خطوط“ سے صدارت کی درخواست کی گئی جس کو انہوں نے بخوشی منظور کر لیا اور حیدرآباد سے بمعہ بیگم صاحبہ اپنے خرچ پر تشریف لائے۔ غالبؔ جیبی سائز کا ایک مختصر سا انتخاب بھی شائع کیا گیا۔ مگر اس تقریب کا حاصل ۱۲۶۱ھ کا وہ یادگار مشاعرہ تھا جو لال قلعہ دہلی میں بہادر شاہ ظفرؔ کے روبرو منعقد ہوا تھا جس میں غالبؔ، مومنؔ اور دوسرے ممتاز شعرا نے شرکت کی تھی۔ اس مشاعرے کو نہایت خوش اسلوبی سے سٹیج کرنے کا سہرا سردار جعفری کے سر ہے۔ انہوں نے محبوب اسٹڈیو سے مغلیہ پوشاکیں فراہم کیں اور اداکار جمع کیے جن میں بعض شاعر تھے اور بعض فلم اسٹار لیکن سب سے کٹھن کام ان ..ک مزاجوں کو پرانے زمانے کے مشاعرے کے آداب سکھانا اور پرانے شاعروں کی شعر خوانی کا انداز ذہن نشین کروانا تھا۔ اوروں کے نام تو اب ذہن سے نکل چکے ہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ جناب ساغرؔ نظامی نے غالبؔ کا کردار ادا کیا تھا اور سردار جعفری خود چوبدار بنے تھے کیونکہ شاعروں کا تعارف کروانا چوبدار کا فریضہ ہوتا تھا۔ اُس وقت تک وی سی آر کیمروں اور فلموں کا رواج نہیں ہوا تھا لہٰذا مشاعرے کی کوئی فلم نہ بن سکی ورنہ آپ لوگ اُس مشاعرے کا منظر دیکھ کر یقیناً بہت خوش ہوتے۔

مولوی عبدالحق صاحب کہا کرتے تھے کہ اُس شخص سے بچو جس کی سب تعریف کرتے ہوں یا جو شخص سب کی ہاں میں ہاں ملاتا ہو۔ جب مَیں سردار جعفری کے بدخواہوں کی زبان سے سنتا ہوں کہ سردار بڑے گھمنڈی ہیں یا اُن میں

لپک بالکل نہیں تو مجھ کو مولوی عبدالحق صاحب کی باتیں یاد آتی ہیں۔ سردار جعفری کی شخصیت بڑی نزاعی ہے اور ہونی بھی چاہیے کیونکہ انقلاب کے نغمہ خواں کا شیوہ ہر کس و ناکس کی خوشنودی حاصل کرنا نہیں بلکہ سچ بولنا ہے۔ سردار کی وفاداریاں وابستگیاں جن انسانی قدروں اور حیات بخش قوتوں سے ہیں وہ بعض حلقوں کو سخت ناپسند ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ شاعر کا نہ تو کوئی جیون آدرش ہونا چاہیے نہ اُس کے جذبات اور احساسات کو اُفتادگانِ خاک کے غموں اور خوشیوں، آرزوؤں اور امنگوں سے کوئی سروکار رکھنا چاہیے، مگر صدق و صفا کی یہی ریاضت، وجدان کا یہی خلوص اور ادراک و آگہی کی یہی بصیرت تو اُن کے فن کی جان ہے۔ وہ ظلمت پرستوں کی تسکینِ قلب کے لیے خودکشی کرنے سے تو رہے۔ اُن کا فن، اُن کے مجادلانہ فلسفہ زیست کا پرتو اور اُن کے ضمیر کی آواز ہے۔ انہوں نے رضاجوئی کے بجائے سدا نبرد آزمائی کی ہے البتہ جو لوگ سردار جعفری سے ذاتی طور پر واقف ہیں، وہ گواہی دیں گے کہ سردار اگر رزم گاہِ ہستی میں فولاد کی مانند سخت ہیں تو بزم گاہِ حسن و محبت میں ریشم سے بھی زیادہ نرم ہیں۔

(ماہنامہ افکار کراچی، سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء)

۲۶؍ اپریل ۱۹۶۴ء کی ایک تصویر میں وزیر اعظم،
ہند پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ سردار جعفری

علی جواد زیدی

رفیقِ زنداں سردار

پچاس ساٹھ برس ادھر کی بات ہے لکھنو یونیورسٹی میں الیکشن ہوا جس میں علی سردار جعفری اور مَیں دونوں ہی اُمیدوار تھے۔ اس سے قطع نظر کہ ہم میں کون جیتا، کون ہارا، ایک نہ ایک کو تو جیتنا ہی تھا۔ الیکشن کے بعد جنوبی ہند کے ایک نووارد طالب علم نے مجھ سے خوش ہو کے کہا۔"جعفری صاحب! مَیں نے آپ ہی کو ووٹ دیا تھا" مَیں نے مسکراتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ تردیدی تشریح کر کے اُس کا دل چھوٹا کیوں کرتا؟ اس واقعے کا اظہار صرف اس وضاحت کے لیے کر رہا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے، ہر تحریک میں اتنی گرم جوشی سے ساتھ ساتھ رہتے کہ یونیورسٹی کے نئے طالب علم کے لیے شناخت میں ایسی بھول چوک عین ممکن تھی، خاص کر اگر وہ جنوبی ہند کے اندرونی علاقے کا رہنے والا ہے جہاں زیدی اور جعفری شاذ شکل معدوم ہیں۔ ہمارا یہ جواں تر رفیق اگر غلطی میں مبتلا ہو گیا تو تعجب کیا ہے؟ یونیورسٹی میں جلسے ہوں تو ہم ساتھ ساتھ تقریریں کریں، نظمیں سنائیں، یا مشاعروں میں شریک ہوں تو ہر جگہ سامعین کے سامنے موجود۔ ہڑتالوں میں تو ہم آگے آگے کیا، اکثر ہڑتال کرانے والوں میں ہوتے بلکہ ہڑتالی قائدین میں شمار کیے جاتے تھے۔ ہمارے دوست بھی تقریباً مشترک تھے اور مخالف بھی۔ اس طرح ہم نے لکھنو میں سیاسی، ادبی، اور ثقافتی ہم آہنگی اور تعاون کا آغاز کیا۔ اتفاق سے جیل بھی گئے تو ایک ہی زمانے میں، ایک ہی طرح کے جرم میں۔ اور زیادہ تر وقت ایک ہی جیل میں یعنی بنارس سنٹرل جیل میں گزارا اور واپس آئے تو پھر اُسی لکھنو یونیورسٹی میں تکمیل تعلیم کے لیے۔

مجھے تو یاد نہیں لیکن سردار ہی نے یاد دلایا کہ اُن کی رفیقۂ حیات سلطانہ سے اُن کی ملاقات بھی میری ہی وساطت سے ہوئی۔ وہ اُس وقت سلطانہ منہاج تھیں، ترقی پسند خیالات رکھتی تھیں اور طالب علموں کی سیاست سے دلچسپی بھی۔ مَیں لکھنو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر تھا۔ اُن سے میرے ملاقات طلبہ کی تحریکوں ہی کے سلسلے میں ہوئی۔ طلبہ کا کوئی جلسہ ہوتا یا ہڑتال ہوتی تو اس میں طالبات کا شمول بھی ضروری ہوتا۔ ایسے موقعوں پر سلطانہ سے تعاون کی اپیل کی جاتی۔ وہ خود اور اُن کی چھوٹی بہنیں آمنہ اور خدیجہ شریک ہوتیں۔ لیکن تحریک میں عملی طور پر سلطانہ ہی زیادہ حصہ

لیتیں۔ ویسے تزئین حبیب اللہ بھی تھیں جو بعد میں تزئین فریدی ہوگئیں، اور یونین کی صدر بھی منتخب ہو چکی تھیں۔ لیکن اُن کو وہ فکری اور ذہنی لگاؤ نہیں جو سلطانہ کو تھا۔ سردارؔ نے ایک اور جگہ کسی کو انٹرویو دیتے ہوئے حکایت کچھ یوں بیان کی ہے جیسے مَیں نے صرف سلطانہ کے حسن کا ذکر کیا ہو۔ یہ پوری حقیقت نہیں ہے۔ یہ ذکر بھی اُن کے ترقی پسندانہ خیالات کے ضمن میں آیا تھا۔ حسین تو وہ تھیں ہی اور ہیں لیکن اُن کی ترقی پسندی بھی اُن کی واضح شناخت تھی۔ غرض سردار اور سلطانہ کی پہلی ملاقات میرے وساطت سے ہوئی اور یہ واسطہ اتنا مبارک ثابت ہوا کہ ابدی رفاقت کا ذریعہ بنا۔ انہوں نے خود اس واقعے کو جس طرح پیش کیا ہے اسے پڑھ کر مجھے بے اختیار غالبؔ کا شعر یاد آ رہا ہے۔

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

بس فرق یہ ہے کہ سردارؔ پہلے بھی رازداں اور بے حد قریبی دوست تھے اور آخر عمر تک رہے، رقابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن پہلا مصرعہ غضب کا چسپاں ہوا ہے!

مَیں لکھنؤ میں پہلے سے تھا اور یہاں کی سیاسی اور ثقافتی زندگی میں اپنے لیے ایک چھوٹی سی جگہ بنا چکا تھا۔ سردار بعد میں ۳۸۔۱۹۳۷ء میں آئے۔ وہ اسرار الحق مجازؔ اور قاضی جلیل عباسی تینوں ایک ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی سے (جہاں کے یہ طالب علم تھے) اپنے ترقی پذیر خیالات کی بنا پر نکالے گئے تھے۔ ہم سب بہت جلد آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں لکھنؤ ترقی پسندی کا گہوارہ بن چکا تھا۔ ۱۹۳۶ء کے اجلاس میں جواہر لال نہرو نے اپنے خطبہ صدارت میں اشتراکیت کی بات چلائی۔ اُسی سال آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانفرنس کا انعقاد ہوا جو آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس بھی لکھنؤ میں ہوا۔

اب تو درو دیوار شکستہ سے ان ''صنادید'' کے آثار بھی ظاہر نہیں ہوتے! بہر حال ترقی پسندی کے اس مرکزی شہر میں علی گڑھ کے یہ تینوں نکالے ہوئے مجاہد یہیں آئے اور داخل یونیورسٹی ہوئے۔ مجازؔ نے تعلیمی سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رکھا لیکن سردار نے کچھ دن دہلی میں گزارنے کے بعد یہیں سے ایم اے کیا اور قاضی جلیل عباسی نے ایل ایل بی۔ سبطِ حسن نے نئی صحافت کی طرح ڈالی اور سردار سے مل کر پہلے ہفتہ وار ''پرچم'' اور پھر ماہانہ ''نیا ادب'' شائع کیا۔ ترقی پسندی کی روایت یہاں کا ہفتہ وار ''ہندوستان'' حیات اللہ انصاری کی ادارت میں پہلے ہی قائم کر چکا تھا اور ہم سب اس کے مضمون نگاروں میں شامل تھے بہ استثنائے قاضی جلیل عباسی کے۔ وہ خاص سیاست کے آدمی تھے۔ ادبی ذوق ضرور رکھتے تھے لیکن کبھی کچھ لکھتے نہیں تھے۔ البتہ اُن کے بڑے بھائی قاضی عدیل عباسی صحافت کے مردِ میداں تھے اور کچھ دنوں ''زمیندار'' لاہور کی ادارت کی خدمت انجام دے چکے تھے۔

لکھنؤ میں ان اصحاب اربعہ کو ہی نہیں بلکہ ہم سب کو بہت ہی خوشگوار ماحول ملا۔ بنّے بھائی (سجاد ظہیر) کا تو

یہ گھر ہی تھا۔وہ سروزیر حسن سابق چیف جج کے صاحب زادے تھے اور اپنی خوشنما اور وسیع کوٹھی وزیر منزل میں رہتے تھے۔اُن کے بڑے بھائی حسین ظہیر یونیورسٹی کے شعبہ کیمسٹری میں ریڈر تھے اور اپنے چھوٹے بھائی کے ہم خیال۔اساتذہ میں ڈی۔پی۔مکرجی (شعبہ اقتصادیات کے پروفیسر) ترقی پسندوں کے نظریاتی سطح پر میر کارواں جیسے تھے۔پھر ڈاکٹر علیم تھے جو شعبہ عربی میں لیکچرر تھے۔شعبہ اُردو میں پروفیسر احتشام حسین اور شعبہ انگریزی میں احمد علی ریڈر اور لیکچرر تھے۔باہر ڈاکٹر رشید جہاں افسانے لکھتیں اور پریکٹس کرتیں۔محمود الظفر نے بھی کچھ افسانے لکھے تھے۔''انگارے'' جیسی تصنیف ایسے ہی اصحاب میں سے چند کی مشترک کوششوں کا نتیجہ تھی۔مسیح الزماں رضوی بھی نمایاں افسانہ نگاروں میں تھے۔فرنگی محل میں حیات اللہ انصاری محتاط قسم کے ترقی پسند تھے لیکن اُن کے عزیز مولوی محمد رضا انصاری زیادہ پُرجوش تھے جو اُس وقت تک مفتی نہیں ہوئے تھے۔جلد مفتی بھی ہوئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ سنّی دینیات سے وابستہ بھی۔مگر موت نے یہ جوہر قابل ہم سے بہت جلد چھین لیا۔علوم اسلامیہ و عربیہ کا عظیم مرکز اپنے دامن میں مولوی فرحت اللہ انصاری کو بھی لیے ہوئے تھا۔وہ بے ریش و بروت حافظ تھے۔آزاد خیال۔شدت پسند قوم پرور،کچھ مارکسیت کی طرف جھکاؤ بھی تھا لیکن ترقی پسند قافلے سے علی گڑھی تعلقات اور دوستی کے باوصف کچھ الگ الگ سے تھے کیونکہ ایک تو ملازم سرکار تھے،پھر ذاتی رجحانات و میلانات کی بھی بات ہوتی ہے۔باہر کی نمایاں شخصیتوں میں نیاز فتح پوری،شوکت تھانوی،اور علی عباس حسینی کلاسیکی ادب کے رسیا ہونے کے باوجود ترقی پسندی کا تاثر قبول کرنے پر آمادہ تھے۔دوسری طرف مولوی اختر علی تلہری،کشن پرشاد کول،نواب جعفر علی خاں اثر اور غلام احمد فرقت ترقی پسندی کے ناقدین میں بھی اور حلقہ ارباب ذوق کی ادبی تجربہ کوشیوں کے خلاف محاذ آرا بھی میں بھی پیش پیش تھے۔ان مخالفتوں کے باوجود لکھنؤ کی مثالی رواداری کی وجہ سے ذاتی سطح پر کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔

اس بڑے مجمع میں علی سردار جعفری اور مجاز اجنبی نہیں تھے۔جو انہیں قریب سے نہیں جانتے تھے،انہیں بھی بہت جلد معلوم ہو گیا کہ شہر میں دو آبدار گوہر اور آ گئے ہیں۔نسبتاً سبط حسن کو لوگوں نے ذرا دیر میں پہچانا۔بنیادی سبب تو یہ تھا کہ اُن کا حلقہ کار بیشتر حیدرآباد رہا تھا اور روزنامے کی صحافت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ادبی حلقوں میں شناسائی شاعروں کی طرح وسیع نہیں تھی۔اُن کے جوہر آہستہ آہستہ کھلے اور پھر تو وہ کبھی کبھی سربراہانہ انداز میں میں سامنے آنے لگے۔لکھنؤ میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اہل جوہر کو بہت جلد اپنا لیتا ہے اور اُن کی تعریف و توصیف ہی نہیں بلکہ انہیں آگے بڑھانے میں پوری سرگرمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔چند ہی دنوں میں یہ سب ''پوربیے'' گویا لکھنؤ والے بن گئے۔مجاز کا تو لکھنؤ کے محلہ نیا حیدرآباد میں مکان بھی تھا اور اگرچہ ردولی بھی لکھنؤ کے پورب میں واقع ہے لیکن اس پر پوربیے کا اطلاق نہیں ہوتا۔سردار ریاست بلرام پور کے ساکن تھے۔لکھنؤ کے علاوہ اس کا فطری صدر مقام کون ہو سکتا تھا؟علی گڑھ تو بہر حال نہیں ہے۔علیگ حضرات سے بے انتہا معذرت کے ساتھ!رہے سید سبط حسن علامہ شبلی کے ہم

وطن۔ اُن کی مشرقیت مسلم لیکن حیدرآبادیت اور مشرقیت کے امتزاج اور پھر لکھنؤ میں آمد نے اُن کو لکھنوی بنا ہی لیا تھا۔ قسمت کے اس چکر کو کیا کہیے گا کہ آخری وطن کراچی قرار پایا اور دلی میں تمام اکابرِ ادب کی دلی میں جان جاں آفریں کے سپرد کرنے کی ٹھانی ایامِ قریب میں لکھنؤ میں اکابرِ ادب کا ایسا اجتماع پھر نہ دیکھا گیا۔ یہ لوگ صرف فنکار نہیں، رجحان ساز تھے۔ لکھنؤ تو اجڑ ہی گیا لیکن اس تاریخی مجمعے میں اپنے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا۔ حد یہ ہے کہ جواں سال سلام مچھلی شہری بھی چل بسا۔ داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع مسیح الحسن رضوی رہ گئے تھے وہ بھی خاموش۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔ جوان تر لوگوں میں عابد سہیل ہیں جن کی نصرت پبلشرز، اُجڑے ہوئے امین الدولہ پارک کے روبرو اور پرائن کی مسجد کی بغل میں شام کے وقت بھولے بھٹکے ترقی پسندوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ باقاعدہ ترقی پسند رام لعل باہر سے آ کر بس گئے تھے وہ بھی سندھ ہے اور باقر مہدی تو مستقل طور سے ممبئی والے ہو چکے ہیں۔

دنیا نے کتنی بڑی مسافت طے کر لی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ۱۹۸۶ء میں طلائی جوبلی منا ڈالی لیکن ترقی پسندی خود نئے پیچ و خم سے دوچار ہے۔ اس کی آفاقی حیثیت ہی اس کی سب سے بڑی پہچان تھی اور روس سے کبھی کبھی روشنی چھن جاتی تھی۔ وہاں مدتوں سے ایک خاموش مگر ایک کرب انگیز نظرثانی کا سلسلہ چل رہا تھا جو دیکھا نہیں جاتا تھا لیکن محسوس کیا جا سکتا تھا۔ چین اور روس دونوں جگہ واضح انحرافات رونما ہونے سے ترقی پسندوں میں بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ گلیسناٹ اور پروسترائیکا کی تحریکیں تبدیل ہی نہیں الٹ پلٹ کی حیثیت رکھتی تھیں اور مارکسیت سے وابستہ دانشوروں کے لیے جن کے نمائندہ سردار جعفری تھے، بڑی آزمائش کی گھڑی آ گئی تھی۔ ترقی پسندی کے مخالفین اب کھل کھل کر واویلا کرنے لگے تھے اور مخالفت نظریوں سے اُتر کر ذاتیات کی سطح پر آنے لگی تھی جوش اور فیض ہوں یا سبط حسن اور سردار کسی کو بھی بخشا نہیں جا رہا تھا۔ مجھ سے سردار سے ۱۹۴۲ء میں نظریاتی سطح پر اختلاف ہوا۔ یہ اختلاف عالمی جنگ کی نوعیت کے بارے میں تھا۔ مجھے بھیمڑی کانفرنس کے شدت پسند رویے سے اختلاف تھا۔ اس وقت تو نہیں لیکن بعد میں بنے بھائی نے بھی گفتگو میں اعترافاً کہا کہ یہ تشدد دانہ رُخ صحیح نہیں تھا۔ ایک اور رُخ تنقیدی طور پر رونما ہوا۔ میرا خیال تھا کہ ترقی پسندی کو شتی کے پہلو بہ پہلو ایک تعمیری رویہ معروضی اعتبار سے اپنانا چاہیے تاکہ مجموعی طور پر رجائی فضا بنی رہے لیکن یہ سب اختلافات فطری تھے۔ ادب کے جمالیاتی اور اجتماعی اقدار کے بارے میں ہمارا نقطۂ نگاہ تقریباً ایک تھا۔ ہم میں باہم کوئی ذاتی اختلاف نہیں تھا۔ اب روس میں جو انکشافات اور وہاں فکر و نظر کی آزادی پر پابندیوں کی جو داستان سامنے آئی، انہوں نے ان سبھی کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا جو ترقی پسندی کے رجحان ساز تھا۔ اس سخت گیر رویے کی ایک مثال وہ قصائد اور نظمیں تھیں جو استالین کی شان میں لکھوائی گئی تھیں۔ ان میں کیفی اعظمی اور رفعت سروش سردار جعفری کے ساتھ ساتھ ہر دل عزیز فطری اعتبار سے خوش نظر مخدوم محی الدین تک کو شامل ہونے پر مجبور کیا گیا۔ استالین کی مخالفت تو پہلے سے ہونے لگی تھی لیکن یہ کون سوچ سکتا تھا کہ لینن کا مجسمہ بھی لڑکھڑانے لگے گا۔ تاریخ کے اس کارواں کے ساتھ

مشرق ومغرب کی تین چار نسلیں چلی ہیں۔ سردار بھی ان نظریوں کے اثر میں آئے۔ اُن کا بیان ہے کہ ۱۹۵۸ء کے بعد انہوں نے کیمونسٹ پارٹی کے کارڈ کی تجدید نہیں کرائی تھی یعنی اُن کے یہاں بھی ایک خاموش نظرثانی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے انقلاب کے بعد جو کچھ روس میں ہوا یا اس کی قیادت میں ہندوستان میں یا دوسرے ملکوں میں ہوا، اُن سب کے خطاوار سردارؔ تو نہیں ہیں۔ وہ تیز ہوا تھی، طوفان کا جھونکا تھا جو اپنی رو میں بہت کچھ بہا کر لے گیا تھا لیکن مارکسیت کوئی جامد عقیدہ نہیں تھا۔ غلطی اُن لوگوں کی تھی جنھوں نے اسے جامد بنانا چاہا۔

ان اختلافات کو تفصیل سے اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اس سلسلے میں یونیورسٹی میں جیل میں، اخبارات ورسائل کے صفحات میں، مشاعروں اور سیمیناروں میں، اپنی کتابوں میں ہم نے متفرق طور پر بہت کچھ کہا اور لکھا ہے۔ دانشوری کے کاروبار میں اس طرح کے اختلافات نہ ہوں تو خیالات اور تخلیق کاری کی دنیا میں بے رنگی اور جمود کے سوا کچھ نہ رہ جائے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی زندگیوں میں آزادہ روی، کھلے دل سے اختلاف کرنا اور اختلاف کے ساتھ ساتھ محبت کرتے رہنا بھی ہم نے یوں ہی سیکھا ہے اور اس پر ندامت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ندامت روس میں ہو سکتی ہے، جہاں منجمد یکسانیت طاری تھی۔ یہاں جمہوری طریق فکر میں وہ لمحہ آنے ہی نہیں پایا جب راہیں مسدود نظر آتیں۔

سردارؔ شروع شروع میں حضرت گنج کے ایک کمرے میں سبط حسن کے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی کبھی اُن کے ساتھ کوئی اور بھی سو رہتا۔ زمین کے فرش میں یہی تو آسانی ہوتی ہے۔ کھانا کسی ریستوراں میں جا کر کھا لیتے یا کمرے میں ہی منگا لیتے۔ وہی دفتر تھا، وہیں شعر نازل ہوتے۔ نظریاتی مضامین لکھے جاتے، رسالے ترتیب پاتے، ترقی پسند ادب کی ترویج پر منصوبے بنتے۔ دو چار ہم خیال جمع ہو جاتے تو چھوٹی موٹی مجلس شعر بھی مرتب ہو جاتی۔ پھر یہ لوگ وہاں سے وسیع تر قندھاری لین والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ یونیورسٹی میں روزانہ ملاقات ہو جاتی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی کسی سلسلے سے ہم لوگ یونیورسٹی کے باہر بھی یکجا ہو جاتے تھے۔ یونیورسٹی میں یونین کا دفتر ہم سب کی مشترکہ نشست گاہ تھی۔ نہ جانے کتنے ہنگامے، کتنے نغمے، کتنی تقریریں، کتنے قہقہے اور نعرے وہاں کی فضا نے جذب کئے ہیں اور ہمارے دوستوں کی یادوں میں محفوظ کر دیے ہیں۔

ترقی پسندی کے جلو میں اسٹڈی سرکلوں کا بھی رواج ہوا جو اکثر یونیورسٹی کے ہوسٹلوں میں منعقد ہوتیں پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے اہتمام سے برابر چھوٹے موٹے اجتماعات رشید جہاں اور ڈاکٹر علیم کے مکان پر یا پروفیسر احتشام حسین کے یہاں ہوتے رہتے تھے۔ نظمیں افسانے سنائے جاتے، مقالے پڑھے جاتے اور پھر اُن پر کھل کر تنقیدیں ہوتیں اور ان میں کسی کو بخشا نہ جاتا۔ مجھے یاد نہیں لیکن عین ممکن ہے کہ میں نے سردارؔ کی یا سردارؔ نے میری کسی نظم پر بھی خیالات کا اظہار تنقیدی لہجے میں کیا ہو۔ ایک دوسرے کو حاجی کہنے کا رواج نہ تھا۔ لیکن اگر کوئی شعر یا پوری نظم پسند آ جاتی تو ہم خواہ مخواہ سکوت کا پیکر بنے بیٹھے بھی نہیں رہتے تھے۔

ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت ہم دونوں کی ۱۹۴۰ء میں گرفتاری بھی عجیب وغریب تھی۔ مَیں ایل ایل بی کے آخری سال کا طالب علم تھا۔ لاء سوسائٹی کا افتتاح کرنے سر ماریس گائر چیف جج سپریم کورٹ آنے والے تھے۔ وہ باعتبار عہدہ دلی یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے اور یونیورسٹی نے دو طالب علموں کو سامراج دشمن سرگرمیوں کی پاداش میں یونیورسٹی سے نکال دیا تھا۔ ہم لوگوں نے طے کیا کہ گائر کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ لاء سوسائٹی کا معاملہ تھا اس لیے بھی اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اہم رکن کی وجہ سے مَیں پیش پیش تھا۔ سردار یونین کے نمایاں لیڈر تھے۔ قاضی جلیل عباسی ہر ایسے موقع پر ہم لوگوں کے ہمراہ آجاتے تھے۔ سپریم کورٹ کا چیف جج اس زمانے میں وائسرائے اور کمانڈر ان چیف کے بعد برطانیہ کی سرکاری صفوں میں کافی اہم مانا جاتا تھا۔ اسی لیے اس کا نوٹس لیا گیا اور ہم تینوں پر اسی سلسلے میں نہیں بلکہ جنگ کے خلاف تقریریں کرنے کے جرم میں، جو ہم کیا ہی کرتے تھے مقدمہ چلایا گیا۔ سردار لکھنؤ ہی میں تھے اس لیے وہ پہلے گرفتار ہو گئے لیکن مَیں اس زمانے میں انڈرگراؤنڈ تھا اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس کی تیاریاں کر رہا تھا، اس لیے میں مہینے سوا مہینے کے بعد ناگپور کانفرنس میں شرکت کرتے وقت گرفتار ہوا اور پھر وہاں سے ایک ہفتے بعد لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل لایا گیا، جہاں سردار اور عباسی کے مقدمات کا فیصلہ پہلے ہو چکا تھا اور انہیں بنارس سینٹرل جیل بھیجا جا چکا تھا۔ مَیں کوئی ڈیڑھ مہینے کے بعد لکھنؤ جیل سے سزایاب ہونے کے بعد ان سے بنارس سینٹرل جیل میں جا ملا۔ کہہ نہیں سکتا کہ کتنی خوشی ہوئی۔ اُن دیرینہ ہمدردوں بالخصوص سردار جعفری سے مل کر۔ یہ قِران السعدین، دو سر پھروں کی، دو شاعروں اور ادیبوں کی، دو دوستوں کی یکجائی۔ دو دیوانے مل بیٹھے تو واقعتاً خوب گزری۔

بنارس سینٹرل جیل خاص سیاسی قیدیوں کا مرکز تھا۔ ایسے قیدی جنہیں برطانوی سرکار نے ''اے'' اور ''بی'' کے قابل سمجھا ہو۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ حسرت موہانی کی طرح 'چکی کی مشقت' کا ہمیں سامنا نہیں کرنا پڑا۔ رسی بٹنے کا کچھ کام ملتا وہ بھی ''سی'' کلاس قیدی کر دیا کرتے تھے کیونکہ وہ ہم تک رسیاں آنے ہی نہ دیتے۔ ہم اُن کی نگاہوں میں سیاسی لیڈر تھے۔ لیڈری کے معاملے میں آج کی سی گھٹیا لیڈری نہیں تھی۔ سیاسی کام بوالہوس کا نہیں تھا، اُن کا تھا جو کچھ قربانی کر سکیں اور زنداں و دار کے لیے تیار ہوں۔ اگرچہ ہمیں مشقت کا کام کرنا نہیں پڑتا تھا لیکن سب سے بڑی سزا یہ تھی کہ ہم اپنے عزیزوں، دوستوں اور سیاسی رفیقوں سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔ اخبار ملتے تو اس طرح کہ اُن میں سیاسی خبروں پر اچھی طرح نشانی انگوٹھا لگانے والی سیاہی جیلر کی نگرانی میں پھیر دی جاتی تھی۔ دم گھٹنے لگتا تھا۔ لیکن ہمارے بیرک میں یہ آسانی تھی کہ لوگ آپس میں مل جل کر رہ سکتے تھے۔ کئی خیالات کے لوگ یکجا تھے۔ سردار اور چمن سنگھ کی طرح کے کمیونسٹ، موہن لال سکسینہ (جو بعد میں مرکزی وزیر ہو گئے تھے) کی طرح کے گاندھیائی، سیٹھ دمودر سروپ، راجارام شاستری، موہن لال گوتم اور راج نرائن کی طرح کے سوشلسٹ، شبن لال سکسینہ کی طرح کے کسان لیڈر، بشمبر دیال ترپاٹھی جیسے فارورڈ بلاک کے لیڈر، غرض سیاسی چھیڑ چھاڑ اور تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا۔ وگلیش نرائن تیواری ہندی کے

زبردست حامی تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹا کتابچہ "ہندی بنام اُردو" لکھا تھا۔ اس پر دو چار روز گرما گرم بحثیں رہیں۔ دن کو شطرنج، شام کو والی بال میں کبھی کبھی ہم دونوں ساتھ ہو جاتے لیکن ان باتوں پر قران السعدین کا اطلاق کہاں ہوتا ہے؟ دو علم وادب کے شائق، اور دو شاعر یکجا تھے اور یہ یکجائی بے سود نہ تھی۔ اچھی اچھی نظمیں وجود میں آئیں، کچھ مضامین لکھے، بہت سی کتابیں باہر سے منگوا منگوا کر پڑھیں اور شعر وادب و جمالیات پر بہت سود مند تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ یہ ہے سعدین کا اجتماع۔ یہاں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ سردار انگریزی میں ایم اے کر رہے تھے۔ اُن کے پاس اکثر شعری مجموعے رہا کرتے تھے۔ خود مَیں آڈن اور اسپنڈر کے تازہ مجموعے اپنے ساتھ خرید لایا تھا۔ یہ اُس زمانے میں ہمارے زیر مطالعہ تھے۔ ایک دن تشبیہوں کی بات چل نکلی اور ہمارے ذہن میں بیک وقت یہ خیال آیا کہ سائنسی ٹیکنالوجیکل ذور سے تشبیہیں کیوں نہیں لیتے؟ فطرت سے سے تشبیہ لیتے تو صدیاں بیت چکیں۔ اس کے بعد ہم دونوں نے وہاں کئی نظموں پر تشبیہیں اور استعارے سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ماحول سے اخذ کرکے استعمال کیے اور برے نہیں لگے۔ مثلاً لیمپ، برقی رو، چمنی تحت شعور، ریل، پالش، بینڈ، روشن قمقمے، کارخانے، جمہور، اشتراکیت، سرمایہ گزاری، جن، رم، بیئر، فون، وِسکی، لال فیتہ، ریل کی زنجیر، تجربہ گاہ، انجن، ایٹم، ہائڈروجن، گھڑی، فلم وغیرہ اور ان کے متعلقات۔ اکبر نے ان کو مزاحیہ شاعری میں صرف کیا اور ہم نے سنجیدگی سے استعمال کیا تاکہ شجر ممنوعہ نہ رہے۔ اس کے ساتھ روایتی علائم و تشبیہات سے بھی کام لیتے رہے۔ جیل میں کچھ مشترک موضوعات پر بھی نظمیں لکھی گئیں۔ یہ نظمیں ایک دوسرے کو سناتے۔ اگرچہ فرصت بہت تھی لیکن ہم لوگوں کے پاس کہنے کو بھی بہت کچھ تھا۔ کہنے سے ہر غبار خاطر دھلتا تھا، دل کی بات دوسروں تک پہنچتی رہی۔ اتنی نظمیں لکھ ڈالیں کہ چھوٹا سا مجموعہ مرتب ہو سکے۔

جیل سے چھوٹنے کے بعد پھر وہی لیل و نہار، ی جوش و خروش بلکہ زیادہ ہی۔ اب ہم طلبہ کی توجہ کے زیادہ مستحق ہو گئے تھے۔ اُن کا برتاؤ کچھ ایسا تھا جیسے انگریزوں کے بارے میں ہم سے کہہ رہے ہوں کہ 'چلے چلو انہیں لندن تلک بھگائے ہوئے' جیل ہی میں میں نے ایک نظم یہ خبر سن کر لکھی کہ سردار کو نظر بندی کا حکم دے دیا گیا ہے (نظر بندی کا حکم باضابطہ نہیں تھا) اس کے چند اشعار آپ بھی سنیے۔ اس سے بہتر سنانے کا موقع اور کون سا ہوگا۔

کل ملا حکم نظر بندی علی سردار کو محملِ زنداں بتایا ہے دیارِ یار کو
ہم شہنشاہی کو یہ سمجھائیں کس عنوان سے جو سمندر میں رہے ڈرتا نہیں طوفان سے
یہ وہ سینہ ہے جو تیروں کا نشانہ یوں بھی تھا ہم سے آزادوں کو تو گھر قید خانہ یوں بھی تھا
ہاں مگر پہلے جب اپنے گھر سے گھبراتے تھے ہم لکھنؤ کے جشنِ طوفاں میں چلے آتے تھے ہم
واں جنوں آسا عمل کی وادیوں میں کھیل کر تازہ دم ہوتے تھے ہم تازہ مصائب جھیل کر
ہم نے جانا ہی نہیں کیا شے ہے دریا کا تھماؤ ہم تھے طوفانی بہاؤ تھی اور تیز دھارے کا بہاؤ

محفلِ شعروسخن سے بزمِ حسن وناز تک — شورشِ راہِ جنوں کے غمزہ و غماز تک
انتخابی کش مکش سے انقلابی راہ تک — وصفِ محنت کش سے لے کر نقدِ شاہنشاہ تک
ہم قدم ہوکر چلے ہم راز داں ہوکر چلے — لوگ چھپتے تھے جہاں واں ہم عیاں ہوکر چلے
زیست کی یکسانیت سے بچ نکلنے کے لیے — لو بھی لیتے تھے مزہ منہ کا بدلنے کے لیے

خیر نظر بندی عارضی تھی اور وہ جلد لکھنؤ آ گئے اور آخر کار ممبئی چلے گئے۔ سجاد ظہیر کے ساتھ پارٹی کا کام کرنے کے لیے۔ مَیں اُس زمانے (۱۹۴۷ء) میں حکومت یو۔ پی کی طرف سے آزادی کی تحریک پر ایک مختصر ڈاکومینٹری بنانے کے لیے ممبئی آ گیا تھا۔ وہاں سردار سے ملاقات ہوئی اور رواداری میں سلطانہ سے بھی۔ یہ وہی زمانہ ہے کہ سلطانہ اور سردار نے دائمی رفاقت کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن شادی بعد میں ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ اس کے بعد میں کشمیر چلا گیا۔ وہاں سردار سے ملاقاتیں ہوتی رہیں یا پھر دہلی میں۔ ہماری دوستی میں ذرا فرق نہیں آیا۔ بلکہ استوار تر ہی ہو گئی تھی مسافت کی دوری سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔

مجھ سے لوگوں نے کئی بار کہا کہ سردار نے ترقی پسند ادب میں، میرا ذکر سرواروی سے کیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ہمارے تعلقات میں دراڑ ڈال دی جائے۔ مَیں نے ہمیشہ یہ جواب دیا کہ اختلافات کے باوجود انہوں نے میرا ذکر تو کیا اور برائی سے نہیں کیا۔ رفیقانِ سفر کی حیثیت سے کیا ہے۔ اب اگر کہیں اختلاف ہے تو وہ اس کو خاموش رہ کر ظاہر کریں یا مناظرہ کر کے، کیا فرق پڑنے والا ہے۔ ہم دونوں بڑے اچھے اور صاحب ذوق دوست ہیں، ترقی پسند ہیں۔ اتنا کافی ہے۔ مَیں نے اُن دوستوں کو بتایا اور غالباً اپنے پہلے شعری مجموعے ''رگِ سنگ'' میں لکھا بھی ہے کہ انہیں کی تحریک پر مَیں نے یہ مجموعہ حیدر آباد میں اشاعت گھر کو اشاعت کے لیے دیا تھا۔ یہ سُن کر ہمارے کرم فرما محوِ حیرت رہ گئے۔

سردار واقعتاً بہت اچھے شاعر تھے۔ اُن کی شاعری کے دو واضح ادوار ہیں۔ ایک تو جب وہ راست اظہار کی طرف زیادہ مائل تھے۔ زبان پر اُس وقت بھی انہیں بڑی قدرت تھی۔ اُن کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا اور جدید تھا۔ اس کے لیے انہوں نے جدید لہجہ بھی اپنایا لیکن اسلوب اظہار کے معاملے میں انہوں نے روایت سے قریب رہنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ یہ دراصل ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ ہے۔ مقصدی، افادی اور نظریاتی شاعری۔ اگر پوری فنکارانہ قوت اور جذباتی شدت وحرارت سے سامع اور قاری تک منتقل نہیں ہو سکتی تو شاعر بھی اپنی تخلیق سے مطمئن نہیں ہوگا۔ ناقد اس پہلو سے نگاہ موڑے نہیں رہ سکتا۔ اس لحاظ سے مَیں سردار کے دورِ اول کی شاعری کو بھی توانائی خلوص کی وجہ سے قابلِ توجہ سمجھتا ہوں۔ پھر موضوعات کے تنوع میں جو عوامی اور بین طبقاتی عنصر ہے جو عصری شعری ماحول کے لیے نئی چیز تھا اور جو ترقی پسندی کا طرۂ امتیاز بنا۔ یہاں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ سند رہے کہ انہوں نے بھی اور مَیں نے بھی آزاد نظمیں لکھیں اور اس طرح سے اس روایت کی تجدید کی جو کئی دہائی پہلے شرر وغیرہ نے اسی لکھنؤ میں قائم کی تھی لیکن پنپ نہ سکی تھی اور یہ کوشش

بھی سردار کی شاعری کے دَورِاول ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

اس تاثراتی مقالے میں تنقید نہ تو مقصود ہے نہ ممکن ہے لیکن اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ اُن کی شاعری میں پانچویں دہائی کے خاتمے تک ایک ارادی تبدیلی آچکی تھی اور اُن کے مجموعوں "پیراہن شرر" اور "ایک خواب اور" میں اس کی آہٹ صاف سنائی دیتی ہے۔ اب ان کی جمالیاتی حس پر ہماری ادبی اور ثقافتی روایت کے تسلسل کے ساتھ جدید حسیت اور عصری میلانات کے انتخابی نشان ملنے لگتے ہیں۔ اور سب مل کے ایک رسیلی تازگی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ لفظیات اور اسلوبیات کے معاملے میں انہوں نے انحرافی یا متشددانہ تجربے نہیں کیے ہیں اور کرتے بھی تو یہ تجربہ برائے تجربہ ہوتا، کیونکہ شاعری صرف پیراہن نہیں بلکہ پیراہن شرر ولباس شبنم ہے، حقیقت بھی اور خواب بھی۔ بقول آنند نرائن مُلا "پیراہن شرر" کرہ ماور بن چکا ہے۔

لبوں کی شعلہ فشانی ہے شبنم افشانی　　اسی میں صبحِ تمنا نہا کے نکھرے گی

سردار کی فکری زندگی میں ایک المناک نازک موڑ آنا باقی رہ گیا تھا، وہ روس کے حالیہ واقعات کی شکل میں نمودار ہوا۔ روس میں کیمونسٹ تجربے کی شکست معمولی واقعہ نہیں ہے۔ مارکس اور لینن کے مجسموں کا سرنگوں ہونا اور سرخ پرچم کا وہاں کی فضا سے غائب ہو جانا صرف سیاسی واقعات نہیں ہیں بلکہ سردار اور اُن کی طرح کے جذباتی طور پر وابستہ مفکرین اور تخلیقی ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایک کرب ناک تجربہ بھی ہے۔ چنانچہ اس سیلابی رو سے متاثر ہو کر سب سے پہلے انہوں نے "الوداع سرخ پرچم" کے عنوان سے ایک نظم اور شائع کرائی۔ اس میں رثائی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ جو اُن کے جذباتی تلاطم کی نشان دہی کرتی ہے۔ وہ اپنی مارکسیت کے باوجود اتنے جذباتی ہو سکتے ہیں شاید یہ پہلے سوچا نہیں جا سکتا تھا لیکن اُن کے انقلابی تفکر میں بھی جو رومانی طرز اظہار جس اسلوب کی طرح نمایاں ہوتا رہتا ہے یہ اُس کا ایک مظاہرہ تھا۔

وہ ایک پُرخلوص دوست تھے۔ نیک، وضعدار اور دوٹوک۔ حالات کا جائزہ تو ٹھہراؤ کے ساتھ شاید وہ بعد میں لیتے کیونکہ یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ جس پر ترقی پسند دانشور پوری توجہ اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ جذبات سے بلند ہو کر بے رحمانہ معروضیت کے ساتھ غور نہ کریں اور وہ بھی اگر موت نے انہیں مہلت دی ہوتی تو یقیناً کرتے۔ روس میں ماضی کی کئی غلط کاریوں کا ردِّعمل تو ہونا ہی تھا، جیسا ہوا اُس کا جائزہ وقت لے گا۔

☆☆☆

(دوماہی "اکادمی" لکھنو ستمبر۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

رباب جعفری

بھائی کے شب و روز

سردار بھائی کی عمر اس وقت ماشاء اللہ پچھتر سال کی ہے۔ لیکن دیکھنے میں اُن کی اتنی عمر معلوم نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خوبی ہے کہ یہ اس طرح کام کرتے ہیں جیسے کہ جوانی میں کرتے تھے۔ صرف کام کی نوعیت میں فرق ہے۔ یہ چونکہ شاعر، نثر نگار اور نقاد ہیں اس وجہ سے بہترین ادب تخلیق کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ مطالعہ بہت گہرا ہے۔ اُردو ادب کے علاوہ مغربی ادب پر بھی بڑی عالمانہ نظر ہے۔

سردار بھائی انسانیت سے پیار کرتے ہیں دل سوزِ محبت سے لبریز ہے۔ تمام انسانوں کے دل کا درد اس دل میں محسوس ہوتا ہے۔ یہ آنکھیں ہر ایک کے غم میں اشکبار ہیں اور سب کی خوشیوں میں مسکراتی ہیں۔ غریبوں، دکھیوں اور غمزدوں کے لیے رحم کے جذبات سے چھلک جاتی ہیں۔ ہنستے کھلکھلاتے ہوئے بچوں میں اُن کے لیے بڑی کشش ہے۔ ان ننھے ننھے پھولوں کی بڑی ناز برداری کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے انسان دوست کا حلقہء ملاقات کتنا بڑا ہوگا۔ اُن سے ملنے والوں اور دوستوں میں ترقی پسند شاعر اور ادیبوں کے علاوہ سماج کے دوسرے افراد بھی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر، انجینئر۔ ایڈیٹر، طالب علم، صحافی اور دوسری زبانوں کے شاعر و ادیب۔

یہ محبت، خلوص اور اخلاق کا پُر شکوہ حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔ اس نے مذہب و قومیت کے فرق مٹا دیا ہے ملکوں کی حدوں، فرسودہ سماج کی دیواروں کو توڑ دیا ہے اور سمندر کی وسعتوں کو پار کر کے یہ ملک در ملک خوبصورت خیال کی طرح پھیل گیا اور عطر بیز ہواؤں کی طرح دوستوں کے دل و دماغ میں بس گیا ہے۔

مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آ گیا جس کو پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان کے دوستوں کے دل میں ان کی کتنی عزت اور قدر ہے۔ آج سے تقریباً پچیس سال قبل سردار بھائی کو دل کی تکلیف ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر موفق الدین یہاں کے مشہور ماہر قلب کے زیرِ علاج تھے۔ کیفی صاحب اور ان کی بیگم جن کو ہم پیار سے موتی کہتے ہیں، عیادت کے لیے آئے۔ سردار بھائی سے ملنے کے بعد موتی نے کہا۔ "کیفی آج کل سرجری نے بہت ترقی کر لی ہے لہذا سردار بھائی کا دل بدلوا دینا چاہیے تاکہ یہ ہمیشہ کے لیے صحت مند ہو جائیں۔" کیفی بھائی نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "مو

بتاؤ اتنا نرم اور خوبصورت دل کہاں ملے گا؟ ہم اس بیمار دل کو ہی اچھا کر لیں گے۔"

سردار بھائی صبح سات بجے بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت صرف دو پیالیاں چائے پیتے ہیں۔ چائے کے دوران روزانہ گھر میں آنے والے اخبارات پڑھتے ہیں۔ اسی وقت میں اپنی پسند یا ضرورت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ناشتے سے پیشتر ہی اپنا لکھنے کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ناشتہ دن کے دس بجے کرتے ہیں۔ کبھی اسی دوران نظموں کا نزول بھی ہوتا ہے۔ کبھی خاموشی سے نظم لکھتے ہیں اور کبھی اشعار آہستہ آہستہ پڑھا کرتے ہیں۔ تخلیقی کام رات کو سوتے سے اُٹھ کر بھی کرتے ہیں لیکن روزانہ نہیں۔

بہت سے نئے لکھنے والے اپنی تخلیقات ان کے پاس دیباچہ لکھنے کے واسطے بھیجتے ہیں۔ کچھ ادیبوں کی کتابیں تبصرے کے لیے آتی ہیں۔ مَیں ٹھیک طرح سے نہیں بتا سکتی کہ ان کتابوں پر کتنا کام کرتے ہیں۔

ان سب کاموں کے علاوہ روزانہ کی معروفیت میں ایک کام یہ بھی شامل ہے کہ ہم لوگوں کو کسی نظم کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم کتاب تلاش کر رہے ہوتے ہیں تو یہ ہم سے پوچھ کر فوراً بتا دیتے ہیں کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یہ نظم موجود ہے۔ اس وجہ سے ہم سب کی عادتیں اس قدر خراب ہو گئی ہیں کہ کسی نظم یا کسی مضمون کو تلاش کرنے کی زحمت گوارا ہی نہیں کرتے۔ پروردگار اس حافظے کو تا دیر سلامت رکھے۔ آمین۔

ٹائپ کرنے کا کافی کام سردار بھائی خود کرتے ہیں۔ باقی کام ان کے اسسٹنٹ شمیم احمد شمیم کرتے ہیں۔ اس میں ذاتی خطوط کے جوابات، اپنے آرٹیکل، اپنے کام کے ضروری کاغذات وغیرہ اپنے سامنے لکھ کر نہیں رکھتے ہیں۔ دماغ سوچتا ہے اور انگلیاں بڑی تیزی سے ٹائپ کے حروف پر چلتی ہیں۔ اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں تو وہ بھی کاغذ پر نہیں لکھتے۔ دماغ خود ترجمہ کرتا ہے۔ انگلیاں ٹائپ کی مشین پر رقص کر کے کاغذ کو سونپ دیتی ہیں۔ اس طرح جب کسی جلسے میں تقریر کرنے جاتے ہیں تو جس مضمون پر بولنا ہوتا ہے، وہ سب ان کے حافظے مین محفوظ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایک گھنٹہ زبانی بولتے ہیں جس میں واقعات کی غلطی نہیں ہوتی۔ دو تین سال ہوئے انڈو عرب سوسائٹی نے ایک پروگرام مرتب کیا تھا جس میں صرف سردار بھائی کو حافظؔ، رومیؔ اور اقبالؔ کی شاعری پر تقریر کرنی تھی۔ یہ تقریر سننے کے لیے پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ سردار بھائی بے تکان دو گھنٹے بولتے رہے اور لوگ خاموشی سے سنتے رہے۔ کسی کو وقت کا احساس نہ ہوا۔ یہ مجمع دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، پروفیسروں اور عربی فارسی کے عالموں کا تھا۔ تقریر ختم ہونے پر ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ لوگوں کی زبان پر یہی کلمہ تھا کہ بڑی عالمانہ تقریر ہے۔ پھر اس عمر میں یہ حافظہ کس کو نصیب ہوتا ہے۔ درازیٔ عمر کی دعاؤں سے بھی ہال گونج رہا تھا۔ یہ تقریر کسی صاحب نے ریکارڈ کی تھی لیکن عام طور سے نہیں۔ کیونکہ ہمارے ملک کے لوگوں میں ابھی یہ شعور بیدار نہیں ہوا ہے کہ اپنے شاعروں، ادیبوں، سائنسدانوں اور دوسرے عالموں کی ایسی نایاب تقریریں ٹیپ کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیں۔ خاص طور سے وہ ادارے جو ایسی تقریب منعقد کرتے ہیں، اُن پر یہ ذمہ

داری زیادہ عائد ہوتی ہے۔ جہاں تک ذہانت کا سوال ہے۔ یہ عادت قابلِ تعریف اور ہم سب کے لیے باعثِ فخر ہے۔ لیکن اس وجہ سے سردار بھائی کی بہترین تقریریں ضائع ہوگئیں۔

شہر میں مختلف قسم کی میٹنگیں ادبی جلسے وغیرہ ہوتے ہیں اُن میں شرکت کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ ذاتی ضروریات کے لیے بھی گھر سے جانا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح کسی دن کئی کئی مرتبہ گھر سے باہر جاتے ہیں۔ پھر جو فرصت کا وقت ملتا ہے، اس میں پڑھا کرتے ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔ اس پر بھی سردار بھائی کو شکایت ہوتی ہے کہ ''مجھے پڑھنے لکھنے کے لیے وقت نہیں ملتا۔ مجھے بہت کچھ لکھنا ہے۔''

سردار بھائی سے ملنے کے لیے روزانہ بہت سے لوگ آتے ہیں۔ اُن میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو اُن سے شاعر کی حیثیت سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ کچھ افراد اپنی ذاتی ضروریات میں مدد لینے آتے ہیں۔ ہندی، اُردو انگریزی میگزین کے نامہ نگار انٹرویو لینے آتے ہیں۔ ملک میں کوئی غیر معمولی واقعہ ہو جاتا ہے یا کوئی فنکار، ملک کا بڑا لیڈر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو ٹی وی اور آل انڈیا ریڈیو پر اُن کے بارے میں بولنے کے لیے بلایا جاتا ہے۔ یا ان دونوں اداروں کے لوگ گھر پہ ریکارڈنگ کے واسطے آجاتے ہیں کیونکہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے وہاں جانے کی فرصت نہیں نکال سکتے۔

عام طور سے سردار بھائی کسی شخص سے ملنے کے لیے منع نہیں کرتے۔ ہاں ہر ایک پہ یہ تاکید ہے کہ وہ فون کر کے اُن سے ملنے کے لیے آئے تاکہ بہ اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو کرسکیں۔ بات چیت میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ اپنے مہمانوں کو بغیر چائے یا کھانے کا وقت ہے تو بغیر کھانا کھائے ہوئے واپس نہیں جانے دیتے بشرطیکہ آنے والے کے پاس بیٹھنے کا وقت ہو۔ بے جا تکلف پسند نہیں کرتے۔

سردار بھائی کبھی کسی ضروری کام میں مصروف ہوتے ہیں اور اس وقت میں ان کا کوئی بے تکلف دوست آجاتا ہے تو اپنا کام چھوڑ کر اس سے باتیں کرتے ہیں۔ پھر اُس سے معذرت کر کے اپنے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت کی خاطر داری کا کام ہم لوگ اور بھابھی انجام دیتے ہیں۔ ان کے دوست اس بات کا بُرا نہیں مانتے۔ اپنے کام سے فارغ ہوکر دیر تک اس کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ اس طریقے سے کام کرتے ہوئے دیکھ کر بعض لوگ حیرت میں ڈوب جاتے اور تعجب سے پوچھتے ہیں کہ اتنی جلدی تحقیقی کام کرنے کے لیے ان کا دماغ کیسے تیار ہو جاتا ہے؟ سردار بھائی کے ایک دوست نے کہا کہ تمہارے بھائی شاعری کے معمار ہیں۔ جس طرح ایک مزدور دیوار بنا کر کھڑی کر دیتا ہے بالکل اسی طرح سے جعفری صاحب نظم کہہ کر رکھ دیتے ہیں گویا تخلیقی کام کوئی مشکل کام ہی نہیں۔ ہمارے پاس اس دماغ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

سردار بھائی کو اپنے گھر میں دوستوں کی دعوتیں کرنا بہت پسند ہیں۔ بمبئی میں رہنے والے دوستوں کے علاوہ

بیرونی ممالک سے بھی جو دوست آتے ہیں ان کے اعزاز میں سب کو کھانے پہ بلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان محفلوں میں شاعروں اور ادیبوں کا مجمع ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے ماضی کی تصویریں میری نگاہوں میں پھر گئیں۔ ان محفلوں میں عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر۔ مہندر ناتھ۔ کیفی اعظمی، ساحر، مجروح سلطانپوری، مخدوم حیدرآبادی، وجد صاحب کی وجہ سے محفل کی رونق دوبالا ہو جاتی تھی۔ ان کے خوبصورت نغموں اور دلکش ترنم سے سننے والوں کی روح سرشار ہو جاتی تھی۔ ان میں علم و ادب کے چرچے ہوتے تھے۔ کبھی روسی شاعروں کا کلام سنتے تھے۔ کبھی کناڈا وغیرہ کے شاعروں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

جوش صاحب اور فیض صاحب کی دعوت کی تقریب میں بہت سے ادب نواز اور شاعری کے شیدائی، قدر شناس لوگ بھی آ جاتے تھے۔ گھر میں بیٹھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی لیکن پھر بھی آنے والے خوش رہتے تھے۔ صرف چند محفلیں ایسی ہیں جو بمبئی ٹی وی نے محفوظ کر لی ہیں ورنہ باقی دعوتوں کی یادیں ہمارے ذہنوں میں ستاروں کی طرح چمک رہی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ایسی خوبصورت تصویریں جس میں ملک کے دانشور، ادیب، شاعر یکجا ہوتے تھے ہم اپنے بعد والوں کے لیے تحفے کے طور پر نہیں چھوڑ سکے۔

سردار بھائی کے ایک قریبی دوست کا خیال ہے کہ جعفری صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر ہم سب جو گفتگو سنتے ہیں، اُس میں اساتذہ سے لے کر موجودہ دور کے نئے شعراء کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

سردار بھائی کے دوستوں یا گھر کے لوگوں میں کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو پھر سب کام ایک طرف، عیادت سے لے کر مریض کو اسپتال میں داخلے تک کی ذمہ داری ان کی ہے۔ اپنے پوتی پوتے کو بیحد پیار کرتے ہیں محمد اقبال آٹھ سال کے ہیں، مہ ناز چار سال کی ہیں۔ اُن کی ہر فرمائش بڑے پیار سے پوری کرتے ہیں۔ بچے اپنے دادا سے بیجا ناز برداری بھی کراتے ہیں۔ کبھی بچوں کی خواہش ہے کہ ٹیکسی سے ورلی سی فیس چلو، کبھی بچے اپنے دادا کے ساتھ ہینگنگ گارڈن (مالا بار ہل) یا ورلی اڈن روڈ کے دوسرے باغوں میں کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی پوتی کی انگلی پکڑے کھلونوں کی دکان کی طرف جا رہے ہیں۔ اقبال مہ ناز جس کھلونے کو پسند کرتے ہیں، قیمت کا خیال نہیں کرتے ہیں۔ کبھی پیسے کی دکان پر کپڑے قلم پنسل دلاتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال مہ ناز جب چھوٹے چھوٹے سے تھے تو یہ اپنے گھر کے آگے کی فٹ پاتھ پر بچوں کی گاڑی میں بٹھا کر ٹہلایا کرتے تھے۔ دادا بچوں کے جج کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ منٹ منٹ پر اُن کی شکایتیں سنتے اور فیصلہ کرتے ہیں۔ دن میں تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ ضرور گزارتے ہیں۔ دونوں بیحد شریر اور ذہین بچے ہیں۔ ہر وقت گھر میں شور برپا کیے رہتے ہیں۔ سردار بھائی اس ہنگامے سے بے نیاز اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان کو اپنے پیارے پوتی پوتا کی آواز دلکش گیت یا نغمہ بن جاتا ہو۔ ہر بات انسان کے سوچنے پر منحصر ہے۔

سردار بھائی کو اُردو میں تخلیقی ادب کے لیے ۱۹۸۶ء میں بھوپال اُردو اکادمی نے اقبال سمان پیش کیا تھا۔ یہ اعزاز ان ادیبوں کو دیا جاتا ہے جو اپنا تخلیقی کام جاری رکھتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اسی ۱۹۸۶ء میں انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی تھی۔ یوں تو اُن کو اور بھی کئی ایوارڈ ملے ہیں لیکن شب و روز میں سب کے بارے میں لکھنے کی گنجائش نہیں۔

سردار بھائی کی شاعری کی کتابوں میں "خون کی لکیر" "جمہور" "امن کا ستارہ" "ایشیا جاگ اُٹھا" "پتھر کی دیوار" "ایک خواب اور" "پیراہنِ شرر" اور "لہو پکارتا ہے" نثر کی کتابوں میں "ترقی پسند ادب" "لکھنؤ کی پانچ راتیں"، "پیغمبرانِ سخن" اور اقبال شناسی چھپ چکی ہیں۔ غالبؔ۔ میر تقی میرؔ، کبیرؔ، میرا بائی، کی شاعری کو اُردو اور دیوناگری میں چھاپا ہے۔ سردار بھائی نے لائٹ اینڈ ساؤنڈ کے لیے لال قلعہ دہلی، شالیمار باغ سرینگر، مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کی تمثیلیں لکھی ہیں۔ عوام نے انہیں بے حد پسند کیا ہے۔ کئی ڈاکومنٹری فلمیں بھی بنائی ہیں۔ یہ سرمایۂ سخن چند سالوں کی محنت نہیں بلکہ گزشتہ پچاس سالوں کی انتھک محنت کا انمول ثمر ہے۔ اس وقت ایک طویل نظم "میرا گہوارہ" لکھ رہے ہیں۔ "کربلا اے کربلا" بھی ایک مشہور نظم ہے۔ آج کل کہکشاں نام کی ٹی وی سیریل بنا رہے ہیں جو حسرت موہانی، جوشؔ، فراقؔ، مخدومؔ، فیض احمد فیضؔ اور مجازؔ لکھنوی کی ادبی اور ذاتی زندگی پر منحصر ہوگی۔

سردار بھائی سیتا محل میں ۱۹۶۲ء سے رہتے ہیں۔ اس کے پیشتر کھیت واڑی عرب بلڈنگ میں رہتے تھے۔ یہ فلیٹ کمیونسٹ پارٹی کا تھا اور بہت بڑا۔ سردار بھائی کے پاس اس فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک میں ہم دونوں بہنیں رہتی تھیں۔ دوسرے میں سردار بھائی اپنے دو چھوٹے چھوٹے بیٹوں ناظم اور حکمت کے ساتھ رہتے تھے۔ باقی کمروں میں دوسرے پارٹی ممبر اپنے خاندانوں کے ساتھ مقیم تھے۔ اس جگہ بھی سکون نایاب تھا، پارٹی میٹنگیں، ادبی میٹنگیں، دوسرے رہنے والوں کے عزیزوں کی آمد و رفت، آیاؤں کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں، کبھی کبھی پانی پر تیز آوازوں میں بات چیت۔ ویسے تمام لوگ آپس میں میل ملاپ کے ساتھ رہتے تھے۔ کھیت واڑی میں بھی بچے سردار بھائی کے کمرے میں کھیل کر خوش ہوتے تھے۔ شبانہ، بابا یہ دونوں اور پنکج بھی بہت شریر تھے۔ شرارتوں کی وجہ سے ہر کمرے سے بھگائے جاتے تو اُن کی پناہ اور تفریح گاہ یہی کمرہ تھا۔ سردار بھائی خاموشی سے اپنی چھوٹی سی میز پر بیٹھے کام کیا کرتے تھے۔ اس سے خوش رہتے تھے کہ بچے خوش ہیں۔ دن میں جگہ جگہ سے ان کے پاس فون آتے تھے۔ امریکہ، کناڈا۔ اوسلو، مسقط، کویت وغیرہ وغیرہ سے بھی فون آتے تھے۔ باہر کے ملکوں کے فون ہمیشہ رات میں آتے ہیں۔ ان کا چھوٹا بیٹا شکاگو میں ہے۔ وہ بھی والدین کو رات میں یاد کرتے ہیں۔ تمام فون کے جواب خود دیتے ہیں۔

کھانا دن میں دو ڈھائی بجے کھاتے ہیں، جیسا بھی کھانا میز پر ہوتا ہے اس کو بہ خوشی کھا لیتے ہیں۔ کھانے کے بعد دوپہر میں مشکل سے گھنٹہ آدھے گھنٹے آرام کرتے ہیں۔ گھر کے لوگوں کو ہدایت ہے کہ اگر کوئی صاحب مجھ سے ملنے

کے لیے آئیں یا کوئی فون آئے تو مجھے فوراً جگا دیا جائے۔ اگر دوپہر میں کسی ضروری کام سے گھر سے باہر جانا ہوتا ہے تو دوپہر میں کھانا نہیں کھاتے صرف ایک توس، ایک سیب کافی کے ساتھ لیتے ہیں۔ اس کے پندرہ بیس منٹ بعد اپنے کام کے لیے چلے جاتے ہیں۔

باہر سے واپسی پر پھر پڑھنے لکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ صبح سے شام تک انہی کاموں میں غرق رہتے ہیں۔ اس مصروفیت کے باوجود کبھی تھکن کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ خوش رہتے ہیں۔ گھر میں ہم سب سے بہت اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ غصہ نہیں کرتے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بڑوں سے لے کر بچوں تک کے دوست ہیں۔ سب کے رازدار ہیں۔ گھر میں رہتے ہیں تو گھر والوں کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں رہتا۔ سب کے خیرخواہ ہیں۔

اکثر رات میں آٹھ نو بجے فون کر کے اپنے دوستوں کی خیریت پوچھتے رہتے ہیں۔ اپنے دوستوں، مداحوں کے گھر رات کے کھانے پر جاتے ہیں۔ مَیں نے آگے لکھا ہے کہ یہ دوستوں کی دعوت کرتے رہتے ہیں ان محفلوں میں ان کی شخصیت بڑی باغ و بہار رہتی ہے۔ دوست شاعروں کی نظمیں سنتے ہیں اور اپنا کلام سناتے ہیں۔ دس گیارہ بجے رات تک کھانے سے فارغ ہو کر اور دوستوں سے معذرت کر کے اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے جاتے ہیں۔ پھر دن بھر کا تھکا ہوا دل و دماغ مزید تھکن برداشت نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

(علی سردار جعفری۔ اپنی بہنوں کی نظر میں ص ۸۰ تا ۸۷ مطبوعہ ۱۹۹۰ء)

آنجہانی اندرا گاندھی (منسٹر آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ) سے سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ لیتے ہوئے سردار جعفری (۱۹۶۵ء)

رفیعہ شبنم عابدی

علی سردار جعفری

ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم

بت پرستی میرا شعار نہیں اور بت شکنی میرا شیوہ نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مَیں نے اکثر موقعوں پر اعتراف کیا تھا کہ مجھے زندگی میں جہاں اس بات کا افسوس رہے گا کہ مَیں غالب کے دَور میں پیدا نہیں ہوئی وہیں اس بات پر فخر رہے گا کہ مَیں علی سردار جعفری کے دَور میں پیدا ہوئی ہوں۔

واقعی یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مَیں نے جعفری صاحب کو قریب سے دیکھا تھا۔ اُن کے ساتھ نجی اور ادبی محفلوں میں اُٹھنے، بیٹھنے، بولنے اور سننے کے بیشتر مواقع مجھے نصیب ہوئے تھے۔ ہر چند کہ وہ خوشگوار، علم پرور اور ذوق آفریں لمحے وقت کی ہتھیلی سے پھسل کر تتلیوں کی مانند اُڑ چکے ہیں لیکن اس کے گونا گوں نقوش اب بھی ذہن کے کینوس پر نمایاں ہیں۔ اُن کی شخصیت اور مزاج کے دو متضاد اور مختلف رنگ، جن کو ان کے سرسری ملنے والے یا کبھی نہ ملنے والے قطعی نہیں دیکھ پاتے تھے، میری خوش قسمتی ہے کہ مَیں نے وہ رنگ دیکھے ہیں۔ مثلاً مفکر جعفری صاحب، اور مدبر جعفری صاحب، سنجیدہ جعفری صاحب اور رنجیدہ جعفری صاحب، شفیق جعفری صاحب اور رفیق جعفری صاحب، بے زار جعفری صاحب اور بیمار جعفری صاحب، حوصلہ اور ہمت کے مظہر جعفری صاحب اور عفو درگزر کا پیکر جعفری صاحب، ،صابر جعفری صاحب اور شاکر جعفری صاحب اور بے نیاز جعفری صاحب اور حاجت مند جعفری صاحب اور پتہ نہیں کون کون سے اور کیسے کیسے جعفری صاحب جو بیک وقت ایک ہی وجود میں سانس لے رہے تھے۔ ہاں البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ مَیں نے جعفری صاحب کے مزاج کی کیفیتیں دیکھی ہیں لیکن انہیں کبھی جلال و اشتعال کی حالت میں نہیں دیکھا۔ معاملہ کتنا ہی سنجیدہ یا مسئلہ کتنا ہی گمبھیر کیوں نہ ہو مَیں نے انہیں کبھی غیظ و غضب میں آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ہی ہر معاملے کو سلجھایا۔ یہ ظرف ہر کسی کے حصے میں نہیں آتا۔ مختصراً بس یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسان تھے، فرشتہ یا دیوتا نہ تھے۔ صرف انسان۔ ! اور

انسان جس حال میں ہے، جیسا ہے مجھے عزیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی طرح جعفری صاحب بھی اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے باوصف میرے نزدیک ایک محترم تھے، معزز تھے، معظم تھے۔

مَیں نہیں جانتی اپنے ادبی کیریر کے ابتدائی دنوں میں اُن کی زندگی کیسے گزری؟ انہوں نے کن کن تحریکوں میں حصہ لیا۔ کتنے ہنگامے برپا کیے، کتنے محشر اُٹھائے، کتنی داد بٹوری، کتنی بیدادیں کیں، کتنی شعلہ بیانیوں سے کام لیا، کتنے مشاعرے لوٹے، کتنی شرابیں پیں، کتنی محبتیں کیں، کتنی دشمنیاں مول لیں اور کتنے دوست بنائے۔ کتنوں کو پسپا کیا اور کتنوں سے زیر ہوئے۔ یہ تمام باتیں نہ مَیں کل اُن کی زندگی میں جاننا چاہتی تھی اور نہ آج اُن کی موت پر جاننا چاہوں گی کیونکہ ہم آپ جیسے لوگ نہ جنت دوزخ کے ٹھیکیدار ہیں اور نہ ادبی عدالتوں کے منصفانِ گرامی اور نہ داورِ محشر کے کارندے۔ مَیں تو ویسے بھی "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کی قائل ہوں۔ یہ سب تو اُن کے ساتھی جانیں۔ دوست احباب جانیں۔ اُن کے مخالفین جانیں اُن کے ہمعصر و ہم کار جانیں اور اُن کے ہم عمر بزرگ جانیں۔ وہ جو چاہیں اُن کے بارے میں کہیں، رائے دیں انہیں اختیار ہے۔ حق ہے۔

مَیں نے تو جب سے ہوش سنبھالا جعفری صاحب کو اپنے ایک بزرگ کی حیثیت سے دیکھا۔ ایک سینیئر ادیب اور کہنہ مشق صاحبِ قلم ... جس کا حرف حرف پھولوں کی طرح شگفتہ، لفظ لفظ نپا تلا۔ جس کا دل باغی، تیور انقلابی، لہجہ خطیبانہ، ذہن فلسفیانہ اور دل صوفیانہ تھا۔ حرفِ محبت کا مارا وہ شاعر جس نے نئی دنیا کو سلام کیا اور ایشیا کی بیداری کو اپنے جاگتے ہوئے قلم میں سو کر خواب پر خواب دیکھتا رہا۔ جس نے پتھر کی دیوار میں خیالوں کے پھول کھلائے، جس نے پیراہنِ شرر زیب تن کر کے انسانی لہو کی پکار پر لبیک کہہ کے انسانیت کی محافظت کا فریضہ انجام دیا کہ وہ انسان دوستی اور امن عالم کا تمنائی اور شیدائی تھا۔ قنوطیت کے تاریک ایوانوں میں رجائی فکر کے دیے جلانے والی وہ ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک! ان کی وہ چمکدار آنکھیں!! غالبؔ کے اشعار کی طرح تہ در تہ جھریوں سے بھرا اُن کا وہ مسکراتا ہوا چہرہ، وہ کھنکتی ہوئی آواز، گردن پر پھیلے ہوئے دراز گیسوؤں کے جھٹکنے کا وہ مخصوص انداز، کُرتے، انگرکھے اور پاجامے میں ملبوس ان کا باوقار وجود، جس کو دیکھتے ہی گردن خود بخود خم ہو جائے، ہاتھ پیشانی تک پہنچ جائے، زبان رُک سی جائے اور ہونٹوں پہ یہ الفاظ آ جائیں۔

ہم سے گلشن ہے احترام کرو　　　　اے بہارو! ہمیں سلام کرو

انہیں پہلی بار زمانۂ طالب علمی میں دیکھا تھا۔ اُف وہ اندازِ گل افشانی و گفتار!! جو مجھ جیسی نو آموز قلم کار اور ادب کی طالبہ کے ذہن کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی تھا۔ پھر جنبشِ دہن نے گویا فضاؤں میں موتی رول دیے۔ لگا علم کا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے۔ اور جب بار بار سنا تو محسوس ہوا غلط نہیں تھی۔ دریا نہیں یہ تو ایک

سمندر ہے۔ایک بحر ذخار۔ایک قلزم بسیط وعمیق۔یہاں سے وہاں تک حروف ومعانی کے دریائے شاہوار اپنی تابانی ودرخشانی سے ہزار ہا دل ونظر کو خیرہ کرتے ہوئے۔جس کا جیسا جی چاہے ویسے موتی چن لے۔ادب، فلسفہ،منطق، سیاسیات،معاشیات،سماجیات،تاریخ،تصوف،مذہب،کون سا باب اس کتاب وجود میں وا نہ تھا۔جس موضوع پر بولنے کے لیے اترتے ایسا لگتا جیسے یہی موضوع اُن کا خاص موضوع ہے۔الفاظ نپے تلے،انداز سنجیدہ،لہجے میں متانت وشرافت،آواز میں بلندی اور اعتماد بلکہ احساسِ طمانیت۔!!اور چہرے پر ایک ہلکی سی تابناک سرخی جو علم کی روشنی کا پرتو معلوم ہوتی تھی۔

خدا جانے کیوں ان سے ایک روحانی قربت سی تھی جیسے کسی مرشد سے ہوتی ہے۔وہ بھی حسبی اور نسبی دونوں اعتبار سے مجھے اپنے قبیلے کے آدمی لگتے تھے۔حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ مَیں مارکسیت یا اشتراکیت سے کبھی متاثر نہیں ہوئی کہ مجھے عدل و مساوات کا بہترین نظام اسلام میں نظر آتا ہے۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ادب میں سب سے زیادہ مجھے ترقی پسندوں نے ہی متاثر کیا۔اُردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند ادب کا دَور مجھے آج بھی سنہرا دور لگتا ہے جیسے مغلیہ تاریخ میں عہدِ شاہجہانی۔میرے ذہن پر سب سے پہلے جو ادبی اثرات مرتب ہوئے وہ سب ترقی پسندوں کی تحریروں کے تھے اور ان میں بھی تین شخصیتیں میرے ذہن پر ہمیشہ غالب رہیں۔فیض کرشن چندر اور علی سردار جعفری۔ان تینوں مرحومین کی تحریروں میں دو عنصر مشترک ہیں۔رومان اور انقلاب۔اور زندگی انہیں دو عناصر سے عبارت ہے۔شاید اسی لیے جعفری صاحب کی نظم ونثر دونوں میں ہمیشہ مَیں نے یک گونہ یگانگت محسوس کی۔یوں ادبی اعتبار سے وہ مجھے اپنے قریب نظر آئے۔اور حسبی اعتبار سے شاید اس لیے کہ ہم دونوں کا سلسلہ نسب امام جعفر صادق سے جا کر مل جاتا ہے۔حسنِ اتفاق دیکھیے کہ اگر ستارہ شناسی پر تھوڑی دیر کے لیے اعتقاد کرلیا جائے تو پیدائش کے اعتبار سے ہم دونوں کا ستارہ برج قوس ہے۔نومبر کا مہینہ ہم دونوں کی زندگی میں اہمیت رکھتا ہے۔نومبر ان کا گہوارہ تھا تو نومبر میری ''ڈولی'' ہے۔شاید یہ چند مشترکہ پہلو ہی تھے زندگی کے جن کے سبب احترام وعقیدت کے فاصلوں کے باوجود جعفری صاحب سے ایک لاڈ بھرا لگاؤ تھا جیسے اپنے خاندان کے کسی بزرگ سے ہوتا ہے۔ورنہ اُن کے سامنے کچھ بولنے یا زبان کھولنے کی کس کی مجال تھی۔وہاں تو اچھے اچھوں کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔لیکن جعفری صاحب جتنے بارعب تھے،اتنے ہی نرم دل بھی۔ناریل والی مثال ان پر سو فی صد صادق آتی تھی۔

ایک ایک کر کے کئی باتیں یاد آتی چلی جارہی ہیں آج سے تین سال پہلے جب مجھ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔میرے شوہر حسن اختر عابدی کو اچانک یکے بعد دیگرے دل کے دو شدید دَورے پڑے اور پھر چند لمحوں کے لیے دھڑکنیں معدوم سی ہو گئیں۔سانسوں کا سلسلہ منقطع سا ہو گیا۔ڈاکٹروں نے جواب دے

دیا۔ زندگی کے تیقن کی مدت صرف چوبیس گھنٹے قرار دی گئی۔ میرے تو ہوش وحواس جاتے رہے۔ مگر مخلصین نے دعائیں مانگیں، تسلیاں دیں، غم گساری کی۔ ذاتی طور پر آ کر بھی اور فون پر بھی۔ ان میں سے تین فون ایسے تھے جو مجھے آج بھی یاد ہیں۔ سب سے پہلا فون علی رضا کا تھا۔ "بی بی! فکر مت کیجیے۔ آپ جیسا کہیں، مَیں مدد کرنے کو حاضر ہوں۔" پھر جاوید اختر صاحب کا فون آیا۔ "آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ جس اسپتال میں کہیں گی، ان کے علاج کا انتظام ہو جائے گا۔" خلوص، ہمدردی، غمگساری اور انسانیت سے بھرپور ان دو فونوں کے بعد تیسرا فون جعفری صاحب کا تھا۔ "رفیعہ مَیں نے ڈاکٹر گویل سے APPOINTMENT لے لیا ہے۔ تم فوراً عابدی کو لے کر ان کے ذاتی کلنک پہنچ جاؤ۔ وہیں بمبئی اسپتال میں کمرہ بھی بک کروادیا گیا ہے۔ کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب انتظام کر دیا گیا ہے۔" اور اس کے بعد سارا کام یوں منٹوں میں ہو گیا کہ پتہ نہ چلا۔ ڈاکٹر بی کے گویل جو صدر جمہوریہ ہند اور گورنر مہاراشٹر کے معالج تھے اور جن سے APPOINTMENT ملنے ہی میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ جب مَیں ان کے کلنک پہنچی تو محسوس ہوا گویا وہ ہمارے ہی منتظر بیٹھے تھے۔ فوراً اُن کا معائنہ کیا۔ اسپتال کے کمرے میں پہنچوانے کا انتظام کیا۔ دوسرے ہی دن اُن کا آپریشن ہوا۔ جعفری صاحب بہ نفسِ نفیس خود ان کی عیادت کو اسپتال تشریف لائے۔ جبکہ ان دنوں وہ خود بھی بیمار تھے۔ ضعف کا یہ عالم تھا کہ عصا کے سہارے چل رہے تھے مگر پھر بھی 'ان' کے پاس دو گھنٹے بیٹھے رہے۔ اپنی تازہ ترین نظم سنائی جو غالباً جعفری صاحب کی آخری نظم تھی جس میں انہوں نے فلسفیانہ انداز میں انسانی تاریخ قلم بند کی ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں اور دلچسپ لطیفے سنا کر ان کا دل بہلاتے رہے۔ جاتے وقت جعفری صاحب نے ان کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو ان کا دل بھر آیا۔ لیٹے لیٹے بولے "جعفری صاحب! آپ نے میرے سر پر ہاتھ کیا رکھا، مجھے ایسے لگا جیسے میرا مرحوم باپ مجھ سے ملنے آیا ہو۔" جعفری صاحب نے ایک بار پھر بڑے پیار سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ کچھ بولے نہیں۔ ہولے سے تھپتھپا کر باہر نکل آئے۔ لیکن مَیں نے دیکھا کہ جعفری صاحب کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی نمی تیر رہی تھی جسے وہ اپنے رومال میں جذب کرنے لگے۔ جیسے انہیں بھی اپنے دور افتادہ بیٹے یاد آ گئے تھے۔ بہر حال میرے لیے وہ لمحے بڑے قیمتی تھے۔ مَیں انہیں آج تک فراموش نہیں کر پائی۔ آج بھی میں سوچتی ہوں کاش وہ موتی میرے دامن میں گرے ہوتے۔ تو مَیں انہیں عمر بھر دل کی ڈبیا میں سنبھال کر رکھتی۔

جعفری صاحب بہت بڑے دل کے آدمی تھے۔ محبتوں سے بھرا ایک دل جس میں حکایتیں بھی محفوظ تھیں اور شکایتیں بھی۔ مگر باوجود کوشش کے وہ "یاروں کے روبرو" کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ اور وہ دشنام طرازی کے قائل نہ تھے۔۔ دیدہ تر کی شائستگی جزو تہذیب خیال کرتے تھے۔ اس لیے دوست دشمن سب کے مددگار تھے۔ ان کے اکثر مخالفین ضرورت پڑنے پر انہیں کے پاس آتے تھے۔ ایسے ہی بمبئی کے ایک صاحب جو آنے

دن جعفری صاحب کے خلاف محفلوں میں زہرافشانی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی ذاتی غرض سے اُن کے پاس گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سوائے جعفری صاحب کے یہ کام کوئی نہیں کرسکتا۔ مجھے اِس کی اطلاع ملی تو بہت غصہ آیا۔ مَیں نے جعفری صاحب کو فون لگایا۔ اتفاق سے جعفری صاحب نے ہی ریسیور اُٹھایا۔ مَیں نے کہا "فلاں فلاں صاحب آپ کے پاس کسی ذاتی غرض سے آنے والے ہیں اور مَیں جانتی ہوں کہ یہ بات غلط ہے۔ پھر بھی مجھے کہنے دیجیے کہ آپ اُن کا کام نہیں کریں گے۔" تجاہل عارفانہ سے بولے۔ "کیوں؟" مَیں نے کہا۔ "وہ آپ کے سخت ترین مخالف ہیں اور آپ کے بارے میں اکثر محفلوں میں اناپ شناپ بکتے رہتے ہیں۔" ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں جانتا ہوں اور تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ وہ اس وقت یہاں تشریف فرما ہیں۔" مَیں نے پھر دہرایا۔ "ٹھیک ہے۔ لیکن آپ ان کا کام ہرگز نہیں کریں گے۔" کھلکتی ہوئی آواز میں بولے۔ "وہ تو مَیں کرچکا۔" مجھے مزید غصہ آیا اُن کی اس دریادلی پر۔ مَیں نے جھنجھلا کر کہا۔ "آپ نے ایسا کیوں کیا؟ جبکہ آپ کو ان کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتنے کمینہ فطرت ہیں۔ پیٹھ پیچھے آپ کو بُرا بھلا کہتے ہیں آپ کے دشمن ہیں۔ آپ کے خون کے پیاسے ہیں لیکن جب وقت پڑتا ہے تو پھر آپ ہی کے در پر پہنچتے ہیں سوالی بن کر..." ہنس کر فرمایا۔ "حضرت علی کے ساتھ بھی یہی ہوتا تھا نا؟ مَیں تو کچھ بھی نہیں۔ پھر تم میرے لیے دکھی کیوں ہوتی ہو؟" اور اس جواب کے ساتھ ہی مَیں لاجواب ہوچکی تھی لیکن جعفری صاحب کا جواب تو ان کی منظوم خودنوشت کے اس حصے میں پنہاں ہے جس کا عنوان ہے "قاتل کی شکست"۔ فرماتے ہیں:

اس کمیں گاہ میں ہیں کتنے کماں دار بتاؤ
تیر کتنے ہیں سیہ ترکش میں
گن کے دیکھو تو ذرا
کون سا تیر ہے مخصوص مرے دل کے لئے
ابنِ مریم کو کیا تم نے سرِ دار بلند
اور وہ زندہ ہے
تشنگی تم نے محمدؐ کے نواسے کو دی
چشمہ فیض حسین ابن علی جاری ہے
ابن مریم نہ حسین ابن علی ہوں لیکن
خوں میں ہے خونِ شہادت کی حرارت پنہاں

وہ جو صدیوں سے دہکتا ہوا انگارہ ہے

اور سینے میں مرے

اک نہیں سینکڑوں، لاکھوں دل ہیں

وہ کسی دیس کا دل ہو کہ کسی قوم کا دل

وہ کسی فردِ بشر کا دل ہو

زخم خوردہ ہو کہ نغموں سے بھرا

میرے سینے میں دھڑکتا ہے مرا دل بن کر

کتنے دل قتل کرو گے آخر؟

کتنے جلتے ہوئے تاروں کو بجھا سکتے ہو؟

کتنے خورشیدوں کو نیزوں پہ اٹھا سکتے ہو؟

جعفری صاحب ایک بے حد وفادار اشتراکی ضرور تھے مگر مذہب بیزار نہیں تھے۔ خدا رسول اور اہل بیت اطہار سے عقیدت ومحبت انہیں گھٹی میں ملی تھی جو براہِ راست انہیں انسانیت اور انسان دوستی کی منزل تک لے جاتی تھیں جس کا اظہار انہوں نے براہِ راست "لکھنو کی پانچ راتیں" میں کیا ہے۔ اس پر بار بار فخر کیا ہے کہ "ہمارے گھر میں انیس کے مرثیے بارہ مہینے پڑھے جاتے تھے" اور جس کا انکشاف ان کی دیگر تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ ظفر گورکھپوری کو ان کے جواں سال فرزند جاوید کی مرگِ ناگہانی پر پرسہ دیتے ہیں تو نہیں مذہبی عقاید وتہذیبی اقدار کے سائے میں۔ ملاحظہ ہو:

> تعزیت ایسے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ایسے وقت میں ہر لفظ بے معنی ہو جاتا ہے۔ میری پرورش مذہبی گھرانے میں ہوئی ہے۔ بچپن سے یہ تربیت دی گئی ہے کہ سوائے غمِ حسین کے اور کسی کے غم میں آنسو نہ بہیں۔ اس لیے جب جوان بیٹا ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتا ہے تو حضرت علی اکبر کی مجلس ہوتی ہے بھائی کے غم میں حضرت عباس کی مجلس۔ بہن کے غم میں حضرت زینب کی مجلس۔ یہ کربلا کی مکمل تہذیب ہمارا ورثہ ہے۔ جو غم کا سہارا بن جاتا ہے۔ (مکتوب بنام ظفر گورکھپوری تحریر کردہ بمبئی ۲۹ راگست ۱۹۸۸ء مطبوعہ چراغ چشم تر از ظفر گورکھپوری صفحہ ۱۱۵)

اس کے بعد وہ مرنے والے نوجوان کے والد (ظفر گورکھپوری) اور والدہ (بیگم ظفر) کے لیے انیس کے مرثیے کے دو خوبصورت بند پیش کرتے ہیں۔ اس طرح جب وہ اپنی بہنوں کا ذکر کرتے ہیں تب بھی وہ اس

تہذیبی معاشرے کی خصوصیات کی تفصیل ضروری سمجھتے ہیں۔

"میری بہنوں کی تربیت شمالی ہندوستان کی اس تہذیب میں ہوئی ہے
جس میں انیس کے مرثیوں کے حسن و جمال اور حزن و ملال کی آمیزش ہے۔انہوں
نے باقاعدہ اسکول اور کالج کی تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔صرف گھر پر قرآن شریف
کے ساتھ اردو پڑھی ہے جس پر انیس کی زبان اور بیان نے جلا کی ہے۔
(روزنامہ انقلاب بمبئی ۹ ستمبر ۱۹۹۷ء مضمون 'مجھ کو باپ آتش دوزخ کا ڈر نہیں'')

انہیں اپنی مذہبی خاندانی ورثے اور اس میں رچی ہوئی تہذیب پر جو بقول ان کے" نیکی اور بدی کی کشمکش میں ہمیشہ نیکی کے ساتھ رہی" زندگی بھر ناز رہا۔اودھ کی اس تہذیب کو آخری دم تک اپنے سینے سے لگائے رہے ان کا عقیدہ تھا کہ۔

"یہ تہذیب ایک جزیرہ نہیں ہے بلکہ ایک سمندر کی موج ہے جس میں
تلسی داس کی رامائن کا ترنم، گاؤں کے ڈھولکوں کی آوازیں اور رام لیلا اور نوٹنکی کی
خوش گفتاریاں شامل ہیں۔"

مجھے یاد ہے کہ مشترکہ تہذیب کے اس فرزند کو جو گیان کا سمندر تھا، ۱۹۹۸ء میں جب گیان پیٹھ ایوارڈ ملا تھا تو میں نے انجمن ترقی اردو، ہند، مہاراشٹر اور بزم اردو مہاراشٹر کالج کی جانب سے ایک شاندار تہنیتی نشست کا انعقاد کیا تھا۔صدارت ڈاکٹر رفیق زکریا فرما رہے تھے۔اور مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری (جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے دل کانپتا ہے) سلمٰی صدیقی اور ایک امریکی صحافی خاتون شریک تھیں۔جعفری صاحب کی شخصیت اور فن سے متعلق اظہارِ خیال فرمانے والوں میں یوسف ناظم، پروفیسر عبدالستار دلوی، عنایت اختر، سلام بن رزاق، عبدالاحد ساز اور ساجد رشید وغیرہ شامل تھے۔چاہنے والوں نے عقیدتیں اور محبتیں نچھاور کرنا شروع کیں تو اسٹیج پر گل دستوں اور پھولوں کی ٹوکریوں کا ڈھیر لگ گیا۔اس قدر پھول تھے کہ انہیں ایک ٹیکسی میں بھر کر الگ سے لے جانا پڑا۔دوسرے دن سلطانہ آپا فون پر گویا تھیں۔"کل سے ہمارا سارا گھر پھولوں سے بھر گیا ہے۔چاروں طرف مہک ہی مہک ہے اور سردار تو پھولے نہیں سمارہے ہیں۔"میں نے دل میں سوچا۔یہ مہک ہماری عقیدت سے زیادہ جعفری صاحب کی شخصیت کی مرہونِ منت ہے۔یہ شگفتگی، یہ تازگی ۸۴ سال کی عمر میں بھلا کس شخص کے ہاں کسی نے دیکھی ہے؟؟

وہ تمام عمر لکھتے رہے۔شعر کہتے رہے۔پڑھتے رہے اور ان کا مطالعہ سرسری بھی نہیں تھا بلکہ بڑی باریک بینی سے ایک ایک پہلو پر نظر کرتے تھے۔گزشتہ دنوں میری چار کتابیں یکے بعد دیگرے منظر عام پر

آئیں۔ مَیں نے چاروں کتابیں اپنے شاگرد کے ہاتھ سے جعفری صاحب کو بھجوادیں۔ اس کے ایک دن بعد الما لطیفی ہال میں انجمن اسلام کی جانب سے وہ حارث میموریل لیکچر کے تحت غالبؔ کی شاعری سے متعلق ایک خصوصی خطبہ دینے والے تھے۔ حسبِ معمول وقتِ مقررہ پر وہ تشریف لائے مگر کچھ تھکے تھکے سے نظر آ رہے تھے۔ بولتے بولتے رک سے جاتے تھے۔ دورانِ تقریر غالب کے اشعار بھول بھول جاتے تھے اور حافظے پر زور دے کر انہیں یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کبھی لاکھ کوشش کرنے پر بھی شعر یاد نہ آیا۔ نتیجتاً سامعین میں سے کچھ لوگوں نے شعر پڑھا۔ کافی ضعیف اور کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ کمر جھکی ہوئی، عصا بردار، دُبلے بھی ہوگئے تھے۔ ایک ان جانے خوف سے میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ مَیں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ شاید عمر اب ان کی ذہانت اور خطابت کا ساتھ نہیں دے پا رہی ہے۔ بے شک یہ وہ جعفری صاحب نہیں ہیں جنہوں نے بمبئی کے انڈین مرچنٹ چیمبر میں اقبالؔ، رومیؔ اور حافظؔ پر بے تکان اظہارِ خیال فرمایا تھا۔ یا خلافت ہاؤس میں حسرتؔ موہانی پر معرکتہ الآرا تقریر کی تھی۔ جنہوں نے جموں یونیورسٹی میں ''اُردو معاشرے میں فلم کی اہمیت'' پر اتنا عظیم الشان خطبہ دیا تھا کہ صدرِ جلسہ وائس چانسلر پروفیسر ایم۔ آر۔ پوری کو یہ کہنا پڑا تھا کہ ''یہ لیکچر سننے کے بعد مَیں محسوس کرتا ہوں کہ یونیورسٹی میں ایک فلم سوسائٹی کی بنیاد رکھنا چاہیے'' جنہوں نے فیضؔ فاؤنڈیشن لاہور کی جانب سے فیض کی شخصیت و شاعری پر ایسی فکر انگیز گفتگو کی تھی کہ ڈاکٹر اعجاز حسین جو اس وقت جلسے کی صدارت فرما رہے تھے اس اعتراف و اقرار پر مجبور ہوگئے تھے کہ ایسا عمدہ لیکچر مَیں نے پہلی بار سنا ہے۔

''خدا جانے برگِ زباں سے نطق و صدا کی تتلیاں کہاں اُڑ گئی تھیں؟''

جلسے کے اختتام پر جب مَیں اُن سے ملنے گئی تو دیکھتے ہی فوراً بولے ''تمہاری کتابیں مل گئیں اور ان میں سے ایک جو تم نے کرشن چندر پر لکھی ہے، مَیں نے خاص طور پر کل ہی پڑھ ڈالی۔ اچھا لکھا ہے۔'' مَیں نے کہا۔ ''جعفری صاحب! آپ نے اسے پسند فرمایا۔ بس میری محنت وصول ہوگئی اور سند مل گئی۔ لیکن اس سلسلے میں مَیں آپ کو عن قریب زحمت دوں گی۔ اس کتاب کا اجراء آپ ہی اپنے دستِ مبارک سے فرمائیں گے۔'' کہنے لگے۔ ''ہاں ضرور آؤں گا۔''

ایک آدھ ہفتے بعد ہی وہ میری کتاب کے اجرائی جلسے میں تشریف لائے۔ کافی دیر سے پہنچے۔ جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ چل نہیں پا رہے تھے۔ مَیں نے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ میرا سہارا لے کر وہ اپنی نشست کی طرف بڑھنے لگے۔ میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ بچپن میں باپ اپنی اولاد کی انگلی پکڑتا ہے۔ لیکن آج مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے باپ اپنی بیٹی کی انگلی پکڑ کر چل رہا ہو۔ اُن کا سارا بدن ضعف سے تھرتھرا رہا تھا۔ دل دہل دہل سا گیا۔ ایک عجیب سا روح فرسا احساس رگ و پے میں دوڑ گیا۔ میرے اللہ! اُردو ادب کا یہ قطب مینار اب

زمیں بوس ہونے کے قریب ہے۔خدایا! اسے یوں ہی ایستادہ رکھنا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں بھی ان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ جلسے کے دوران وہ خاموشی سے میرے اُردو ترجمے سلام (مراٹھی شاعر مکیش پڈگاؤکر کا شعری مجموعہ) کا مطالعہ کرتے رہے۔ بعض نظموں کو خاص طور پر ٹھہر کر غور سے پڑھتے، دھیرے سے اس پر انگلی رکھ کر مجھ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے۔ اس دوران مجروحؔ صاحب، سلمیٰ آپا، ڈاکٹر الحق جم خانہ والا، یوسف ناظم، پروفیسر عبدالستار دلوی، ڈاکٹر آدم شیخ۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی، ڈاکٹر خورشید نعمانی، سلام بن رزاق، رام پنڈت، اور عثمان غنی عادل وغیرہ نے مجھ ناچیز کی چار کتابوں پر خیال آرائی فرمائی اور مضامین پڑھے۔ فیاض احمد فیضی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جب انہوں نے جعفری صاحب کو آواز دی تو مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا۔ جعفری صاحب نے کرشن چندر کی دوستی سے گفتگو کا آغاز کیا اور پھر اپنی گفتگو کا رخ پارٹی کی سرگرمیوں کی طرف موڑ دیا۔ اور اس کے بعد ایسا لگا جیسے وہ ناسٹلجیا کا شکار ہو گئے ہوں۔ ماضی کی یادوں میں گم۔ یادیں۔ خوبصورت، دل کش، شیریں، تلخ، جان لیوا یادیں۔ جعفری صاحب شاید کسی اور جہان کی سیر کر رہے تھے۔ ایک ایسی حسین دنیا، جہاں سے لوٹ آنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ بولتے بولتے اچانک رک سے گئے۔ . . ایک طویل وقفہ۔ حاضرین و سامعین کی نگاہیں ان پر مرکوز تھیں۔ ایک بار پھر وہ ذہن میں ان منتشر یادوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر زندگی بھر کی یہ ڈھیر ساری یادیں اُن کے قابو میں نہ آ رہی تھیں۔ اس دکھتے ہوئے دماغ پر تو سرطان کے قاتل جرثوموں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ پھر کچھ دیر کے لیے مجروحؔ سے ان کی نوک جھونک بھی ہوئی۔ مگر بس ایک لمحے کے لیے۔ اور جعفری صاحب پھر بیتے دنوں کے نامعلوم، گم شدہ جزیروں میں جا چکے تھے۔ ڈاکٹر رفیق زکریا جو اس جلسے کی صدارت فرما رہے تھے، پہلو بدلنے لگے۔ جعفری صاحب کو اس طرح رک رک کر قسطوں میں بولتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔ زکریا صاحب نے مجھے اشارہ کیا۔ انہیں روکو۔ مطلب تھا "انہیں ٹوکو"۔ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ "یہ میرے بس میں نہیں۔ یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔" آخر زکریا صاحب نے ان کے بائیں شانے کو ہولے سے تھپتھپایا۔ برسوں کے رفیق کا لمس پا کر جعفری صاحب نے ایک بار پھر اس جرثومے کو پسپا کر دیا اور اپنے خوابوں کی دنیا سے لوٹ آئے۔ معذرت کے ساتھ اپنی ادبی تقریر کو سمیٹا۔ یہ جلسہ اُن کی زندگی کا آخری جلسہ تھا۔ اس کے بعد تو انہوں نے صرف نہرو کلچر سینٹر کے سالانہ مشاعرے میں شرکت فرمائی۔ جہاں پھر وہی کیفیت رہی۔ وہی یادوں کے سلسلے کا انقطاع۔ گفتگو میں رکاوٹ، لمحہ خاموشی، حافظے پر زور دینے کی سعی، لاحاصل۔ وہی بھول بھول جانے کی تکلیف۔ آخر ناظم مشاعرہ سید محمد اشرف کے اصرار پر وہ "میرا سفر" سنانے لگے۔ ایک مہینہ قبل آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے مشاعرے میں بھی انہوں نے یہ نظم سنائی تھی اور جب اس بند پر پہنچے کہ:

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں
ہاتھوں کے کنول کملائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اُڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی
خوں کی گردش، دل کی دھڑکن
سب راگنیاں سو جائیں گی
اور نیلی فضا کی مخمل پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی
یہ میری جنت، میری زمیں
اس کی صبحیں، اس کی شامیں
بے جانے ہوئے، بے سمجھے ہوئے
اک دشتِ غبارِ انساں پر
شبنم کی طرح رو جائیں گی
ہر چیز بھلا دی جائے گی
یادوں کے حسیں بت خانے سے
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں

تو اسٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے تمام سامعین پر خاموشی چھا گئی تھی اور اسٹیج پر جعفری صاحب کے پیچھے بیٹھے ہوئے عبدالاحد ساز، شاہد لطیف اور ناچیز کی آنکھیں پُرنم ہو چکی تھیں مگر جعفری صاحب کی گمبھیر آواز پھر بھی جادو جگا رہی تھی:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا

بچوں کے ذہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

لیکن افسوس کہ وہ آنکھیں جن میں دانش وری کی چمک تھی، جذبوں کا رنگ تھا، حوصلوں کی تابانی تھی، یکم اگست کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ وہ گیسو جن کے جھٹکنے کے مخصوص انداز پر لوگ مرتے تھے۔ کیموتھراپی کی نذر ہو چکے تھے۔ وہ ہر گھڑی چاک و چوبند اور فعال رہنے والا جسم . . اب ایک پنجر میں تبدیل ہو چکا تھا اور وہ وجود جو کتنے دلوں کو جینے کا حوصلہ عطا کرتا تھا، اب قضا کے چنگل میں پھنس کر لقمۂ اجل بن چکا تھا۔ میں اسپتال میں جا کر انہیں دیکھ نہ سکی کیونکہ مجھ میں اتنی تاب نہ تھی کہ جس شخصیت کی تابانی نے میرے ذہن کے اندھیروں کو دور کر کے احساس و شعور کی شمعیں جلائیں، میں اُسے عدم کی تاریکی میں ڈوبتا ہوا دیکھوں۔ میں سلطانہ آپا کے پاس بھی نہ جا سکی کہ مجھ میں ان کے کندھوں پر سر رکھ کر رونے کی ہمت نہ تھی۔ وہ جس وجود کا نصف بہتر تھیں اسے معدوم اور آپا کے "خالی پن" اور ادھورے پن کو کیسے دیکھ سکتی تھی۔ میں نے فون پر ہی انہیں پرسہ دیا۔

آخر میرا اور کبیر کا وہ ہم نوا جو حرف محبت پر جان دیتا تھا، اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے کے لیے تیار تھا۔ جعفری صاحب زندگی بھر انسان دوستی کا دم بھرتے رہے۔ مذہب، مسلک، وطن، زبان، نسل و رنگ، تمام امتیازات سے بالاتر ہو کر انہوں نے انسان کو اپنی نظر سے دیکھا۔ جب اپنے آخری سفر پر روانہ ہوئے تو کبیر ہی کی طرح اپنے آپ کو مر کر بھی چاہنے والوں میں تقسیم کر دیا۔ ان کی چادر کے نیچے پھولوں کا ڈھیر تو نہ ملا لیکن ہاں عقیدتوں کے پھولوں کی مہک ان کے بے جان جسم کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اسی لیے تو ان کی تجہیز و تکفین تو "رحمت آباد" میں ہوئی اور تدفین "جوہو قبرستان" میں جہاں ان کے دیگر ترقی پسند ساتھی پہلے سے محوِ خواب تھے۔ نماز جنازہ دونوں طرف پڑھی گئی اور سنی اور شیعہ دونوں طریقوں سے۔ قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ دونوں مسلک کے افراد نے دونوں ہی جگہ شرکت فرمائی اور بغیر کسی رنجش کا اظہار کیے۔ اس کی ایک وجہ اگر بمبئی والوں کا کاسموپولیٹن مزاج ہے۔ تو دوسری وجہ جعفری صاحب کی شخصیت کا جادو بھی ہے کہ جو زندگی میں بھی تمام انسانوں کے تھے اور مر کر بھی سب کے رہے۔ اُن کے جنازے میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، شیعہ، سنی سبھی بلا امتیاز مذہب و ملت

شریک تھے اور احباب کے ہاتھوں اودھ کی یہ خاک حسیں بمبئی کی خاک کا جزو بن گئی۔ مٹی ڈالتے ہوئے احباب نے یقیناً محسوس کیا ہوگا جیسے اودھ کی ہزاروں سال پرانی تہذیب مٹی میں مل رہی ہو۔ وہ عشق پیچاں کی بیلیں، وہ ڈیوڑھی پر جھولتا ہوا ہاتھی، وہ برگد کا درخت۔ وہ جھیلوں میں تیرتے ہوئے کنول کے پھول، وہ گلی پر لٹکتے ہوئے دھانی دوپٹے، وہ ندی کے پانی میں تیرتی ہوئی بید کی جھاڑیاں، وہ سریلی آواز میں بولنے والے پپیہے، وہ غریب کسانوں کی جھونپڑیوں میں اگتی ہوئی ترکاریوں کی بیلیں۔ جعفری کے ساتھ یہ سب کچھ خاک میں مل گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے ہوں۔

ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم
کہ فانی نہیں جاودانی ہیں ہم

الوداع! اے اُردو شاعری کی پچاس سالہ آواز۔ الوداع اے خطابت کے امام! الوداع اے ترقی پسند تحریک کے عاشق عالی مقام! الوداع اس صدی کی آخری صدائے بے باک!

جعفری صاحب نے اپنی بہن رباب جعفری کی موت پر چند اشعار کہے تھے، وہی اشعار میں جعفری صاحب کی روح کی نذر کرتی ہوں:

رباب درد ہے خاموش ، دل کے تاروں میں
نہ کوئی نغمۂ جانکاہ ہے، نہ شعلۂ آہ
بس ایک اشک کا قطرہ ہے بھیگی پلکوں پر
تمہارے کربِ مسلسل کے خاتمے کا گواہ
سکون کہتا ہے چہرے کا، باغِ جنت سے
جناب فاطمہ زہرا کی پڑ رہی ہے نگاہ
تمہارا زادِ سفر عشقِ اہلِ بیتِ رسولؐ
تمہاری دولت ایماں تمہارا توشۂ راہ
جوارِ رحمتِ حق میں ملے جگہ تم کو
بحق اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

☆☆☆

(سہ ماہی "نیا سفر" ممبئی ۲۰۰۰ء، ماہنامہ عوامی منشور کراچی جنوری ۲۰۰۱ء)

حمید اختر

ایک چراغ اور بجھا

کرشن چندر کی وفات پر میں نے ایک مختصر اخباری مضمون کا پہلا فقرہ یہ لکھا تھا "اُردو افسانے کی سب سے مدھر آواز خاموش ہو گئی ہے۔" علی سردار جعفری کی رحلت پر میں اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ "برصغیر میں ترقی پسند شعر و ادب کی سب سے توانا آواز ہم سے بچھڑ گئی ہے"

علی سردار جعفری نے اپنی ستر سالہ بھرپور ادبی زندگی میں بہت کام کیا۔ بدقسمتی سے ترقی پسند تحریک کے مخالفوں نے سب سے پہلے جن لوگوں پر ادب کو نعرہ بازی کا ذریعہ بنانے کا الزام لگایا، اُن میں علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے نام سر فہرست رہے، یہی نہیں بلکہ تیس اور چالیس کے عشروں میں شعر و ادب کی روایتی اقدار کے اسیروں نے برسوں جعفری کو جینوئن شاعر تسلیم کرنے ہی سے انکار کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں اگرچہ ترقی پسند شعراء کی تعداد درجنوں میں تھی اور اُن میں جوشؔ، فیضؔ، مجازؔ، فراقؔ، جذبیؔ، جان نثار اخترؔ اور ساحرؔ جیسے مسلمہ شعراء شامل تھے مگر اُس دور کے جن دو تین اہم شاعروں نے اپنے فن کی آبیاری کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی حصہ لیا، اُن میں علی سردار جعفریؔ کیفی اعظمی اور مخدوم محی الدین کے نام نمایاں ہیں۔ سردار جعفریؔ نے اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں نہ صرف تخلیقی صلاحیتوں کا سب سے زیادہ مظاہرہ کیا بلکہ اپنے کام کی مقدار اور معیار میں بھی سب سے آگے رہے، وہ انتہائی وسیع المطالعہ انسان تھے اور اُنہیں اُردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب پر پورا عبور حاصل تھا، وہ محض شاعر ہی نہیں، ایک اچھے تنقید نگار بھی تھے۔ انہوں نے پرانے کلاسیکی ادب اور اُس ادب کو تخلیق

کرنے والے ادباء اور شعراء پر تحقیقی اور تنقیدی کام بھی کیا اور اُن کا یہ کام اتنا معیاری اور اس حد تک مستند ہے کہ آنے والے زمانوں میں ادب کے طالب علم اس سے مدتوں رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

ابتدائی دور کی مخالفتوں کے باوجود علی سردار جعفری نے اپنے ریاض، محنت اور فراواں تخلیقی جوہر کے بل بوتے پر جلد ہی اپنے آپ کو بڑا شاعر اور مستند نقاد کے طور پر منوالیا اور گزشتہ تیس چالیس برس کی مدت میں ادب کے بڑے بڑے نقادوں نے انھیں جینوئن شاعر قرار دینے میں کبھی تامل سے کام نہیں لیا۔ اُن کی تخلیقات پر سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اپنی زندگی میں اُنھوں نے کتنا کام کیا۔ اُن کا پہلا مجموعہ 'پرواز' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا، 'نئی دنیا کو سلام' کے عنوان سے طویل تمثیلی نظم ۱۹۴۸ء میں طبع ہوئی۔ پھر یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہا، جیل یاترا اور سیاسی میدان کی کٹھن سرگرمیوں کے ساتھ شعر گوئی اور تنقید نگاری کے میدان میں بھی کام ہوتا رہا اور نئے مجموعے سامنے آتے رہے، 'خون کی لکیر' ۱۹۴۹ء میں 'امن کا ستارہ' اور 'ایشیا جاگ اُٹھا' ۱۹۵۱ء میں 'پتھر کی دیوار' ۱۹۵۳ء میں، 'ایک خواب اور' ۱۹۶۴ء میں، 'پیراہن شرر' ۱۹۶۵ء میں اور 'لہو پکارتا ہے' ۱۹۶۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر ادب کے قارئین تک پہنچیں۔ ان میں سے چھ تو باقاعدہ شعری مجموعے ہیں جب کہ باقی کی تین مطبوعات طویل نظموں پر مشتمل ہیں۔

سردار جعفری کی نثری تخلیقات بھی، شعری مجموعوں کے مقابلے میں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں اُن کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں "یہ خون کس کا ہے؟" کے عنوان سے ان کا ایک ڈرامہ چھپا اور ۱۹۴۴ء میں "پیکار" کے عنوان سے دوسرا ڈرامہ شائع ہو کر سامنے آیا۔ 'ترقی پسند ادب' اور 'لکھنو کی پانچ راتیں' علی الترتیب ۱۹۵۳ء اور ۱۹۶۵ء میں چھپیں مگر ان کا اصل تنقیدی جوہر 'اقبال شناسی' ۱۹۴۹ء اور 'پیغمبران سخن' (کبیر، میر اور غالب) کی اشاعت کے بعد کھلا۔ اُنھوں نے متعدد دستاویزی فلمیں بنائیں اور ٹیلی ویژن کے لیے متعدد سیریل بھی تحریر کئے۔ عام طور سے ان سب کے موضوعات بھی ادبی تھے، اس طرح علی سردار جعفری نے بھارت میں اُردو کی روز بروز کم ہوتی ہوئی اہمیت کو سہارا دیا اور اُردو زبان کی ترویج کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

اقبال، سردار جعفری کی ہمیشہ سے کمزوری رہا، ۱۹۴۲ء میں انھوں نے اقبال کی شعری صلاحیتوں اور اس کے فکر و فلسفے کے بارے میں پہلی کتاب تحریر کی۔ اس کی اشاعت کا معاہدہ بھی ہو گیا اور ناشر سے کچھ رقم بھی سردار جعفری کو مل گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسندوں میں کچھ لوگ اقبال کو فاشسٹ شاعر قرار دے رہے تھے اور اس قسم کے کچھ تنقیدی مضامین ادبی رسالوں میں شائع بھی ہوئے تھے جن میں

اقبال پر فاشی خیالات رکھنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ اصل میں دوسری جنگِ عظیم کے دوران دنیا فسطائی اور جمہوری قوتوں کے درمیان بٹی ہوئی تھی،اس لیے انقلابی اور دانشور لوگ اقبالؔ کے افکار کو اسی تناظر میں لے رہے تھے، علی سردار جعفریؔ ان سے متفق نہیں تھے مگر ان لوگوں کے اعتراضات کی وجہ سے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے جس کے سردار نہ صرف ممبر بلکہ ہول ٹائم کارکن تھے، جعفریؔ کو اس کتاب کی اشاعت سے روک دیا۔ برسوں یہ مسودہ ویسے ہی پڑا رہا مگر بالآخر علی سردار کی کوششوں سے پارٹی نے اپنا نقطہء نظر تبدیل کیا اور یہ کتاب ترمیم واضافہ کے بعد کہیں ساٹھ کے عشرے میں طبع ہو سکی۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں ان کی کتاب پر اعتراض ہونے اور اس کی اشاعت میں تاخیر ہونے کے باوجود علی سردار جعفریؔ اقبالؔ کو اپنا رہنما اور انسان دوست شاعر تسلیم کرتے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے رہے۔ راقم کو ۴۷-۱۹۴۶ء میں تقریباً ڈیڑھ پونے دو برس، انجمن ترقی پسند مصنفین شاخ بمبئی کے سکریٹری کی حیثیت سے انجمن کے ہفتہ وار جلسوں اور ملک کے مختلف حصوں میں ہونے والی ادبی کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا جہاں سردار جعفریؔ ہمیشہ اپنی ہر تقریر میں اور ہر لکچر میں علامہ اقبالؔ کو اپنے آئیڈیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ انجمن کے ہفتہ وار تنقیدی جلسوں میں انسانی رائے کو جا طور سے سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، اس لیے کہ وہ اس سارے ہجوم میں سید سجاد ظہیر کے بعد غالباً سب سے زیادہ پڑھے لکھے ادیب تسلیم کیے جاتے تھے جو تحریر ہی میں نہیں تقریر میں بھی پوری طرح رواں تھے، اُن کی یہ خوبی کہ وہ جو کچھ پڑھتے تھے اس سے پورا پورا اکتساب بھی کرتے تھے، میں نے یہ خوبی اپنے حلقہء احباب میں اُن سے زیادہ کسی میں نہیں دیکھی، اس لیے ترقی پسند ادیبوں کے اجتماعات میں علی سردار جعفریؔ کی رائے کو دقیع سمجھا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کرشن چندر سردار کو اپنا ادبی گرو تسلیم کرتے تھے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ۴۷-۱۹۴۶ء میں ترقی پسند ادیبوں کا جو انتہائی طاقتور گروپ بمبئی میں موجود تھا، علی سردار اس میں شامل سب ہی ادیبوں کے مسلمہ نظریاتی رہنما تھے۔

اگر میں یہ کہوں کہ علی سردار جعفری کا شمار بیسویں صدی کے انتہائی اہم اُردو شاعروں میں ہوتا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے بہت لکھا اور خوب لکھا۔ میں ادب کا نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا نہ ہی اپنے تئیں علی سردار جعفری کی شاعرانہ صلاحیتوں کی نشان دہی کرنے کا اہل سمجھتا ہوں، مجھے تو وہ شاعر سے زیادہ ایک سچے، کھرے، ہمدرد اور انسان دوست فرد کی حیثیت سے ہمیشہ بہت عزیز رہے۔ تاہم ان کی بعض نظمیں اور کچھ اشعار ایسے ہیں جو دل پر اس طرح نقش ہو گئے ہیں کہ اُنہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان میں اُن کی نظم "ایک خواب اور" بھی ہے جو کچھ اس طرح ہے:-

خواب اب حسنِ تصور کے اُفق سے ہیں پرے
دل کے اک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب
اور تعبیروں کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
تشنگی آبلہ پا، شعلہ بکف موجِ سراب
یہ تو ممکن نہیں، بچپن کا کوئی دن مل جائے
یا پلٹ آئے کوئی ساعتِ نایاب شباب
پھوٹ نکلے کسی افسردہ تبسم سے کرن
یا دمک اُٹھے کسی دست بریدہ میں گلاب
آہ پتھر کی لکیریں ہیں کہ یادوں کے نقوش
کون لکھ سکتا ہے پھر عمر گزشتہ کی کتاب

اور آخر میں کہتے ہیں ۔

در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح اُن سے گریزاں ہے جواب
سرکشی، پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں
میں ترا شاعرِ آوارہ و بے باک و خراب
پھینک پھر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند

علی سردار جعفری جد وجہد کے آدمی تھے۔ اپنی پوری زندگی اُنھوں نے بنی نوع انسان کی بھلائی اور فلاح کے لئے وقف کیے رکھی۔ اُن کے فن اور شخصیت کے بارے میں یوں تو درجنوں مشاہیر اپنی رائے ظاہر کر چکے ہیں، ہم یہاں صرف دو ایسے اشخاص کی آراء پیش کر رہے ہیں جن کی بہ جو اپنی اہمیت اور جن کی رائے کی اصابت سے انکار کرنا مشکل ہے۔ ان میں سے ایک حکیم محمد سعید مرحوم ہیں جنھوں نے سردار کے بارے میں لکھا کہ "جناب علی سردار جعفری کا شمار اس دور کی فکری، تہذیبی اور ادبی تحریکوں سے

ممتاز نمائندوں میں ہوتا ہے اور وہ ہندوستان اور پاکستان میں ایک بلند پایہ شاعر، نقاد اور ادیب تسلیم کیے جاتے ہیں۔ تنقید کو انھوں نے نئے زاویوں کی نظر اور عصری آگہی کی روشنی دی۔ اُن کی شاعری جدید حیثیت سے آراستہ ہے اور عصری شعر کی نمائندہ علامت سمجھی جاتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے عہد کی حسیں اور فکری فضا کو ابھارنے اور اُردو زبان کو نئے تجربات اور نئے رجحانات سے روشناس کرانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اُن کی شخصیت عہدِ حاضر کے لیے بامعنی اور کیف سامان ہے"۔

دوسرے بزرگ ڈاکٹر زتشی گلزار دہلوی ہیں جنھوں نے علی سردار جعفری کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا کہ "علی سردار جعفری گہرے مطالعے، علوم پر نظر، فن پر گرفت، کلاسیکل ادب کے غائر عالم، ادیب، شاعر اور ایسے مفکر اور دانشور ہیں جو کسی قوم اور معاشرے میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں"۔ ان دونوں بزرگوں کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سردار جعفری کے نظریاتی ساتھی ہیں یا اُن کا ادب کی ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق ہے۔ اِن کی رائے خالصتاً جعفری کے فن کی قدردانی کی عکاسی کرتی ہے اور اس لیے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔

علی سردار جعفری جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ایک سچے، کھرے اور ہمدرد انسان تھے، وہ دوستوں کے دوست اور انسانی قدروں کے پاسبان تھے۔ پیسہ اُن کے پاس کبھی نہیں رہا مگر اپنی محنت سے انھوں نے جو کچھ بھی کمایا اسے انھوں نے دوستوں، رفیقوں اور ضرورت مندوں پر بشرطِ ضرورت خرچ کرنے میں کبھی تامل سے کام نہیں لیا۔ کیفی بیمار ہوئے تو اُن کے علاج کے لیے بمبئی کے ڈاکٹروں کے پاس بھاگے پھرتے رہے، پھر انہیں ایک بہت اچھے کلینک میں داخل کرایا اور اُن کی بیگم کو اپنے گھر لے آئے کیوں کہ اُن کا گھر اس ہسپتال کے نزدیک تھا جس میں کیفی داخل تھے۔ کرشن چندر، ساحر اور بمبئی میں رہنے والے متعدد ادیبوں اور شاعروں کی بیماری میں علی سردار جعفری ہی سب سے زیادہ اُن کے کام آتے رہے۔ کسی کو اچھے ڈاکٹر اور ہسپتال کی تلاش میں مدد بہم پہنچائی تو کچھ ایسے بھی تھے جن کے لیے فنڈز فراہم کرنے کی ضرورت تھی جو علی سردار جعفری نے پوری کی۔ بمبئی میں اُن کا فلیٹ بہت بڑا نہیں ہے، پھر اس میں اُن کے اپنے بیٹوں بہوؤں کے علاوہ اُن کی دو بہنیں مستقلاً رہتی تھیں۔ یہ دونوں سردار جعفری کے لائبریری روم میں جہاں ہر طرف کتابوں کے ڈھیر اور الماریاں تھیں، مقیم تھیں۔ اس کے باوجود سردار دوستوں کو اپنے گھر ٹھہرا کر خوش ہوتے۔ ۱۹۷۹ء میں ساحر کی بیماری کے وقت، تقسیمِ ملک کے بعد پہلی بار جب میں، میری بیوی اور میرا چھ سالہ بیٹا عمیر بمبئی گئے تو دو ہفتے کے قریب ساحر کے بہت بڑے اور محل نما مکان "پرچھائیاں" میں ٹھہرے۔ ہمارے وہاں جانے کا مقصد ہی ساحر کی تیمارداری

تھی۔ دو ہفتے کے اس قیام کے دوران میں سردار جعفری سے بھی ملاقاتیں رہیں مگر ہمارے قیام کے آخری چار پانچ روز وہ بہت زور دے کر ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ تم نے اپنے دوست ساحر کے ہاں کافی دن گزارے ہیں، ہم بھی تمہارے دشمن نہیں دوست ہیں۔ اس لیے پاکستان واپسی سے قبل کچھ دن ہمارے ہاں بھی قیام کرو۔ ان کی بیگم سلطانہ ساحر کے ہاں آئیں اور ہمیں اپنے گھر لے گئیں۔ وہاں جگہ کم تھی، سردار جعفری نے اپنی بہوں کو اپنے کمرے میں منتقل کر دیا اور لائبریری روم ہمارے حوالے کر دیا۔ جگہ کی تنگی کے باوجود ہم نے یہ چار پانچ روز بڑے مزے سے وہاں گزارے اور سردار کی صحبت میں گزرے ہوئے یہ دن زندگی بھر یاد رہیں گے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان موجود کشیدگی پر میں نے سردار جعفری کو ہمیشہ پریشان دیکھا۔ ان دونوں ہمسایہ ملکوں میں بہتر تعلقات کے لیے انہوں نے عملی کام بھی کیا اور بہت کچھ لکھا بھی۔ اس سلسلے میں ان کی نظم 'صبح فردا' بلاشبہ دل کے تاروں کو چھو دینے والی تخلیق ہے۔ اس نظم کی تکمیل ۲۵ ستمبر ۱۹۶۵ء یعنی پاک بھارت جنگ کے مہینے کے آخر میں ہوئی۔ ایک بند ہے ۔

یہ سرحد من چلوں کی، دل جلوں کی جاں نثاروں کی
یہ سرحد سرزمین دل کے بانکے شہ سواروں کی
یہ سرحد کج کلاہوں کی، یہ سرحد کج اداؤں کی
یہ سرحد گلشنِ لاہور، دلی کی ہواؤں کی
یہ سرحد امن اور آزادی کے دل افروز خوابوں کی
یہ سرحد ڈوبتے تاروں، ابھرتے آفتابوں کی
یہ سرحد، خوں میں لتھڑے پیارے زخمی گلابوں کی
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

علامہ اقبال کے سوسالہ یوم پیدائش پر سردار جعفری ہی نے سب سے پہلے ایک خوبصورت دستاویزی فلم بنائی۔ اس کے لیے وہ خود اور ہدایت کار خواجہ احمد عباس کافی دن لاہور رہے۔ اس وقت پاکستان میں حکومت یا کسی دوسرے ادبی یا ثقافتی ادارے نے ایسی کسی کوشش کی ضرورت کا احساس تک نہیں کیا تھا۔ فلم بنانے کے سلسلے میں سردار جعفری نے لاہور میں طویل قیام کیا۔ اس سے پہلے بھی وہ لاہور متعدد بار آئے۔ ان کی بیگم سلطانہ کی دو بہنیں آمنہ بیگم، منظور حسین اور خدیجہ عمر مستقلاً لاہور میں رہتی ہیں اس لیے

سلطانہ اور سردار کا ہر دو ہر چار سال بعد آنا جانا رہا اور یوں اُن سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور ہندوستان کے دوسرے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے مقابلے میں ہم ایک دوسرے کے حالات سے زیادہ باخبر رہے۔ گزشتہ برس کے اوائل میں بھی وہ لاہور میں تھے اور اتفاق سے اُس وقت اکادمی ادبیات کے زیرِ اہتمام اُنہوں نے پاک ٹی ہاؤس میں لاہور کے ادیبوں اور شاعروں سے خطاب کیا تھا اور سوالات کے جواب بھی دیے تھے۔

سردار جعفری گزشتہ کئی ماہ سے بیمار تھے، اُن کی بیماری کے بارے میں مجھے اپنے عزیز دوست اسد اللہ کے ذریعے جو برلن میں رہتے ہیں برابر اطلاع ملتی رہی، اسد اللہ برلن سے بمبئی فون کرتا، پھر سلطانہ یا دیگر اہلِ خانہ سے بات کر کے مجھے اطلاع دیتا۔ سردار جعفری نے زندگی کے آخری دو تین ماہ ہسپتال ہی میں گزارے اور اُن کی حالت خاصی مایوس کن رہی، پھر بھی ہم یہی دعا کرتے رہے کہ خدا انہیں صحت دے تاکہ اُن سے ملنے، باتیں کرنے اور ان کی محبت اور شفقت سے مستفیض ہونے کا کچھ مزید وقت مل جائے مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا اور پھر جعفری تو خود ہی کہہ چکے ہیں ؎

کل صبح کے دامن میں تم ہوگے نہ ہم ہوں گے
بس خاک کے سینے پر کچھ نقشِ قدم ہوں گے

اب دوسرے اور بہت سے دوستوں، ہمدردوں اور رفیقوں کی طرح سردار جعفری کی بھی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں مگر یہ ایک بہت پیار کرنے والے، پاکیزہ جذبات سے معمور دل رکھنے والے ہمدرد انسان کی روشن اور دمکتی ہوئی یادیں ہیں، جس نے پوری زندگی ظلم، جبر، استحصال اور منافقت کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ جو چٹان کی طرح اپنے نظریات پر آخر وقت تک قائم رہا اور جس نے ہمیشہ انسان کو سربلند کرنے اور دنیا میں مساوات کے قیام کے خواب دیکھے اور انہیں سچ ثابت کرنے کے لیے عملی جدوجہد کی۔ نقصان تو ہمارے جیسے اُن کے چاہنے والوں کا ہوا جن کی حالت وہی ہے جو کچھ عرصہ قبل اپنے سے بچھڑنے والوں کو یاد کرتے ہوئے علی سردار جعفری کی اپنی تھی اور جس کا اظہار اُنہوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

ایک اک کر کے کھلی تھیں کلیاں، ایک اک کر کے پھول گئے
ایک اِک کر کے ہم سے بچھڑے، باغِ جہاں میں یار بہت

****

(ماہنامہ "تخلیق" لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰ء)

ساجد رشید

رومانی انقلاب کا آخری سالار

نئی صدی کے پہلے سال کی ابتداء اُردو غزل کے ایک اہم بزرگ شاعر مجروحؔ سلطان پوری اور ہندی کے بلند مرتبہ ادیب رام ویلاس شرما کے وصال سے ہوئی۔ ہم اپنے وقت کے دو انقلابی قلمکاروں کو ٹھیک طرح سے رو بھی نہیں پائے تھے کہ علی سردار جعفری بھی اپنے ان دو ہمعصروں کے پیچھے خاموشی سے چل دیئے۔ یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ تینوں شخصیتیں اس جہان رنگ و بو میں کچھ آگے پیچھے وارد ہوئیں تھیں اور رخصت بھی کچھ اسی طرح ہوئیں۔ ایک ہی عہد میں اپنے تیشۂ قلم سے زمانے کی جبیں پر انسانی فکر و عظمت کی تاریخ رقم کرنے والے یہ دانشور ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ انہوں نے جہاں ایک نسل کو متاثر کیا وہاں ادبی لہروں کو نئی دشائیں دیں اور نصف صدی تک ادب کے اُفق پر درخشاں رہے۔

علی سردار جعفری کی موت کے ساتھ ترقی پسند تحریک کا ایک تناور درخت گر گیا۔ موت کی سفاک حقیقت نے ایک انقلابی شاعر اور ادیب کے خوابوں کی دنیا کو اس کے وجود کے ساتھ نگل لیا اور ہم سب بے چارگی سے اس سانحہ کو ہوتا ہوا دیکھتے رہ گئے۔ جسم کا مقدر ہی خاک بسر ہونا ہے۔ وہ چاہے کسی عظیم ہستی کا ہو یا گدا کا۔ سردار جعفری بھی اپنی زندگی کے سخت دشوار گزار سفر کی مسافت کو اپنے وجود کی پوری توانائی کے ساتھ جی کر بڑی شان سے اس پُر اسرار دھند لکے میں کھو گئے ہیں جسے انہوں نے کبھی بھی مابعد الطبیعاتی سطح پر تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ ایک باغی شاعر کی حیثیت سے جہانِ ادب پر ایسے چھائے کہ جوشؔ، فیضؔ اور فراقؔ کے ناموں کے ساتھ ان کا نام بھی ناگزیر ہو گیا تھا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے آخری برسوں میں ایک ایسے لشکر کے سالار بن کر رہ گئے تھے جس میں تھکے ہوئے بزرگ سپاہی اپنی زندگی کی شام کر رہے تھے۔ تقریباً ٦۵ سال قبل سید سجاد ظہیر نے جب ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی تو باغی شاعروں اور ادیبوں کے اس لشکر کے ہراول دستے کے سالاروں میں جعفری صاحب کا نام سرفہرست تھا۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے روشن خیال اور سائنسی نقطۂ نظر رکھنے والوں کی یہ انسانیت پسند تحریک اُردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر چار بڑی زبانوں میں بھی پھیل گئی۔ ہندی میں پرگتی شیل لیکھک سنگھ کے سالاروں میں ڈاکٹر رام ویلاس شرما، یشپال، کیدار ناتھ اگروال، بھیشم ساہنی اور ناگ ارجن کے نام

قابل ذکر ہیں لیکن انہوں نے بھی روشنی ترقی پسند تحریک ہی سے لی تھی۔ ان دنوں جوش، فراق، فیض، سردار، مجروح، کیفی ساحر، مجاز اور جان نثار اختر اُن مقبول شعراء میں سے تھے جن کو دیکھنے اور سننے کے لئے کالج کے طلباء ایسے اُمڈ پڑتے تھے جیسے کہ آج فلمی ستاروں کو دیکھنے کے لئے نوجوان ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جعفری صاحب اپنے ہمعصر شعراء میں ایک علاحدہ مقام اس لئے بھی رکھتے تھے کہ ان کی شناخت صرف ایک شاعر ہی کی نہیں تھی، وہ افسانہ نگار (جعفری صاحب نے خوبصورت افسانے بھی لکھے ہیں) اور ناقد تو تھے ہی۔ وہ ایک پُر اثر خطیب بھی تھے۔ وہ اپنے زورِ خطابت سے سامعین کو مسحور کر دیتے تھے۔ جعفری صاحب کی مقبولیت نے اگر شخصی سطح پر انہیں فیض پہنچایا تو ترقی پسند تحریک کو کسی حد تک نقصان بھی پہنچایا۔ جب کسی وجود کے اطراف میں ایک روشن ہالہ کھنچ جاتا ہے تو اس کی کمزوریاں اور کوتاہیاں شخصیت کی اس خیرہ کن روشنی میں نظر نہیں آتی ہیں۔۔ ترقی پسند تحریک کے اس ابتدائی دور میں جعفری صاحب تحریک کا ماحصل تھے اور آگے چل کر وہ اسی تحریک کے لئے کہیں نہ کہیں رخنہ بھی بننے لگے تھے۔

سردار جعفری اپنی کمسنی ہی سے باغی تیور رکھتے تھے۔ وہ ایک متمول کسان خاندان میں پیدا ہوئے تھے لیکن کارل مارکس نے اُن پر ایک نئی دنیا کو منکشف کیا تھا جہاں بھوک نہیں تھی، غربت نہیں تھی، استحصال نہیں تھا بلکہ کائنات میں معلق اس ذرے کو جنت سے نکالے گئے ملعون انسان کے جینے لائق ایک بہتر دنیا بنانے کا ایک مجنون خواب تھا

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہیں ہے

اسی نئی دنیا کے خواب کو لے کر وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے جہاں دو قومی نظریے کی گرم ہوا نے پوری یونیورسٹی کے طلباء کو دو گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ بڑا گروہ پاکستان نواز تھا تو ایک بہت چھوٹا گروہ 'نیشنلسٹ' مسلمانوں کا تھا۔ ظاہر ہے کہ فرقہ واریت کی سیاست کے اس طوفان میں ایسے روشن خیال طلباء کا اپنے نظریات پر ثابت قدم رہنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ سردار جعفری نام کے اس نوجوان طالب علم کا مقام آخر الذکر قسم کے طلباء میں بہت نمایاں تھا۔ ۱۹۳۶ء میں انہیں انگریز سامراج کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کے جرم میں یونیورسٹی سے نکلنا پڑا تھا۔ یہاں سے وہ لکھنؤ یونیورسٹی پہنچے جہاں سے انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ جرم وہی انگریز سامراج مخالف سرگرمیاں! تب تک جعفری صاحب پورے ملک میں ایک انقلابی شاعر اور ACTIVIST کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ اُن کے کوہ شکن حوصلوں کا بلند آہنگ اُن کی نظموں میں محسوس کیا جانے لگا تھا۔

ہماری رد میں ہر ایک شے ہے زمیں سے تاروں کی انجمن تک
ہماری پرواز فکر ہے بجلیوں سے کرنوں کی بانکپن تک
ہماری تخلیق کا کرشمہ ہے سوت کے تار سے کفن تک

(ایشیا جاگ اُٹھا)

یہ مشاعروں کی تہذیب کا دور تھا۔ پورے ملک میں اکتوبر سے مارچ کے مہینے تک مشاعرے منعقد ہوتے۔ یہ مشاعرے رات کے پہلے پہر سے رات کے بھیگنے تک چلتے کبھی کبھی فجر کی اذان پر مشاعرہ کا اختتام ہوتا۔ خواتین کے لئے مشاعرہ گاہ میں پردہ کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ جوش، فیض، فراق، مجاز۔ جاں نثار اختر، ساحر، کیفی مجروح اور سردار ان مشاعروں کے ایسے ہیرو ہوتے جن کے بغیر کسی مشاعرے کی کامیابی کا تصور محال تھا۔ ترقی پسند تحریک کی مقبولیت میں ان مشاعروں کا بہت اہم رول رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے آزادی کے بعد کے بارودی دنوں میں رجعت پسندی اور فرقہ واریت کا مقابلہ قلم سے جس سطح پر کیا تھا اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

یہ خدا، یہ دیوتا دوروز ہی رہ پائیں گے جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مرجائیں گے۔

تقسیم وطن کے بعد سجاد ظہیر کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد تحریک کی باگ ڈور جعفری صاحب نے سنبھال لی تھی لیکن سن ساٹھ میں انہیں ایک بار پھر آرتھر جیل بھیج دیا گیا۔ بقول رفعت سروش۔

"شاید آرتھر روڈ جیل میں سردار نے اپنے نظریات پر نظر ثانی کی اور کسی قدر مفاہمتی رویہ اختیار کیا اور رہائی کے بعد وہ ادبیات کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے اور موقع ملتے ہی سوشلسٹ ممالک کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے۔"

(کتاب نما سردار جعفری نمبر مرتبہ رفیعہ شبنم عابدی)

سردار اگرچہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے لیکن وہ بھی دوسرے بہت سے کمیونسٹوں کی طرح پنڈت نہرو کے رومانی سوشلزم کے اسیر تھے۔ یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ سردار جعفری اور اُن کے حلقہء احباب نے ترقی پسند تحریک کو ایک ادبی اور سماجی تحریک سے زیادہ کانگریس کا ہمنوا بنا دیا۔ پرائم منسٹر ہاؤس کے لان پر نہرو کے ساتھ **نہروین سوشلزم** (Nehruvian Socialism) کی چائے پیتے ہوئے کمیونسٹوں نے اپنے انقلاب کو شکر کی طرح گھول کر پی لیا تھا۔ جعفری صاحب کے اندر کے انقلابی نے پتہ نہیں کیسے ہندوستان کی سب سے بڑی ادبی تحریک کی شعلگی اور اپنے باغیانہ تیوروں کو نہرو کی شیروانی میں لگے گلاب کے تروتازہ پھول کے ساتھ ٹانک دیا تھا۔

نہرو کی شخصیت کے سحر نے سیاست میں ڈانگے جیسے انقلابی لیڈر کو جس زوال سے دوچار کیا، کم وبیش وہی حشر ادب میں انقلابی تیور رکھنے والے جعفری صاحب کا ہوا۔ دو مختلف لیکن اہم میدانوں میں سرگرم شخصیتوں نے اپنا ہی نہیں اپنی تحریکات کا نقصان نہرو میں اپنے یقین محکم کی وجہ سے کیا جو ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ استحصال اور ظلم وجبر کے شکار طبقات کے حق میں اور اسٹیبلشمنٹ کے خلاف سب سے بلند آواز رکھنے والی یہ دونوں عظیم شخصیتیں نہرو ہی نہیں ان کی عقیدت میں اُن کے خاندان کی بھی ارادت مند ہوگئی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۵ء کی ایمرجنسی کے نفاذ کے

بعد اندرا گاندھی کی آمریت کی حمایت کرنے تک میں انہیں وہ سابھی علامتیں ہوا تھا۔ ایک جانب وہ سردار جعفری تھے جو ۱۹۷۵ سے ۱۹۹۶ء تک اسٹیبلشمنٹ اور استحصال پسند طبقے کی مخالفت میں اپنی قوتِ تحریر اور تقریر دونوں کا بے پناہ استعمال کرتے رہے تھے لیکن آرتھر روڈ جیل سے رہائی کے بعد جعفری صاحب میں اُن کے احباب نے بڑی غیر معمولی تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔ وہ رفتہ رفتہ اسٹیبلشمنٹ کی بہت بڑی مشین کے ایک پرزے میں ڈھلتے چلے گئے۔ جعفری صاحب اربابِ اقتدار کی نظروں میں جیسے جیسے چڑھ رہے تھے ترقی پسند تحریک کا گراف اسی رفتار سے گرنے لگا تھا۔ اب یہ تحریک محض کاغذ پر ہی رہ گئی تھی۔ اس کا تنظیمی ڈھانچہ ٹوٹ چکا تھا۔ نئے ادیبوں اور شاعروں کے لئے اس میں کوئی جگہ تھی نہ ہی کوئی کشش۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جس ترقی پسند تحریک نے انگریز سامراج کے جبر سے لوہا لیا تھا وہ ایسے وقت میں بے اثر ہو چکی ہے جب پورے ملک میں فرقہ واریت اور مذہبی فاشزم کی کالی آندھی چل رہی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ جعفری صاحب نے تحریک کو تنظیمی سطح پر مضبوط کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ انہوں نے ایسے ادیبوں کو ترقی پسند تحریک میں قدم جمانے نہیں دیا جو اُن کے خیالات سے اختلاف رکھنے کی جرأت رکھتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کی اس کمزوری کا سب سے زیادہ فائدہ رجعت پسندوں نے جدید ادب کے نام پر اٹھایا۔ افسوس کہ ترقی پسند تحریک کا تابوت تیار کرنے والوں ہی سے جعفری صاحب کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ اور وہ اپنے ان نظریاتی دشمنوں کو ایسے وقت میں گلے لگا بیٹھے جب رجعت پسندوں کے خلاف نئے لکھنے والے علمِ بغاوت بلند کر رہے تھے لیکن یہ اعتراف تو کرنا ہی ہوگا کہ جعفری صاحب نے مذہبی انتہا پسندوں سے کبھی مفاہمت نہیں کی، خاص طور پر مسلم انتہا پسندوں کے سامنے انہوں نے کبھی سپر نہیں ڈالی۔ اُس وقت بھی نہیں جب شاہ بانو کی حمایت کرنے پر حیدرآباد میں منعقد ایک آل انڈیا مشاعرہ میں کچھ پُرجوش مسلم نوجوانوں نے ان کے گلے میں جوتے کا ہار پہنا کر قومِ مسلم پر مذہبی غیر رواداری کے الزام کی تصدیق کر دی تھی۔ انتہا پسند مسلمانوں کے اس سلوک کے بعد بھی وہ اپنے موقف پر قائم رہے اور جب اصغر علی انجینئر اور تسلیمہ نسرین کا معاملہ سامنے آیا تو دونوں ہی موقعوں پر جعفری صاحب اُردو کے پہلے ادیب تھے جنہوں نے مذہبی انتہا پسندوں کی سخت لفظوں میں مذمت کی تھی۔ اس طرح انہوں نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان نوجوان ادیبوں کے مقابلے میں جن کو ضعیفِ فکر ہو گیا ہے وہ ضعیف جسم رکھتے ہوئے بھی جوان حوصلہ رکھتے ہیں۔

جعفری صاحب دراصل ایک رومانی انقلابی تھے۔ اُن کی رومانیت انہیں ابتداء میں مارکس کے فلسفے تک لے گئی، پھر وہ نہرو کے سوشلزم میں اس انقلاب کو تلاش کرتے رہے، اس کے بعد اندرا گاندھی کے پرکشش نعروں میں انہیں انقلاب کی آہٹ سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ اسی رومانی انقلاب کے تعاقب میں چلتے رہے جو ریگزار میں سراب ہی دکھاتا ہے، اس کے باوجود اُردو ادب میں اُن جیسا بلند قامت ادیب اب کوئی دوسرا نہیں رہا۔ ☆☆☆

(سہ ماہی نیا ورق، ممبئی جولائی۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

عبداللہ ملک

سردار جعفری

نصف صدی پہلے کی یادیں

سردار جعفری میرے بہت ہی پیارے دوست بھی ہیں اور محترم بزرگ بھی اس لئے کہ وہ مجھ سے آٹھ برس عمر میں زیادہ ہیں۔ میری اور اُن کی دوستی کو پورے پچپن برس ہونے کو آرہے ہیں لیکن اُن کی شاعری سے متاثر ہونے کی مدت تو بالمشافہ دوستی اور قربت سے بھی سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ اس ساٹھ پینسٹھ برس کی داستان رقم کرنا مقصود نہیں بلکہ مجھے صرف ان دنوں کی اپنی یادداشتوں کو حوالۂ قرطاس کرنا مقصود ہے، جب مجھے سردار جعفری، سبطِ حسن اور مشہور آرٹسٹ شاکر علی کے ہمراہ ایک ہی چھت تلے بمبئی کے علاقے بائیکلہ کے ایک فلیٹ میں آٹھ نو مہینے اکٹھے زندگی بسر کرنی پڑی اور اس کی یادیں میرے لئے اب بھی سرمایۂ افتخار ہیں۔

یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگریس بمبئی میں منعقد ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں بمبئی میں ہی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر واقع تھا اور دہلی میں کمیونسٹ پارٹی کا صدر دفتر تقسیم ملک کے آٹھ دس برس بعد ہی منتقل ہوا۔ اُس دور میں بمبئی کمیونسٹ پارٹی کے لئے بہت ہی اہم مرکز ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ یہ مزدور طبقہ کا سب سے اہم مرکز تھا اور اسی "مزدور طبقے" میں ہی اس دور کے کمیونسٹ لیڈروں کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ چنانچہ ڈانگے، مند یوے، میرجکر، ادھیکاری یہ سب اسی مزدور طبقے کے اہم لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ یہ درست ہے کہ یہ سب دانشور طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے ایک نہ ایک انداز میں مزدور طبقے میں ان کی ٹریڈ یونین میں کام کر کے ہی اس برصغیر کی ٹریڈ یونین تحریک کی قیادت میں اپنا ایک مخصوص مقام پیدا کیا تھا۔

یہ زمانہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی زندگی میں بڑا ہی اہم اور تاریخی زمانہ تھا اس لئے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے کمیونسٹوں نے اُس وقت لڑی جانے والی جنگ کو انڈین نیشنل کانگریس کے موقف کے خلاف اسے قومی جنگ قرار دیا تھا اور یہ قوم پرست حلقے میں بہت حد تک معتوب ٹھہرے تھے۔ کیونکہ وہ اس جنگ کو ایک سامراجی جنگ تصور

کرتے تھے لیکن ایسے ہیجان خیز زمانے میں ہم لوگ جو کیمونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے اور فاشزم کی بڑھتی ہوئی یلغار کے خلاف سینہ سپر ہونے کا یارا رکھتے تھے۔ زبردست محنت طلب دور تھا چنانچہ ۱۹۴۲ء میں جب ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی پر سے پابندی اُٹھائی گئی اور اُس نے ایک قانونی جماعت کی حیثیت سے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو یہ حقیقتاً پہلی سیاسی جماعت تھی جس نے عوام میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے اور رائے عامہ کو اپنے موقف کے حق میں کرنے کے لئے ایک سائنسی انداز میں کام شروع کیا اور سب سے پہلے انہوں نے بمبئی سے مختلف زبانوں میں اپنے ہفتہ وار اخبارات کا اجراء کیا۔ اُس زمانے میں بمبئی سے انگریزی ہفتہ وار اخبار "پیپلز وار" اُردو میں "قومی جنگ" اور ہندی میں "جن یُدھ" کا اجراء کیا گیا۔ اسی طرح صوبائی زبانوں میں بھی تمام صوبوں سے اخبارات کا اجراء عمل میں آیا۔ چنانچہ پنجاب کی کیمونسٹ پارٹی نے اُردو میں "جنگِ آزادی" اور پنجابی گورمکھی میں اخبارات کا اجراء ہوا۔ فیروز الدین منصور "جنگِ آزادی" کے مدیر تھے اور مَیں اسسٹنٹ کے طور پر اُس میں شامل ہوا اور اُسی زمانے میں مرکزی اخبار "قومی جنگ" جس کے مدیر اعلیٰ سجاد ظہیر ٹھہرے، اُس میں اُن کے رفقاء میں سید سبطِ حسن اور سردار جعفری شامل ہوئے۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے آشنا ٹھہرے لیکن جب پارٹی کانگرس منعقد ہوئی اور مَیں بھی پنجاب پارٹی کی طرف سے اس کانگرس میں ایک مندوب کی حیثیت سے شامل ہوا تو بمبئی میں باقاعدہ بالمشافہ ملاقات ہوئی اس لئے کہ میری خبریں اور پنجاب میں پارٹی کی سرگرمیوں کے بارے میں میرے تبصرے "قومی جنگ" میں بھی شامل ہوتے تھے اور ۱۹۴۲ء کے آخر میں تو میرے ایک انٹرویو نے پارٹی حلقوں میں خاصا تہلکہ مچادیا تھا۔ یہ انٹرویو تھا جو مَیں نے قائداعظم محمد علی جناح سے ایک کیمونسٹ اخبار نویس کی حیثیت سے کیا تھا۔ یہ پہلا انٹرویو تھا جس میں مختلف مسائل پر قائداعظم سے مَیں نے سوالات کئے بالخصوص راج گوپال آچاریہ کے فارمولے اور ملی دفاع اور قومی حکومت جیسے مسائل پر قائداعظم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چنانچہ میرا یہ انٹرویو ہندوستان کے تمام کیمونسٹ اخبارات میں پہلے صفحے کی زینت بنا تو اسی بنا پر سید سجاد ظہیر نے پنجاب کیمونسٹ پارٹی کے قائد سردار سوہن سنگھ جوش سے کہا کہ وہ عبداللہ ملک کو بمبئی میں ہی "قومی جنگ" کے ادارتی عملے میں شرکت کی اجازت دے دیں کیونکہ "قومی جنگ" کے سب سے زیادہ پڑھنے والے پنجاب میں ہی ہیں اور ہمارے ادارتی عملے میں کوئی پنجاب کی سیاست پر لکھنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ اس بنیاد پر میرے بمبئی میں ٹھہرنے کا فیصلہ ہوا اور سجاد ظہیر نے ہی سبطِ حسن اور سردار جعفری کو کہا کہ عبداللہ ملک تمہارے ساتھ ہی ٹھہرے گا۔

اس طرح مَیں بائیکلہ کے اس فلیٹ میں جہاں سردار جعفری اور سبطِ حسن ٹھہرے تھے، میرا بھی زمین پر بستر لگ گیا۔ یہ فلیٹ دراصل شاکر علی کا تھا جو اُس زمانے میں بمبئی کے آرٹس اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ اُن کے ہمراہ اُن کا ایک دوست نواب جو غالباً فلموں کے چکر میں بمبئی آیا ہوا تھا، وہ بھی مقیم تھا۔ پھر سبطِ حسن اور سردار آگئے اور سب سے آخر میں مَیں پانچواں شخص تھا۔ دراصل یہاں سب لوگوں کی اپنی اپنی زندگی تھی جس کا دوسرے کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہ

تھا۔ اب ہم تین آدمی دن بھر اکٹھے ایک ہی دفتر میں کام کرتے لیکن دفتر سے نکلنے کے بعد کبھی ایک دوسرے سے واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ ہر ایک کی اپنی دنیا ہوتی تھی اور مَیں اس دنیا میں سب سے چھوٹا اور پنجاب کا نووارد نوجوان تھا جس کے ساتھ یہ بزرگ اپنی زندگی کا کوئی وقت SHARE کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہی وہ دن تھے جب سعادت حسن منٹو کو پتہ چلا کہ مَیں بمبئی آیا ہوں اور وہ صبح صبح مجھے ملنے کے لئے آ گیا اور اس کے بعد وہ مصر ہو گیا کہ مَیں روزانہ ناشتہ اُس کے ہاں کروں۔ دراصل اُس کو نہ جانے کیسے میری تنہائی کا احساس ہو گیا اور چونکہ میری سعادت حسن منٹو سے لاہور میں باری علیگ کے توسط سے انہی کے اڈے پر کئی ایک شامیں اکٹھی گزر چکی تھیں اور وہ مجھے خاصا پیار کرتے تھے چنانچہ یہی رشتہ تھا جس نے اُن کی موجودگی نے بمبئی میں میرا قیام خاصا سہل بنا دیا اور اس بمبئی میں قیام کے دوران دوسرا پیار اور محبت کا جو جھونکا مجھے محسوس ہوا وہ خود سید سجاد ظہیر اور اُن کی بیگم رضیہ تھیں جو اکثر مجھے اپنے گھر بلا کر خاطر کرتے اور ہر وقت انہیں یہ احساس رہتا کہ پنجاب کا رہنے والا ہے اور اُس کو یہاں پارٹی ہیڈ کوارٹر میں باجرہ کی روٹی اور مدراسیوں کی دال کھانی پڑتی ہے، اُس زمانے میں جنگ کی وجہ سے گندم بالکل پابند تھی فقط راشن میں باجرہ ملتا تھا۔

بمبئی کے اس قیام کے دوران گو سردار جعفری اور سید سبط حسن سے ایک نامعلوم اجنبیت قائم رہی لیکن بعد کی زندگی میں یہ اجنبیت پیار میں بدل گئی کیونکہ سردار جعفری کی بیگم سلطانہ اور اُن کی چھوٹی بہن خدیجہ لاہور میں مقیم تھیں ور اُن کے ساتھ میرے پارٹی کام کے حوالے سے خاصے مراسم ہو گئے خصوصاً خدیجہ عمر سے۔ اور وہ میری شادی کے بعد میری بیگم سے کافی گھل مل گئی اس لئے آج بھی اُن سے بہت پیار کے مراسم ہیں ور سردار اور سلطانہ جب بھی لاہور آتے ہیں اور ہم پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہیں۔ کچھ آہیں بھرتے ہیں اور کچھ ولولے تازہ کرتے ہیں۔

میں نے ان سطور میں سردار جعفری کی ادبی اور شاعرانہ زندگی پر جان بوجھ کر کچھ نہیں لکھا اس لئے کہ سردار جعفری اس وقت زندہ شاعروں، نثر نگاروں اور اہلِ علم میں واحد شخص ہیں جس کی تحریروں کے حوالے سے اس برصغیر اور تقسیم کے بعد کے ہندوستان کی سیاسی اور کمیونسٹ تاریخ کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ سطور لکھتے وقت مجھے خیال آ رہا ہے کہ کاش مجھے موقع ملتا تو مَیں سردار کی نگارشات اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالتا اور بتاتا کہ کس طرح سردار نے بحیثیت مارکسی اور کمیونسٹ کے اپنے مسلک کو شاعرانہ زبان عطا کی ہے اور اُس نے اس میدان میں ۱۹۳۶ء سے اب تک ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اُس نے زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے مارکسی فکر کی روشنی میں شعوری طور پر قبول کیا ہے۔

ہر منزل اک منزل ہے نئی اور آخری منزل کوئی نہیں
اک سیلِ رواں ہے دردِ حیات اور درد کا ساحل کوئی نہیں
ہر گام پہ خون کے طوفاں ہیں ہر موڑ پہ بسمل رقصاں ہیں
ہر لحظہ ہے قتلِ عام مگر کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں

مجھے یہ معلوم نہیں کہ سردار جعفری کیمونسٹ تحریک کا باقاعدہ رکن کب بنا۔ ویسے ایک لحاظ سے سردار جعفری، اُس کی شاعری، اُس کی نثر، اور اُس نے برصغیر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر جو کام کیا ہے، اُس کا تجزیہ کرنے کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کیونکہ خود سردار کی شاعرانہ اور علمی نشو ونما کیمونسٹ تحریک سے جڑی ہوئی ہے لیکن سردار جعفری نے اس برصغیر میں ترقی پسند تحریک کے اجراء سے پہلے ہی غالباً شاعری کے میدان میں قدم رکھ دیا تھا اور اُس دَور کی بات ہے جب علی گڑھ میں ہندوستان کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں اور آزادی کی تحریکوں نے طلباء کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور دراصل یہی وہ فضا تھی جس نے ترقی پسند تحریک کو قبول کرنے کے لئے زمین ہموار کر دی تھی چنانچہ ایک لحاظ سے پہلے دن سے ہی وہ عملاً نہ صرف ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے بلکہ سجاد ظہیر کے اُن چار پانچ رفقاء میں شامل ہو گئے جو ایک طرح سے اس تحریک کے کل وقتی کارکن سمجھے جانے لگے۔ چنانچہ جب لکھنؤ سے ۱۹۳۶ء کے زمانے میں ہی "نیا ادب" نکلنا شروع ہوا تو اُس میں سب سے پیش پیش ڈاکٹر علیم، سید سبطِ حسن، سردار جعفری اور خود سجاد ظہیر ہی تھے۔ اور برصغیر کی تقسیم تک یہ رفقاء قریب قریب ایک ساتھ رہے۔ سوائے ڈاکٹر علیم کے باقی کے تو آخر تک کیمونسٹ پارٹی کے کل وقتی رکن رہے تا آنکہ سید سجاد ظہیر دوسری کانگرس کے فیصلے کے مطابق پاکستان کیمونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری نامزد ہو کر پاکستان چلے گئے اور سید سبطِ حسن جو اُس زمانے میں ہندوستان سے باہر تھے، وہ بھی واپس آ کر پاکستان آ گئے۔ لیکن سردار جعفری نے پاکستان آنے سے گریز کیا اور ہندوستان میں پارٹی اور ترقی پسند ادب کا پرچم اُٹھائے رہے۔

سردار جعفری کیمونسٹ بھی ہیں۔ مارکسی فکر اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے اور جہاں ان افکار اور ہندوستانی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیاں اُن کی شاعری اور تجزیوں کا موضوع رہے ہیں وہاں ایک مسلمان ہونے کے ناتے بھی ایک طرف اُردو کی حفاظت کے لئے شعوری طور پر زبردست جدوجہد کرنی پڑی ہے تو دوسری طرف اُن کو مسلمانوں کے اندر علیحدگی کے رجحانات اور رویوں کے خلاف اگر جہاد کرنا پڑا ہے تو دوسری طرف ہندو تعصب اور مسلمانوں کے خلاف ایک گونہ نفرت کے خلاف بھی مصروفِ پیکار ہونا پڑا ہے۔ یہاں میرے پاس نہ تو اُن کی تمام کتابیں موجود ہیں۔ یہ سب باتیں میں اپنے حافظے سے لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں کچھ لغزشیں ہوئی ہوں تو مَیں معذرت خواہ ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں اُس نے مسلمان صوفیا کی مانند وحدۃ الوجود کا بھی سہارا لیا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنے اسی جہاد کے سلسلے میں کبھی اُردو شاعری اور بالخصوص غالب کو دیوناگری رسم الخط میں منتقل کر کے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی تو کبھی "کبیر بانی" "دیوانِ میر اور غالب پر کتابیں رقم کیں۔

☆☆☆

(مجلسِ فروغِ اُردو ادب، دوحہ، دوحہ)

محمد حسن

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

سردار جعفری کو آخری سلام

سردار جعفری سے ملاقات تو بہت بعد میں ہوئی مگر نام بہت پہلے سن رکھا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں جب پہلی بار بعض صوبوں میں کانگریس کا راج قائم ہوا تو اتر پردیش میں بھی کانگریس کی حکومت قائم ہوئی اسی زمانے میں اردو کی تین کتابوں پر ڈھائی سو یا پانچ پانچ سو روپے کے انعامات ملے۔ اسرار الحق مجاز کا مجموعہ کلام آہنگ علی سردار جعفری کا افسانوں کا مجموعہ اور سید سبط حسن کی تاریخ سے متعلق کوئی کتاب کا نام اب یاد نہیں۔ تینوں دوستوں نے انعام کی یہ رقم جمع کر کے رسالہ 'نیا ادب' نکالنے کا ارادہ کیا۔ سید حسن ظہیر کا ایک مکان حضرت گنج کے نواح میں خالی پڑا تھا وہاں دفتر قائم ہو گیا اور رسالہ اس مفلوک الحالی کی حالت میں نکلنے لگا۔ حیات اللہ انصاری کانگریس کے اردو اخبار 'ہندوستان' کے مدیر تھے جس میں ڈاکٹر محمد اشرف کے مضامین قسط وار چھپا کرتے تھے۔

میری ملاقات نہ سردار جعفری سے تھی نہ 'نیا ادب' سے البتہ ان دونوں کے نام سنا کرتا تھا پھر جب ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے بی اے میں داخلہ لیا تو قریب سے تو نہیں دور سے ان دونوں سے واقفیت ہوئی۔

سردار سے میری ملاقات تو بہت بعد کو ہوئی مگر غائبانہ ملاقات البتہ خاصی تفصیلی ہو گئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں دستور یہ تھا کہ ایک سال مسلمان امیدوار یونین کا صدر منتخب ہوتا تھا اور اس سال سکریٹری ہندو ہوتا تھا اس کے بعد دوسرے سال ہندو صدر اور مسلمان امیدوار سکریٹری منتخب ہوتا تھا۔ سردار جعفری نے جس سال لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا یعنی داخلہ لینے کے چند ماہ بعد ہی صدارت کے امیدوار

ہوئے۔ مقابل تھے لکھنؤ یونیورسٹی کے پرانے طالب علم علی جواد زیدی اور حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ نووارد سردار جعفری منتخب ہو گئے۔

علی سردار جعفری علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے۔ وہیں پہلی بار اسرارالحق مجاز کی ملاقات علی سردار جعفری سے ٹینس کورٹ میں ہو گئی تھی جہاں دونوں ٹینس کھیلنے جایا کرتے تھے دونوں میں سے کوئی بھی ان دنوں ادبی دنیا میں مشہور نہیں ہوا تھا مگر یہ دوستی ادبی شہرت مل جانے کے بعد بھی قائم رہی۔

علی گڑھ کی یادوں میں فلک نما کوٹھی کی یادیں بھی تھیں جہاں سلطانہ رہتی تھیں جن سے سردار نے شادی کی اور جنھیں اپنی نظم 'میرا سفر' کے ایک مصرعہ میں اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے:

ہر عاشق ہے سردار یہاں ہر معشوقہ سلطانہ ہے

علی گڑھ میں سردار جعفری کا زمانہ خاصہ طوفانی زمانہ تھا۔ دراصل اس زمانے کا علی گڑھ بڑے انقلابی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ وہاں ڈاکٹر علیم بھی تھے اور پروفیسر حبیب بھی۔ خواجہ منظور حسین بھی تھے اور شبیہہ الدین لائبریرین بھی ایک طرف خاکساروں کے لیڈر بھی اسٹاف میں شامل تھے اور دوسری طرف ڈاکٹر ضیاءالدین جیسے لوگ بھی تھے مگر علی گڑھ میں سردار جعفری کی اس دور کی سرگرمیوں کی تفصیلات معلوم نہیں البتہ وہاں سے نکلے تو ان پر مارکسزم اور کمیونزم کے اثرات غالب تھے اور ان دونوں سے بڑھ کر قوم پرستانہ خیالات تھے جو ملک کو آزاد دیکھنے اور ہر قسم کی طبقاتی اور دقیانوسی ظلم وستم سے محفوظ دیکھنے کی خواہش سے عبارت تھے۔

اس زمانے میں ایک عجیب حادثہ ہوا۔ سر مارس گائر ان دنوں ہندوستانی کی عدالت عالیہ کے جج تھے اور بعد میں دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی مقرر ہو گئے تھے۔ انھوں نے باغیانہ سرگرمیوں کے الزام میں مقیم الدین فاروقی کو دہلی یونیورسٹی سے نکال دیا کیوں کہ انھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف سخت تقریر کی تھی اس پر قوم پرست طلبا نے ہڑتال کی اور ان پر لاٹھی چارج ہوا۔

علی سردار جعفری ان دنوں لکھنؤ آ گئے تھے۔ سر مارس گائر غالباً لکھنؤ یونیورسی کا کانووکیشن ایڈریس پڑھنے کے لیے لکھنؤ آئے تو سردار جعفری کی سربراہی میں ان کے خلاف مظاہرہ کیا گیا، لاٹھی چارج ہوا اور سردار کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

جب اترپردیش میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی اور 'نیا ادب' نکلنے لگا تو سردار جعفری نے سبط حسن

اور مجاز سے مل کر اس رسالے کے ذریعے قدامت پرستی اور بیرونی حکومت کے خلاف آزادی کی آواز اٹھائی۔ یہ مہم ہر قسم کی قدامت پسندی کے خلاف تھی۔ 'انگارے' کے نام سے افسانوں کا جو انتخاب چھپا تھا وہ ضبط ہو چکا تھا اور اسے فحش قرار دیا گیا تھا۔ 'انگارے' کی اسی روایت آزادیٔ تحریر و تقریر کو 'نیا ادب' نے اپنا منشور بنا رکھا تھا۔

'نیا ادب' نے اردو ادب میں نیا رجحان پیدا کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ترقی پسندی کی طرف میلان عام کیا۔ تھوڑے دنوں بعد جوش ملیح آبادی کا رسالہ 'کلیم' بھی اس میں شامل کر لیا گیا ہے اور اس کا نام 'نیا ادب' اور 'کلیم' قرار پایا۔ رسالے کے شمارے خاصی بے ترتیبی سے نکلے۔ مالی دشواریاں بھی تھیں، جن میں سے بعض کا ذکر سردار جعفری نے 'لکھنؤ کی پانچ راتیں' میں کیا ہے۔ خاص طور پر وہ واقعہ جب یہ لوگ کسی دوست کے ہاں 'نیا ادب' کا زر سالانہ وصول کرنے گئے تھے اور انھوں نے جو کرنسی نوٹ دیا اس کی نقدی بھی ان تینوں دوستوں کے پاس نہ تھی یا کسی طرح ایک انگریز (یا امریکی) سپاہی اپنے کتے کا نام نیرو رکھ کر اسے رے فلمز سنیما لکھنؤ کے سامنے اس کے نام سے اسے پکار رہا تھا۔ ان تینوں کی قومی غیرت جوش میں آئی اور انھوں نے ایک بازاری کتے کو نیلسن نام دے کر پکارنا اور چمکارنا شروع کیا۔ اس پر اس انگریز یا امریکی سپاہی کو غصہ آ گیا اور نوبت مار پیٹ تک پہنچی۔ اتفاق سے ان دوستوں کے ساتھ ایک کشمیری چک نامی 'پانیر' کے سب ایڈیٹر تھے وہ تنومند تھے اور انھوں نے اس انگریز یا امریکی کی پٹائی کر دی۔ سردار جعفری کے بیان کے مطابق مجاز اس دوران ناچ ناچ کر "بول اری او دھرتی بول" گیت کے بول دہرانے لگے۔

اسی رسالہ 'نیا ادب' کے ایک شمارے میں محمد حسن عسکری کا افسانہ 'پھسلن' چھپا تھا جو بعض لوگوں کے بیان کے مطابق فراق صاحب سے حسن عسکری کے ذاتی تعلقات کا افسانہ ہے مگر اس افسانے کو فحش قرار دیا گیا۔ نیا ادب ہی پر منحصر نہیں اس دور کے نئے ادب میں ترقی پسندی اور عریاں نگاری کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ 'انگارے' پر بھی پابندی انقلابی افسانوں کے بجائے عریاں افسانوں کی بدولت عائد ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ن۔ م۔ راشد، میراجی اور سعادت حسن منٹو کو بھی ترقی پسندوں کا امیر کارواں سمجھا جاتا تھا اور خود 'انگارے' میں بھی سجاد ظہیر اور احمد علی تک افسانوں میں عریانی بھی موجود ہے اور اس زمانے کے معیار کے برخلاف مذہبی اور سماجی اعتبار سے قابل اعتراض تھا۔

'نیا ادب' جلد ہی بند ہو گیا اور سردار جعفری جیل کے پہلے تجربے کے بعد سیاست کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ ان کی شاعری میں بھی یہی ہنگامی لہجہ در آیا۔ آخر کار ۱۹۴۲ء میں کیمونسٹ پارٹی پر سے پابندی ہٹی اور پارٹی کا باقاعدہ دفتر بمبئی میں قائم ہوا اور اس کا اخبار 'قومی جنگ' شائع ہونے لگا تو سردار جعفری بھی

بمبئی پہنچے اور پارٹی میں کل وقتی کارکن ہوگئے۔ 'قومی جنگ' (اردو) کی ادارت میں بھی سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف کے ساتھ شامل ہوئے اور پارٹی کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں بھی شریک ہوگئے۔ اسی زمانے میں انڈین پیپلز تھیٹر کی تحریک شروع ہوئی اور اس کے لیے بھی سردار جعفری نے کئی گیت اور ڈرامے لکھے۔ بعد کو ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ 'یہ کس کا خون ہے' نام کا ڈراما بھی خواجہ احمد عباس کے ساتھ مل کر لکھا۔

پھر کمیونسٹ پارٹی کی سیاست نے ایک نئی کروٹ لی۔ ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی بحریہ کی بغاوت ہوئی اور اس بغاوت کی کمیونسٹ پارٹی نے بھرپور حمایت کی۔ اس پر نظمیں سردار نے بھی لکھیں اور اسے انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیا۔ یہ صحیح بھی تھا کیوں کہ انگریز حکومت نے اسے خطرے کی گھنٹی سمجھ کر ہندوستان کو آزاد کرنے کی ٹھان لی اور آخرکار لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کا منصوبہ بنایا۔ ملک تقسیم ہوگیا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ فسادات اور لاکھوں آدمی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہوگئے۔

اسی زمانے میں کمیونسٹ پارٹی نے انقلابی حکمت عملی اپنائی اور ۱۹۴۸ء میں پارٹی نے انقلاب کا نعرہ دیا تلنگانہ اور شھاگا کی تحریکیں شروع ہوئیں ملک بھر میں طویل ہڑتال کا نعرہ دیا گیا مگر ہڑتال کہیں نہیں ہوئی۔ سردار پٹیل وزیر داخلہ تھے۔ انھوں نے پارٹی پر پھر پابندی لگادی اور اسی دوران سردار جعفری پھر جیل چلے گئے۔ البتہ اسی زمانے میں پارٹی کے ایک خفیہ سرکلر میں سردار جعفری کے جیل میں اسٹاف سے دوستی بڑھانے اور مراعات حاصل کرنے کے الزام میں پارٹی سے نکالے جانے کی اطلاع بھی ملی۔

تحریک ختم ہوگئی مگر سردار جعفری کی شاعری کا رنگ نہیں بدلا۔ ان کی شاعری کا رنگ خالص ہنگامی تھا ان کی نظموں میں نعرہ بازی کی گونج تھی ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا انداز تھا، تقریر کا لب و لہجہ تھا اور یہی لب و لہجہ سردار جعفری کی شاعری کے ذریعہ وقت کا دستور بنا جا رہا تھا۔ سردار کو بھی اس کا احساس تھا چنانچہ اس سے الگ جو دوسرے شعری لہجے رائج تھے ان کی سخت تنقید سردار نے رسالہ 'شاہراہ' دہلی کے مختلف مضامین میں کی۔ پہلا مضمون جذبی کے نام ایک خط کی شکل میں تھا جس میں اعتراض کیا گیا ہے کہ عمومی لہجے میں شاعری غلط فہمی پیدا کرسکتی ہے شاعری میں وضاحت ضروری ہے۔ جذبی کی نظم 'نیا سورج' میں تمثیل کے ذریعہ آزادی پر تبصرہ تھا یہی اعتراض سردار نے بعد میں فیض کی نظم 'یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر' پر بھی کیا کہ یہی بات تو قدامت پسند جن سنگھی بھی کہہ سکتا ہے۔ فراق صاحب کا ایک مضمون 'شاہراہ' میں چھپا تھا اس کی مخالفت میں سردار نے 'یہ ترقی پسندی نہیں ہے' کے عنوان سے جوابی مضمون لکھا۔ غرض جلد ہی سردار کی شعری ہی نہیں فکری جہت بھی متعین ہوگئی۔ اور یہ جہت تھی براہ راست ہنگامی شاعری کی جہت۔ اس کے لیے سردار نے آزاد نظم کو راشد، میراجی کی گرفت سے آزاد کرکے نئی معنوی

جہت بخشی تھی اور ان کی طویل نظموں میں تکرار کے باوجود تقریر کا سا انداز تھا۔ یہ دور تھا بھی نظم کا دور اور کم سے کم ہندوستان میں نظم کا اسلوب طے کرنے میں سردار جعفری کی شاعری کا ایک اہم مرتبہ تھا۔

'نئی دنیا کو سلام' گو ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ چھپی تھی مگر اس میں بھی آزاد نظم کے ٹکڑوں سے براہِ راست خطیبانہ اندازِ بیان اختیار کیا گیا تھا اسی رنگِ سخن کو سردار نے 'پتھر کی دیوار' اور 'خون کی لکیر' میں اور آگے بڑھایا اور اس میں شک نہیں کہ یہی رنگِ سخن کم سے کم ہندوستان میں عام ہو گیا۔ غزل کی طرف شعرا کی توجہ کم ہونے لگی حد یہ ہے کہ جگر مراد آبادی جیسے ٹھیٹھ غزل گو شاعر بھی یا تو نظم نما غزلیں کہنے لگے یا پھر براہِ راست 'ساقی سے خطاب' جیسی نظم ہی کہنے لگے۔

غرض یہ دور کم و بیش سردار کا دور کہا جا سکتا ہے اسی دور میں وہ شاعری کی طرف تیزی سے رجوع ہوئے اور ان کی شعریت سے تقریباً محروم نظموں کو کسی قدر مقبولیت بھی ملی مگر ان کا لہجہ اور اسلوب دونوں ہنگامی تھے اور

ایک طرف گورکی ایک طرف ایلیٹ

جیسے مصرعے جلد ہی سپاٹ گردانے جانے لگے۔

سردار جعفری اس منزل پر بھی تھک ہار کر بیٹھ جانے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اسی زمانے میں 'ترقی پسند ادب' نام کی کتاب لکھی جو اس دور کی ترقی پسندی کو تقریباً سبھی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ احتشام حسین، ممتاز حسین اور ان دونوں سے بڑھ چڑھ کر خود سجاد ظہیر اور مجنوں گورکھپوری نے بھی ترقی پسند تحریک پر کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ سجاد ظہیر نے 'روشنائی' لکھی بھی تو محض تحریک کے تنظیمی پہلو کو پیشِ نظر رکھا باقی باتیں ضمنی طور پر تھیں ہاں عزیز احمد نے ترقی پسند ادب کے نظریے اور تحریک پر پہلی مستقل کتاب لکھی تھی اور آج بھی اس تحریک پر کسی جائزے کو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ کہا جا سکتا ہے تو عزیز احمد ہی کی کتاب ہے۔ سردار جعفری نے تمام ترقی پسند نقادوں کے برعکس ترقی پسندی کا خاصہ سخت گیر رویہ اپنایا۔ حد یہ ہے کہ پریم چند، راشد اور سعادت حسن منٹو بھی ان کی ضربِ کلیمی سے نہ بچے بعد کو سردار خود بھی شاید اتنے شدت پسند نہیں رہے تھے جو اقبال سے ان کی غیر معمولی عقیدت سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس زمانے کے قصے، حکایتیں اور واقعات تو بے شمار ہیں مگر ان سب سے قطعِ نظر کرنا واجب ہے۔ آخر ہوا یہ کہ سردار کمیونسٹ پارٹی سے تو باہر آ گئے مگر نہرو پر نظمیں اور حکومتِ ہند کی خارجہ حکمتِ عملی کی

ستائش ان کی شاعری میں جگہ پانے لگی۔ ریڈیو اسٹیشن پر ان کے کلام کے نشر نہ ہونے پر پابندی بھی ہٹی بلکہ وہ اس کے اعزازی مشیر قرار دیے گئے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ۱۹۶۵ء کی لڑائی تاشقند معاہدے پر ختم ہوئی تو سردار نے جنگ کی حمایت میں بھی نظمیں لکھیں اور جب تاشقند کا سمجھوتہ ہوا تو اس پر اپنی معرکۃ الآرا نظم لکھی جس کا کیسٹ حال ہی میں بھارتیہ جنتا پارٹی والے وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نواز شریف سے ملاقات کرتے وقت پاکستان لے گئے تھے۔

اسی دوران سردار جعفری نے اپنی سرگرمیاں مختلف شعبوں میں بہت تیز کردیں۔ اول تو ایک صنعت کار اور ادب نواز دوست شیام کرشن نگم کے تعاون سے ہندوستانی ٹرسٹ بمبئی میں قائم ہوا اور اردو کی مختلف اصناف کے انتخابات شائع ہونے لگے دوسرے غالبؔ، کبیرؔ اور میرا بائی کے کلام کا انتخاب اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع ہوا جسے سردار نے مرتب کیا تھا۔ تیسرے سہ ماہی رسالہ 'گفتگو' کا آغاز ہوا جو خاصہ ضخیم رسالہ تھا اور ہر قسم کے ادبی مال مسالے سے مالا مال تھا یہی دور جدیدیت کے عروج اور ترقی پسندی پر ان کے بڑھتے ہوئے حملوں کا زمانہ بھی تھا مگر 'گفتگو' نے خاصہ بین بین کا رویہ اختیار کیا۔ چوتھے سردار نے فلم سازی بھی شروع کردی اور 'گیارہ ہزار لڑکیاں' نام کی فلم بنائی جو چلی نہیں۔ کچھ ہی سال بعد اپنے معاصر اردو شاعروں پر ٹیلی وژن پر کئی قسطوں میں ایک سلسلہ بھی پیش کیا۔

اور اسی کے ساتھ ان کی شاعری اور ان کی فکر کا سفر بھی جاری رہا۔ شاعر کی حیثیت سے انھوں نے کئی بین الاقوامی مذاکروں میں شرکت کی اور ایک زمانہ وہ بھی تھا جو دنیا کے انقلابی فن کاروں میں ایلیا ایرن برگ، لوئی اراگاں اور پبلو نرودا کے ساتھ سردار جعفری کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ پھر وہ دور بھی آیا کہ سردار نے قاہرہ کے کسی قہوہ خانے میں اپنی مشہور اور نہایت مسجع نظم 'تین شرابی' سنائی اور درودیوار جھوم اٹھے۔ پھر پبلو نرودا ہی کی ایک نظم سے متاثر ہو کر ان کی نظم 'میرا سفر' لکھی گئی جو بعض اضافے اور ترمیموں کے باوجود نرودا کی نظم ہی کا چربہ تھی مگر اردو میں بے حد مقبول ہوئی۔ آج بھی ذاتی طور پر میرے لیے سردار جعفری غزل کے تین اشعار اور تین نظموں کے شاعر ہیں جن میں بلاشبہ 'تین شرابی' اور 'میرا سفر' نظمیں شامل ہیں اور غزل کے وہ تین شعر جن میں وہ بے پناہ مصرعہ بھی ہے: (جس نظم کی نشان دہی باقی رہ گئی ہے اس کی نشان دہی کیا ضرور ہے)

راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا

جی ہاں! راستے سب بند تھے تو اب انقلاب کے بجائے اعزاز و اکرام کی طرف متوجہ ہونے کا بھی وقت آ گیا تھا اور انقلابی رویے کی تبدیلی کا اظہار 'ایک خواب' اور مجموعے کے چند سطری دیباچے اور خود اس نظم

کے لہجے اور نفس مضمون سے ہو جاتا ہے اور آخر تک انھوں نے یہی رنگ نبھایا۔ یعنی سیاسی حزب مخالف سے گریز اور ارباب اقتدار کو 'قومی لیڈر شپ' کی حمایت۔

پھر انعامات اور مشاعروں کے سلسلے تھے۔ انھیں جب بھی کوئی بڑا انعام ملا مبارک باد کے چند جملوں کے خط میں یہ شعر ضرور لکھا

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

یعنی خوش قسمتی تو لعل و گہر کی ہے کہ وہ تیری کلاہ تک جا پہنچے ہیں اور کیا کیا اور کیسے کیسے انعام اور کیسے کیسے لوگوں کے ہاتھ سے انعام ملے۔ سردار ہی کا ظرف تھا کہ ان سب کو قبولیت ملی۔

مشاعروں میں بھی سردار نے اکثر اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ ان کے لہجے میں ایک منفرد قسم کی دلکشی تھی جو مصرعے اور اشعار تو کیا نثر کے جملوں میں زندگی پیدا کر دیتی تھی۔ نہ جانے کس کا مصرعہ ہے

حیات بانٹ رہا تھا وہ بے فروش نہ تھا

یہی کیفیت سردار کی شعر خوانی ہی نہیں گفتگو کی بھی تھی اور نثر کے بجے سنورے جملے پڑھنے کی بھی۔ مشاعروں میں ملک کے باہر دور دراز کے شہروں اور ملکوں کے مشاعروں میں بھی انھیں یہی بلکہ اپنے ملک سے کہیں بڑھ چڑھ کر مقبولیت حاصل تھی۔ کینیڈا اور لندن اور دبئی کی محفلوں میں ان کی تقریر اور شعر خوانی کی مقبولیت دیکھ چکا ہوں۔

ان کی تحریروں میں خصوصیت کے ساتھ ذکر واجب ہے ان کی انگریزی میں لکھے ہوئے مضامین کا جن میں سے صرف دو کا تذکرہ ہی کافی ہوگا ایک اردو کے بارے میں [illegible] ین لٹریچر' بمبئی کے شمارے میں ہے جس میں اردو کی لسانی انفرادیت پر زور دیا گیا ہے اور مدلل انداز میں اردو کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا 'السٹریٹڈ ویکلی' میں ان کی پچھلی بار علالت کے موقعے پر شائع شدہ ایک مضمون ہے [illegible] نھیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ جو لوگ آئیں وہ بیماری اور موت [illegible] ریں مگر خود ڈاکٹر سے لے کر تمام آنے جانے والوں تک کی تمام تر گفتگو انھیں دونوں موضوعات پر ہوتی تھی اور انھیں احساس نہیں ہوتا تھا۔

سردار جعفری چلے گئے، دکھ ہے تو یہ کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں والا ایک ہی ادیب ہمارے درمیان تھا اور وہ بھی اپنی صلاحیتوں کا بہت تھوڑا بہت چھوٹا سا حصہ ہی قومی وراثت کو دے پایا تھا کہ موت نے اس کے

ہاتھوں سے قلم اور زبان سے جادو چھین لیا۔ آخری دور کی شاعری ہی میں شعری کیفیات کی بوقلمونی جلوہ دکھانے لگی تھی کہ خاموشی کا پیغام آگیا۔ اب انتظار ہے تو ان کا جن کے بارے میں سردار جعفری نے 'میرا سفر' میں لکھا تھا کہ ان کے زبان سے بولوں گا اور ان کی آنکھوں سے دیکھوں گا۔

آج بھی یہ خیال آتا ہے کہ غالب کے لفظوں میں سردار جعفری کے لیے بھی قدرت نے جو صلاحیتیں اور جس قسم کے کمالات ودیعت کیے تھے وہ سو میں سے ایک فی صد بھی پوری طرح ظہور میں نہ آئے پھر بھی اس نامکمل سے اظہار نے اردو ہی کو نہیں ہماری پوری قومی زندگی کو منور کیا۔ بقول شخصے جادو الفاظ میں نہیں شخصیت میں ہوتا ہے اور جب یہ شخصیت بولتی ہے تو سارا عالم گوش بر آواز ہو جاتا ہے۔ ایسی شخصیت تھی سردار جعفری کی جس کا اظہار بہت تھوڑا سا اظہار سردار کی ہمہ جہات سرگرمیوں میں ہوا اور اسی شکوے کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہو گیا:

نہ بزم آسمان و یک ذرہ در سماع

آں ہم بہ کام دل نہ فشاند آستین خویش

(نو آسمانوں کی وسعت میں ایک ذرہ رقص میں ہے اور اسے بھی اتنی وسعت نہیں ملی کہ جی بھر کر اپنی آستینیں پھیلا سکے)

اس مضمون کا خاتمہ سردار جعفری کے میرے نام آخری خط سے کرتا ہو جو انھوں نے بمبئی سے ۲۰؍ جنوری ۱۹۹۸ء کو لکھا تھا:

"برادرم تسلیم!

گیان پیٹھ انعام پر مبارک باد کا شکریہ!

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری

وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

اس سال نثر و نظم کی دو جلدیں شائع کرنے کا خیال ہے۔ نظم کا انتخاب کر لیا ہے۔ نثر کے مضامین جمع کرنا ہیں۔

فی الحال چند کتابیں شائع ہو رہی ہیں جو مارچ اپریل تک آجائیں گی۔

۱۔ غالب کا سومنات خیال اردو مرکز، پٹنہ

۲۔ کبیر بانی (ہندی) راج کمل، نئی دہلی

۳۔ کبیر بانی (اردو) انجمن ترقی اردو، دہلی

۴۔ دیوانِ غالب (ہندی، اردو) دہلی

۵۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں (ہندی) راج کمل

۶۔ سرمایۂ سخن (شاعری کی لغت) مکتبہ جامعہ

۷۔ اقبال، کمیونزم اور اسلام پر انگریزی میں کتاب۔ پٹنہ

۸۔ گیان پیٹھ انعام کی تقریب سے پہلے منتخب نظموں کا شعری مجموعہ (ہندی)

اس وقت اردو کی پانچ کتابیں بازار میں ہیں:

۱۔ پتھر کی دیوار (پاکٹ بک) بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔

۲۔ ایک خواب اور

۳۔ لہو پکارتا ہے

۴۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں

۵۔ پیغمبرانِ سخن (بمبئی)

تہنیت کا دوبارہ شکریہ۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا

سردار جعفری

□□□

□□□

محمد علی صدیقی

علی سردار جعفری

ایک خراجِ عقیدت

علی سردار جعفری بلاشک وشبہ برصغیر کے اُردو ادب پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی تحریک کے ایک بزرگ رہنما تھے۔ وہ اپنی ۸۶ سالہ زندگی میں صرف چند ماہ غیر فعال رہے۔ بالآخر دماغ کی رسولی نے اس اعلیٰ دماغ شاعر، ادیب، نقاد، محقق، صحافی، فلمساز، مزدور تحریک کے رہنما کی زندگی کا دیا یکم اگست ۲۰۰۰ء کے روز بجھا دیا۔ یہ دن برصغیر کی آزادی کے مہینے کا پہلا دن تھا اور آزادی کی جنگ کا یہ مجاہد ادیب اپنے "گہوارہ مہینے" یعنی نومبر سے صرف چند ہفتے پیشتر حقیقی آزادی کے لیے جدوجہد کا راستہ دکھاتے ہوئے اُسی طرح روپوش ہوگیا جس طرح آسمان پر ستارے یک بیک خوبصورت منظروں کی طرح نظروں سے اوجھل ہوجایا کرتے ہیں۔ لیکن آزادی کے بارے میں سردار جعفری کی ایک "غزل" کے درج ذیل اشعار آج بھی حسب حال ہیں:

سکوں میسر جو ہو تو کیوں کر ہجومِ رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظامِ دار و رسن وہی ہے
فریب یہ دے دیا ہے کس نے کہ حریت کی رات آئی
ذرا تو چلمن اُٹھا کے دیکھو تو ساحرِ مکر و فن وہی ہے

مندرجہ بالا اشعار پر غور کیا جائے تو علی سردار جعفری کی ساری زندگی آزادیٔ موہوم کو حقیقی آزادی میں تبدیل کرنے کی خواہش میں گزری، وہ عوام دوست تھے اور دنیا بھر کے محنت کشوں کے ساتھی۔ وہ ہم سب کے لیے اسی بنا پر قابلِ احترام رہے اور ہیں۔ انہوں نے برصغیر میں روشن خیالی کی تحریک کے لیے نہ صرف بہ حیثیت شاعر بلکہ مفکر، محقق، شارح اور مترجم کی حیثیتوں میں جو کام کیا اور بطور صحافی جس جزئیات نگاری کا مظاہرہ کیا وہ صرف اسی شخص کا حصہ ہوسکتا

ہے جس کا ذہن صاف، منزل متعین، اور فکر انسان دوستی کی ترجمان ہو۔

علی سردار جعفری کی شاعری...... ترقی پسند تحریک کی تاسیس کے وقت کی ذہنی فضا، نازی ازم اور جمہوریت کے مابین مبارزہ آرائی کے حوالے جنگِ عظیم کی اہمیت، آزادی کی تڑپ، سامراج کے خلاف ایک توانا آواز، اندرونی استحصالی ڈھانچے میں سامراج کے حلیف طبقے کے خلاف غم و غصہ، آزادی اور آزادیِ موہوم کے مابین فرق، انسانی اخوت اور بین الاقوامی امن... کے عنوانات کے گرد گھومتی ہے۔ علی سردار جعفری ہر لحاظ سے ترقی پسند تحریک کے مقتدر رہنما تھے اور وہ کم از کم ان تمام حضرات کے لیے بھی جو ترقی پسندی کی کم از کم تعریف پر بھی جھٹ پٹ جبیں ہو جاتے ہیں، چوٹی کے ترقی پسند رہنما رہے۔

علی سردار جعفری زندگی کے ساتھ اپنے کمٹمنٹ میں فیض اور دیگر ترقی پسند ہمعصروں کے ہمرکاب تھے۔ آخری چند برسوں میں وہ اپنے شعری اسلوب میں فیض کے اس قدر قریب آ چکے تھے کہ اُن کے بعض اشعار پر فیض کے اثرات واضح ہیں۔ فیض کا رنگ اس درجہ مقبول ہوا ہے کہ علی سردار جعفری بھی اس رنگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ فیض احمد فیض سے جب ڈاکٹر نصرت چودھری نے سردار جعفری اور اُن کے لہجے میں فزوں تر مشابہت کے بارے میں رائے دریافت کی تو فیض نے جواب دیا تھا

"ہمارا رنگ تو اب ایک عام رنگ بن گیا ہے۔ محض ہمارا نہیں رہا۔ کوئی بھی رنگ کسی کا ذاتی نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یوں ہے کہ وقت کے ساتھ ایک محاورہ، ایک خاص قسم کی نہج، ایک خاص قسم کا استعارہ مقبول ہو جاتا ہے، جس سے اس عہد کا مزاج بنتا ہے۔ کسی نے اس کو پہلے اختیار کر لیا اور بعد میں وہی رنگ عام ہو گیا۔"

(اقتباس از فیض کی شاعری۔ ایک مطالعہ: ڈاکٹر نصرت چودھری۔ نگارشات، لاہور، ۱۹۸۷ء، صفحہ ۲۰۱)

علی سردار جعفری اپنی شاعری کے اوائلی دور میں انیس، اقبال اور جوش سے زیادہ متاثر رہے ہیں۔ اقبال سے بالخصوص۔ اور شاید اسی لیے اُن کے یہاں بھی فیض کی طرح استعاراتی ڈکشن کی طرف جھکاؤ زیادہ ہوتا جا رہا تھا جیسا کہ میں نے ٹورونٹو، کناڈا، میں سردار جعفری کی سترویں سالگرہ کی تقریب ۱۹۸۳ء کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں کہا تھا کہ علی سردار جعفری نے شعری مجموعہ "لہو پکارتا ہے" کے ذریعے جس استعاراتی ڈکشن سے اپنی رغبت و موانست کا ثبوت بہم پہنچایا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ خود فیض نے بھی نصرت چودھری کے سوال کے جواب میں جو کچھ کہا تھا، وہ میرے دعوے کی تصدیق ہے۔ میں اس گفتگو میں جس نکتہ پر زور دے رہا ہوں اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ اپنے آخری دَور میں سردار جعفری عملی جدوجہد میں سیاسی حقیقتوں کی کھردراہٹ سے شعوری طور پر گریز کی وجہ سے ایک زیادہ گُلی اور شیریں ڈکشن کی طرف آ گئے تھے۔ علی سردار جعفری نے فیض کے رنگ کے بارے میں خود کہا تھا:۔

کاٹ تلوار کی شعروں کو عطا کرتی ہے
وہ کسک درد کی جو فیض کی آواز میں ہے

بہر حال یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ علی سردار جعفری کا دورِ جمال اُن کی زندگی کا ایک خوبصورت لمحہ تھا۔ اگر ہم ذرا دیر کے لیے اس لمحہ پر رکیں اور غور کریں کہ آیا سیاسی حقیقتوں سے عملی طور پر نبرد آزمائی غیر شیریں جلال کو جنم دیتی ہے اور ان حقیقتوں سے دوری شیریں لہجہ کو۔ تو شاید بحث و تمحیص کا اور در کھل سکتا ہے۔ علی سردار جعفری کے یہاں "جمال کی طرف رغبت مندرجہ ذیل اشعار میں کس قدر خوبصورتی کے ساتھ واضح ہوتی ہے۔

سینے میں حرارت ہے، افسونِ تمنا سے
امروز مرا روشن ہے رنگِ رُخِ فردا سے

شب ہجر صبحِ وصال ہے، ترا عکس جب بھی جگا لیا
تری یاد دل کا چراغ ہے، سرِ شام ہی سے جلا لیا
غمِ زندگانی تھا تلخ تر، غمِ عشق اس کو بنا لیا
یہ امانتِ غمِ دوست ہے، اسے طاق دل میں سجا لیا

ترا حسن بادۂ ناب ہے، جو کھنچا ہے رنگ و بہار سے
مری جرعہ نوشی شوق ہے، ترے لعل لب کے خمار سے
تجھے اے شبِ غمِ زندگی، وہ طلوعِ صبح نصیب ہو
جو دمک اُٹھے رُخِ دوست سے، جو مہک اُٹھے لبِ یار سے

شمع کا، مئے کا، شفق زار کا، گلزار کا رنگ
سب میں اور سب سے جدا ہے لبِ دلدار کا رنگ

علی سردار جعفری نے "لہو پکارتا ہے" میں شامل ۱۹۶۵ء کی شاعری کے بعد جوش کے اثرات سے نکلنے کی کامیاب کوشش کی۔ یہی وہ موڑ ہے جب اُن کے یہاں تشبیہ کے مقابلے میں استعارہ اور ادعایت کے مقابلے میں ایمائیت کے لیے شگفتگی کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے۔ "نومبر میرا گہوارہ" جو غالباً ابھی تک نا تمام ہے، اس دائرہ کی تکمیل کرتی ہے۔ مجھے علم نہیں کہ یہ نظم مکمل ہو چکی ہے یا اس کی تکمیل کے بارے میں امکان ختم ہو چکے ہیں لیکن یہ نظم برصغیر کی

ذہنی اور جذباتی فضا کی حسین ودلکش ترجمان کے طور پر اُردو شاعری میں اہم اضافہ ثابت ہوگی۔

علی سردار جعفری نے میر تقی میر، مصحفی اور اقبال پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ اور پوری شیفتگی اور سپردگی کے ساتھ۔ جب علی سردار جعفری کے پائے کا شاعر جوش کی گھن گرج سے کبیر، میرا، اور میر کے نرم وگداز لہجے کی طرف آئے گا تو پھر وہ لازمی طور اپنے ڈکشن سے انحراف ہی کرے گا۔

علی سردار جعفری نے اپنی شاعری کے دوسرے دَور میں روسیٹی (Rossetti) سوئن برن (Swinburne) اور پابلو نرودا کے اثرات کے علاوہ انگریزی "میٹا فزیکل" شاعروں کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا تھا اور غالباً اُن کی شاعری میں جلال کے مقابلے میں جمال کا وفور اسی لیے ملتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ جس آواز نے زندگی بھر فکری انقلاب کے لیے خود کو وقف کر رکھا تھا، اُس کی یاد کی مشعل تا دیر ہمارے ہاتھ میں رہے۔ ہمارے اردگرد پھیلتا ہوا اندھیرا ہم سے روشنی ..اور روشنی کا مطالبہ کر رہا ہے اور ہمارے پاس بہتر سے بہتر مستقبل کے لیے بامعنی جدوجہد اور زندگی افروز رجائیت پر پہلے سے بھی زیادہ ایقان کے علاوہ کیا رہ جاتا ہے؟

☆☆☆

(سہ ماہی ارتقاء کراچی نمبر ۲۶ ستمبر ۲۰۰۰)

ہم عصری ادبی مسائل

سردار جعفری سے ایک انٹرویو

(شرکاء: محمد علی صدیقی۔حسن عابد۔مسلم شمیم۔شاہد نقوی۔مظہر جمیل)

مظہر جمیل: جعفری صاحب آپ کی موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم لوگ در اصل اُن تبدیلیوں کو سمجھنا چاہتے ہیں جو گذشتہ نصف صدی کے دوران ہندوستانی ادبیات میں بالعموم اور اردو ادب میں بالخصوص رونما ہوئی ہیں، خصوصاً ترقی پسند ادب کی تحریک کے تناظر میں، تو آپ اس سلسلے میں کچھ فرمائیے۔؟

جعفری صاحب اس میں کچھ باتیں تو بدیہی ہیں اور ایسی ہیں جو بار بار دُہرائی گئی ہیں اور شاید ان میں کوئی نیا پن محسوس نہ ہو، لیکن ادبی جائزہ لینے کے لیے ان باتوں کا دہرایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہی ہے کہ ہمارے ہاں جدید ادب ایک واضح رجحان کے طور پر ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے اور یہ صورتِ حال صرف ہمارے اُردو ادب میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی کم و بیش تمام بڑی زبانوں میں ایسا ہی ہوا ہے، ممکن ہے یہ خبر آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہو کہ میں ان دنوں ایک ڈاکومنٹری فلم پر کام کررہا ہوں جس کا نام ہے" دی لٹریری اسٹورم" (THE LITERARY STORM) اور اس کا موضوع ہے ہندوستان کی بڑی زبانوں میں پیدا ہونے والے جدید ادب کا ارتقائی تجزیہ اور خصوصاً ان زبانوں کے ادب نے تحریک آزادی میں جو کردار ادا کیے ہیں اور جو رشتے قائم رکھے ہیں ان کو سمجھنا، یہ موضوع آپ جانتے ہیں بجائے خود خاصا وسیع و ہمہ گیر ہے اور ایک نشست میں ہندوستان کی تمام اہم زبانوں کے ادب کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔ لہٰذا ہم اپنی گفتگو اُردو ادب تک ہی محدود رکھیں گے۔ تو جناب آپ یہ دیکھیے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جو پہلا اہم واقعہ رونما ہوتا ہے وہ ہے ادبی تنقید کا ایک باقاعدہ نظام کے طور پر رواج پانا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس سے پہلے اُردو ادب تنقیدی عناصر سے خالی تھا۔ نہیں، ایسا ہو

بھی نہیں سکتا تھا کہ ہر تخلیقی عمل میں تنقیدی شعور کارفرما رہتا ہے۔ شاعر کے لیے تنقیدی نظر کا حامل ہونا لازمی ہے، لیکن آپ اسے نقاد نہیں کہتے اسی لیے قدیم تذکروں میں تنقیدی تبصرے بھی نظر آجاتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں خاصا تنقیدی مواد موجود ہے، پھر بعض لسانی، عروضی اور فنی نکات پر تنقیدی بحثیں بھی آپ کو کتابچوں کی صورت میں دستیاب ہوجائیں گی، لیکن ان سب کو ملا کر بھی کوئی ایسا باقاعدہ اور منضبط نظام تشکیل نہیں پاتا جسے آپ تنقیدی نظام کا نام دے سکیں اور یہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے سالوں میں ہی ممکن ہوسکا۔ جب آپ تنقید اور شاعری کو دو علیحدہ خانوں میں رکھ سکیں۔ ان ابتدائی ناقدین میں حالؔی اور شبلؔی دو اہم نام آتے ہیں ان میں آزادؔ کا نام بھی آئے گا، بلکہ پہلے آنا چاہیے، لیکن اپنی اثر پذیری کے سبب ترتیب میں جو بلند تر مقام ہوگا وہ حالی اور شبلی ہی کو ملے گا۔ دوسری تبدیلی جو ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ ہمارے ہاں محسوس ہوتی ہے وہ ہے غزل کے تعلق سے۔ اب آپ دیکھیے کہ غزل اپنے تمام تر کلاسیکل امکانات غالبؔ کی شکل میں پورے کرچکی تھی اور جب میں یہ بات کہتا ہوں تو میری مراد ہوتی ہے کہ غالبؔ اپنی پیش رو غزل کی روایت کو سمیٹتے ہوئے ایک ایسا منفرد لہجہ ہی نہیں بلکہ اندازِ نظر دیتے ہیں جو اُردو ادب میں قطعی نیا تھا اور جسے میں جدید ادب کے لیے ایک نقطۂ آغاز خیال کرتا ہوں، آپ غالب کے ہاں سے ایک ایسا انتخاب بآسانی کرسکتے ہیں جو آج کے تمام ادبی موضوعات کا احاطہ کرسکے۔ اگر آپ جدیدیت چاہتے ہیں تو آپ کو یہ شعر ملے گا ؂

خفقانی ہوں تو یہ باغ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر اب اُگاتا ہے مجھے

چوں کہ وہ شاعری اپنے عہد کی پوری بصیرت کے لیے ہوتی تھی اور اس میں ماضی وحال کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانے کی دھمک بھی سنائی دیتی ہے لہٰذا آپ دیکھیے وہ آج بھی زندہ ہے۔ غالبؔ ہی کے ہاں دارورسن کا استعارہ پہلی بار نئے معنوں اور نئی امیج کے ساتھ آتا ہے۔ میرؔ تک تو یہ استعارہ یعنی دارورسن کا استعارہ صوفیانہ انداز میں آتا ہے۔ حافظ شیرازی کا شعر ہے ؂

گفت آں یار کزو گشت سردار بلند
جرمش ایں بود کہ اسرار ہویدا می کرد

اب یہ شعر حلاج کے بارے میں ہے اور بات یہ کہی گئی ہے کہ اس نے راز کو ظاہر کر دیا تو اسے دار پر کھینچ دیا گیا حالاں کہ تاریخی طور پر تو حلاج کو قتل کیا گیا تھا لیکن بطور استعارہ یہاں دار کا استعمال ہوا۔ میرؔ کا شعر ہے۔

فصل آئی تو نخلِ دار پہ میرؔ
سرِ منصور ہی کا بار آیا

یہ بھی صوفیانہ انداز ہے لیکن اب آپ دیکھیے کہ غالبؔ کے یہاں کس انداز میں جدید عہد جھلکتا ہے۔

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

یہ صرف ۱۸۵۷ء کے قتل و غارت گری کا ہی نوحہ نہیں بلکہ پوری انیسویں صدی کے قتل و غارت گری کا اشارہ ہے۔ اس میں ایک باریک نکتہ اور بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ قد و گیسو میں تو قیس و کوہکن کی آزمائش ہو رہی ہے لیکن جہاں دار و رسن کا معاملہ ہے وہاں مجاہد و شہید کی آزمائش درپیش نہیں ہے بلکہ خود دار و رسن آزمائش سے دوچار ہیں۔ یہ غالبؔ کی بلاغت کی مثال ہے۔

حسن عابد: واہ واہ کیا بات پیدا کی ہے، سبحان اللہ۔

جعفری صاحب: ہاں تو یہ دار و رسن کا استعارہ غالبؔ کے ہاں سے ترقی پسندوں کے ہاں آتا ہے۔ ان سے پہلے حالیؔ شبلیؔ اور حسرتؔ کے ہاں یہ استعارہ ان معنوں میں نہیں آیا بلکہ اقبالؔ کے ہاں بھی روا روی اور ایک محدود مضمون میں آتا ہے۔ یعنی

قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل وغیرہ

لیکن جدید معنوں میں دار و رسن کا استعارہ غالبؔ کے ہاں سے ترقی پسندوں کے ہاں آیا ہے ارتقائی شکل میں جو غالبؔ نے کہا ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

تو اس شعر میں جو دوئی ہے وہ ترقی پسندوں کے ہاں باقی نہیں رہتی۔ مجروحؔ نے کہا ہے۔

قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

فیضؔ کا شعر ہے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

یا مخدوم کا مصرعہ ہے۔

اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

تو یہاں دیکھیے دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ امیج (Image) ہر ترقی پسند شاعر کے ہاں اس کے اپنے انداز میں موجود ہے۔ فیض کے ہاں، مخدوم کے ہاں، مجروح کے ہاں اور میرے ہاں۔

حکایت دل کی کیا دارورسن کی اک کہانی ہے
قدو گیسو کی لیکن داستاں معلوم ہوتی ہے

سب کے ہاں آپ کو یہ بات ملے گی، لیکن الگ الگ انداز میں۔ اب آپ غالب کے اور اشعار لیجئے، دیکھیے سب غزل کے شعر ہیں، لیکن ان میں آپ نے آنے والے عہد کی چاپ سن سکتے ہیں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف میں زنجیر سے بھاگیں گے کیا
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

تو اس طرح کے سینکڑوں شعر ہیں جنہیں آپ آج کے عہد کے ساتھ رکھ کر دیکھ سکتے ہیں اور وہ بھی عالمی پس منظر میں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اشعار ہندوستان کے لئے ہیں، پاکستان کے لئے ہیں یا فلسطین کے لئے ہیں۔ جہاں جہاں صورت حال تظلم و تشدد سے دوچار ہے وہاں وہاں یہ اشعار اپنی پوری معنی آفرینی کے ساتھ جلوہ ساماں ہوتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ شاعر کے کلام کا پرتو مستقبل پر بھی پڑ رہا ہے، اسی لئے میں نے کہا تھا کہ غزل اپنے تمام تر امکانات غالب کے ہاں ختم کر چکی تھی اور اسی لئے آنے والے شعراء کو جن میں آزاد، حالی، اور شبلی شامل تھے غزل سے گریز اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ان حضرات تک آتے آتے غزل انحطاطی ابتذال کی انتہائی صورت اختیار کر چکی تھی اور اب اس

کا قیام طوائف کے کوٹھے پر تھا، گو اسی عہد میں غزل کو داغؔ جیسا شاعر بھی ملتا ہے جس کے ہاں زبان اور محاورے کی صفائی ہوتی ہے لیکن اب آپ دیکھیے حالیؔ نے غزل پر کیسا تند کتنا سخت حملہ کیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ غزل ایک موقر اور معتبر صنف سخن کی حیثیت سے اپنا اعتبار کھو چکی ہے اور یہاں سے نظم کی ابتداء ہوتی ہے۔ اُردو نظم کی تعمیر جو حالیؔ مکمل نہ کر سکے اس پر اقبالؔ نے ایک ایسی عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی کہ اس کے سامنے غزل پنپ ہی نہیں سکتی تھی۔ حالاں کہ اُن کے عہد میں غزل کہی جا رہی تھی لیکن وہ کس معیار کی تھی اس سے سب واقف تھے۔ در اصل اس عہد میں حسرتؔ موہانی نے غزل کو ایک بار پھر نکالنے کی کوشش کی اور پھر جگرؔ تھے، اصغرؔ تھے، شادؔ تھے، فانیؔ تھے اور دوسرے شعرائے لکھنو تھے، جن میں عزیزؔ، ثاقبؔ، اور یگانہؔ چنگیزی جیسے لوگ شامل تھے، یہ سب حضرات غزل لکھ رہے تھے لیکن سچ بات یہ ہے کہ ان سب کی مشترکہ کوشش بھی غزل کو اس مقام تک نہیں لا سکی ہے جہاں اقبال کی نظم کھڑی نظر آتی ہے اور غالباً اسی وجہ سے ان حضرات کا رویہ اقبالؔ کی طرف کچھ زیادہ گرمجوشی کا نہیں رہا۔ بلکہ یگانہؔ چنگیزی نے تو کچھ نازیبا کلمات بھی کہے تھے، اقبال کے سلسلہ میں فانیؔ تو سرے سے اقبالؔ کو شاعر ہی نہیں سمجھتے تھے اور دوسرے لوگ بھی طوعاً و کرہاً انہیں واجبی سا شاعر تو مان لیتے تھے لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ "ٹھیک ہے صاحب یہ کلام ہے شاعری نہیں ہے۔" یہ ترقی پسند تھے جنہوں نے اقبال کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی اور اقبالؔ کو ایک اہم ادبی ورثے کے طور پر قبول کیا۔ بات در اصل یہ ہے کہ اقبالؔ طبقاتی ناہموار سماج کا بہت بڑا شاعر ہے، جیسے ٹیگور اور دوسرے شعراء ہیں لیکن ان کے ہاں شاعری کا کینوس بہت وسیع ہو گیا ہے اور اس میں ہر طرح کے رجحانات آ گئے ہیں۔ اس طرح ہمارے ہاں ایک اقبال کی بجائے دو تین اقبالؔ وجود پا گئے ہیں، ایک اقبالؔ وہ ہے جو ہندوستان کے قوم پرستوں اور نیشنلسٹوں کا اقبال ہے یعنی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ایک اقبال پاکستان کے مذہب پرستوں کا اقبال ہے یعنی "خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ" ایک اقبال وہ ہے جو ترقی پسندوں کو عزیز ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو — کاخِ امراء کے در و دیوار ہلادو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

ایک وہ اقبال ہے جو پروفیسروں کا اقبال ہے جو FUNDAMENTAL

ONTOLOGY کی بات کرتے ہیں بصرف مسجدِ قرطبہ کی بات کرتے ہیں ،اب مسجدِ قرطبہ ایک ایسی نظم ہے کہ اگر ہم ابھی سڑک پر نکل جائیں تو پڑھے لکھے لوگوں کے اس بڑے شہر میں بھی شاید ہی کوئی ایسا عام آدمی ہمیں مل سکے جو اس نظم کو سمجھنے کا مدعی ہو سکے، لیکن کالج کے پروفیسروں کے لئے اس نظم میں ایک خاص معنویت اور جاذبیت پنہاں ہے۔ تو اس طرح اقبال کے چار پانچ رنگ اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور ہر رنگ اپنی جگہ خوب ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے یعنی ترقی پسندوں نے اقبال سے کیا لیا ہے ۔تو جناب ہم نے اقبال سے تصورِ انسانیت لیا ہے اور انسانی خلاقی ،انسان کی تخلیقی قوت اور انسانی ہاتھوں کی عظمت کا تصور لیا ہے ۔"دستِ دولت آفریں" اقبال ہی کے ہاں آیا ،اس سے پہلے کہاں تھا ۔پھر ہم نے اقبال کے ہاں سے نظریۂ کائنات لیا ہے کہ "آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون"، یعنی تخلیق کا عمل ایک جاری و ساری عمل ہے، ہر دم ایک نئی دنیا تخلیق پا رہی ہے جس میں لمحۂ گزشتہ کا عکس بھی شامل ہوتا ہے۔تو اس طرح ادب کی تخلیق کا عمل بھی ایک مسلسل جاری و ساری عمل ہے اور کلاسیکیت کی تخلیق بھی ایک مسلسل عمل ہے ۔ہر دور اپنی قدریں ساتھ لاتا ہے اور اس طرح روایت کی تخلیق کا عمل بھی جاری رہتا ہے جس طرح انسانی جسم میں نئے cells بنتے رہتے ہیں اور پرانے خارج ہوتے رہتے ہیں اسی طرح میری نظر میں روایت کی تخلیق کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔تو اس طرح آپ دیکھیے کہ ترقی پسند ادب یا ترقی پسند ادیب کوئی آسمان سے نہیں اُتر آیا ، بلکہ اس کے پیچھے روایت کا ایک عظیم سلسلہ ہے اور اب خود ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ہماری ادبی روایت کا ایک زندہ اور فعّال حصہ بن چکا ہے ۔

محمد علی صدّیقی: جعفری صاحب یہ روایت کے بارے میں ترقی پسندوں کا نظریہ ٹی ،ایس ،ایلیٹ کی روایت کے تخلیقی ارتقاء کے (CREATIVE EVOLUTION TRADITION) کے تصوّر سے کس حد تک مختلف ہے ۔ٹی ،ایس، ایلیٹ کے ہاں روایت کا conception تو یہ ہے کہ خزاں جب آتی ہے تو خشک پتے ہوا میں اُڑ جاتے ہیں اور نئے پتے شاخوں پر نکل آتے ہیں ، یہ تصوّر بڑا جاذب نظر آتا ہے ،لیکن جزیات میں کچھ پہلو قابل بحث نکل آتے ہیں تو آپ یہ فرمائیے کہ ترقی پسندانہ تصوّر روایت کیا ہے اور آپ بالخصوص کس طرح سمجھتے ہیں ۔

جعفری صاحب: ہاں بھئی یہ سوال بہت اہم ہے ،لیکن اگر ہم پہلے اس بات کو ختم کر لیں تو پھر اس سوال پر

بھی آجائیں گے اور جب اس پہلو پر گفتگو کریں گے تو آپ کے اس نکتے کو سامنے رکھ کے بات کریں گے ،لیکن سرسری طور پر یہ عرض کرسکتا ہوں کہ میں روایت کو ایک جاری وساری عمل سمجھتا ہوں ،آج جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ کل روایت کا حصہ بن جائے گا ،بشرطیکہ اس میں زندہ رہنے کی قوت ہوئی ورنہ اپنا وقتی کردار ادا کر کے ختم ہو جائے گا۔خیر اس پر تفصیلی گفتگو آگے چل کر کریں گے ۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ترقی پسند ادب نے اقبآل سے کیا کچھ لیا ہے تو بھائی ہم نے اقبآل سے آہنگ بھی لیا ہے اور آپ دیکھیے کہ اقبآل کے آہنگ سے کوئی باشعور شاعر بچا ہی نہیں۔ وہ بھی جو مخالفین تھے وہ بھی نہیں بچے ،کیونکہ میں اقبال کے آہنگ کو بیسویں صدی کا آہنگ سمجھتا ہوں اور بیسویں صدی دراصل اقبآل کی صدی ہے ۔اگر ہم محض اُردو ادب کے پیمانے سے ناپنے بیٹھ جائیں تو پھر ہم ادب میں ہونے والی تبدیلیوں تک شاید ہی پہنچ پائیں ،لیکن اگر آپ عالمی ادب کے تناظر میں دیکھیں تو آپ کو فلسطینی شاعر کا انقلابی آہنگ ملے گا۔ عرب انقلابی شاعر کی بلند لَے سنائی دے گی۔Latin America جنوبی امریکہ کے انقلابی شاعر پابلو نرودا کا آہنگ سنائی دے گا ۔اب سب کے ہاں بالکل جدا گانہ آہنگ ہے جو اُن کے اپنے کلاسیکی آہنگ کے ساتھ مل کر بنا ہے ۔اب آپ اسے اُردو کی خوش نصیبی کہیے یا بدنصیبی کہ ہماری زبان اس طرح عوامی زبان نہیں رہی جس طرح دوسری زبانیں عوام سے قریب رہی ہیں ،ہمارے ہاں شاعر کی زبان کسانوں کی بول چال کی زبان سے مختلف رہی ہے ۔اس پر شرفا کی زبان اور کلچر کے اثرات کچھ زیادہ ہی غالب رہے ہیں ،لہٰذا شرفا کا تہذیبی انجماد اور روحانی انجماد ہماری کلاسیکل شاعری میں اُتر آیا ہے اور اس میں اس روایت کے اثرات بھی آگئے ہیں جنہیں وقت کے ساتھ ختم ہو جانا تھا ۔تو بھئی ہمارے ہاں یہ سب مسائل رہے ہیں اور آج بھی ہیں ۔اب اس کے ساتھ ایک دوسرا بڑا مسئلہ سامنے آتا ہے اور وہ ہے نئی شاعری کی بوطیقا کا مسئلہ ۔نئی شاعری کی لغت اور ڈکشن Diction کا مسئلہ۔ اس سلسلہ میں خود ترقی پسندوں کے ہاں واضح اختلاف رہا ہے اور آج بھی ہے۔ایک گروہ وہ ہے جو سمجھتا ہے کہ قدیم استعارہ کافی نہیں ہے اور ہمیں اظہار کے لئے اپنے آس پاس سے جدید استعارہ تراشنا ہوگا۔ اس گروہ میں مَیں خود کو بھی شامل سمجھتا ہوں ۔ایک دوسرا گروہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ نہیں قدیم استعارہ ،قدیم زبان ،کلاسیکل طرزِ اظہار کافی ہے اور ہمیں اس پر

بڑی حد تک انحصار جاری رکھنا چاہئے کہ یہ زیادہ قابل اعتماد اور موثر ہے اور روایت سے گندھا ہوا ہونے کے سبب بھی اور آزمودہ بھی۔ اس گروہ میں فیضؔ شامل ہیں، مجروحؔ اور دوسرے احباب شامل ہیں، مخدومؔ کے ہاں دونوں طرح کے رویئے آتے ہیں خود میرے ہاں بھی ایسا ہوتا ہے لیکن آس پاس سے نیا استعارہ تراشنے کا رجحان ہمارے ہاں غالب رہا ہے۔ اس میں آپ اخترالایمان کو بھی شامل کر لیجئے کہ وہ بھی اس ذہنی رویئے میں شریک ہیں۔ مثال کے طور پر آپ میری نظم "پتھر کی دیوار" کو دیکھئے میں نے اپنے شعری مجموعہ کا نام ہی "پتھر کی دیوار" رکھا ہے اس میں جو استعارہ ہے وہ کلاسیکل شاعری سے جداگانہ چیز ہے۔ ہمارے ہاں پہلے تو دیوار کے لئے سنگ وخشت کے الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ اس میں ہی کچھ فارسی کی آمیزش سے نئی تراکیب تراش لی جاتی تھیں اور اس طرح حسن پیدا کر لیا جاتا تھا۔ اب جو یہ نظم آئی تو نئے استعارے لے کر آئی۔ اس نظم میں اس قسم کے ٹکڑے آتے ہیں۔

پتیوں کی پلکوں پر اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
چاند کے کٹورے سے چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت پر گر کر دودھ جذب ہو جائے
روشنی کے گالوں پر
تیرگی کے ناخن کی سینکڑوں خراشیں ہیں

یہ ساری فضا دراصل گرد وپیش سے لی گئی ہے۔ اچھا اب دیکھیے یہ دین کس کی ہے، یہ دراصل جوشؔ کی دین ہے ہم نے جوشؔ پر کام نہیں کیا ہے، جوشؔ کو نظر انداز کیا گیا ہے اور مجھے کہنے دیجیے کہ بعض سیاسی اسباب کی بناء پر جوشؔ کو دانستہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہاں بھی اور ہندوستان میں بھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اب سے بہت پہلے ایک بات کہی تھی، جب اقبالؔ کو ہندوستان میں نظر انداز کیا جا رہا تھا "کسی قوم کا تہذیبی معیار دراصل اس قوم کے فلسفی، شاعر اور ادیب قائم کرتے ہیں، آتے جاتے سیاست داں نہیں۔"
ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اقبالؔ اور جوشؔ کو ناپا بھی ہے تو محض سیاسی پیمانوں سے،

جمالیاتی پیمانوں سے نہیں ، حالاں کہ شاعری کی اصل تو جمالیاتی ہوتی ہے اور جب ہم جمالیات کو محض سیاسی پیمانوں سے ناپیں تو یہ یقیناً درست رویہ نہیں ہوگا۔ہم نے ماضی میں غلطیاں بہت کی ہیں اور وہ غلطیاں آج بھی ہو رہی ہیں جن کا ادراک اور درستگی انتہائی ضروری ہے۔تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جوش کی دین بہت بڑی ہے انہوں نے جمالیاتی اعتبار سے اُردو کو بہت کچھ دیا ہے ،انہوں نے گری پڑی چیزوں کو بھی اس طرح شاعری میں جگہ دی ہے کہ حسن پیدا ہوگیا ہے اور یہ اُن کا فنکارانہ اعجاز ہے۔دیکھیے اُن کے ہاں کیسے کیسے لفظ آتے ہیں ،کیسے استعارے اور علامتیں ہیں جن کا حوالہ خالص مقامی ،ہندوستانی ہوتا ہے اور یہاں پاکستانی بھی کہہ لیجیے۔ان کے ہاں ''دونے کے پتے'' ''جامن'' اور ''جوہی'' کی کلیوں کا ذکر ملے گا ورنہ ان سے پہلے تو گل و لالہ ہی سے کام چل رہا تھا اور یہ نئے الفاظ ،استعارے اور علامتیں جو آئی ہیں وہ جوش کے واسطے سے آئی ہیں اور انہیں جوش ہی کی دین سمجھنا چاہئے۔ہم ترقی پسندوں نے شعوری طور پر جوش سے اکتساب کیا ہے اور اس کا اعتراف ضروری ہے۔

حسن عابد: جعفری صاحب یہ اکتساب تو جدیدیوں نے بھی جوش سے کیا ہے لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کرتے ،غالباً اس سے انہیں اپنے چھوٹے ہوجانے کا خدشہ لاحق رہتا ہوگا۔

جعفری صاحب: یہ سراسر زیادتی ہے ،جوش میرا جی سے پہلے تھے ،اختر الایمان سے پہلے تھے اور اُن کے ہاں جوش کے اثرات موجود ہیں جس کا اعتراف نہیں ہوتا ،اختر الایمان نے تو شاید کہیں لکھا بھی ہے کہ یہ کارنامہ اُن کا ہے ،میں نے اختر الایمان سے کہا بھی تھا کہ تمہارا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے ،یہ اصل میں جوش کی دین ہے ،تم اور ہم تو ہم عصر ہیں اور ہم نے اور تم نے جوش سے بے شمار چیزیں لی ہیں۔خیر یہ تو جملہء معترضہ تھا۔ہم پھر اپنی گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑتے ہیں ،تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نظمِ جدید کی جو عظیم الشان عمارت اقبال اور جوش نے تعمیر کر دی تھی وہ ترقی پسندوں تک پہنچتی ہے اور ترقی پسند شعراء نے اُس کو نہ صرف استحکام دیا ہے بلکہ مقدور بھر اسے آگے بڑھانے کا فریضہ بھی ادا کیا ہے۔دوسری طرف غزل تھی۔ غزل کو عصرِ حاضر میں لانے کا کام فیض اور مجروح نے انجام دیا ،ہم اس سلسلہ میں مجروح سلطان پوری کا نام اکثر و بیشتر بھول جاتے ہیں حالاں کہ ان کا contribution کسی طور کم نہیں رہا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس صورتِ حال کی ذمہ داری خود مجروح پر بھی عائد ہوتی

ہے، میں نے یہ بات مجروحؔ سے بار بار کہی ہے، بات یوں ہے کہ جب ایک شعر فلمی دنیا سے نکل کر آتا ہے تو اس کا اثر یقیناً مختلف ہوتا ہے اُس شعر سے جو جیل کی کوٹھری سے نکل کر عوام تک پہنچتا ہے، مجروحؔ نے در اصل خود کو فلمی دنیا میں بند کر رکھا ہے جس کا اثر اُن کی شاعری، اس کی مقبولیت اور خود اس خود اعتمادی پر ہوا ہے جس کا احساس انہیں جتنی جلدی ہو جائے بہتر ہے۔ خیر اس کے باوجود غزل کو نیا رنگ آہنگ دینے میں فیضؔ کے ساتھ مجروحؔ کا بھی بڑا contribution ہے۔ اس میں مجازؔ اور جذبیؔ بھی شامل ہیں، گو ان کا حصہ فیضؔ اور مجروحؔ سے کم ہے۔ اب دیکھیے ایک بات جو ہم ترقی پسندوں کو غیر ترقی پسندوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ ہم فن، حسن، اور افادیت تینوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، ہمارے ہاتھوں یہ تینوں قدریں کسی کامیاب فن پارے کے ضروری اجزاء ہیں، جب کہ ان کے ہاں فن اور حسن کاری پر اصرار تو ہے لیکن افادیت کی آمیزش کو نہ صرف غیر ضروری جانتے ہیں بلکہ اسے مہلک تک کہتے رہے ہیں اور یہی ہمارا اور اُن کا بنیادی اختلاف رہا ہے جسے ہر گفتگو میں یقیناً سامنے رکھا جانا چاہئے۔

مظہر جمیل: جعفری صاحب میں یہاں آپ کی توجہ اس طرف دلاؤں گا کہ ترقی پسندوں پر تحریک کے ابتدائی دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب کچھ لوگ جو صفِ اوّل میں تھے.

جعفری صاحب: (بات کاٹتے ہوئے) نہیں صاحب، یہ غلط ہے آپ کو جو کہنا ہے نام لے کر کہیے جو اعتراض کرنا ہے نام بہ نام کیجیے ورنہ اس سے بڑا گھپلا ہو جاتا ہے، میں خود نام لے کر واشگاف انداز میں بات کرتا ہوں۔ ہاں اگر کسی کی برائی مقصود ہو تو بے شک نام نہ لیجیے۔ لیکن اگر واقعی کسی بات کو سمجھنا ہو تو صاف صاف کہیے تاکہ گفتگو نتیجہ خیز ہو سکے۔

مظہر جمیل: جی ہاں، جی ہاں، جعفری صاحب میں در اصل یہ کہہ رہا تھا کہ تحریک کے ابتدائی دور میں ترقی پسندوں پر افادیت کا غلبہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا اور جمالیاتی عنصر پر توجہ کم تھی۔ لہٰذا ترقی پسند ادیب پر پروپیگنڈے (الزام) بھی لگے، تو آپ اس اعتراض کے سلسلہ میں کیا فرماتے ہیں۔

جعفری صاحب: ہاں یہ بات بالکل صحیح ہے، ایسا بے شک ہوا ہے اور بعض حلقوں نے بجا طور پر اس طرف نشاں دہی کی تھی، خصوصاً حلقہ اربابِ ذوق والوں نے۔ اس پر بھی گفتگو کیے لیتے ہیں، میں در اصل یہ کہہ رہا تھا کہ اگر کسی اہم شاعر کو کسی دور میں ترقی پسندوں نے نظر انداز کیا ہو تو

آپ اس کا نام لے لیں، اس سے ہماری غلطی کی اصلاح اور اس شاعر کی باز یافت میں آسانی رہے گی جہاں تک میرا خیال ہے کوئی بڑا اہم اور اچھا شاعر ہمارے ہاں نظر انداز نہیں ہوا۔

محمد علی صدیقی: جعفری صاحب اچھے شاعر سے آپ کی کیا مراد ہے۔؟

جعفری صاحب: یہ تو آپ خود مجھ سے بہتر جانتے ہیں، آپ دیکھیے ترقی پسندوں کا رشتہ عوام سے بہت قریب رہا ہے اور ہم نے کبھی عام آدمی سے صرف نظر کرنے کی جسارت نہیں کی، یوں بھی ہمارے ہاں شعر کتابوں کے ذریعے کم پہنچتا ہے۔ اُس زمانے میں تو خصوصاً ایسا ہوتا تھا لہٰذا ہمارا شعر مشاعرے کے ذریعے لوگوں تک پہنچتا تھا۔ ترقی پسندوں میں ایسا کون سا شاعر تھا جو مشاعروں میں نہیں گیا۔ دیکھیے میں یہ بات بالکل نہیں کہہ رہا ہوں کہ مشاعرے شعر کا معیار ہوتے ہیں، نہیں ایسا بالکل نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی تو مشاعرے گمراہ کن بھی ہوتے ہیں۔ مقصد صرف یہ کہنا تھا کہ مشاعرے کے ذریعے شعر زیادہ موثر طور پر عوام تک پہنچ جاتا ہے۔ آج کیفی نے نظم مشاعرے میں پڑھی نہیں اور کل وہ سب میں عام ہوگئی۔ یہی کیفیت مجاز کی تھی، مجروح کی تھی، جاں نثار اختر کی تھی گویا سب کی یہی کیفیت تھی اور ہمارے لیے مشاعرہ اپنی نظم، اپنی شاعری کو عوام تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا۔ انھیں اچھے شعر کا معیار نہیں سمجھا جاتا بلکہ ترسیل کا ایک اہم ذریعہ۔ یوں محمد علی صدیقی صاحب سے معذرت کے ساتھ میں عرض کردوں کہ میں اچھا شعر اس کو نہیں سمجھتا جس کو نقاد بڑا شعر مان لے یا جو محض دانشوروں کے حلقے سے سند پالے بلکہ میں تو بڑا شعر اس کو سمجھتا ہوں جو نقاد سے بھی داد پائے اور عوام میں بھی پسندیدہ قرار پائے۔ مشاعرے سے حاصل ہونے والی فوری مقبولیت ایک بات ہے اور کتاب میں خشک حروف کی صورت میں زمانے کی نشیب و فراز سے گزر کر باقی بچ رہنا ایک دوسری بات ہے اور یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اچھے شعر اور اچھے شاعر کا معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں کہ اسے آپ کسی تعریف کی گرفت میں لاسکیں۔

محمد علی صدیقی: جعفری صاحب آپ نے اپنی گفتگو میں جو ترقی پسند استعارے کی توجیہہ فرمائی ہے، خصوصاً ''یار'' اور ''دار'' کے حوالے سے ترقی پسندوں نے اپنے گردوپیش سے استعارے ڈھالنے کا کام شروع کیا تو اس سے نئی زبان کی تشکیل کا معاملہ بھی تو پیش آیا ہوگا اور نئی امیجری کے

اظہار کے لیے نئی لسانی تشکیلات بھی کرنی پڑی ہوں گی۔ تو یہ فرمائیے کہ لفظیات کے باب میں ترقی پسندوں نے کیا تبدیلیاں اور اضافے کیے؟

جعفری صاحب: جی ہاں اس ذیل میں بھی ترقی پسندوں نے خاصا کام کیا ہے اگر آپ صرف ترقی پسند شاعری کو لے لیں تو آپ دیکھیں گے کہ نئی امیجری کے ساتھ ترقی پسندوں نے لفظیات کی تشکیل میں کیا کیا کام سرانجام دیے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات کہوں گا کہ ابھی دورانِ گفتگو اس اعتراض کا تذکرہ ہوا تھا کہ ترقی پسندوں کے ہاں جمالیاتی اظہار کو پسِ پشت ڈال کر افادیت اور پروپیگنڈے کی راہ اختیار کی گئی تھی، معلوم نہیں آپ کے ذہن میں کون سی شاعری تھی آپ نے نام تو لیا نہیں تھا، لیکن میں

مظہر جمیل: (بات کاٹتے ہوئے) جیسے نیازؔ حیدر کی شاعری۔

جعفری صاحب: چلیے میں خود آپ کی مشکل حل کیے دیتا ہوں، آپ نیازؔ حیدر ہی کا نام کیوں لیتے ہیں آپ میرا نام بھی لے سکتے ہیں، مخدومؔ کا نام بھی لے سکتے ہیں، مجروحؔ کا نام بھی لے سکتے ہیں۔ ہم سب پر کم و بیش یہ اعتراض.. اگر یہ کوئی اعتراض کی بات ہے تو لگایا جاسکتا ہے۔

حسن عابد: جعفری صاحب وہ جو ترقی پسندوں پر پروپیگنڈے کا الزام لگایا گیا تھا تو میں تو یوں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسندوں کا کوئی اہم روشن نام مثلاً جوشؔ، فراقؔ، فیضؔ، مجازؔ، مجروحؔ، مخدومؔ یا خود آپ یعنی سردار جعفری ان میں سے کسی کی بھی شاعری کلیۃً پروپیگنڈے کی ذیل میں شمار نہیں کی جاسکتی اور خود معترضین نے بھی واشگاف طور پر یہ نہیں بتایا کہ فلاں فلاں شاعر کی فلاں فلاں نظمیں جمالیات سے عاری ہیں، ہمیں تو ان الزامات کی پشت پر کوئی مضبوط دلیل یا ثبوت نہیں ملتا۔

محمد علی صدیقی: غالباً معترضین کا اصل ہدفِ ملامت ترقی پسندوں کی فکر رہی ہے اور وہ فلسفۂ حیات جو ترقی پسندوں کو عزیز رہا تھا ناپسندیدگی کا باعث بنتا رہا ہے۔

حسن عابد: دیکھیے خود آپ کی نظم "نئی دنیا کو سلام" پر آثرؔ لکھنوی صاحب نے توصیفی تبصرہ لکھا تھا اور اس میں آپ کی نظم کی تعریف کی تھی، انہوں نے بھی جمالیاتی طور پر اس نظم میں کسی کمزوری کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔

جعفری صاحب: ہاں غالباً ۱۹۴۸ء میں آثرؔ صاحب نے میری شاعری خصوصاً "نئی دنیا کو سلام" پر حوصلہ افزاء تبصرہ لکھا تھا۔ "نئی دنیا کو سلام" پر تو آج تک اس قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا جاسکا ہے

اور نہ وہ اس قبیل کی چیز ہے۔

حسن عابد: اور پھر مخدوم کی شاعری ہے۔

اس میں بھی کبھی کسی نے جمالیاتی حسن کی کمی کی نشاندہی نہیں کی۔ فیض اور مجروح بھی اس الزام سے بری رہے ہیں تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ معترضین آخر کس شاعری کو سامنے رکھ کر تمام ترقی پسند شاعری کو معیار حسن پر کم تر ٹھہرا سکتے ہیں۔ ہمیں تو اس میں ادبی دیانت کے بجائے کچھ اور سخن گسترانہ باتیں شامل نظر آتی ہیں۔

جعفری صاحب: دراصل میں خود اس بات کو واضح کرنا چاہ رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ ترقی پسند ادب تحریکِ آزادی سے واضح وابستگی رکھتا تھا اور یہ تحریکِ آزادی محض ہندوستان کی تحریکِ آزادی نہیں تھی بلکہ ایک عالمگیر جدوجہد کا حصہ تھا، سامراجی استحصال کے خلاف، اس میں جغرافیائی، نسلی اور قومی قیود کوئی معنی نہیں رکھتے تھے بلکہ ہماری ہمدردیاں دنیا بھر میں برپا ہونے والے ہر اس جہاد کے ساتھ تھیں جن میں سامراجی شکنجے میں گرفتار سبھی مظلوم قومیں آزادی کا پرچم اُٹھائے ہوئے تھیں، ایک طرف ملکی اور مقامی سطح پر ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی غافل نہیں رہا جاسکتا تھا اور دوسری طرف کرۂ ارض پر ہونے والی "تبدیلیوں سے اغماض ممکن نہ تھا۔ یہ تھا پس منظر جس میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ اس میں دو عالمی جنگوں اور قحط بنگال کی ہولناکیاں بھی شامل ہیں، میں نے اپنی کتاب 'ترقی پسند ادب" میں اس صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس کے ثبوت فراہم کر دیے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس شاعری کی بھی ضرورت ہے جو ایک وقتی لمحہ کی ضرورت کو پورا کر رہی ہو اور اس شاعری کی بھی جو لمحاتی اور وقتی سطح سے بلند ہوکر دائمی قدر کی بھی حیثیت حاصل کر سکے۔ میں اب بھی یہ بات کہتا ہوں کہ فوری ردعمل کے طور پر جو شاعری پیدا ہوتی ہے وہ بالکل ہی بے معنی نہیں ہوتی، یہ بات شاید آج کی صورت حال میں زیادہ بہتر طور پر نہ سمجھی جا سکے لیکن اگر اس کو اس وقت کے تناظر میں دیکھیں تو پوری بات سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ جیسا کہ عرض کیا اُس وقت ہم ایک ہیجانی صورت حال سے دوچار تھے، ایک طرف ہندوستان کی آزادی کی جنگ تھی، بنگال کے قحط کی ہولناکیاں تھیں، بحریہ کی ہڑتال تھی۔ کسانوں، مزدوروں اور نچلے طبقوں کی جدوجہد تھی، غرض حوادث و واقعات کا ایک سیل تھا جو ہمارے چاروں طرف اُمڈا ہوا تھا۔ کیا ترقی پسند ادیب کے لئے جو اپنا رشتہ عوام سے

اُستوار رکھتا ہو اور جو تخلیقِ ادب کو ایک سماجی ذمّے داری بھی جانتا ہو،ان بدلتے ہوئے حالات سے چشم پوشی ممکن ہو سکتی تھی؟ ظاہر ہے نہیں ۔لہٰذا انہوں نے وقتی تقاضوں کے تحت بھی شاعری کی ہے اور اردگرد ہونے والے واقعات پر بے شمار نظمیں بھی لکھی ہیں ۔مَیں نے اپنی کتاب" ترقی پسند ادب" میں بیشتر مثالیں مجروحؔ کی شاعری سے پیش کی تھیں ،لیکن ابھی حال ہی میں شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر نعیم چوہدری صاحب کا ایک مضمون اُردو انٹرنیشنل (کنیڈا)میں شائع ہوا ہے،مجروحؔ کی شاعری پر ۔اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مجروحؔ نے بعد میں مرتب ہونے والے کلام سے اس قسم کی شاعری کو خارج کر کے در اصل دشمنوں کے سامنے اعترافِ شکست کیا ہے ۔اُنہوں نے کہا ہے کہ مجروحؔ نے وقتی طور پر کہے ہوئے اشعار کو خارج کر کے دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ ان اشعار کی تاریخی اہمیت تو بہر حال بنتی ہی ہے ،یاد رکھیے یہ بات شکاگو میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے ،ماسکو سے نہیں آئی ہے ۔اگر کوئی نظم ہزاروں مزدوروں کے سامنے پڑھی جائے اور وہ اُن کے خون میں شامل ہو کر اُن کی جد و جہد میں تعاون کرے تو اس میں قباحت کیا ہے کہ ترقی پسندوں کو مطعون کیا جائے۔ آپ دیکھیے ٹیگور کو جن کی عظمت سے شاید ہی کسی صحیح الدماغ شخص کو انکار ہو۔کیا اُنہوں نے پارٹیشن آف بنگال کے سلسلہ میں چلنے والی تحریک اور جلوس میں شامل ہو کر نظمیں نہیں پڑھیں؟ اور جناب کیا پابلو نرودا نے ہنگامی نوعیت کی نظمیں نہیں لکھیں اور بڑے بڑے مجموں کے سامنے نہیں پڑھی ہیں؟ اور کیا ایسا کرنے سے ان حضرات کا اثاثہ شعری کیا قابلِ دریا برد ٹھہرے گا ؟بات در اصل یہ ہے کہ مخدومؔ محی الدین ،کیفیؔ اعظمی ،سردارؔ جعفری ، وامقؔ جونپوری،نیازؔ حیدر ،جذبیؔ اور اس قسم کے دوسرے مجرموں نے ایجی ٹیشنل (Agitational)احتجاجی شاعری دانستہ اور شعوری طور پر کی تھی کیوں کہ ہم اس قسم کی شاعری کی ضرورت اور اہمیت کا احساس رکھتے تھے اور آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ شاعری بے اثر تھی اور اس نے کوئی کام سر انجام نہیں دیا ۔تو جناب ہم نے احتجاجی شاعری ضرور کی ہے ،لیکن ساتھ ہی ہم نے دائمی قدروں کی شاعری جسے آپ اچھی شاعری کہتے ہیں،کی ہے۔اب آپ کرتے یہ ہیں کہ ہماری اچھی شاعری کو نظر انداز کر لیتے ہیں اور پکڑ لیتے ہیں اس شاعری کو جو ہم نے ہنگامی ضرورتوں کے پیشِ نظر کی تھی یہ تو کوئی ادبی دیانت نہیں ہوئی۔ خیر اس کو چھوڑ دیجیے میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ جناب وہ ہماری ہنگامی نوعیت کی شاعری آپ کی

اس مہمل شاعری سے بہتر تھی جس کا کوئی مقصد، کوئی بدل، کوئی رخ اور کوئی مافی الضمیر نہیں ہوتا۔ اب رہا اچھی اور گہری شاعری کا معاملہ تو کیا جناب دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کے پاس کوئی کمزور اور بُرا شعر نہیں ہوتا؟ آخر آپ میرؔ کے اس شعر کو کہ ؎

میرؔ کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب   اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

اور غالبؔ کے اس شعر کو کہ ؎

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا   ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

کیا ان اشعار کو یا اسی قسم کے سینکڑوں اشعار کو جو کلاسیکل شاعری میں بھرے پڑے ہیں آپ اچھی شاعری کے ذیل میں رکھیں گے؟ تو جناب بات جو ہونی چاہئے وہ دیانت داری سے ہونی چاہئے۔ اگر آپ مخدومؔ کے ہاں، میرے ہاں یا ہمارے کسی مجرم ساتھی کے ہاں سے کچھ اچھے اشعار کی داد بھی دے ڈالتے تب تو شاید آپ کے اعتراض میں کوئی وزن ہوتا۔

مسلم شمیم: ظاہر ہے اس رویّے میں تو معترضین کی ادبی دیانت ہی مشکوک ٹھہرتی ہے۔

جعفری صاحب: اب اس مسئلہ کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جن لوگوں نے شروع میں احتجاجی شاعری کی تھی انہوں نے بعد میں لطیف شاعری بھی کی ہے اور جن لوگوں نے شروع میں زیرِ لب بات کی تھی اُنہوں نے آخر آخر میں احتجاجی شاعری بھی کی ہے۔ یہاں میں فیضؔ کا نام لوں گا۔ فیضؔ شروع سے ہی لطیف لہجہ کے شاعر رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے لطیف لہجہ میں مزید چاشنی، مزید لطافت، حسن اور نغمگی پیدا ہوتی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے انتساب جیسی نظم بھی کہی۔ کلرکوں، پوسٹ مینوں اور گاڑی بانوں جیسے الفاظ میں۔ اور پھر فیضؔ کی آخری دور کی نظمیں جو اُنہوں نے فلسطینی نعرے پر لکھی ہیں کہ "ہم کہ جیتیں گے" یہ لہجہ یہ ٹون فیضؔ کے ہاں پہلے نہیں تھا لیکن آخر آخر میں اُن کے ہاں بھی یہ بلند بانگ احتجاجی لہجہ آیا۔ فیضؔ کی ایک غزل نما نظم ہے کہ ؎

"جب مزدور، کسان جاگیں گے تو ایک کھیت نہیں، ایک دیس نہیں ہم ساری دنیا مانگیں گے،
ہم ہر پرچم پر اک لال ستارہ مانگیں گے۔"

بات دراصل یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری میں دونوں چیزیں شامل ہیں۔ اگر کوئی اس بلند آہنگی کو بہانہ بنا کر فیضؔ کی پوری شاعری پر معترض ہو تو کیا آپ اسے ادبی دیانت کہیں گے؟

مسلم شمیم: جعفری صاحب آپ کی گفتگو سے یہ مترشح ہو رہا ہے کہ ترقی پسندوں نے جو احتجاجی شاعری

کی تھی وہ اچھی شاعری کے زمرے میں نہیں آتی ہے۔

شاہد نقوی: صاحب یہ تو معذرت خواہانہ طریقہ ہوا آخر اچھی شاعری کے معیار کیا ہیں؟

جعفری صاحب: دیکھیے میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ اچھی شاعری نہیں تھی بلکہ صرف یہ عرض کیا تھا کہ وہ لمحاتی اور وقتی شاعری تھی اور اس قسم کی شاعری کی افادیت سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک اچھی شاعری کے فنی معیار کا تعلق ہے تو جناب یہ انتہائی مشکل سوال بلکہ ٹیڑھی کھیر والی بات ہے۔ فنی معیار بڑی عجیب وغریب چیز ہے اور بعض اوقات آپ کو ایسے اشعار ضرب المثال کی صورت سنائی دیں گے جن میں کوئی حسن نہیں ہوتا اور جو کسی فنی معیار پر پورے نہیں اترتے "اوروں کی تجھ کو کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جو کچھ تخلیق کیا جا رہا ہے اس میں سے کل کیا باقی رہ جائے گا اور پھر یہ فنکار کا مسئلہ ہوتا بھی نہیں، اگر یہ کہا جائے کہ۔

ولیؔ اس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

تو اچھی شاعری کی مثال ہے اور۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے

بُری شاعری ہے تو یہ تنقید کا کوئی معیار نہیں ہوا، یہ دونوں شعر ولیؔ کے ہیں، اب آپ کسی ایک شعر کو بنیاد بنا کر شاعر کے مقام اور اہلیت کے بارے میں کوئی فتویٰ صادر نہیں کر سکتے، جیسا کہ ہمارے غیر ہمدرد اور برخود غلط ناقدین ہمارے بارے میں کرتے ہیں۔ اچھا اس سلسلہ میں ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ لمحاتی اور وقتی شاعری میں بھی اکثر ایسی لا فانی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں جو باید وشاید ہی دیکھنے میں آتی ہیں میں آپ کو اقبالؔ کے طلوع اسلام میں سے مثال دے کر سمجھاتا ہوں، شعر ہے۔

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

دیکھیے یہ مصرع ایک وقتی ضرورت کے تحت لکھا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ جو دوسرا مصرع آیا ہے وہ اپنے حسن اور قوت کے اعتبار سے دائمی چیز بن گیا ہے۔

"کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا"

اب دوسری مثال اقبالؔ کے مقابلہ میں نسبتاً کم مشہور شاعر مظفر شاہجہاں پوری کے ہاں سے دیکھیے، پہلا مصرع ہے۔

اس طرف روس ادھر چین ملایا برما
اب اجالے مری دیوار تک آ پہنچے ہیں

محمد علی صدیقی: جعفری صاحب ابھی گفتگو کے دوران آپ نے خاصی وضاحت سے بتایا کہ فیض صاحب کے ہاں کس طرح آہنگ کی تبدیلی رونما ہوئی اور جب فیض کے ہاں رجائیت سرفروشانہ جذبے اور رجز کا اظہار ہوا تو بعض معترضین نے یہ بات کہی کہ شاید فیض صاحب اپنے آپ کو دوہرا رہے ہیں وہ یہ بھی نہ سمجھے کہ فیض کا جو لطیف تر حصہ جس پر وہ بہت نازاں و فرحاں رہے ہیں فیض کی بلند آہنگی کے ساتھ مل کر مزید لطیف تر ہوا ہے۔

جعفری صاحب: بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ فیض کا جو لطیف تر لہجہ تھا وہ وقت کے ساتھ بہتر سے بہتر ہوتا گیا، فیض تو آخر وقت تک ارتقا پذیر رہے ہیں اور اُن کا خلاقانہ ذہن آخر وقت تک کچھ نہ کچھ دیتا ہی رہا ہے۔ اُن کی نغمگی جو رومانی نظموں میں تھی وہ بعد کی رجزیہ نظموں میں زیادہ اعلیٰ سطح پر نظر آتی ہے۔ لہٰذا شاعری کو لطیف لہجے اور بلند آہنگ میں تقسیم کر دینا، یہ ہی غلط بات۔ لہجہ اور آہنگ تو موضوع سے بنتا ہے، بات در اصل یہ ہے کہ ہمارے معترضین کے لئے وجہ شکایت ہماری شاعری نہیں بلکہ ہمارا فلسفۂ زیست رہا ہے، خواہ مجروح ہوں فیض، ہوں مخدوم ہوں کہ سردار جعفری، ان سب کو اشتراکی فکر عزیز رہی ہے اور یاروں نے اس فکر کو مطعون کرنے کے لئے ایسے بہتان تراشے ہیں، جن کی کوئی علمی بنیاد تھی نہ ادبی دیانت اور آپ دیکھیے ان اعتراضات کا حشر ہوا کیا؟ ہمیں اپنی بلند آہنگی کا نہ صرف اعتراف ہے بلکہ اس پر ناز بھی۔ لیکن ذرا ہمارے معترضین کا بھی تو جائزہ لیجئے۔ آپ کو اگر بہت نہیں تو کم از کم دو چار مثالیں ایسی مل ہی جائیں گی جن پر خود ہی الزام وارد ہوگا۔

محمد علی صدیقی: بات تو صاحب وہی ہے، جو لوگ فیض کی فکر اور نظریئے سے خوش نہ تھے بھلا انہیں فیض کی شاعری کیوں کر پسند آتی۔ ان کے ہاں جو clarity ہے، جو کمٹ منٹ ہے اور جو رجز کی کیفیت ہے اس پر تو ایسے لوگ خوش ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

جعفری صاحب: نہیں بھئی بعض لوگ تو فیض کی جمالیاتی کیفیت سے بھی خوش نہیں رہے ہیں مثلاً ن۔م۔ راشد نے جو خود اچھے شاعر تھے "لا مساوی۔ الا انسان" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ فیض کہ ہاں بے انتہا آرائش ہے اور مجھے خوف ہے کہ کہیں بعد کو یہ نرگس کے کاغذی پھول ہی ثابت نہ ہوں" تو مجھے اس جملہ میں معاصرانہ چشمک کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ فیض

کے خلاف ایک اچھا خاصا محاذ آپ کے ہاں رہا ہے اور آج بھی کسی نہ کسی پہلو سے مخالفانہ سرگرمیاں جاری ہیں لیکن دیکھیے یہ فیض کی آواز کی سچائی اور فن کا طلسم تھا کہ انہوں نے ایک عالم سے داد وصول کر کے چھوڑی۔

مظہر جمیل: جعفری بھائی وہ جو ابتدا میں محمد علی صدیقی صاحب نے روایت کا مسئلہ اُٹھایا تو کیا مناسب نہ ہوگا کہ اس سلسلے میں بھی کچھ گفتگو ہو جائے۔

جعفری صاحب: ہاں بھئی اب اس پر گفتگو ہو سکتی ہے، ذرا آپ سوال دہرائیں۔

محمد علی صدیقی: روایت کے بارے میں ہمارے ہاں اپنا ایک نظریہ تھا، پھر ٹی۔ایس۔ایلیٹ کے نظریہ روایت پر عسکری صاحب اور جمیل جالبی صاحب نے کچھ کام کیا اور Creative Evolution Of Tradition کی بات آئی، بعد میں عسکری صاحب نے روایت کے سلسلہ میں بالکل جداگانہ موقف اختیار کر لیا، دوسری طرف وہ نظریۂ روایت بھی رہا ہے جس کی طرف ابھی آپ نے اشارہ فرمایا تھا۔میری خواہش ہے کہ مختلف نظریہ ہائے روایت کے حوالے سے آپ کچھ روشنی ڈالیں۔

جعفری صاحب: دیکھیے اس سلسلہ میں جو کچھ کہوں گا وہ میری ذاتی بات ہوگی اور ضروری نہیں کہ ہر ترقی پسند میری ان گزارشات سے متفق ہو کیوں کہ ترقی پسندوں کے ہاں بھی اس سلسلہ میں مختلف رنگ رہے ہیں۔ایک رنگ تو وہ ہے جسے آپ گہرا سرخ رنگ کہتے ہیں۔آپ اسے سجاد ظہیر کا رنگ کہہ لیجئے، ایک رنگ گیروا رنگ ہے اسے آپ منشی پریم چند سے منسوب کر سکتے ہیں اور اس کے درمیان بہت سے ہلکے گہرے شیڈ shade کی ایک دھنک ہے۔میں تو مارکسی ہوں اور مارکسزم میری سوچ بلکہ ضمیر کا حصہ بن چکا ہے۔اس نقطۂ نظر سے میں روایت کو طبقاتی سماج کے عمل سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتا یہ کوئی قائم بالذات چیز نہیں ہے اور جب سماجی ماحول بدلتا ہے تو وہ سماجی رشتے تبدیل ہوتے ہیں تو روایت میں بھی ٹوٹ پھوٹ واقع ہوتی ہے اور اس طرح روایت کا حصہ زندہ ورثے کے طور پر مستقبل کے سپرد ہو جاتا ہے، جب کہ ایک حصہ جو معاشرتی ابتری کے سبب مردہ ہو چکا ہوتا ہے تاریخ کے سرد خانے میں جا پڑتا ہے، اس بات کو ہم اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ زبان تو باقی رہنے والے ورثے کے طور پر خود آگے چلتی ہے اور تراش خراش کے ساتھ نمو پاتی رہتی ہے یعنی اس کی ریڑھ کی ہڈی جسے ڈھانچہ کہتے ہیں باقی رہتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ سامتی سماج میں زبان جو تھی وہ سرمایہ

دارانہ سماج میں یکسر بدل جائے یا کمیونسٹ سماج میں بالکل ہی ختم ہو جائے۔ یہ نہیں ہوتا بلکہ زبان میں ترقی اور نمو پذیری کا عمل جاری رہتا ہے، بنیاد نہیں بدلتی، لیکن اقدار بدل جاتی ہیں، اقدار کے ساتھ رویے بدل جاتے ہیں، رویے کے ساتھ الفاظ بدلتے ہیں، محاورہ بدلتا ہے، غرض روایت کا توانا حصہ تو سماجی تبدیلی کے ساتھ گھل مل کر آگے چلتا ہے، لیکن مردہ حصہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ یہ روایت کا جدلیاتی عمل ہے، اب دیکھیے روایت میں فکر کا عنصر بھی شامل ہوتا رہتا ہے جو معروضی حالات میں پیدا ہوتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ فکر بہت ضدی واقع ہوتی ہے، ہوتا یوں ہے کہ ہر دور میں ماضی کی فکر کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی بچ رہتا ہے اور اس طرح مختلف النوع خیالات اور عقائد وغیرہ بھی روایت میں چلتے رہتے ہیں اور اسی لئے ایک طرح کی Dichotomy کا احساس بعض لوگوں کے ہاں ملتا ہے۔

اور معلوم یوں ہوتا ہے جیسے کوئی شخص اپنی فکر میں تو بے حد ترقی پسند نظر آئے گا لیکن اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ آپ کو ترقی پسند نہ معلوم ہوگا، اس کے برعکس ایسے لوگ بھی آپ کو ملیں گے جو مزاجاً تو ترقی پسند دکھائی دیتے ہیں لیکن فکر میں فرسودگی کا عنصر غالب۔ یہ تضاد جمالیات میں آکر عجیب گل کھلاتا ہے، جمالیات تو ہمارے ذوق کا حصہ ہے اور ہم اسے کلیجے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سبطِ حسن نے ایک بہت خوبصورت مثال دی تھی جس طرح بندریا اپنے مردہ بچے کو سینے سے چمٹائے پھرتی ہے اسی طرح ہم کبھی کبھی اپنی ان بعض اقدار کو سینے سے چمٹائے رکھتے ہیں جو معاشرتی طور پر مر چکی ہوتی ہیں فیض نے اس بات کو غالباً اس طرح کہا تھا۔

دل کے ایوانوں میں لیے گُل شدہ شمعوں کی قطار ۔۔۔ نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیّال تصوّر کی طرح ۔۔۔ اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

تو گل شدہ شمعوں کو جب سینوں سے لپٹا لیا جاتا ہے تو اس کے حصار سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی غالبؔ، مومنؔ کے مقابلہ میں زیادہ ترقی پسند تھا کہ اس کے ہاں ماضی پرستی نہیں، ہاں ٹوٹتی ہوئی قدروں کا غم ضرور ہے۔ خود ماضی کے مٹ جانے کا غم نہیں۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی موت پر غالب نے ایک مصرع نہیں کہا، لیکن اقدار کی موت پر وہ ضرور تڑپا، کیا اس کی شاعری اور کیا خطوط سب جگہ آپ اُس کی تڑپ کو دیکھ سکتے ہیں، غالبؔ کی نظر مستقبل پر رہی ہے۔ یہاں میں آپ کو غالبؔ کی ایک فارسی غزل سناتا ہوں۔ غالبؔ

خود کو شاہانِ ایران کی اولاد سمجھا کرتے تھے اور اس پر کچھ فخر بھی تھا لیکن اُس نے شاہی کو خود اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا ،اُس نے انگریزوں کی لائی ہوئی ایجادوں کو دیکھا، سائنس اور نئے علوم کا ایک شہرہ اور غلغلہ بلند ہوا تھا اسے غور سے نہ صرف سنا بلکہ سر سید کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی ۔''آئینِ اکبری'' پر اس نے جو تقریظ لکھی ہے وہ غالبؔ کی اس طرزِ فکر کی غمازی کرتی ہے ۔یہاں تک تو ٹھیک تھی لیکن اُس نے ان تبدیلیوں کو اپنی شاعری اور وہ بھی غزل میں جگہ دی اور فارسی غزل کی روایت سے ہٹ کر ۔آپ مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ ہماری کلاسیکل شاعری میں رات کا استعارہ عیش و نشاط کا استعارہ رہا ہے ،غالب پہلا شاعر ہے جو رات کو عیش و نشاط کے سمبل Symbol سے الگ کر کے استعمال کرتا ہے ،آپ غزل سنیے ۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند   شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

گہر از رایتِ شاہانِ عجم بر چیدند   بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

یعنی خوشا کہ تیرہ شبوں کے لئے صبح ہو گئی ہے اور غموں کے گل ہونے کے ساتھ ہی خورشید عالمتاب نکلا چاہتا ہے اور شاہانِ عجم کے پرچموں سے جواہر نوچ لئے گئے ہیں اور ان کے بدلے مجھے اظہار کے جواہر سے مالا مال کر دیا گیا'' یہی نہیں بلکہ مزید یہ کہا کہ میرے بزرگوں کے ٹوٹے ہوئے تیر میرے ہاتھوں میں قلم بن گئے ہیں ،تو جناب یہ نیا استعارہ تھا، نیا لہجہ تھا جو روایت کے زندہ ورثہ کے طور پر ترقی پسندوں کو تفویض ہوا۔

مظہر جمیل : جعفری بھائی! آپ نے روایت پر خاصا کام کیا ہے اور دیکھا جائے تو ترقی پسند معاصرین میں آپ تنہا نظر آتے ہیں جنھوں نے ایک تسلسل کے ساتھ کلاسیکل شعراء پر تحقیقی نوعیت کا کام کیا ہے خصوصاً کبیرؔ ،میرؔ اور غالبؔ پر آپ نے بہت دقیع کام کیا ہے اور اقبالؔ شناسی بھی آپ کا موضوع رہا ہے تو یہ سارا کام زندہ روایت کے سلسلہ ہی کو منسلک کرنے کا کام تھا یا کچھ اور بھی مقاصد آپ کے پیش نظر رہے ہیں ۔

جعفری صاحب : بعض اوقات اہم کام بے ارادہ ،رواداری اور بغیر کسی منصوبہ بندی کے بھی ہو جاتے ہیں ۔ جب کبیرؔ ،میرؔ ،غالبؔ یا اقبالؔ پر کام شروع کیا تھا تو میں دراصل ان شعراء کی بازیافت نہیں کر رہا تھا بلکہ میری خواہش تھی کہ اپنے کلاسیکل ورثے سے خود آگاہی حاصل کر سکوں ، میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ادب کا صحیح ذوق رکھتا ہو اور اسے اپنے ادب میں دلچسپی ہے تو

اسے دوسروں کی کہی ہوئی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کر لینا چاہئے بلکہ اپنے طور پر جس حد تک ممکن ہو اس ورثے تک خود پہنچنے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو پھر ہم میر کو محض آہ کا شاعر، اور سودا کو واہ کا شاعر جیسا کہ ہمیں آزاد اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے بتایا تھا، سمجھتے رہ جائیں گے، لیکن جب آپ خود میر کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ صاحب وہ تو اپنے عہد کا بڑا کرانیکلر شاعر تھا جس نے اپنے عہد کو سمجھا اور برتا تھا اور جس کی شاعری میں اس کا عہد جھلکتا ہے۔ میر کے ہاں جو جلال یا تلخی تھی تو وہ اس کے عہد کی تلخی تھی وہ صرف عطار کے لونڈے سے دوا نہیں لیتا تھا بلکہ یوں بھی کہتا تھا ۔

کاش تجھ کو ملے کوئی تجھ سا مدعا ہم کو انتقام سے ہے

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھلا کے نہ ہم اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

اچھا اب غالب کا وہ جو شعر ہے نا کہ ۔

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

تو دیکھیے یہ مضمون میر کے ہاں کس طرح آیا ہے ۔

پی کے شراب شگفتہ ہوا ہے اس نوگل پہ بہار ہے آج

شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بوس و کنار ہے آج

تو جناب یوں میں نے میر اور کبیر پر کام کیا، اس وقت ایک اور مقصد پیش نظر تھا اور وہ تھا تصوف اور بھگتی کے باغیانہ کردار کو سمجھنا۔ آج تصوف خصوصاً وہ تصوف جو مردنی کی طرف لے جاتا ہے ہم تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن ماضی میں تصوف نے جو کردار انجام دیا ہے اس سے منکر بھی نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تصوف نے ایک ادارے کی حیثیت سے مذہبی اور ریاستی بیورو کریسی کے خلاف اہم اور فعال کردار انجام دیا ہے، قرون وسطیٰ میں مذہبی اور ریاستی بیورو کریسی تقریباً ایک تھی مثلاً مد، قاضی محتسب سب ایک زنجیر کی کڑیاں تھیں، چنانچہ ایسے وقت صوفیوں کا یہ کہنا کہ "خدا ہمارے اندر ہے اور خدا اور انسان کا براہ راست تعلق ہے" تو یہ بظاہر معصوم سا فقرہ در اصل ہر قسم کی بیورو کریسی کی بنیاد کاٹ کر پھینک دینے کے مترادف تھا بلکہ آپ اسے پورے معاشرتی جبر کے خلاف بھرپور ردعمل قرار دے سکتے ہیں۔ ابھی کچھ دن قبل لاہور میں میں نے تقریر کرتے ہوئے مولانا جلال الدین رومی کی غزل کے کچھ شعر

سنائے آپ بھی سنیے اس سے صوفی مزاج بلکہ باغیانہ صوفی مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے ۔

چوں من خراب و مست را در خانہ خود رہ دہی   پس می دانی ایں قدر ایں بشکنم آں بشکنم

خوان کرم گستردۂ مہمان خویشم کردۂ   گوشم چرا مالی اگر من گوشہ ناں بشکنم

(اگر روٹی کا لقمہ یا ٹکڑا میں نے توڑ لیا ہے تو میرے کان کیوں کھینچتا ہے) یہ ترک دنیا کے خلاف رہبانیت کے خلاف ردعمل تھا اور یہی در اصل تصوف کا صحت مند رویہ تھا جو رومی کے ہاں نظر آتا ہے یا ہندوستان میں بھگتی اور تصوف کی تحریکوں میں ملتا ہے ۔

گر دیو بد فعلی کند یعنی ترسد از علی   من گردن آں دیوا پیش سلیماں بشکنم

گر محتسب جوید مرا تا درہ کوبد مرا   من دست و پائش را زخم تا فرق و دنداں بشکنم

گر شمس تبریزی مرا گوید ہمی آہستہ رو   گویم کہ من دیوانہ ام ایں بشکنم آں بشکنم

اب آپ ان اشعار کا آہنگ دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ یہ ہم جو ترقی پسندوں پر اعتراض ہے بلند آہنگی کا تو کیا اعتراض رومیؔ پر بھی وارد ہوتا ہے اور کیا آپ رومیؔ کے اس آہنگ کو سرگوشیانہ آہنگ قرار دے دیں گے؟ میں تصوف کو موت کا فلسفہ نہیں سمجھتا اور یہ بات صرف ہمارے ہاں ہی نہیں بلکہ دوسرے معاشروں میں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی ،اس کا سراغ ہمیں ملتا ہے ۔مارکس اور اینگلز کے ہاں بھی۔ اینگلز کو اگر بغور پڑھا جائے تو اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے عہد میں عوامی تحریکوں کے مرکز تھے ،محدود پیمانے پر ہی سہی۔ اینگلز کی ایک کتاب ہے (PEASANT,WAR IN GERMANY)اس میں MYSTICISIM پر خاصا تفصیلی اور تجزیاتی مواد موجود ہے، میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں ،میں نے ایک مرتبہ تابور جو جنوبی سلواکیہ میں، ہے ایک شعر دیکھا جو اپنی معنی ،مفہوم اور تاثر میں مجھے بالکل میرؔ کا شعر معلوم ہوا ،اس شعر کا مطلب کچھ یوں تھا ''موت عصائے شاہی کو اور کسان کے ہل کو ایک ہی قبر میں سلا دیتی ہے'' میرؔ کے ہاں اس مفہوم کا یہ شعر ہے ۔

جب فنا یک بارگی طاری ہوئی   ٹھیکرا اس مرتبے میں کیا سرِ فغفور کیا

ظاہر ہے اس زمانے میں مساوات کا وہ معاشراتی تصور تو تھا ہی نہیں جو آج موجود ہے یعنی جدید علوم و تصورات کے ساتھ۔ تو اس وقت موت اُن کے پاس ایک ایسا حربہ تھا جس سے وہ ڈراتے تھے ظالموں کو اور جابروں کو ان کو ظلم و جبر سے باز رکھنے کے لئے اور مظلوم و مفلس کو

موت کی نوید دیتے تھے کہ بس موت آئی کہ ساری مشکلات انجام کو پہنچ جائیں گا اور پھر موت اُن کے ہاں ایک ایسا مقام تھا جہاں ادنٰی و اعلیٰ غلام و آقا سب ایک ہی انجام کے سزاوار ہوتے تھے۔ اس طرح وہ ممکنہ طور پر انسانوں کو مساواتی زنجیر میں پروئے رکھنا چاہتے تھے۔

حسن عابد: جعفری صاحب جب تذکرہ موت کا آ ہی گیا تب یہ فرمایئے کہ ترقی پسندوں کے ہاں موت کا تصور کس طرح آیا ہے خصوصاً اُن کی شاعری میں۔

جعفری صاحب: ارے صاحب ہمارے ہاں تو موت کا تصور انتہائی شگفتہ رہا ہے اب آپ شگفتگی اور موت کی یکجائی پر چونکیے مت بلکہ یہ دیکھیے کہ ہم موت کو بھی زندگی کا نیا سلسلہ سمجھتے ہیں وہ جو میر نے کہا ہے نا کہ ؎

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے　　　یعنی آگے چلیں گے دم لیں کے

تو یہ تصور ہمارے بعض ترقی پسندوں کے ہاں کچھ اور طرح سے آیا ہے، اور اس طرح کہ خزاں تجدیدِ بہار ہے اور موت تجدیدِ حیات ہے۔ فیض کی خوبصورت نظم جس کا موضوع ہی موت ہے، آپ کے ذہن میں تازہ ہوگی، دیکھیے کیسی دلکش اور بھرپور نظم ہے اور اس سے کیا کیا تصور نکل کر آتے ہیں۔ موت آئے گی تو کس طرح آئے گی، وصلِ محبوب کی شکل میں یا جلاد کی صورت۔ موت کیسے بھی آئے، جب ہم ختم ہوں گے تو کہیں گے ؎

"الحمد بیاد لب شیریں دہناں"

دیکھیے کس قدر شگفتہ تصور ہے۔ اب آپ جاں نثار اختر کے ہاں دیکھیے اس نے اپنی بیٹی عنیزہ کے نام ایک نظم لکھی جس میں اس نے کہا کہ "بیٹی تم میری زندگی میں اس وقت آئی ہو جب میں پا بہ رکاب جا رہا ہوں، تمہارے لئے ورثے میں کچھ نہیں چھوڑ رہا ہوں سوائے مسائل کے پشتارے کے اس تعقل کے جو میں نے اس پشتارے کو حل کرنے میں حاصل کی اور اب جو تمہاری میراث ہے" تو موت اس طرح نئی زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

حسن عابد۔ آپ کی بھی تو نظم تھی موت کے موضوع پر۔

جعفری صاحب: ہاں خوب یاد دلایا "میرا سفر" کے عنوان سے مَیں نے نظم لکھی تھی جس کے چند مصرعے کچھ اس طرح تھے ؎

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا　　　بچوں کے دہن سے بولوں گا

چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا　　　جب بیج ہنسیں گے دھرتی پر

اور کونپلیں اپنی انگلی سے مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل انداز سخن بن جاؤں گا

جب یہی تصور غزل میں آتا ہے تو یہ شعر کا روپ دھار لیتا ہے ۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

اچھا اب دیکھیے کہ ترقی پسندوں کے ہاں موت کا یہ رجائی تصور آیا کہاں سے ہے؟ تو جناب یہ تصور اس فکر سے پھوٹتا ہے جو ہمیں زندگی اور عام معاشرتی زندگی کو تمام تلخیوں اور تمام تر شیرینیوں کے ساتھ جینا سکھاتی ہے ۔عام انسان کے دکھ درد، ہمارے دکھ درد ہوتے ہیں اور جہد حیات میں برابر کے شریک ظلم کے خلاف، جبر کے خلاف، چیرہ دستیوں کے خلاف، استحصال کے خلاف اور ہر اس کام کے خلاف جو انسان کو شرف انسانیت سے گرا دے اور شامل ہیں ہم ہر اس معرکے میں جو زندگی کے فروغ، علم کے فروغ، انسانیت کے فروغ، شرافت کے فروغ اور مساوات کے فروغ کے سلسلے میں دنیا کے کسی بھی حصے میں جاری ہو لہٰذا ہمارے لوگ پھانسی پر کلمۂ حق کہنے کی جسارت رکھتے ہیں اور اسی صورت حال میں اس قسم کے شعر ہو سکتے ہیں کہ ۔

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے

یا مجروح کا یہ شعر ۔

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

تو یہ تصور دراصل زندگی سے مکمل ہم آہنگی کے سبب پیدا ہوا ہے ۔زندگی سے گریز کر کے یہ تصور پیدا ہی نہیں ہو سکتا ۔

محمد علی صدیقی : تو گویا زندگی سے ہم آہنگی ترقی پسندوں کی سب سے بڑی دین ہوئی ۔غالباً کیا بلکہ یقیناً زندگی اور فنون برسوں الگ الگ خانوں میں بٹے رہے ہیں کیوں کہ ESTABLISHMENT نے انہیں کبھی ایک جا ہونے کا موقع ہی نہیں دیا تو گویا اب ترقی پسندوں نے زندگی اور فنون کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا اور اس سلسلے میں خود آپ کا بڑا contribution ہے کیوں کہ گزشتہ نصف صدی کے

دوران ترقی پسند تحریک کے رہنما بلکہ Theoretician کی حیثیت سے۔ آپ یہ فرمائیں کہ آپ نے جب یہ سفر شروع کیا تھا تو آپ کے مقابل روایتی لوگوں کے ساتھ لبرل لوگ بھی تو شامل ہو گئے تھے اب لبرلزم تو یہ کہتا ہے کہ Knowledge برائے knowledge ہونی چاہئے اور کلیسا اور اسٹیبلشمنٹ کا کوئی اجارہ علوم پر نہیں ہونا چاہئے۔ اب دیکھیے کہ مغرب میں لبرلزم کے خلاف ترقی پسند مخالفانہ رویّہ اختیار کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں لبرلزم بجائے خود ایک ترقی پسندانہ رویّہ ٹھہرتا ہے تو آپ ہمیں ترقی پسند Scholar کی حیثیت سے یہ بتائیے کہ آج ہم لبرلزم کو کس Context میں دیکھیں، خاص طور پر آج کے معروضی حالات میں۔

جعفری صاحب: بھئی یہ تو مختلف معاشرے اور مختلف وقت کے معروضی حالات کا معاملہ ہوتا ہے ویسے تو آپ کے سوال کا جواب خود اس کے بین السطور میں موجود ہے لیکن اگر کسی خاص لبرلزم کی طرف اشارہ ہے تو دوسری بات ہے ورنہ تو ہر جگہ کے معروضی حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ردعمل سے وہاں کے رویے متعین ہوتے ہیں۔ کسی جگہ لبرلزم ترقی پسند ہوگی اور کسی جگہ ترقی پسند کو پچھاڑنے کا ذریعہ اور اس سلسلے میں کوئی بات حتمی طور پر کہی نہیں جا سکتی، لیکن پھر بھی اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کٹر پن کے مقابل لبرلزم بہر حال ایک مستحسن رویہ قرار پائے گا۔

محمد علی صدیقی: جعفری صاحب ایک سوال آپ کے ہم عصروں کے بارے میں، یوں تو بہت سے احباب آپ کے ہم سفر رہے ہیں ان میں سے بعض اپنی اپنی اننگ کھیل کر اب شگفتہ موت سے ہمکنار ہو چکے ہیں تو آپ کو سب سے زیادہ کس ہم عصر نے متاثر کیا ہے؟

جعفری صاحب: بھائی! اب اس سلسلے میں کیا کہا جائے کس کس کا نام لیا جائے سیدھی سی بات یہ ہے کہ سب ہی نے متاثر کیا ہے۔

مظہر جمیل: جعفری صاحب، دراصل محمد علی صدیقی بھائی کے سوال کے دو حصے ہیں، پہلا سوال تو آپ کے ہم عصروں کے بارے میں ہے جو فکری طور پر بھی آپ کے ہمسفر رہے ہیں جیسے جوشؔ، فراقؔ، مجازؔ، مخدومؔ، فیضؔ، جذبیؔ، اخترالایمان، جاں نثار اخترؔ، کیفیؔ، مجروحؔ، ساحرؔ وغیرہ اور دوسرا حصہ سوال کا ہے ان ہم عصروں کے بابت جو ترقی پسند تحریک کے باہر تھے اور جن میں سے اکثر کا تعلق حلقہ ارباب ذوق سے تھا مثلاً میراجیؔ، تاثیرؔ، ن۔م۔راشدؔ وغیرہ تو آپ

وضاحت سے اس سلسلے میں فرمائیے۔

جعفری صاحب میں آپ کے دوسرے سوال کا جواب پہلے دے دوں جس میں غالباً آپ زیادہ Interested معلوم ہوتے ہیں (قہقہہ) بات یوں ہے کہ جب ترقی پسند تحریک شروع ہوتی ہے تو اس وقت اس میں ہر چیز گڈمڈ تھی بس اتنا تصور تھا کہ ہم کو نئی جہت نکالنی ہے۔ نئے راستے تلاش کرنے ہیں اور ماضی کی بہت سی چیزوں سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اظہار و بیان کے نئے پیمانے بھی بنانے ہیں۔تو یہ مشترکہ احساس تھا کہ اس وقت کے سب لکھنے والوں کا بس فرق ڈگری اور مقدار کا تھا، اختلاف تھا، لیکن افتراق کی وہ صورت نہ تھی جو بعد میں ظہور پذیر ہوئی۔فیض کے پہلے مجموعہ کلام "نقشِ فریادی" کا دیباچہ ن۔م۔راشد نے لکھا اور خود ن۔م۔راشد کے مجموعے پر دیباچہ لکھا کرشن چندر نے، خود میراجی جو ایک بہت پڑھے لکھے آدمی تھے اور خلاقانہ ذہن رکھتے تھے اس وقت ترقی پسندوں کے اجلاس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے اور اسی طرح "حلقہ" کے اجلاس میں شرکت سے ترقی پسندوں کو عار نہ تھا۔میراجی کا ایک بہت بڑا Contribution اس عہد میں جو تھا وہ یہ تھا کہ انہوں نے مغربی ادب خصوصاً مغربی شاعری سے بہت خوبصورت ترجمے اُردو میں کئے۔ان ترجموں کی صورت میں اردو میں نئی فارم آئی نئی روشنی، نئی ہوا آئی۔اسی طرح کے ترجمے دوسرے لوگوں نے بھی کئے تھے لیکن یہ کام زیادہ تر ہیئت اور فارم کے نئے پن سے بندھا رہا، بہر حال وہ ایک بڑا کام تھا جس نے ہندوستان میں نئے ادب کو اسلوبیاتی راہ دکھائی اسی طرح انہوں نے ہندی ادب کے فارم کو اُردو میں منتقل کرنے کا کام کیا۔میراجی دراک، ذہین، پڑھے لکھے اور خلاق آدمی تھے۔میرے ان سے بہت دوستانہ مراسم رہے ہیں اور ہمیشہ ان کی ذہانت کا معترف رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میراجی کا ایک دوسرا کارنامہ بھی رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ میراجی نے شعر کا رشتہ شعور سے کاٹنے کی کوشش کی اور شاعری کو فن اور ادب کو جبلت کے اظہار کی طرف لے جانا چاہا۔جبلت تو زندگی کا حصہ ہے اور زندگی سے ماورا تو نہیں، ہمارے نزدیک جبلت کا راستہ شعور سے ہوکر گزرتا ہے، جبلت کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے اس کے لئے بھی ایک ادراک کی ضرورت پڑتی ہے۔میراجی شعور اور ادراک کو ادب کے لئے غیر ضروری عنصر جانتے تھے۔انہوں نے شعر کا تعلق شعور سے کاٹا اور یہی

ہمارے اور ان کے درمیان بنیادی اختلاف رہا ہے۔شعور کو شعر سے کاٹنے کی کوشش میں میراؔ جی نے انتہائی گنجلک، مبہم اور بے مقصد شاعری کو فروغ دیا۔جس کا اثر حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ بہت سے لوگوں پر پڑا لیکن اسی حلقے میں اور لوگ بھی تھے جن کے ہاں ابہام اور گنجلک فضا تو نسبتاً کم ہے لیکن مقصدیت پھر بھی عنقا رہی کیوں کہ وہ لوگ ادب میں مقصدیت کے بھی قائل نہیں ہوئے تھے لیکن ان سب اعتراضات کے باوجود ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ حلقۂ ارباب کے ساتھیوں نے اُردو نظم کو ہئیتی اعتبار سے بہت کچھ دیا ہے۔ نئی نئی فارم کے تجربے جو ان لوگوں نے کیے ہیں، ترقی پسندوں نے کم کیے ہیں۔نئی لفظیات کے سلسلے میں بھی ان احباب کا کام زیادہ وقیع اور قابلِ تحسین رہا ہے۔اس میں سب سے بڑا نام جو سامنے آیا ہے وہ ن۔م۔راشدؔ ہیں جن کی شاعری مختلف مراحل سے گزرتی رہی ہے۔ یہاں موقع نہیں ہے ورنہ میں راشدؔ کی شاعری کے ارتقا پر بھی گفتگو کرتا۔عرض کر رہا تھا کہ اُردو نظم میں ہئیتی تجربوں کا کام حلقۂ اربابِ ذوق کے لوگوں نے خاصا کیا ہے، ترقی پسندوں کے مقابلے میں۔اب رہا معاملہ ایک دوسرے سے اثر پذیر ہونے کا تو جناب یہ معاملہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے اور ہم عصر ایک دوسرے پر غیر محسوس طور پر اثر انداز ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ اثرات عموماً غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے ہیں۔اب دیکھیے لفظیات ایک دوسرے کے ہاں چولا بدل کر کس طرح در آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال میں آپ کو بتاتا ہوں، صفی لکھنوی کا ایک بڑا مشہور شعر ہے۔

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

جذبیؔ نے جب نظم "موت" لکھی تو اس میں ایک شعر آیا کہ۔

میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا

دیکھیے صفیؔ کا شعر کس طرح چولا بدل کر جذبیؔ کے ہاں آیا لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جذبیؔ کے شعر میں نیا آہنگ قائم ہوا جو صفیؔ کے شعر کے آہنگ سے مختلف ہے۔اب آیئے اسی آہنگ کو ایک نئی صورت میں مخدومؔ کے ہاں دیکھتے ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں اپنی مشہور نظم اسٹالن میں کہ۔

برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا

دیکھیے بظاہر ایک ہی لفظیات سفر کرتے ہوئے تین مختلف ہم عصروں کے ہاں تین نئے آہنگ

کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں اور تینوں سفر الگ الگ جمالیاتی خوبی رکھتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ آگے چل کر فیض کے ہاں ایک بالکل نئی صورت پیدا ہوتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ ۔

طلش کی آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ

تو دیکھیے کس طرح ایک ہی عہد میں لکھنے والے غیر شعوری طور پر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اب آپ ان میں سے کسی پر نقل کرنے کی بد ذوقی کا الزام تو نہیں لگا سکتے بلکہ یہ عصری اثرات ہیں جو ہوا میں شامل ہو کر زندہ احساس رکھنے والے فنکاروں کے ہاں اظہار پا جاتے ہیں۔ فیض کے بہت سے الفاظ آپ کو دوسرے ترقی پسند شعراء کے ہاں بلکہ غیر ترقی پسند شعراء کے ہاں بھی مل جائیں گے، شاید ان کی امیجری بھی آپ کو دوسروں کے ہاں جھلکتی مل جائے، بالکل اسی طرح جس طرح خود فیض کے ہاں بعض دوسرے لوگوں کی امیجریز کی جھلک نظر آ جائے گی۔ تو جناب کہنا صرف یہ ہے کہ ایک ہی عہد میں لکھنے والے ایک دوسرے پر اپنے اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں۔ بالکل غیر شعوری طور پر، اس سے مفر ممکن ہی نہیں ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے لکھنے والوں سے فکری اعتبار سے نہ سہی تو اسلوبیاتی اعتبار سے ترقی پسندوں نے اثرات یقیناً قبول کیے ہیں اور ترقی پسندوں کے اثرات بھی ان کے ہاں موجود ہیں جن کا اعتراف ہر دو جانب سے کھلے طور پر ہونا چاہیے۔ اب اس سلسلے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آزاد شاعری کا جو نمونہ راشدؔ اور میراؔجی نے قائم کیا تھا، وہ آگے چلا نہیں۔ اُن کے مقابلے میں ترقی پسندوں نے بھی آزاد شاعری کی جو آج بھی چل رہی ہے۔ فیضؔ نے میں نے یا دوسرے ترقی پسند شعراء نے آزاد شاعری میں جو آہنگ اختیار کیا ہے وہ جدید لکھنے والوں کے ہاں تک پہنچتا ہے، لیکن راشدؔ اور میراؔجی کی شاعری اپنی شناخت کھو چکی ہے، بات یوں ہے کہ فارم بغیر فکر کے اچھی اور زندہ رہنے والی شاعری پیدا نہیں کر سکتی اور وقت نے اس کلیے کو ثابت کر دیا ہے۔ یہ بات صرف میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اکثر جدید ناقدین نے اس مسئلے کو اُٹھایا ہے، ابھی حال ہی میں اُردو انٹرنیشنل (کینیڈا) میں ڈاکٹر وحید اختر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے نام بنام بتایا ہے کہ کس کس کے ہاں میرے آہنگ کی جھلک موجود ہے، بات خود میرے لیے تو باعث افتخار ہے ہی لیکن اس کو اس طرح بیان کرنے کے بجائے یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ دراصل ایک عصری آہنگ کا توسیعی عمل ہے۔ ایک ہی وقت میں بہت سے لوگ نئے نئے انداز سے نئے

لہجے کی شاعری کرتے ہیں، لیکن اس بوقلمی کے باوجود ہر عہد کا ایک ٹوٹل یعنی مجموعی آہنگ نکل کر آتا ہے جو ایک دوسرے کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں کبھی دبے پاؤں اور کبھی واشگاف انداز میں دَر آتا ہے۔

مسلم شمیم۔ اب جب بات تکنیک پر چل پڑی ہے تو نثری نظم کے بارے میں آپ کی کیارائے ہے؟ فیض صاحب نے تو نثری نظم کے وجود ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا آپ فرمائیے کہ اس صنف کے کیا امکانات ہیں؟

جعفری صاحب: اس سلسلے میں صرف ایک جملے میں یہ بات کہوں گا کہ نثری نظم کے امکان ہو سکتے ہیں بشرطیکہ لکھنے والا اتنا ہی بڑا شاعر ہو جتنا WALT WHITMAN تھا کیوں کہ اس میں در اصل فکر کا RYTHM ہوتا ہے محض فارمز کے ذریعے نثری نظم کا حقیقی ردم (RYTHM) پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے نئی زبان اور استعارے کی تخلیق بھی ضروری ہوگی۔ ایک مرتبہ ناظم حکمت نے فیض سے گفتگو کرتے ہوئے جو شاید کہیں شائع بھی ہوچکی ہے، کہا تھا کہ ''بڑی شاعری زبان کے مروجہ ردم کو توڑ کر پیدا ہوتی ہے۔ آپ عربی زبان کے اوزان کیوں استعمال کرتے ہیں؟ عربی اوزان تو عربی مزاج کو پیش کرتے ہیں۔ ہماری اپنی زبان کا ایک ردم ہے جسے میں نے اکثر و بیشتر توڑنے کی کوشش کی ہے''۔ اب یہ کوشش آپ کو فیض کے آخری زمانے کی بعض نظموں میں بھی ملے گی۔

محمد علی صدیقی: جعفری صاحب میں آپ کی توجہ فیض صاحب کے ایک انٹرویو کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو گذشتہ دنوں نصرت نے اُن سے لیا تھا۔ اس میں جب فیض صاحب سے دریافت کیا گیا کہ آج کل بیشتر شعراء آپ کے آہنگ میں شاعری کررہے ہیں اور اس ذیل میں کچھ نام بھی لیے گئے تھے اس میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔ گویا آپ بھی فیض صاحب کے آہنگ میں شاعری کررہے ہیں حالاں کہ میں ایسا نہیں سمجھتا، کیوں کہ آپ کے ہاں آہنگ کا انفرادی DEVELOPMENT اور ارتقاء ملتا ہے۔ اس سوال پر فیض نے جواب دیا تھا کہ ''بھائی اب ہمارا آہنگ ہمارے عہد کا آہنگ ہوگیا ہے''۔ تو اس پر کوئی تبصرہ کرنا چاہیں گے۔

جعفری صاحب دیکھیے یہ بات یوں نہیں تھی بلکہ فیض نے، جو گفتگو بہت سنبھال کر کرنے کے عادی رہے ہیں محض یہ کہا تھا کہ ہر عہد کا ایک محاورہ ہوتا ہے انہوں نے آہنگ کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا

بلکہ محاورے کی بات کی تھی۔ اب اس محاورے کو ایک آدمی پہلے استعمال کر لیتا ہے اور دوسرا آدمی بعد میں اور اس طرح سے ہمارا مقبول محاورہ ہمارا محاورہ نہیں ہے بلکہ اس عہد کا محاورہ ہے ۔اب اس بات کی وضاحت میں گھپلا اور کنفیوزن پیدا ہونے کے بڑے امکانات ہوتے ہیں اگر پورے مسئلے کو ذرا احتیاط سے نہ دیکھا جائے تو۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے جو مثالیں دی تھیں اس میں مخدوم کا مصرع تھا ۔

برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا

اور فیض کا مصرع ہے کہ ۔

طپش کی آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ

تو اس مثال کو سامنے رکھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فیضؔ نے مخدومؔ کا مصرع لے لیا ہے۔ یہ غلط بات ہے ہمارے ہاں ہوا یہ ہے کہ بعض ان ناقدین کرام نے جو بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک کے مخالف ہیں، فیضؔ کا استحصال کرنے کی کوشش کی ہے اور فیضؔ کی غزل کے لہجے کو لے کر ترقی پسند شاعری پر حملہ کیا ہے چناں چہ وہ فیضؔ کے اس لہجے کو جو بعد میں اُن کے ہاں DEVELOP ہوا کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اب انہوں نے کسی کے ہاں دو چار لفظ پکڑ لیے اور جھٹ فتویٰ صادر کر دیا کہ "دیکھیے صاحب یہ فیضؔ ہیں" یہ بات میں یونہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ تحریری طور پر موجود ہے، اس سلسلے میں بھی اپنی ہی مثال دیتا ہوں میری کتاب "ایک خواب اور" پر جب شمس الرحمان فاروقی نے تبصرہ لکھا تو اس میں ایک نظم پر انہوں نے فرمایا کہ "یہ نظم فیضؔ کے رنگ میں لکھی گئی ہے" در اصل اس نظم میں ایک لفظ استعمال ہوا تھا نسیم کا اور دوسرا لفظ "قبا" کا اسے بنیاد بنا کر شمس الرحمان فاروقی نے پوری نظم کو فیضؔ کا فیضان قرار دے دیا۔ میں نے انھیں خط لکھا اور کہا کہ "آپ نے جو تبصرہ کیا ہے اس کا آپ کو پورا حق ہے، لیکن مجھے گمان ہوتا ہے کہ شاید آپ میری نظم کو سمجھ ہی نہیں سکے ہیں اور محض دو ایک لفظوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں"۔ وہ نظم صرف چار پانچ مصرعوں پر مشتمل ہے آپ بھی سنیے ۔

نسیم تیری قبا، بوئے گل ہے پیراہن   حیا کا رنگ ردائے بہار اُڑھاتا ہے
ترے بدن کا چمن ایسے جگمگاتا ہے   کہ جیسے سیلِ سحر جیسے نور کا دامن
ستارے ڈوبتے ہیں چاند جھلملاتا ہے ---

میں نے عرض کیا جناب یہ نیوڈ پینٹنگ ہے نسیم تیری قبا۔ نسیم کیا قبا پہنائے گی، بوئے گل ہے پیراہن، تو جناب بوئے گل کا پیراہن بھلا کیا ہوگا؟ حیا کا رنگ روائے بہار اڑھاتا ہے، اس طرح پوری نظم ایک برہنہ جسم کو پیش کرتی ہے۔ اس تک شمس الرحمٰن فاروقی کی رسائی ہو ہی نہیں سکی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ چند لفظوں میں اُلجھ کر رہ گئے اور یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ مجرد لفظ بھی میرے ہاں اس طرح استعمال ہی نہیں ہوئے ہیں جن معنوں میں فیض کے ہاں آئے ہیں "ایک خواب اور" کے دیباچہ میں مَیں نے جو بات کہی تھی کہ "خواب اور شکستِ خواب اس دور کا مقدر ہے اور نیا خواب دیکھنا انسان کا حق ہوتا ہے جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ میں نے اس کتاب میں تین پیٹرن رکھے ہیں خواب، شکستِ خواب اور نیا خواب جو در اصل پیاس، آسودگی اور نئی پیاس، وصال، ہجر اور پھر وصال کی خواہش کی تثلیث ہے اور یہ تثلیث انسانی جبلّت کا مقدر ٹھہری ہے۔ اس مجموعے میں اکثر نظمیں اسی احساس کو پیش کرتی ہیں۔ تشنگی، آسودگی اور پھر تشنگی، بلکہ شدید تشنگی کہ یہی ہمارے بیشتر تجربوں کا ماحصل رہا ہے۔ لیکن کسی نقاد نے اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے اور اپنی ہم عصر شاعری کو اس کے اصل تناظر میں پڑھنے کی کوشش کی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں شعری مجموعوں کو پڑھنے کا جو طریقہ ہے وہ بھی عجیب و غریب ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم کتاب اُٹھاتے ہیں کہیں سے کسی نظم کو پڑھ لیا، کسی غزل پر داد دے لی اور بس۔ تن آسان ناقدوں کا بھی یہی احوال ہے، حالاں کہ شعری مجموعوں کو بھی مکمل اکائی کی طرح پڑھا جانا چاہیے اور شعراء کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے مجموعۂ کلام کو اس طرح ترتیب دیں جس سے اُن کے فکری ارتقاء اور اکائی کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

مظہر جمیل: گویا ناول اور افسانے کی طرح۔

جعفری صاحب: جی ہاں ناول اور افسانے کی طرح۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میری کتاب "ایک خواب اور" میں بعض مضامین ایک ہی نظم میں مکمل ہوگئے ہیں لیکن بعض اوقات فکری سلسلہ دو تین نظموں میں غیر محسوس طور پر چلتا رہا مثلاً ایک نظم کا ٹکڑا ہے۔

تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ

یہاں سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد حصہ آتا ہے۔

تمہارے نرم حسیں دل نواز ہاتھ نہیں
مہک رہے تھے مرے ہاتھ میں بہار کے ہاتھ

لرز رہی ہیں ہتھیلی میں انگلیوں کے لویں
تڑپتی نبض کہے جا رہی ہے پیار کی بات
پگھل رہی ہے رخِ آتشیں پہ ہجر کی شام
نکل رہی ہے سیہ زلف سے وصال کی رات

اس کے بعد وہ حصہ آتا ہے ۔

نسیم تیری قبا بوئے گل ہے پیراہن

اب آپ دیکھیں تو ایک فکری اور اسلوبیاتی تسلسل بنتا ہے حالاں کہ علٰحدہ علٰحدہ نظمیں ہیں۔ یہ "خواب" اور شکست خواب کی نظمیں ہیں اور علٰحدہ ہونے کے باوجود ایک فکری زنجیر کی تشکیل کرتی ہیں ۔اب اگر آپ اس کو اس طرح نہیں دیکھیں گے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ وہی ہوگا جو شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصرہ میں ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ لوگوں نے فیض کی نقل کی ہے اور ان کے اثرات واضح طور پر قبول کیے ہیں ۔کیوں کہ فیض دلکش لہجے کے مالک ہیں۔ یہ اثرات کہیں غیر شعوری طور پر ہیں اور کہیں شعوری طور پر ۔خود میں نے فیض کے ہاں شعوری طور پر "سنگ دشنام" کی ترکیب لی لیکن "بارشِ سنگ، ترکیب فیض کی نہیں ہے، "بارشِ سنگ" اقبال کی ترکیب ہے۔" بارشِ سنگ حوادث کا تماشائی نہ بن" اقبال کا مصرع ہے میرے ہاں بارشِ سنگ کی ترکیب آئی ہے ۔

سفید شیشۂ نور اور سیاہ بارشِ سنگ
زمیں سے تابہ فلک ہے بلند رات کا نام

تو یہ کوئی ایسی معیوب بات نہیں بلکہ تخلیق کا قدرتی عمل ہے، ماضی کا پورا ورثہ ہمارا ورثہ ہے اور وہ ہمارے شعور کا حصہ بنتا جاتا ہے اور عصری آوازیں اور لہجے بھی ہمارے کان میں پڑتے جاتے ہیں اور یہ سب مل کر تخلیقی عمل میں ظہور بھی پاتے جاتے ہیں ۔اب یہ مضمون کا قطرہ اگر دریا نہیں بنے گا تو زمین اسے پی لے گی یہ بات فکر کی صورت میں بار بار ہمارے شعراء کے ہاں آئی ہے، لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ یہ مضمون نیا تو نہیں، لیکن نئے شعراء نے اظہار کے نئے انداز سے اس کو نیا پن دے دیا ہے۔ خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارے ہاں دو لہجے ملتے ہیں ایک لہجے کو آپ غنائی یا بزمیہ اور دوسرے کو رزمیہ یعنی رزم کا لہجہ (کہہ سکتے ہیں) ترقی پسند شاعری میں دونوں لہجے ساتھ ساتھ سفر کرتے ملیں گے۔ فیض کے ہاں غنائی لہجہ میں جو نہایت خوبصورت اور موثر ہے اور اس کا بڑا اثر اپنے عہد کی شاعری پر پڑ رہا

ہے۔میرے ہاں بھی اس کا اثر ہے۔مخدوم کے ہاں بھی ہے،لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے ہاں جو رزمیہ لہجہ ہے اس کا اثر بھی فیض کے ہاں موجود ہے،مجاز کے مصرعے ہیں۔

ہاں ہم نے کمندیں پھینکی ہیں
ہاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
ہاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں
ہاں ہم نے تاج اُتارے ہیں

یہ لہجہ رزمیہ لہجہ ہے، اور فیض کے ہاں آیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ

جب تاج اچھالے جائیں گے جب تخت گرائے جائیں گے
یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی

تو دیکھیے اس طرح ہم عصر شعرا ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہی رہتے ہیں۔

محمد علی صدیقی: ظاہر ہے یہ تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی،لیکن بعض حضرات نے تو فیض کا نام لے کر دراصل اکثر ہم عصر شعراء کو گھسیٹنے کی کوشش کی ہے۔

جعفری صاحب: وہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ لوگوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے فیض کا استحصال کرنے کی کوشش کی ہے اور کچھ نہیں۔

مظہر جمیل: فیض نے تو کہا ہے کہ میں نے اپنے جونیئر ہم عصروں سے بھی اثرات لیے ہیں تو لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔

جعفری صاحب: ہاں صاحب فیض نے تو اس معاملے میں ہمیشہ ہی بڑی فیاضی اور کشادہ دلی سے کام لیا ہے، ابھی ابھی میں کہیں پڑھ رہا تھا کہ فیض نے وضاحت کے ساتھ نام لے لے کر بتلایا کہ میں نے اس سے اثر لیا، اس سے اثر لیا اور جب میں لکھنؤ گیا تو مجاز، سردار، جاں نثار اختر سے اثر لیا۔تو اس معاملے میں فیض نسبتاً بہت فیاض اور کشادہ دل انسان تھے اور ہمیں یعنی ترقی پسند شعراء کو تو کشادہ دل ہونا ہی چاہیے۔ میں نے خود ابھی یہ بات کہی ہے کہ میں نے فیض سے اثر قبول کیا۔فیض کا ایک شعر ہے

اِک اک کر کے پلٹ آئے گریزاں لمحے اِک اک کر کے ہوئے سارے ستارے روشن

میرے لیے یہ عمل بہت فطری تھا۔

میری شاعری میں لمحات کا حسن نئے نئے انداز اختیار کرتا ہے مثلاً

''ہوا میں اُڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح
گذرتی برسات آتے جاڑوں کے نرم لمحے ہواؤں میں تتلیوں کے مانند اُڑ رہے ہیں۔
لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں''۔

حسن عابد: آپ نے تو بدل ہی دیا اس شعر کو۔ آپ کے ہاں تو یہ نئے انداز سے آیا ہے جو فیض سے مختلف ہے۔

جعفری صاحب: لیکن بنیادی طور پر ہے تو فیض ہی کا اور میں نے اسے وہی سے لیا ہے اور شعوری طور پر لیا ہے جس کا مجھے اعتراف ہے۔ فیض یقیناً اس عہد کے بہت بڑے شاعر تھے اور اُن کے لہجے اور آہنگ سے گریز ممکن ہی نہیں خواہ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے۔

مسلم شمیم۔ یہ جو ابھی آپ نے فرمایا کہ فیض کا سفر بزم سے رزم کی طرف اور آپ کا رزم سے بزم کی طرف رہا ہے تو کہیں یہ دو تقاضوں اور دو مختلف سیاسی کلچر کے فرق کی وجہ سے تو نہیں ہوا۔

جعفری صاحب: نہیں میں ایسا نہیں سمجھتا۔ دیکھیے اس میں شاعر کے مزاج کا بڑا دخل ہوتا ہے، فیض شروع ہی سے بڑے دھیمے اور ملائم لہجے کے آدمی تھے۔ یہ دھیما پن اُن کا مزاج تھا، غنائیت ان کی شخصیت میں شامل تھی میرا اپنا مزاج بالکل الگ رہا ہے لہٰذا لہجوں کا فرق مزاج اور افتادِ طبع کے فرق سے ظہور میں آیا ہے۔ مَیں تو کم از کم ایسا ہی سمجھتا ہوں اب آپ اس کی کوئی اور توضیح فرمانا چاہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا۔

شاہد نقوی۔ جعفری صاحب ترقی پسند شاعر کا نمائندہ لہجہ تو رزمیہ ہی رہا ہے، بلند آہنگی اور جتنے اہم نامور ترقی پسند شاعر ہوئے ہیں اُن کے ہاں رزمیہ لہجہ غالب رہا ہے آپ نے بزمیہ لہجے کو بھی ترقی پسند شاعری کا لہجہ قرار دیا ہے تو کہیں اس سے تضاد تو پیدا نہیں ہو رہا ہے۔

جعفری صاحب۔ نہیں بھائی کوئی تضاد نہیں۔ ہمارا مقبول ترین اور نمائندہ شاعر تو فیض ہے نا؟ اُس سے زیادہ مقبولیت تو اس عہد میں کسی اور شاعر کو ملی ہی نہیں۔ ہم سب فیض کے ہم عصر ہیں، لیکن فیض کی مقبولیت کو خود اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں اور اُن کی مقبولیت کو اپنی مقبولیت جانتے ہیں کہ وہ ہمارے ہی قبیلے کے آدمی تھے اور انھیں جو مقبولیت ملی ہے میں تو ایسا سمجھتا ہوں گویا وہ مقبولیت خود مجھے ملی ہے اور یہی ایک امتیازی فرق ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں میں ہے۔ اب آپ خود فیض کو معیار بنا کر دیکھ لیجیے کہ فیض کے ہاں رزمیہ لہجہ کس بلند آہنگی کے ساتھ آیا ہے بلکہ آخر آخر میں تو انقلابی نعرہ کی گونج اُن کے ہاں سنائی دیتی ہے۔ تو کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری کو کسی ایک آہنگ یا لہجے سے مخصوص کر دینا یقیناً درست نہ ہوگا۔

مظہر جمیل۔ جعفری صاحب آخر میں صرف ایک بات اور۔ اور وہ یہ کہ ابھی حال ہی میں ہندوستان کے ایک مشہور ترقی پسند ناقد اصغر علی انجینئر صاحب نے بیدی پر لکھتے ہوئے ادب میں وابستگی کے مسئلے کو سمجھاتے ہوئے ہندوستان میں NEW PROGRESIVISM یعنی جدید ترقی پسندیت کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ تو میں پوچھنا یہ چاہوں گا کہ کیا واقعی ہندوستان

کے مسئلے کو سمجھاتے ہوئے ہندوستان میں NEW PROGRESIVISM یعنی جدید ترقی پسندیت کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ تو میں پوچھنا یہ چاہوں گا کہ کیا واقعی ہندوستان میں جدید ترقی پسندیت کی کوئی تحریک ہے اور ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟

جعفری صاحب: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے وہ مضمون جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے دیکھا ہی نہیں لہٰذا میں اس پر تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ویسے اصغر علی انجینئر صاحب کو میں جانتا ہوں۔ وہ بڑے بالغ نظر اور پڑھے لکھے نقاد ہیں، مارکسی نظریات کے حامل ہیں، قطعِ نظر اس سے کہ انہوں نے کیا بات لکھی ہے یہ بات کس حد تک صحیح ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے کے جو حالات تھے وہ آج کے حالات سے مختلف تھے اور آج کے نئے معروضی حالات میں تخلیقی روّیے مختلف ہونے ہی چاہیں اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔

حسن عابد: جعفری صاحب ترقی پسند تحریک نے جو منشور دیا تھا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج کے مختلف حالات میں وہ کافی ہے یا ہمیں کسی نئے منشور کی ضرورت ہوگی خصوصاً ہمارے ملک عزیز پاکستان کے حوالے سے۔

جعفری صاحب: دیکھیے برنارڈ شا نے ایک مرتبہ بڑی دلچسپ بات کہی تھی کہ ''میرا درزی ہر سال آ کے میرا ناپ لے جاتا ہے'' تو یہ بات حالات اور ہمارے باہمی رشتے پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ یہ بات تو یقیناً غیر متنازعہ ہے کہ ہمیں یعنی لکھنے والوں کو اپنے معروضی حالات کو جانچتے پرکھتے رہنا چاہیے کہ یہی عصری شعور کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے، اب جہاں تک ۱۹۳۶ء کے منشور کا حوالہ ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور پر اس منشور میں جو باتیں کہی گئی تھیں وہ بڑی حد تک اب بھی باقی ہیں، لیکن جزیات میں نئے رویے ہمارے متعین ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ کم از کم ہندوستان میں اس بات کو محسوس کر لیا گیا ہے کہ اگر حالات سے بے بہرہ اور لاتعلق رہ کر کوئی ادب تخلیق کیا گیا تو وہ یقیناً نہ صرف اپنی طاقت سے محروم ہوگا بلکہ اپنی بنیاد سے بھی۔ اب جو عالمی صورت حال ہے اور دنیا کا دائرہ جس تیزی سے تنگ ہوتا جا رہا ہے اور فاصلے جس سرعت سے اپنی طنابیں کھینچے جاتے ہیں تو یہ صورت حال بھی ہمارے لیے معروضی حالات کا حصہ بن جاتی ہے اور ان سب کا اپنے اپنے طور پر جائزہ لیا جاتا رہنا چاہیے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو میں اس سلسلے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ یہ یہاں کے لکھنے والوں کا مسئلہ ہے ہاں اصولی طور پر اپنی اس بات کو دہراؤں گا کہ اپنے ماحول اور اپنے عصری حالات سے لاتعلق ہو کر کوئی زندہ اور متحرک ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ ☆☆☆

(ماہنامہ افکار کراچی: جعفری نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء)

اکرام بریلوی

علی سردار جعفری کی ڈراما نگاری

ڈراما نگاری کا فن سنسکرت ڈرامے کے زوال کے ساتھ ختم ہو چکا تھا۔ اُردو اور ہندی، کالی داس تو کیا چند
بروھائی اور بھوبھوتی کی مثال بھی نہ لا سکے اور رفتہ رفتہ رہس اور امانت کی ''اندر سبھا'' کے بعد یہ پارسی تھیٹر کے طالع
آزماؤں کے طفیل آغا حشر کاشمیری اور اُن کے معاصرین کے ہاتھوں آگیا۔ اس منزل پر یہ حقیقت سب سے پہلے آغا حشر
پر آشکارا ہوئی کہ ڈراما ادب کی ایک مہتم بالشان صنف ہے اور اسٹیج کا وجود ملک اور معاشرے کی ثقافتی زندگی کے مختلف
پہلوؤں کی عکاسی کے لیے ناگزیر ہے۔ تاریخ اور ثقافت کے تابندہ پہلو اور معاشرے کے قابل اصلاح گوشے ڈراما اور اسٹیج
کی بدولت جس طرح زندہ و پائندہ کیے جاسکتے ہیں، وہ فنونِ لطیفہ کی کسی اور صنف کے ذریعے ممکن نہیں۔ تہذیب و ترقی بلکہ
حکمت و تفکر کی دعوت ایک عمدہ ڈرامے کے چلتے پھرتے اور بولتے کردار اسٹیج کی فٹ لائٹ (FOOT LIGHT) کے
پیچھے جس خلوص جذبات، جس اثر انگیزی سے زندہ ہوتی ہے وہ غالباً کسی اور طرح ممکن نہیں ہے اور اس طرح، آج یہ
حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ یونان کے علاوہ ہندوستان میں سنسکرت ڈرامے اور جاپان میں ''نو'' ڈرامے نے اپنے اپنے
انداز اور اپنی اپنی حد تک ملک کی تہذیب اور معاشرے کی کس طرح اور کس قدر فطری طور پر تزئین اور آرائش کی ہے۔

اس کے برعکس اُردو میں ڈرامے کا آغاز و ارتقاء ہی ایسے ماحول میں ہوا جس میں معاشرتی طور پر زوال
پذیری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ سیاسی اعتبار سے اُردو ڈرامے کا باقاعدہ آغاز اور اس کی ترقی و ترویج کا بیشتر ابتدائی
دَور ہماری محکومی کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس دَور میں ہمتوں کی پستی، تہذیب کے مردہ عناصر کو ثقافت کا جزوِ اعظم قرار دے کر
سینے سے لگائے ہوئے تھی معاشرہ چند رسوم اور بندھے ٹکے آداب و آئین کی ظاہری منت کاریوں کا ہیولیٰ بنا ہوا
تھا۔ زندگی کا مقصد موقع پرستی تھا اور موقع پرستی کا مفہوم یہ تھا کہ چند تفریحات، چند تعصبات اور اپنی نام نہاد فوقیت کے
توہمات میں قلعہ بند رہو۔ زندگی کے بدلے ہوئے ماحول سے آنکھیں بند رکھو، نئے تقاضوں سے بے خبر رہو۔ ایک مدت
اور ایک منزل و مقام تک اس خود ساختہ بے خبری کا عالم قائم رہا۔ مگر رفتہ رفتہ غبار چھٹنے لگا اور دوسری عالم گیر جنگ کے آس
پاس حالات نے اتنی شدت اور تیزی کے ساتھ کروٹ لی کہ اس خود ساختہ بے خبری کا حصار ٹوٹ گیا۔ ذہن و فکر نے ٹوٹے

کر، نئی زندگی سے بھرپور انگڑائی لی۔ نئے خیالات کا سیلاب امڈ آیا۔ سائنسی اور تکنیکی ایجادات عام ہونے لگیں جس نے زندگی، زندگی کے غموں، مسرتوں اور اخلاقی معیار و اعتبار کو نئے سانچوں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب بھی اس سے متاثر ہوا، اور عوام و خواص کے اندر یہ خیال زور پکڑتا گیا کہ ڈراما محض ڈھول دھپا ہی کا نام نہیں بلکہ ادب کی ایک باقاعدہ صنف ہے اور اس کی طرف پوری سنجیدگی اور متانت سے توجہ دی جانا چاہیے۔ چنانچہ نئے افسانے کی تخلیق و ترویج کی طرح اس کی طرف بھی سب سے پہلے ترقی پسند مصنفین نے توجہ دی۔ شاید اس لیے کہ ڈراما ماس کانٹکٹ (Mass Contact) کا موثر ذریعہ تھا۔ یہ بات اپنی جگہ منطقی بھی معلوم دیتی ہے کیونکہ ترقی پسند مصنفین کا نقطۂ نظر اصلاحی سے بڑھ کر انقلابی بلکہ تمام و کمال انقلابی تھا۔ چنانچہ نئے اسالیب کے ساتھ ایسے موضوعات اور مسائل پر توجہ دی جانے لگی جو ذہنی انقلاب لا سکیں اور غور و فکر کی دعوت دیں۔

یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب شکست و ریخت کا عالم ہو اور سوسائٹی بحران سے گزر رہی ہو تو ڈراما دوسری اصناف کی طرح تنقیدِ حیات سے زیادہ تنقیدِ معاشرت کو موضوع بناتا ہے۔ چنانچہ دوسرے ڈراما نگاروں سے زیادہ ترقی پسند ڈراما نگاروں نے اسے اپنا فرض سمجھ کر انجام دینا شروع کر دیا۔ چونکہ یہ ایک شعوری کوشش تھی، لہٰذا ادب میں گہرائی تو پیدا نہ ہو سکی مگر طنز کا وار جاندار اور تیز ہو گیا۔ افادی ادب کی اس دوڑ میں ادبی ارتقاع اور نئی قدروں کا خیال کیے بغیر، جہاں کہیں بھی ظلم کا نشان ملا، استحصال کی صورت یا سماجی بے انصافی نظر آئی، اس پر وار کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی گئی۔ اس دَور کے دوسرے ڈراما نگاروں کی طرح سردار جعفری میں بھی ڈراما لکھنے کی تحریک ہوئی۔ ہر چند کہ وہ بنیادی طور پر ڈراما نگار نہیں تھے اور ابھی تک انہوں نے شاعری، مضمون نگاری اور ادبی تنقید کے علاوہ افسانے ہی لکھے تھے۔ ڈرامے کا میدان اُن کے لیے بالکل نیا تھا، لیکن اتنا نیا بھی نہیں کیونکہ اُن کی طویل نظموں میں ڈرامیٹک مونولاگ (Dramatic Monologue) پوئٹک ڈراما (Poetic Drama) اور کلوزٹ ڈراما (Closet Drama) کے عناصر موجود تھے۔ مگر ڈراما تو ایک علیحدہ اور باقاعدہ فن ہے جس کے اپنے فنی تقاضے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ جانتے تھے اور یہ سب کچھ جانتے ہوئے انہوں نے ڈراما لکھا۔ اس اکلوتے ڈرامے کا نام تھا ''یہ کس کا خون ہے؟'' علی سردار جعفری کا یہ اکلوتا ڈراما اپنے موضوع و فکر اور عصری واقعیت کے اعتبار سے نہ صرف چونکا دینے کی صلاحیت کے ساتھ ادبی حلقوں کی توجہ کا مرکز بنا بلکہ اسے اہمیت بھی دی گئی۔

علی سردار جعفری کا ڈراما ''یہ کس کا خون ہے؟'' جنگی محاذ کے ایک ملٹری ہسپتال میں شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ڈرامے میں، ڈرامے کی تینوں اکائیاں (UNITS) یعنی ساعت (TIME) مقام (PLACE) اور خیال (THOGHT) موجود ہیں۔ جو ڈرامے کے جمالیاتی حسن کی دلیل ہیں اور اس کا طنزیہ موضوع اپنے جلو میں ایسی کشش اور کشمکش رکھتا ہے کہ ڈرامے کے تاثر میں تیزی اور شدت در آئی ہے۔ ڈرامے کا تھیم یہ ہے کہ ایک ہندوستانی

سپاہی (کالا آدمی) زخمی حالت میں ہسپتال میں لایا جاتا ہے۔ انڈین ہسپتال میں کوئی بستر خالی نہیں۔ اس کی جان بچانے اور فوری طبی امداد پہنچانے کے لیے ایمرجنسی کے پیش نظر اُسے مجبوراً برٹش (گوروں کے) ہسپتال میں جگہ دے دی جاتی ہے۔ بستر پر لٹا دئے جانے کے بعد جب مدھم روشنی میں ہسپتال کی گوری نرس کا نرم و گداز ہاتھ اس کی پیشانی مس کرتا ہے تو سپاہی کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور وہ خواب گوں خیالوں میں گم ہو کر اپنے گاؤں کی مٹی کی مہک میں گھلنے لگتا ہے۔ ہرے بھرے کھیت، اُس کی بیوی اور اُس کا ہمکتا ہوا ننھا منا بیٹا، دور اور قریب کے عزیز اور رشتے دار اُن سے متعلقہ یادیں آتے ہی وہ NOSTALGIC لمحوں میں حل ہونے لگتا ہے یہ NOSTALGIC GLIMPSES طرح طرح کی اشکال، مرئی صورتوں اور واضح صورتوں میں چلتی ہوئی فلم کی طرح اُس کے ذہن پر اُترنے لگتی ہیں۔ وہ اچانک ہرے بھرے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کی چنچل البیلی بیوی اس کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ ابھی ہندوستانی سپاہی کا علاج شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ایک یوروپین (گورا) شدید زخمی حالت میں اسی برٹش ہسپتال میں لایا جاتا ہے۔ یوروپین سپاہی کا انڈین ہسپتال میں بھیجا جانا تو خیر ناممکن تھا۔ یوروپین ہسپتال میں کوئی بستر خالی نہیں رہا تھا لہٰذا اُس مرتے ہوئے گورے کو یوروپین ہسپتال میں جگہ دینے کی خاطر ایک ایسے ہندوستانی سپاہی کو ہٹا دیا جاتا ہے جس کی جان بچائی جاسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی مرگئے۔ وہ بھی جس کی جان بچ سکتی تھی۔

جن فکری عناصر نے اس ڈرامے میں اپنے بے پناہ افادی پہلو کے باعث اثر انگیزی اور تاثیر کی شدت پیدا کردی ہے، وہ بھی ڈرامے کی تین اکائیوں (UNITS) کی طرح تین ہی نظر آتے ہیں اور یہ تین فکری عناصر یہ ہیں:

(۱) تمیز بندہ و آقا (۲) فساد آدمیت اور (۳) قومی تفاخر رنگ و نسل کی بنیاد پر

ان تینوں فکری عناصر کی فطری کشمکش کے ساتھ ڈرامے کی بنت میں جا بجا جو PASTORAL TOUCHES کی کہیں ہلکی اور کہیں تیز رنگ آمیزی کی گئی ہے، وہ ڈرامے میں وفورِ جذبات سے کسک اور چبھن پیدا کر دیتے ہیں جس سے فوجی فاشزم کی جلا دینے والی گرمی لو دینے لگتی ہے۔ ''جدید ڈراما اور اُس کے بعض مسائل'' میں احتشام حسین نے علی سردار جعفری کے اس اکلوتے ڈرامے کو میلو ڈراما (MELO DRAMA) قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں عصری واقعیت کا جذباتی پہلو غالب آگیا ہے میرے خیال میں اس کی اصل وجہ PASTORAL TOUCHES) اور NOSTALGIC GLIMPSES کی رنگ آمیزی اور غیر ضروری جزئیات نگاری کی بھرمار ہے جس کی وجہ سے تصویریں (IMAGES) شوخ اور بھڑکیلی ہوگئی ہیں۔ اور یہ اظہار کا ایک ایسا فطری عمل ہے جو اُن کی شاعری کے حوالے سے اُن کے ڈراموں میں در آیا ہے۔ علی سردار جعفری کے شاعر ہونے کی حیثیت کے پیش نظر ایسا عمل غیر فطری محسوس نہیں ہوتا کیونکہ شاعری میں تھوڑے بہت غلو کو روا رکھا ہی جاتا ہے۔ احتشام حسین کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ''یہ خون کس کا ہے؟'' میں عمل کے مقابلے میں مکالموں سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور کردار بھی بجھے بجھے سے نظر آتے ہیں۔''

میری ناقد رائے میں احتشام صاحب کو اس اہم ڈرامے میں یہ خامی یا کمزوری اس لیے محسوس ہوئی کہ اس میں فنی تقاضوں سے زیادہ مقصدیت اور افادیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور یہ ایک ایسی کمزوری ہے جو اس وقت کی ترقی پسندی تحریک سے وابستہ ہر ادیب اور دانشور کے ہاں پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر عصمت کا 'دھانی بانکیں' اور خواجہ احمد عباس کا 'زبیدہ'۔
حرفِ آخر کے طور پر یہ بات اپنی جگہ کیا کم ہے کہ علی سردار جعفری نے ڈراما لکھا اور ایسا کہ احتشام حسین جیسے ناقد نے اسے "بہت اہم" قرار دیا۔

(ماہنامہ افکار کراچی، سردار جعفری نمبر)

عتیق احمد

سردار جعفری کے افسانے

ایک امریکی نقاد جوئیل اسپنگارن ہو گزرے ہیں (۱۹۳۹ء۔۱۸۵۷ء) جن کا بڑا کنٹری بیوشن امریکی ادب کو خالص ورصالح ادب بنانا ہے۔یعنی ادب کو ہر حال میں غیر جانبدار رہ کر "سب خیریت ہے" کا ادب تخلیق کرتے رہنا چاہیے۔موصوف نےس ضمن میں ادبی نقادوں کا بھی لائحہ عمل تجویز فرمایا تھا۔یعنی یہ کہ اسے صرف واقعات کی صحت اور سچائی اور لکھنے والے کے افکار اور خیالات کی صحت اور عدم صحت سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔یہ کام تاریخ نویسوں اور فلسفیوں کا ہے۔

موصوف نے پنے تنقیدی منشور میں مریکی نقادوں سے خطاب فرمایا ہے کہ:

امریکی نقادو! یہ تمہارا فرض اولین ہے کہ تم افادیت پسندوں کے خلاف مورچہ بند ہو جاؤ جو اخلاقیات بگھارنے والے،عیش پسندی کی تعلیم دینے والے ہیں۔ان کے خلاف مورچہ بند ہو کر امریکی ادیبوں کی خالص فن پسندی کے حق کا دفاع کرو۔ . . یہ بھی تمہارا ہی فرض ہے کہ عوام کی خوش بسری کی خاطر خالص جمالیات کے معنی اور مفاہیم کی تشہیر کا بیڑہ اُٹھاؤ. روحانی زندگی کی رفعتوں میں فن، تاریخ،فلسفہ،مذہب اور اخلاقیات کے خمیر (نہ کہ علاحدہ علاحدہ ان کی اپنی اہمیت) کی اہمیت بنیادی ہے۔جو ادیب زندگی میں متذکرہ تمام علوم اور فن کو روحانی ارتفاع میں! کائی کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور پراگندہ خیالی کو اس کا متبادل بناتے ہیں وہ ایک بامعنی انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔وہ دشمنوں کی مانند ہیں"

اسپنگارن کا یہ ادبی منشور بذات خود لکھنے والوں پر اخلاقی بندشیں عائد کرنے کے مترادف ہے۔جس سے وہ ادب میں غیر جانبداری کی ضمانت کر کے انہیں "آزاد اور روشن خیال" ایسے ادیب بنانا چاہتے تھے جو معاشرہ کی جامد تصویر پیش کرتا رہے اور حالات حاضرہ پر لب کشائی اپنے ٹیلنٹ کریمنس اور بیورو کریٹس کی ذمہ داری سمجھ کر اُن سے دور رہے۔

اسپنگارن صاحب نے اس منشور کے باوجود تیسری دہائی کے امریکی لکھنے والوں میں پرولتاری ادب تخلیق

کرنے والے ادیبوں کی تخلیقات کا ایسا ریلا آیا کہ وہ ان ساری بندشوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کرلے گیا۔ظاہر ہے کہ جب دولت اور زندگی کی آسائش وال اسٹریٹ کے سیٹھ ساہوکاروں اور اُن کے گماشتوں تک محدود ہو کر رہ جائے اور آبادی کا باقی حصہ افلاس اور جرائم کا شکار ہو کر رہ جائے تو "باقی سب خیریت ہے" لکھنے کی تلقین کرنے والی زر پرستانہ پارٹی لائن" دولت پیدا کرنے اور فاقہ کشی کا شکار رہنے والوں کے دست ادیبوں کی تخلیقات کے سامنے کہاں اور کتنی دیر ٹھہر سکتی ہیں؟

یہ اتفاق یا پیروی مغرب نہیں تھی کہ متحدہ ہندوستان میں تیسری دہائی میں سیاسی اور سماجی استحصال پسندوں کی مغربی اور مغرب پسند حکومت بھی ایسے ہی حالات پیدا کر چکی تھی۔جس میں ہمہ سمت سماجی بے چینی جنم لے رہی تھی۔اور اس بے چینی کی کھلی اور واضح نشان دہی یہاں بھی ادب میں "سرپھروں" اور "باغیوں" کی وہ نسل جنم دے رہی تھی جنہوں نے ہندوستان کے خیریت طلب' اسپنگارنوں کے ادبی منشور کو اپنی انحرافیوں سے شکست دے کر سماجی افادیت پسندی کو اپنا منشور بنالیا تھا۔ہندوستان اور پاکستان میں آج بھی سماجی افادیت پسند اور انقلاب آفرینی کے آرزومند ادیب کا یہ نیا منشور ادب کو خوشبویات اور عطریات میں بسا ہوا حجلہء عروسی سمجھنے والوں کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔یہ 'وال اسٹریٹ پارٹی لائن' سے اُن کی اٹوٹ وفاداری کا مسئلہ ہے۔ایسی وابستگیوں میں کھنڈت ڈالنا ظاہر ہے ناخوشگوار عمل ہے۔

سردار جعفری کا ادبی شعور اسی تیسری دہائی کی "انحرافی" کا پروردہ ہے کہ جب اس دور کے نوجوانوں کی باشعور اور باخبر نسل "حالاتِ حاضرہ" کے پس پشت غیر ملکی چیرہ دست حکمرانوں کی خفیہ اور باریک چالوں کو سمجھنے لگی تھی۔انہوں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل مختصر سی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں اپنے ذہنی تغیرات کی مرحلہ وار روداد بڑی سچائی کے ساتھ قلم بند کی ہے کہ وہ کس طرح ادبی ایہام و ابہام کی سکون بخش اور مخملی راہوں پر چلتے چلتے اعزاء کی طعن و تشنیع اور حکومت کی وفادار قوتوں کی نگاہوں میں قابلِ تعزیر بن جانے کی پُرخار راہوں کے مسافر بن گئے۔یہاں اُن کی اس ادبی زندگی کی تفصیلات کو دہرانا بے موقع سی بات ہے جس سے گزر کر وہ حریت پسند قافلے کے شریکِ سفر ہو گئے تھے۔یہاں اتنا ہی حوالہ کافی ہے کہ وہ بیک وقت جنبشِ ماضی کی ادبی کاوشوں کو قلم زد کر کے ایک نئے اور مشکل راستے پر گامزن ہو گئے جو اُن دنوں جسم و جان کی سلامتی کے اعتبار سے خطرات کو جان بوجھ کر مول لیتا تھا اور آگے چل کر سردار جعفری کو ان خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

متذکرہ بالا احوال و کوائف کے حوالے سے اگر سردار جعفری کے ادبی سفر کے اولین مستحکم اور نظریاتی تخلیقات کو حوالہ بنانا مقصود ہو تو غالباً اُن کی افسانہ نگاری پر ہی نظر ٹھہرے گی۔یہ عجیب سی بات ہے کہ آج اُن کی افسانہ نگاری کا حوالہ ہی طاقِ نسیاں کی زینت بن گیا ہے۔اِدھر تیس برسوں میں آنے والی ادبی نسلوں کے سامنے سردار جعفری کی افسانہ نگاری کی نشان دہی کرنا اُن کے لیے بڑی ان ہونی سی بات بن جاتی ہے۔خیر یہ ہماری ادبی یادداشت کا واحد المیہ

نہیں ہے۔اور بھی کئی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ یہ بات المیہ ان معنی میں راقم الحروف کے نزدیک بن جاتی ہے کہ جب کسی ایک صنف میں مقامِ شہرت پا جانے کی بنا پر ہم کسی ادیب کو اُن کی اُن تحریروں کو فراموش کر ڈالتے ہیں جن تحریروں میں اُس کے اولین نقوش ہی اُس کے بعد کی تخلیقات کا جاندار پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

سردار جعفری نے جن دنوں افسانہ نگاری شروع کی تو اُن کے پیش رووں میں اُس ہی "طرزِ فغاں" کے بانیوں میں احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر ہماری سماجی اور ادبی زندگی میں بھونچال لا چکے تھے۔اسی اندازِ نگارش (کہ جس کی بنیاد سماجی ظلم و جبر کو بے نقاب کرنے کی روایت پر رکھی گئی تھی) کے بعد کے متبعین میں جن نوجوانوں کا اضافہ ہوا اُن میں سردار جعفری اور اختر الایمان کے نام خاصے نمایاں ہو کر اُبھرے۔ اختر الایمان کے افسانے بھی تعداد میں اتنے ہی قلیل تھے جتنے کہ سردار جعفری کے ہیں۔لیکن وہ صرف "ساقی" (دہلی) کے صفحات میں مقید ہو کر رہ گئے اور اب شاید تقسیم ہندوستان کے بعد کی نسل اختر الایمان کے اس ادبی پہلو سے باخبر بھی نہیں۔سردار جعفری کے افسانوں کی قسمت اچھی تھی کہ وہ حلقہء ادب لکھنؤ کی توجہ سے (۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء میں) کتابی شکل میں 'منزل' کے نام سے محفوظ ہو گئے ہیں۔

"منزل" میں سردار جعفری کے پانچ افسانے اور ایک یک بابی ڈرامہ (ONE ACT PLAY) شامل ہیں۔ افسانوں کے نام (۱) منزل (۲) بارہ آنے (۳) باپ (۴) مسجد کے زیرِ سایہ اور (۵) آدم زاد ہیں۔ڈرامے کا نام "سپاہی کی موت" ہے۔ بڑی اہم بات اس ضمن میں یہ ہے کہ ان ساری تحریروں کے اختتام پر اُن کا سن تحریر بھی درج ہے۔جس سے نہ صرف ان کے محرکات کی فضا کا تعین آسان ہو جاتا ہے بلکہ موضوعات کی تفہیم اور اُن کی فنی کیفیات کی بات بھی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔سب سے پہلے آخر الذکر (یعنی فنی نوعیت) پر دو ایک باتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں، موضوعات پر بعد میں کچھ عرض کیا جائے گا۔

باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ہو گیا تھا۔سجاد حیدر یلدرم اُردو میں اس صنف کے محرکِ اول تھے اور پریم چند اس کو مستحکم کرنے اور عروج پر لے جانے والے تھے۔یلدرم کا سورس آف انسپریشن (Source Of Inspiration) ترکی افسانہ تھا۔ پریم چند کا یہ منطقہ خالص ہندوستانی فضا سے تعلق رکھتا تھا۔ یہی دو باتیں اُردو افسانہ کی ابتدائی نوعیت کا فیصل خاص بھی تھیں یعنی ابتدائی نقوش بالکل قصے کہانیوں کی طرح سیدھے سادے بیانیہ کی حدود میں مقید تھے۔تکنیکی اعتبار سے اُس دور میں نمونوں کی کمیابی تو عذر نہیں بنائی جا سکتی اس لیے کہ انگریزی زبان میں اُس دور کی کہانی ایڈگر ایلن پو، ہنری جیمز۔جیمز جوائس اور ورجینا وولف کے ہاتھوں کئی ایک خوبصورت تجربات سے گزر چکی تھی مگر اصل مسئلہ اس طرف توجہ دینے کا تھا۔یلدرم اور پریم چند دونوں ہی انگریزی دان بھی تھے اور پڑھنے پڑھانے کے شوقین بھی۔لیکن متحدہ ہندوستان کی فضا سر سید احمد خان اور ڈپٹی نذیر احمد (بمع چند

رفقاء) کی نثری کوششوں اور محمد حسین آزاد اور حالی کی طرف سے روایتی اور برائے شعر گفتن کی لایعنی یلغار کی صف شکنی کے باوجود شاعری کی سہل انگار روش کی گونج فضا پر مسلط تھی۔ یلدرم کی رومانیت سے لبریز تحریروں نے ایک بڑا کام کیا جس کو ہمارے نقادوں نے کبھی لائق اعتنا نہ سمجھا۔ یعنی نثر کی زبان کو شاعری سے قریب تر کر کے لکھنے والوں کے دلوں سے شاعری کی طرف نکل جانے والی راہیں افسانہ نگاری کی طرف موڑ دیں۔ بلاشبہ وہ افسانوی ادب کے بڑے محسن ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی شاعری کی راہیں نئی نسل کے لیے مسدود کرنے کے اولین امام مولانا ابوالکلام آزاد ہی تھے جن کی ادق تحریروں میں بھی حسن بیاں کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ بہت کچھ معانی و مطالب MISS کر جانیکے باوجود قاری جنبش نہیں کر سکتا۔ اور یوں بھی کچھ کہانیاں مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی لکھی ہوئی ہیں جن کے موضوعات کا تعلق صرف جذباتی منطقہ میں سفر کرتا ہے۔ مگر اُن کی نثری دین اُردو کی جدید فکشن کی ابتدائی رہنمائی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یلدرم کی رومانوی افسانہ نگاری کی معنوی نسل کا قبیلہ بیسویں صدی کے ابتدائی تیس برسوں میں بڑا پھلا پھولا۔ اُردو میں یہ نسل مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحوری، راشد الخیری، حکیم احمد شجاع، سدرشن، سلطان حیدر جوش مولانا حسن نظامی ایسے معروف مشاہیر سے لے کر بہت سے۔۔ آج کے گمنام افسانہ نویسوں مثلاً عبدالمجید سالک، راز چاند پوری، مولانا حامد علی خان، مولانا ظفر علی خان، ضیا الدین شمسی، ل۔ احمد اکبر آبادی، عطاء الرحمٰن، آثر صہبائی، شیخ ہادی حسین (ایڈیٹر ہزار داستان) حکیم یوسف حسن، ناصر نذیر فراق دہلوی۔ محمد حسین پہلی بھیتی، منشی بدر الدین، حافظ امام الدین وغیرہ سینکڑوں نہیں تو ساٹھ ستر افسانہ نگاروں پر تو ضرور مشتمل ہے۔ دوسری طرف پریم چند کا معنوی قبیلہ تو آج بھی عمودی اور اُفقی ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

اس قدرے طویل اور بے موقع حوالہ جاتی گفتگو سے اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ ابتدائی دَور کے حوالے سے تکنیکی رنگ کی طرف بھرپور توجہ دلانا ہے اصل مقصد اس لیے کہ اُس دَور کے بعد بھی کسی افسانہ نگار کی تحریریں اس ڈھرے سے باہر نکلتی نظر نہیں آتیں۔ خاص طور سے اس امر کی نشان دہی اس بنا پر بھی ضروری تھی کہ نیا قاری سردار جعفری کے افسانوں میں کسی بڑے تکنیکی تجربے کی تلاش میں آج کے تجریدی افسانوں سے تقابل کرنے لگے تو اُس کے ذہن میں سردار جعفری کی افسانہ نگاری سے پہلے کے تیس پینتیس برسوں کی صورت حال واضح ہونی چاہیے۔

سردار جعفری کی ادبی زندگی کا ابتدائی دَور اور اُس کا عام ادبی رویہ شاعری میں استثنا کے ساتھ کہ جہاں تکنیکی اجتہاد بھی عروج پر تھا افسانوں کی حد تک تکنیک کا نہیں بلکہ مواد کے تنوع کا دَور تھا۔ اُس دَور میں پہلی بار ادب بالراست انداز میں زندگی کے ساتھ ساتھ لگ کر چلنے کی راہوں پر ڈالا گیا تھا چنانچہ اُس دَور کی شاعری، ناول نویسی، افسانہ نگاری، رپورتاژ وغیرہ وغیرہ تمام اصناف ادب، شعر کے مواد کا تنوع دراصل زندگی کے تنوع کا زندہ اور سچا جامہ تھا۔

بیاں کی خاطر" بڑھا بھی لیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے" تو بالکل ہی الگ بات ہے۔ البتہ یہ ادب صرف اور محض "زیبِ داستاں" کی خاطر ہوائیاں چھوڑنے والا شعر و ادب نہیں تھا۔ یہ نظریاتی ادب تھا جو آج بھی ہے۔ سردار جعفری کے افسانوں میں اگر حُسن، دلکشی اور رعنائیاں تلاش کرتی ہیں تو اُس دَور میں کی جانے والی زندگی کے اضمحلال اور اضطراب کی عکاسی دیکھیے۔

"منزل کے مندرجات کی فہرست میں سرِ اول یک بابی ڈرامہ "سپاہی کی موت" ہے۔ جو ۱۹۳۷ء کی تحریر ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ڈرامہ دائرہ اظہار رائے سے خارج ہے لیکن مشمولاتِ منزل کے لحاظ سے اس کو خارج از موضوع نہیں قرار دیا جاسکتا۔ دوسری اہم وجہ سردار جعفری کے چنے ہوئے اس موضوع کی SEQUNCE کا احاطہ ہے۔ جو اُن کے دَورِ افسانہ نگاری اور دوسری اصنافِ شعر و ادب کا اہم ترین موضوع ہے۔ یعنی برطانوی استعمار کا اپنی حکومتوں اور اقتدار کے استحکام کی خاطر افریقہ سے لے کر مشرقِ بعید تک جگہ جگہ جنگ جوئی کی بساطیں بچھانا۔ "منزل" میں یہ سلسلہ (SEQUENCE) "سپاہی کی موت" سے بالراست انداز میں شروع ہوکر ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور کے نومبر ۱۹۴۲ء میں شائع ہونے والے ریگنس سمڈے کے افسانہ "ٹوٹی ہوئی بانسری" کے ترجمہ سے اپنا دائرہ مکمل کرتا ہے۔۔ درمیان میں اس مجموعہ کا افسانہ "آدم زاد" بھی جنگ سے متعلق ہے لیکن میدانِ کارزار سے بالراست جڑا ہوا نہیں بلکہ جنگ سے پیدا شدہ مسئلہ میں سے ایک مسئلہ کا عکاس۔ آیئے پہلے اِن ہی تین تخلیقات پر ایک موضوعاتی بات چیت کرلیں:

"سپاہی کی موت" کا منظرنامہ

"اکتوبر ۱۹۱۶ء کی ایک شام"

فرانس کی مشرقی سرحد پر ایک چھوٹے سے اسکول کی عمارت جو اب فوجی ہسپتال میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ایک کمرہ جو زخمی سپاہیوں سے بھرا ہوا ہے۔ دروازے کے قریب ایک ہندوستانی سپاہی جس کے سر میں گولی لگی ہے، نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہے۔ ایک فرانسیسی نرس اُس کے سرہانے خاموش کھڑی ہے۔

یہ سپاہی بے ہوشی میں بڑبڑا رہا ہے۔ اس بڑبڑاہٹ میں وہ بتاتا ہے کہ وہ گنگا کے کنارے آباد ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے ولا ہے جہاں اُس کی بیوی اور چھوٹا سا بچہ ہے۔ بیوی زندگی گزارنے کے لیے اپنے بھائیوں کے گھر اُن کا کام کاج کرتی ہے۔ وہ کافی دنوں سے فرنٹ لائن پر ہونے کی وجہ سے خط بھی نہیں لکھ سکا اِس لیے اُس کی بیوی سوچتی ہوگی کہ "میں بے وفا نکلا۔" اس دوران اُس کے سر سے گولی نکالنے کے لیے آپریشن کی تیاری کی جاتی ہے لیکن عین موقع پر ایک انگریز سارجنٹ زخمی ہوکر اسی ہسپتال میں لایا جاتا ہے۔ اس پورے وارڈ میں جو صرف گورے فوجیوں کے لیے مخصوص ہے، اب کوئی بستر خالی نہیں ہے۔ چنانچہ گورے فوجی کے لیے بستر خالی کرانے کی غرض سے اُس 'کالے' سپاہی کو زہر پلا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور گورے فوجی کو لٹا دیا جاتا ہے۔ چوں کہ گولی اُس کے عین دل کے قریب لگی ہے اس لئے خون چشمے

کی طرح اُبل رہا ہے اور چند ہی لمحوں کے بعد مر جاتا ہے۔

"ٹوٹی ہوئے بانسری" چین اور جاپان کی لڑائی سے متعلق ہے۔ جاپانیوں سے لڑنے کے لیے جب چین میں عام بھرتی کا اعلان ہوتا ہے تو گیارہ برس کی عمر کے بچے بھی بڑے فوجیوں کی مدد کے لیے میدانِ جنگ میں اُتر پڑتے ہیں۔ ان ہی کمسن بچوں میں بچپن کے دو دوست لی کوائی اور یونگ بھی شامل ہیں۔ لی کوائی بانسری بجانے کا اتنا شوقین ہے کہ وہ میدانِ جنگ جاتے ہوئے بھی اپنی بانسری ساتھ لے جاتا ہے اور رات کو فرصت کے وقت میں دیر تک بانسری بجاتا رہتا ہے۔ ایک روز شدید لڑائی کے بعد جاپانی سپاہی پسپا ہو کر فرار ہوتے ہوئے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیتے ہیں۔ لی کوائی اُس وقت برف پگھلنے کے بعد گیلی زمین سے پتھر اُکھاڑ اُکھاڑ کر لال سپاہیوں کو دے رہا تھا۔ جو وہ جاپانیوں پر پھینک رہے تھے۔ ایک مضبوط سے گڑے ہوئے پتھر کو لی کوائی نے اپنی بانسری زمین میں گاڑ کر اُکھاڑا تو بانسری ٹوٹ گئی اور عین اُس وقت جاپانیوں کی اندھا دھند فائرنگ سے کسی سپاہی کی گولی لی کوائی کے سینہ میں پیوست ہو گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میدانِ جنگ سے براست متعلق متذکرہ بالا دونوں افسانوں کے ساتھ ساتھ "آدم زاد" جنگ کے دوران میں پیدا ہو جانے والے ایک اہم معاشرتی مسئلہ کا احاطہ کرتی ہے۔ جب کوئی ملک جنگ میں ملوث ہو جاتا ہے تو جوان، نوجوان، شادی شدہ اور غیر شادی شدہ سب ہی افراد سرحدوں پر بھیج دیے جاتے ہیں۔ جنگ اگر دو چار سال بھی چلتی ہے تو سرحدوں پر ان شادی شدہ اور کنوارے افراد کی گھروں سے دوری اور بیویوں سے جدائی لمبے عرصے تک جاری رہنے کے سبب جنسی تشنگی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف شوہروں سے کٹی ہوئی بیویوں اور گاؤں میں نوجوانوں کی قلت کے سبب کنواری لڑکیوں کے لیے غیر شادی شدہ رہنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ نتیجتاً میدانِ جنگ اور گاؤں اور شہروں میں جنسی بے راہروی اور کرپشن کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

"آدم زاد" میں یہی مسئلہ اُٹھایا گیا ہے۔ جمنا ایک نوبیاہتا عورت ہے جس کے خاوند کو شادی کے فوراً بعد میدانِ جنگ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اور جنگ ختم ہو جانے کے باوجود وہ لاپتہ ہے۔ اس طرح آٹھ سال کا عرصہ گزر جاتا ہے۔ جمنا اس دوران گمراہ ہو کر ایک بچے کی ماں بن جاتی ہے۔ دوسری طرف گاؤں کا کوئی نوجوان اس کے بچے کو اپنا کہنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ نہ چودھری کا بیٹا، نہ عیدو اور نہ گھسیٹا۔ جمنا کے سامنے اب ایک بے یار و مددگار اور بدنامی کی طویل زندگی ہے۔

جنگ سے بالراست اور اور براہِ راست پیدا ہونے والے موضوعات پر مبنی اِن افسانوں میں بظاہر کوئی معرکتہ الآرا مسئلہ نہیں ہے۔ جنگ کے دوران یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ بے قصور جوان بے مقصد زندگیاں گنواتے ہیں، میدانِ جنگ میں اخلاقی بے راہ رویاں پھیلتی ہیں۔ معاشروں میں مہنگائی اور جنگ کی تباہ کاریاں بھری پری بستیوں کو

کھنڈر بناتی ہیں۔ شوہروں کی طویل عدم موجودگی عورتوں میں جنسی فرسٹریشن اور کرپشن کو جنم دیتی ہے اور وہ خود گمنام باپوں کے بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ یہ سب واقعاتی کھتونی ہے جس میں اور بھی بے شمار واقعات درج کرنے کی گنجائش ہے لیکن ان ہی واقعات سے ایسے اخلاقی مسائل سر اُبھارتے ہیں جو متعلقہ گاؤں اور شہروں ہی کو نہیں پوری عالم انسانیت کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔ مثلاً ''سپاہی کی موت'' میں ایک لڑتے ہوئے گورے سارجنٹ کو صرف چند لمحات کے لیے بستر مہیا کرنے کی خاطر ایک کالے سپاہی کو زہر دے دیا جاتا ہے حالانکہ آپریشن کے بعد اس کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔ طرف داری اور تعصب کے اِس موازناتی عمل کی گرفت نے اس افسانے کو پوری عالم اِنسانیت کی ایک چیخ بنا دیا ہے۔ نسلی برتری کا یہ خود ساختہ اور جھوٹا تفوق دو عالمی جنگوں کے میدانوں سے ہوتا ہوا ہماری رواں صدی میں افریقہ سے لے کر مشرق بعید میں چین تک اس جھوٹے تفوق کو سر بلندی کے لیے کرہ ارض کے تین چوتائی حصے کو ظلم، جور، تشدد اور سماجی ذلتوں کی فصلوں کی آبیاری کے لیے کتنے ہزاروں ٹن خون ان ظالموں نے لیا ہے۔ اس کے ایک ایک قطرہ کا حساب ڈیڑھ دو صدیوں کی تاریخ میں 'ذرا ذرا' درج ہے۔ خود برصغیر پاک و ہند میں دو سو برسوں تک جو کچھ ہوتا رہا اور گزشتہ ساٹھ ستر برسوں میں امریکہ اور افریقہ میں نسلی تفوق اور برتری کا جو ننگا کھیل جاری ہے، وہ سب جنگ عظیم اول کے اس فرانسیسی گاؤں کے اس اسکول کے چھونے سے کمرے سے دست پذیر ہوا ہے۔ جس کو ہسپتال بنا کر وہاں یقینی موت کے بدلے ایک یقینی زندگی کو زہر پلا کر ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہی عمل ذرا دوسرے انداز میں ''ٹوٹی ہوئی بانسری'' میں بھی استعماری قوتوں کے با معاوضہ کارندے اندھا دھند فائرنگ کر کے ایک معصوم کی زندگی کے ہاتھوں اور ہونٹوں سے اس بانسری کو بے روح کر جاتے ہیں جس سے زندگی بخش کومل کومل سُر اور نغمے پھوٹتے تھے۔

اُس خون آشام استعماریت کا اصل روپ سردار جعفری نے اس مجموعے میں شامل افسانہ ''منزل'' میں دکھایا ہے۔ یہ خونریز بہیمت اپنے قول، عمل اور کردار میں جتنی بے دھڑک تھی اس کی اتنی ہی جیتی جاگتی بلکہ کچھ زیادہ ہی بے دھڑک مرقع کشی اس افسانے میں ملتی ہے۔ یہ ایک اُونچے جاگیردارانہ خاندان کی لڑکی فاطمہ کی کہانی ہے۔ جو پڑھی لکھی ہے اور اپنے خالہ زاد انقلابی بھائی عظمت کی عنایتوں اور دوستی کی وجہ سے انقلابی شعور کی منزل سے گزرنے والی بھی۔ عظمت خود کٹر کانگریسی اور انگریز دشمن نوجوان ہے جو فاطمہ کے خاندان کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اُس کی ان انقلابی سرگرمیوں اور فاطمہ پر اپنے خیالات کی اثر انگیزی کی بنا پر فاطمہ کے والد خان بہادر حامد علی خان اُسے اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ لیکن اس کی رفاقت اُس وقت تک فاطمہ کے اندر بھی انقلابی سوچ کے 'جراثیم' پیدا کر چکی ہے۔ فاطمہ کی شادی ایک نئے نئے آئی سی ایس نوجوان اشفاق سے ہوتی ہے۔ وہ ضلع کا ڈپٹی کمشنر بھی ہے۔ اُن کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے جس کی پرورش کے لیے وہ ایک دودھ پلانے والی عورت دلاری کو رکھتے ہیں۔ بچے کو سونے کے کڑے پہنائے جاتے ہیں تو دلاری اُسے لے کر غائب ہو جاتی ہے۔ بھلا ڈپٹی کمشنر سے بچ کر دلاری کہاں جا سکتی تھی، چنانچہ وہ پکڑی جاتی ہے اور

اشفاق اُسے جیل بھجوا دیتا ہے۔ اسی دوران میں اس شہر میں ایک مسجد پر ہندو مسلم قضیہ شروع ہو جاتا ہے۔ دونوں طرف سے سخت ایجی ٹیشن ہوتا ہے۔ عظمت بھی گرفتار ہو جاتا ہے۔ ایک رات بغیر خاوند کو اطلاع دیئے اپنی نوکرانی کے ساتھ فاطمہ بھی ایجی ٹیشن دیکھنے جاتی ہے۔ جہاں اُسی وقت جھگڑا ہو جاتا ہے اور اشفاق بحیثیت ڈپٹی کمشنر فائرنگ کرا دیتا ہے۔ فاطمہ اس صورت حال کو دیکھ کر خود بھی ایجی ٹیشن میں شامل ہو جاتی ہے۔ فائرنگ سے سینکڑوں لوگ زخمی ہوتے ہیں اور بلوہ ختم ہونے پر گرفتاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ زخمی فاطمہ بھی کچھ خواتین کے ساتھ گرفتار ہو جاتی ہے۔ گھر جا کر اشفاق کو ملازمہ کی زبانی اس کی ایجی ٹیشن میں شرکت اور گرفتاری کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ اُسے چھڑانے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ جب زخمی اور گرفتار عورتیں اس کے سامنے سماعت کے لیے پیش ہوتی ہیں تو وہ سب کو (بمع فاطمہ) چھ چھ مہینے کی سزا سنا دیتا ہے۔ اس مرحلہ پر اشفاق کو اپنے عہدہ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ جیل میں دلاری بھی ہے۔ جب فاطمہ وہاں پہنچتی ہے تو دلاری اُس سے پوچھتی ہے کہ کیا ڈپٹی صاحب نے اُسے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ (تب ساری عورتوں کو علم ہوتا ہے کہ وہ ڈپٹی کمشنر کی بیوی ہے) فاطمہ جواب دیتی ہے یہ ''اُن کے اختیار سے باہر تھا۔'' فاطمہ کا یہ مختصر سا جواب ساری قیدی عورتوں کے اندر عجیب سا شعور پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سب بیک زبان کہتی ہیں۔ ''ظلم تو حکومت کرتی ہے حاکم بیچارے کیا کریں؟'' فاطمہ فوراً ہی تنگ آ کر جواب دیتی ہے۔ ''پھر وہ حاکم بنتے ہی کیوں ہیں؟''

سپاہی کی موت، منزل، آدم زاد اور ریکلس سمڈلے کے افسانے کے ترجمے ''ٹوٹی ہوئی بانسری'' کے موضوعات کے ایک سرسری جائزے سے ہمیں افسانہ نگار کے سیاسی اور سماجی شعور کے اُن صد رنگ بوقلمونی کا پتہ ملتا ہے جو تخلیقِ شعر و ادب میں اُن کی راہیں متعین کر رہی ہیں۔ ان افسانوں کا محدود اور مخصوص موضوع ہونے کے باوجود غور طلب امر یہ ہے کہ ان کے مصنف نے زندگی کے کتنے مختلف پہلوؤں کو اپنی تخلیقی گرفت میں لیا ہے۔ مثلاً ان افسانوں میں میدانِ جنگ میں خود غرضی، نفسانفسی اور معمولی معمولی باتوں پر ہم پیشہ افراد کو ظالمانہ طریقہ سے موت کی نیند سلا دینا (سپاہی کی موت) اور میدان جنگ ہی میں مہر و محبت، رفاقت اور انسانی جانوں کے بے مصرف اور بے مقصد زیاں پر بیک وقت ترحم اور بغاوت کے جذبات کا انگیخت ہونا، چاروں طرف آگ اور خون کی بارش کے باوجود بنسری کے کومل اور زندگی بخش سُر چھیڑنا (ٹوٹی ہوئی بانسری) یا پھر اس جنگ و جدال اور خوں ریزی کو بچوں کا کھیل سمجھ کر کھیلنے والی پس پشت قوتیں جب خادمانِ عوام (سول سرونٹس) کا روپ دھار کر عدل و انصاف کی گدیوں پر براجمان ہوتی ہیں تو اُن کے چہروں پر چڑھے خونخوار بھیڑیوں اور ہر لحظہ 'آدم بو آدم بو' کا نعرہ لگانے والے دیوزادوں کے مصنوعی چہرے بات بات پر نہتے عوام پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں اور زخمیوں کو جیلوں میں ٹھونس دیتے ہیں۔ یا پھر میدان جنگ کے باہر انسانی آبادیوں میں روزمرہ کی اشیائے ضرورت کا قحط پڑتا ہے۔ بیٹیاں بہنیں اور گھروں کی عزت بہوئیں دو دو چھٹانک، اناج اور چاول کے عوض بکتی اور لٹتی ہیں یا اپنی جنسی تشنگی بجھانے کی خاطر ایسے بچوں کو جنم دیتی ہیں جن کو اس دنیا میں لانے والے باپ، نہ صرف انہیں

اپنانے سے گریز کرتے ہیں بلکہ اپنی آغوش گرم کرنے والی خواتین کو اُلٹا آبرو باختہ قرار دے کر اُن کو پنچایتوں سے سزائیں دلواتے ہیں اور اُن کے لواحقین کا حقہ پانی بند کرا دیتے ہیں۔ (آدم زاد)

ان افسانوں میں عشق و عاشقی کی چاشنی ہے نہ ہجر کی نہ کٹنے والی تاریک راتیں، نہ وصال کے لمحات کے لیے اضطراب و تڑپ کی مرقع کشی۔ نہ رومانوی فضا ہے، نہ کہانی کہنے سے پہلے کی طولانی تمہید، نہ کردار نگاری کے لیے زباندانی کے مظاہرے اور شعبدے۔ یہ افسانے سیدھے سادے بیانیہ انداز کے ہیں لیکن ان کی سادگی اور الفاظ کی صنعت کاری سے محروم اندازِ نگارش میں ہمکتی لپکتی اور ہزار زاویے اور ہزار رنگ دکھاتی زندگی ہے۔ ان زاویوں اور رنگوں میں مایوسیاں بھی ہیں، نامرادیاں بھی۔ اضمحلال بھی اور شکست و ریخت بھی۔ لیکن ان ہی زاویوں میں نفی سے اثبات کی تراوش بھی پھوٹتی ہے۔ سر کے معمولی زخم کا مریض اپنی تمام محرومیوں اور مایوسیوں کا مداوا ہونے والے آپریشن کی آس میں موت سے پنجہ آزمائی کی سکت تو رکھتا ہے لیکن دوسرے شدید زخمی اور چند لمحات کے مہمان فوجی افسر کے لیے اپنا بستر زہر کا گلاس پی کر خالی کر دیتا ہے۔ (سپاہی کی موت) اچھی زندگی کی خواہاں فاطمہ اپنے والدین کے فیصلہ پر سر جھکا کر ایک نوجوان آئی سی ایس سے شادی کر کے ڈپٹی کمشنر کی بیوی تو بن جاتی ہے لیکن مسجد کے قضیہ پر بیرونی استعمار کے کارندوں اور گماشتوں کے ذریعہ کرائے گئے ہندو مسلم فساد پر فاطمہ کے اندر کا انقلابی ولولہ جاگ اٹھتا ہے اور اپنے ڈپٹی کمشنر خاوند سے چھپ کر خود میدانِ کارزار کو دیکھنے پہنچ جاتی ہے۔ پھر اُس میں شریک ہو جاتی ہے۔ زخمی ہو کر تھانے پہنچ جاتی ہے اور اپنے خاوند کے اختیارات ہی سے چھ مہینے کی سزا (بلوہ میں حصہ لینے کی پاداش میں) پا کر جیل میں پہنچ جاتی ہے۔ پھر اُس کا مکالمہ کہ اگر بیرونی حکومت ظالم ہی ہے تو لوگ ظلم کرنے والے حاکم کیوں بننا پسند کرتے ہیں؟ زندگی کے اس رخ کے حسن پر مرمٹنے والے ہی اس کی داد دے سکتے ہیں۔ شعر و ادب کی جان اور آن صرف اور صرف سخن سازی اور بقول مولانا آزاد لفظوں کے طوطا مینا اُڑانے والوں میں اس کی داد کا حوصلہ کہاں؟ یا پھر ''آدم زاد'' کی حوصلہ مند چھمنا جو حوادث اور سماجی طوفانوں سے اُلجھ جانے کا حوصلہ رکھتی ہے، جو چودھری کے لڑکے کو ترخ کر جواب دیتی ہے 'بھیا چلو رہا تعلق ہے ڈگریا نا ہیں چھکتی' اس افسانے میں بھی کہیں عشق و عاشقی کی چاشنی نہیں البتہ اس چاشنی پر مکھیوں کی طرح بھنبھنانے والے اوباش اور لفنگے تن ساز ہیں۔ چودھریوں اور بلیک مارکیٹیوں کی بزدل اولادیں جو جنگ کی سرحدوں پر باہمت نوجوانوں کی گاؤں سے عدم موجودگی پر بے سہارا عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر گویا قلعے سر کر رہے ہیں۔

اس مجموعے کے باقی تین افسانے ''بارہ آنے'' ''باپ'' اور ''مسجد کے زیر سایہ'' میں اُن عام معاشرتی کوائف کو موضوع بنایا گیا ہے جن کو جنم دینے میں کرداروں کا کوئی ہاتھ نہیں لیکن وہ ان ہی حالات کی زنجیروں کی صید ہیں۔ مثلاً یہ دیکھیے کہ 'بارہ آنے'' کا بوڑھا کباڑیہ جو دن بھر تو اپنے کباڑ خانے میں بیٹھا مکھیاں مارتا ہے لیکن رات کو اسی کباڑ خانے کے عقبی کمرہ میں تاڑی خانہ اور اُوپر کے کمرہ میں قحبہ خانہ چلاتا ہے۔ شراب خانہ میں جو ابھی ہوتا ہے جہاں دن بھر کی

محنت سے تھکے ہوئے تانگے والے اور مزدور اپنی دل بستگی کی خاطر دن بھر کی کمائی بوڑھے کے کیسہ میں انڈیل جاتے ہیں۔اور قحبہ خانے میں مزدوری نہ پانے والی فاقہ کش گھروں اور کسانوں کی بیٹیاں عاجز آ کر بارہ بارہ آنے میں جسم فروشی پر مجبور ہو جاتی ہیں۔افسانہ "باپ" کی اندرا جس کی ماں بھی مر چکی ہے تنہا اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ یتیمی کی بے رنگ و بو زندگی گزارتی ہے۔بے حد شریف اور سوتیلے باپ کی خدمت گزار لڑکی ہے لیکن ایک رات اپنے شرابی باپ کی ہوس کا شکار ہو کر ایک بچی کی ماں بن جاتی ہے۔اور اس کے بعد قصبے کے نوجوانوں کے لیے نرم چارہ بن جاتی ہے۔تسبیح روز و شب کے دانوں کی طرح اسی اُلٹ پھیر میں وہ ایک مسلمان لڑکے سے حاملہ ہو جاتی ہے۔اس لڑکے پر اندرا کو بڑا امان تھا کہ وہ اُس سے شادی کرے گا لیکن جب وہ لڑکا اپنے اور اُس کے درمیان مذہبی فرق کا حوالہ دیتا ہے تو وہ لڑکی جیسے اپنے پورے وجود سے ڈھیر ہو کر انتہائی بے بسی سے کہتی ہے۔ "تمہارا مذہب میری جان بچانے سے روکتا ہے۔ ..اچھا"

"مسجد کے زیرِ سایہ" میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جسے کئی دنوں سے نہ کام ملا ہے اور نہ کہیں سے بھیک۔وہ اور اُس کا چھوٹا سا بچہ گلیوں گلیوں اور سڑکوں سڑکوں ہاتھ پسارے پھرتے ہیں مگر نتیجہ صفر رہتا ہے۔وہ ایک ہوٹل کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہے جہاں سامنے ہی چند فیشن ایبل لڑکے معاشرہ کے مسائل اور بے روزگاری اور بھوک پر دھواں دھار تقریریں کر رہے ہیں۔لیکن یہ عورت ہاتھ پھیلاتی ہے تو نفرت بھرے الفاظ اور جھڑکیاں بھیک میں ملتی ہیں۔مسجد کے پیش امام فلاح، نیکی، بھائی چارے اور غریب غرباء کی مدد کی تبلیغ تو سرِ عام کرتے ہیں مگر اس بھوکی عورت اور معصوم بھوکے بچے کو اُن سے بھی وہی فیشن ایبل نوجوانوں والا تحفہ ملتا ہے۔ایک جگہ وہ ایک وہی بڑے والے کا خوانچہ فٹ پاتھ پر دیکھتی ہے تو اس کے قدم جم کر رہ جاتے ہیں۔بالآخر وہ اس خوانچہ کے اُوپر گر پڑتی ہے۔سارے بڑے مٹی میں گر جاتے ہیں۔ یہ عورت گرے ہوئے ریت بھرے بڑے خود بھی کھانا شروع کر دیتی ہے اور اپنے بچے کے منہ میں بھی جلدی سے ٹھونس دیتی ہے۔دونوں ماں بیٹوں پر چاروں طرف سے مار پڑتی رہتی ہے مگر وہ ریت میں بھرے ہوئے بڑے بغیر چبائے جلدی جلدی نگلتی رہتی ہے۔

سردار جعفری کے اس افسانوی مجموعہ سے باہر ایک اور بڑا اہم افسانہ اُن کی یادداشت پر مشتمل کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں شامل ہے۔سردار نے اس کہانی کو بھی بطور یادداشت رقم کیا ہے۔لیکن یہ بھی ایک ہر طرح سے مکمل افسانہ ہے۔جس موضوع سے متعلق اُن کے تین افسانوں کا اُوپر کی سطور میں جائزہ لیا گیا ہے اسی موضوع سے متعلق مماثل یہ افسانہ رکہانی ریادداشت "چھرو مانجھی" اس سلسلہ کا تکملہ بھی ہے۔

یہ کہانی بنگال کے ساحلی علاقوں میں سے ایک علاقہ کی بستی کی بیٹی (چھرو مانجھی) کی کہانی ہے جو بقول بوڑ مائی گیر اس فضا سے جنم لیتی ہے۔"جب سے لڑائی یعنی (دوسری جنگ عظیم) شروع ہوئی ہے، مفلسی اور بڑھ گئی ہے۔ قحط پڑا پھر وبائیں پھیلیں اور ایسی وبائیں ایسا قحط تو میں نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ہیضہ اور پھر کالا آزار پھر بد چلنی

آوارہ ہو گئے۔ لڑکیاں گھر بار چھوڑ کر چلی گئیں۔ . . اب لڑکے بے حیا ہو گئے ہیں لڑکیاں اور بھی زیادہ بے شرم ہو گئی ہیں۔ سپاہی انہیں روپے دیتے ہیں اور وہ سپاہیوں کو ... ؟ اب کیا کہوں کیا دیتی ہیں۔ . ؟"

ان حالات نے بستی کی بستیوں کے لڑکے اور لڑکیوں کو بے شرمی کی ڈگر پر ڈال دیا۔ ان ہی سینکڑوں میں سے ایک چھرو ماجھی ہے جو انگریز فوجی افسروں کی منہ چڑھی بن چکی ہے اور نہایت عیش کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی کہانی اُسی کی زبانی سنیے "لوگ کہتے ہیں کہ مَیں بہت خوبصورت ہوں۔ مجھے بھی اپنی صورت اور اپنا جسم بہت اچھا لگتا ہے۔ مَیں اسے بیچتی ہوں۔ تم سمجھتے ہوگے کہ یہ میرا خاندانی پیشہ ہے نہیں مَیں کسان کی بیٹی ہوں۔ . جب میرے ماں باپ مر گئے اور سارا گاؤں اُجڑ گیا اور مَیں ہزاروں لاشوں کے بیچ اکیلی رہ گئی۔ تو گیارہ دن کے فاقوں کے بعد مَیں اپنے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئی۔ مَیں نے مٹھی بھر چاول مانگے۔ اُس نے پوچھا کیا قیمت دوگی؟ مَیں نے کہا خیرات دے دو اُس نے کہا تمہارے پاس جوانی ہے۔ خوبصورت چہرہ ہے، بھرا پُرا جسم ہے اسے کہیں جا کر بیچ آؤ۔ مَیں وہاں سے بھاگ آئی دو دن بعد جب مَیں تیرہ دن کی بھوکی تھی، پھر زمیندار کے پاس گئی۔ مَیں نے کہا اپنا جسم مٹھی بھر چاول میں بیچنے آئی ہوں۔ زمیندار ناراض ہو گیا۔ اُس نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا۔ . اُس کا بیٹا مجھے گھسیٹ کر باہر لایا۔ سیر بھر چاول میں میرا جسم خرید کر لے گیا۔ تب سے مَیں محسوس کرتی ہوں میرے پاس میرا جسم نہیں ہے۔ میری خوبصورتی نہیں ہے۔ میری جوانی نہیں ہے۔ یہ تو سب کچے سیر بھر چاول میں بک چکی۔ اور اب کوس بازار میں میری حکومت ہے مگر یہ اُوپری روپ کی کہانی ہے۔ چھرو کی یہ "حکمرانی" ایسے حالات کے دلدل میں پھنسنے کی "حکمرانی" ہے جس دلدل سے اب وہ زندہ نہیں نکل سکتی اور اسے اپنے ظاہری روپ کی ہر رات ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

سردار جعفری کے افسانہ نگاری کے دَور کی دین ابھی تک یہی چھ سات افسانے سامنے آئے ہیں۔ اس کے امکانات ہیں کہ ابھی کچھ اور بھی افسانے (منزل کے افسانوں کے بعد) جو امتداد روز و شب کی بنا پر اس دَور کے رسائل میں ابھی تک محفوظ ہوں۔ ایسا ہے تب بھی سردار جعفری کے آج کے مسلمہ ادبی مرتبہ کے assesment میں کوئی کمی نہیں آتی بقول احتشام حسین "وہ اُس انسان دوست اور انقلابی کارواں میں شامل ہیں جس میں گورکی مایا کاوسکی پبلو نرودا، ناظم حکمت اور لوئی آراگان کے نام لیے جاتے ہیں۔

ہر چند کہ سردار جعفری کی ادبی تخلیقات میں ان افسانوں اور ان کی افسانہ نویسی کا کوئی ذکر کہیں سنائی نہیں دیتا۔ خود سردار جعفری بھی اب شاید ہی ان افسانوں کو کبھی یاد کرتے ہوں۔ اور اس کے باوجود کہ ان فسانوں کے ذکر اذکار یا حوالوں کے بغیر سردار جعفری کی تخلیقی دستار کی فضیلت اور افضلیت کا کوئی پَر کم نہیں ہوتا۔ پھر بھی شعر و ادب کی تخلیق میں سماجی شعور اور انقلاب آفرینی کی راہوں کے شعوری انتخاب کی خبر شاعری سے پہلے ہمیں یہی افسانے دیتے ہیں۔ اپنے ابتدائی دَور کے زمانہ سے متعلق موضوع اور مواد کے انتخاب اور سماجی انقلاب پسندی کے فلسفے کو مشعلِ راہ بنا

کران موضوعات اور مواد میں تاثر پیدا کرنا جو سماجی جدوجہد اور عوامی شعور پیدا کرنے میں تخلیقات کو آلہء کار بنانے کا فن بن جائے، ان ہی افسانوں کی وساطت سے آج سے نصف صدی پہلے کے اس نوجوان سردار جعفری سے پہلے پہل متعارف ہوتے ہیں جو انقلابی ادب کے قافلے میں نئے نئے شامل ہوئے تھے۔

سردار جعفری کے متذکرہ بالا سات آٹھ افسانوں کے متعلق جو مختصر سی باتیں اُوپر کہی گئی ہیں، اُن میں تشنگی کا احساس مجھے خود بھی ہے اور اس کمی کو میں خود سردار جعفری کا ایک شعر قارئین کی خدمت میں پیش کر کے دُور کرنا چاہتا ہوں۔ اُن کی افسانہ نگاری کے موضوعات اور مواد پر اس شعر سے بہتر کوئی طویل تحریر بھی نہیں ہو سکتی

چُن لیے ہیں باغِ انسانی سے ارمانوں کے پھول
جو مہکتے ہی رہیں گے میں نے گوندھے ہے وہ ہار

☆☆☆

(افکار کراچی سردار جعفری نمبر)

سردار جعفری اداکار بھارت بھوشن، دلیپ کمار اور خواجہ احمد عباس

سردار جعفری

چہرو مانجھی

ہوا بہت دھیرے سُروں میں گا رہی تھی۔ دریا کا پانی آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے نغمہ بڑا پُر شور تھا لیکن اب اس کی تانیں مدھم پڑ چکی تھیں اور ایک نرم اور لطیف گنگناہٹ باقی رہ گئی تھی۔ وہ لہریں جو پہلے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، اب اپنے سیال ہاتھوں سے تھکے ہوئے ساحل کا جسم سہلا رہی تھیں۔ ہماری کشتی بڑی نرمی کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ کنارے سے دُور آ کر بیچ دریا میں ماہی گیروں نے اپنے چپو چھوڑ دیئے تھے اور بادبان کھول دیئے تھے۔ اور سمندر کی طرف دوڑتی ہوئی موجیں کشتی کو بہائے لیے جا رہی تھیں بادبان میں ہوا بھری ہوئی تھی اور اُس کا سینہ غرور سے پھولا ہوا تھا۔ ہماری کشتی لمبی لمبی نازک اور پتلی سمپانوں کو، اُن میں بیٹھے ہوئے مانجھیوں کے گیتوں کو بڑے سے سیاہ فام جہاز کو اور ساحل کے پاس شہر کی چمکتی ہوئی روشنی کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتی جا رہی تھی، سمپانیں موجوں میں، ساحل اندھیرے میں اور روشنیاں ننھے ننھے خوبصورت ستاروں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔

بوڑھے ماہی گیر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "رات اچھی ہے۔ آج طوفان کا خطرہ نہیں ہے۔ ایک گھنٹے میں چاند نکل آئے گا۔"

نوجوان ماہی گیر نے جو اُس کا بیٹا تھا کہا کہ۔ "اتنی دیر ہم کھلے سمندر میں پہنچ جائیں گے۔" یہ وہ جگہ تھی جہاں دریائے کرنافلی خلیج بنگال میں جا کر ملتا ہے۔ جس کے کنارے چٹ گاؤں کا شہر آباد ہے۔ سبز اور نیلی پہاڑیوں کے دامن میں سپاری کے خوبصورت اور چھریرے بدن کی دوشیزاؤں کی طرح نازک درختوں کے سائے میں، جب سمندر میں پانی بڑھتا ہے تو دریا کا دھارا اُلٹا بہنے لگتا ہے اور ماہی گیر اپنے جال دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ جب سمندر کا پانی اُترتا ہے تو دریا پھر سمندر کی پھیلی ہوئی آغوش کی طرف لپکتا ہے۔ اور ماہی گیر اپنی کشتیاں اور جال لے کر کھلے سمندر میں چلے جاتے ہیں اور ساحل کے کنارے کنارے کوسوں بازار تک مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ گھروں پر اُن کی بیویاں اور محبوبائیں اُن کا انتظار کرتی ہیں اور سمندر میں اُن کے گیت تیرتے رہتے ہیں جنہیں سننے کے لیے دُور دُور کی مچھلیاں سمٹ آتی ہیں اور اُن کے جال بھر جاتے ہیں اور کشتیاں بھاری ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے مضبوط بازوؤں کی قوت سے چپو چلاتے ہیں۔ ان کی

سانس پھول جاتی ہے۔ گیتوں کی تان وزنی ہو جاتی ہے۔ گلے کی رگیں اُبھر آتی ہیں۔ بازوؤں کی مچھلیاں تڑپنے لگتی ہیں ہتھیلیاں لال ہو جاتی ہیں اور جب وہ اپنے گاؤں کے کنارے آ کر شکار سے بھری کشتیوں کو خالی کرتے ہیں تو اُن کی بیویوں اور محبوباؤں کی آنکھیں رنگ برنگی مچھلیوں کو دیکھ کر چمک اُٹھتی ہیں اور وہ اپنا دل ہمیشہ کے لیے بہادر ماہی گیروں کو دے دیتی ہیں۔ اور رات کو جب تیل کی کمی سے چراغ کی مدھم لو ٹمٹمانے لگتی ہے اور ہوا کی ہلکی سی پھونک اُسے بجھا دیتی ہے تو یہ تھکن سے چور ماہی گیر ان کے نیلگوں سینوں پر جن میں مچھلی کی بو آتی ہے، اپنا سر رکھ کر سو جاتے ہیں۔

لیکن جب سے لڑائی شروع ہوئی تھی اور جاپان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا تب سے ماہی گیروں کو عام طور سے سمندر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کھلے سمندر میں جانے کے لیے انہیں فوجی افسروں سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ جو چند امیر ماہی گیروں کو ملتا تھا کیونکہ دوسرے ماہی گیر رشوت دینے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ کوکس بازار جانے کے تمام راستے بند ہو گئے تھے کیونکہ بندرگاہ بہت بڑی چھاؤنی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ سڑک سے صرف فوجی لاریاں گزرتی تھیں اور سمندر سے صرف جنگی جہاز۔ مجھے اخباری نمائندے کی حیثیت سے خاص اجازت نامہ ملا تھا جس پر فوجی افسروں کے علاوہ چٹ گاؤں کے ڈپٹی کمشنر کی مہر بھی لگی ہوئی تھی۔

بوڑھے ماہی گیر نے اپنی چلم سلگائی۔ نوجوان ماہی گیر مانجھیوں کے گیت گانے لگا۔ مَیں کشتی میں لیٹ کر خواب دیکھنے لگا۔ میری نگاہ دُور دُور تک سر پر سے گزرتے ہوئے ہوائی جہازوں کی سرخ اور سبز روشنیوں کا تعاقب کرتیں اور پھر آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں میں کھو جاتیں جو نیلے آسمان کی گود میں دریا کی موجوں کی طرح بہہ رہے تھے۔

بوڑھا ماہی گیر میرے پاس سرک آیا اور چلم میری طرف بڑھا دی۔ مَیں نے ایک لمبا سا کش لے کر پوچھا۔

"تم اپنا جال ساتھ لائے ہو؟"

"نہیں جال کا کیا ہوگا۔ جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے سمندر میں جال ڈالنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے؟"

"کہتے ہیں پانی میں بڑے بڑے بم ڈال دیئے گئے ہیں تاکہ دشمن کے جہاز نہ آسکیں اور مَیں سوچتا ہوں، سرکار کے جہاز کیسے چلتے ہیں؟"

"بم تو سرکار نے ہی ڈالے ہیں۔" بیٹے نے اپنا گیت بند کر کے جواب دیا۔ "انہیں معلوم ہے کہ بم کہاں پڑے ہیں اور وہ اپنے جہازوں کو بچا کر نکال لے جاتے ہیں۔"

"ہم تو تباہ ہو گئے۔" بوڑھے نے اپنی داستان شروع کی۔ رات کے اندھیرے میں اُس کا جھریوں پڑا ہوا پُر وقار معلوم ہو رہا تھا جس پر پچاس برسوں کی صعوبتوں کے نشان تھے۔

"پچاس برس سے دریا میں جال ڈال رہا ہوں۔ اس کے ایک ایک چپے کو جانتا ہوں۔ بہتی ہوئی موجوں

دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ ان کے نیچے کتنی مچھلیاں ہیں۔ سمندر کی مچھلیاں اور دریا کی مچھلیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ جب وہ چلتی ہیں تو موجوں کی رفتار میں فرق آ جاتا ہے اور میں ایک نظر میں بھانپ لیتا ہوں کہ کون سی مچھلی جا رہی ہے۔ آسمان کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ موسم کتنی دیر میں بدل جائے گا۔ سمندر میں طوفان کب آئے گا اور دریا کا پانی اُلٹا کب بہے گا؟ پچاس برس سے کچھ نہیں تو لاکھوں مچھلیاں پکڑ ڈالی ہوں گی۔ لیکن آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ ہم جو محنت کرتے ہیں وہ دولت کہاں جاتی ہے؟ ہم دریا میں خالی جال ڈال دیتے ہیں۔ جب اُسے کھینچتے ہیں تو اُس میں چاندی بھری ہوتی ہے جو جھلمل جھلمل چمکتی ہے۔ عورتیں اس چاندی کو بھر کر بازار لے جاتی ہیں اور اس کے بدلے میں تانبے ، نکٹ اور کاغذ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ہمارے جسم سوکھتے چلے جاتے ہیں اور آنکھیں دھنستی چلی جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں لکڑی کی طرح خشک ہوتے جاتے ہیں۔ مَیں پچاس برس سے چٹ گاؤں کے بازاروں کے لئے دریا سے چاندی نکال رہا ہوں لیکن مجھے تانبے اور نکٹ کے ٹکڑوں اور کاغذ کے میلے پرزوں کے سوا کچھ نہ ملا اور وہ بھی میرے پاس نہیں رہے۔ جیسے زندہ مچھلیاں تڑپ کر نکل جاتی ہیں، یہ ٹکڑے بھی، ہماری ہتھیلیوں سے پھسل جاتے ہیں اور ہماری مفلسی پہلے سے بھی زیادہ بھیانک ہو جاتی ہے۔"

نوجوان ماہی گیر، باپ کی داستانِ غم سے بے نیاز کشتی کے اگلے سرے پر بیٹھا ہوا ایک عشقیہ گیت گا رہا تھا۔

بوڑھے نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم پڑھے لکھے ہو، بہت سے دیس دیکھے ہوں گے تم جانتے ہو گے کہ ہماری دولت کہاں جاتی ہے؟"

مَیں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بوڑھے ماہی گیر نے اس کا موقع نہیں دیا اور بہتی ہوئی موجوں کی طرف دیکھ کر اپنے سوال کا جواب دینے لگا۔ جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے۔

"یہ دریا ہزاروں برس سے بہہ رہا ہے اور اس کا پانی سمندر میں گر رہا ہے۔ میری عمر ساٹھ برس کی ہونے کو آئی لیکن مَیں نے ایک دن بھی نہیں دیکھا کہ اس کی موجوں کا بہاؤ رک گیا ہو۔ ایک کے پیچھے دوسری موج دیوانہ وار سمندر کی طرف چلی جا رہی ہے۔ سمندر جس کی تہہ کا کچھ پتہ نہیں جو آکاش کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ہماری محنت بھی اسی طرح بہتی ہوئی کسی بڑے سے سمندر کی طرف چلی جا رہی ہے۔ کوئی اندھا سمندر ہے جو ہماری چاندی کی طرح چمکتی ہوئی محنت کو نگلے لے رہا ہے۔ چاندی ہی تو ہے جو بہہ رہی ہے۔ دیکھو یہ موجیں چاندی کی طرح چمک رہی ہیں۔ دریا کا رنگ سفید ہے اور سمندر کا رنگ نیلا اور یہ سفید چاندی نیلے سمندر میں جا کر کھو جاتی ہے۔"

مَیں نے موجوں کی طرف دیکھا۔ جو واقعی بہتی ہوئی چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہمارے بائیں طرف دُور اُفق میں مہینے کی آخری راتوں کا چاند اُبھر رہا تھا جس کی نرم کرنیں فضا سے گزر کر دریا کے جسم میں پھیل گئی تھیں اور مٹیالے پانی کو سیال چاندی میں تبدیل کر رہی تھیں۔ بوڑھے کا سیاہی مائل چہرہ چاندی کی ہلکی سی سرخی مائل روشنی میں چمک اُٹھا تھا اور سفید بادبان بادل کا ایک خوبصورت ٹکڑا معلوم ہوتا تھا جو ہمیں چاندی کے دریا میں بہائے لئے جا رہا تھا۔

بوڑھے ماہی گیر نے نظر اُٹھا کر چاند کی طرف دیکھا پھر بادبان کی طرف۔ بادبان کچھ ٹیڑھا ہو گیا تھا یا شاید ہوا کا رخ بدل گیا تھا اور اس لئے بادبان کا رخ بھی بدلنا ضروری تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ دونوں نے لپٹی ہوئی رسیاں کھولیں اور بادبان کا رخ بدل کر میرے پاس آ بیٹھے۔

"جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے، مفلسی اور بڑھ گئی ہے۔ پہلے قحط پڑا، پھر وبائیں پھیلیں۔ ایسا قحط اور ایسی وبائیں تو مَیں نے دیکھی نہیں تھیں۔ ہیضہ اور پھر کالا آزار۔ پھر بد چلنی۔ ہمارے گاؤں کے گاؤں اُجڑ گئے۔ بوڑھے اور بچے مر گئے۔ لڑکے آوارہ ہو گئے اور لڑکیاں گھر بار چھوڑ کر چلی گئیں۔ پھر یہاں فوج آ گئی اور ہمارے لڑکے اور لڑکیاں ماہی گیری چھوڑ فوج میں مزدوری کرنے لگے۔ ماہی گیری کیسے کرتے؟ نہ جال تھے، نہ کشتیاں۔ سر چھپانے کے لئے گھر بھی نہیں تھا۔ یہ سب چیزیں تو قحط ہی کے زمانے میں بک چکی تھیں۔ اب لڑکے بے حیا ہو گئے تھے۔ لڑکیاں اور بھی زیادہ بے شرم ہو گئی ہیں۔ سپاہی انہیں روپے دیتے اور وہ سپاہیوں کو اب کیا کہوں؟ کیا دیتی ہیں۔ پہلے انہیں جال کی مرمت کرنی پڑتی تھی۔ سر پر مچھلیوں کی ٹوکری رکھ کر بازار جانا پڑتا تھا۔ پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تھا تو بھی محنت سے جسم تندرست رہتے تھے۔ چہرے پر ایمانداری کی چمک ہوتی تھی۔ اور اب ...؟ اب کیا ہے۔ ذرا سی آنکھیں مٹکائیں، ذرا سا کولھا چلایا اور کام بن گیا۔ مجھ ہی کو دیکھو۔ میرے گاؤں میں تین سو گھر تھے اب صرف آٹھ گھر رہ گئے ہیں۔ باقی سب اُجڑ گئے۔ ان کھنڈروں میں بیٹھ کر کتے روتے ہیں۔ میری بیوی قحط میں مر گئی۔ دو بیٹیاں تھیں، وہ گھر سے بھاگ گئیں۔ اب سنا ہے کہ اراکان روڈ پر مزدوری کر رہی ہیں۔ مزدوری تو کیا کر رہی ہوں گی۔ یہ تو بہانہ ہے۔ ایک کا نام رادھا ہے اور دوسری کا ساوتری۔ یہ نام تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم گھومنے پھرنے والے آدمی ہو، شاید تمہیں اراکان روڈ پر وہ لڑکیاں مل جائیں تو اُن سے کہہ دینا کہ تمہارا باپ زندہ ہے۔ نیا جھونپڑا ڈال لیا ہے، جال بھی ہے اور کشتی بھی اور دریا میں بہت سی مچھلیاں ہیں۔ رادھا اور ساوتری آ جائیں تو ہم خوب مچھلیاں پکڑیں گے۔ ہمارا ایک جال بھی ٹوٹا پڑا ہے، اُس کی مرمت بھی اُن کے بغیر کیسے ہو گی؟

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ چپ ہو گیا اور بہتے ہوئے پانی کی موجیں گننے لگا۔ جیسے وہ ان موجوں کے آئینے میں اپنی ساری گزری ہوئی زندگی کا عکس ڈھونڈ رہا تھا۔ اُس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس کا اُجڑا ہوا گاؤں، مرے ہوئے ساتھی، بیوی جو داغِ مفارقت دے گئی، گھر چھوڑ کر بھاگ جانے والی بیٹیاں جو اُسے اب بھی اتنی پیاری تھیں۔ وہ سب ان موجوں پہ تیر رہی تھیں۔ مَیں نے دیکھا کہ بوڑھے ماہی گیر کی انگلیاں کانپ رہی ہیں اور آنکھوں سے بہہ کر آنسو اُس کی جھریوں میں بھر گئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگا۔ "رادھا اور ساوتری ہی کو کیوں بُرا کہو۔ آج کل سب لڑکیاں ایسی ہی ہو گئی ہیں۔ ہمارے یہاں کالے گورے ہزاروں سپاہی آ گئے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے لئے موز-

لاتے ہیں سفید اور لال پاؤڈر سے بھرے ہوئے ڈبے لاتے ہیں چھوٹے چھوٹے آئینے لاتے ہیں اور لڑکیاں دیوانی ہو جاتی ہیں اور اپنا منہ رنگ کر اُن کے پیچھے دوڑتی ہیں۔ سپاہی دریا میں اور تالابوں میں ننگے نہاتے ہیں اور لڑکیاں کنارے کھڑی ہو کر اُن کا تماشہ دیکھتی ہیں۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ اور کئی بار سوچا کہ یہ سب لڑکیاں قحط اور وبا میں مر کیوں نہیں گئیں، مچھلیاں پکڑنا، کھیت بونا اچھا پیشہ ہے۔ مانا کہ اس سے غریبی دور نہیں ہوتی لیکن عزت تو باقی رہتی ہے۔ گھر بار تو رہتا ہے۔ لیکن یہ منہ پر رنگ پوت کے دیسی بدیسی سپاہیوں سے آنکھیں لڑانا کہاں کا پیشہ ہے؟ لیکن اب جسے دیکھو وہ یہی کر رہی ہے۔ سپاہی اپنی موٹروں پر گزرتے ہیں تو سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی لڑکیوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں اور دو تین میل آگے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں سے دوسرے سپاہی انہیں اُٹھا لے جاتے ہیں۔ چٹ گاؤں سے چِٹگا اور چِٹگا سے رامو اور رامو سے کوکس بازار تک یہی سلسلہ ہے۔ سب لڑکیاں خراب ہو گئی ہیں۔ کوئی اچھی نہیں رہ گئی۔ مَیں سوچتا ہوں ہم پر جاپانی بم کیوں نہیں گرتے۔"

پچھم کے ساحل پر ایک گاؤں آباد تھا اور اس کے سرسبز درختوں کا جھنڈ چاندنی میں آہستہ آہستہ پیچھے سرک رہا تھا۔ بوڑھے ماہی گیر نے اپنی انگلی کا اشارہ کر کے کہا۔ "وہ گاؤں دیکھتے ہو۔ قحط کے زمانے میں وہاں کے تمام آدمی مر گئے۔ اُن کی لاشیں گیدڑوں اور کتوں نے کھائیں۔ اس سال درختوں میں پھل نہیں آئے بلکہ شاخوں پر گدھ پھیلے تھے جو اکثر زندہ آدمیوں پر بھی جھپٹ پڑتے تھے۔ کوئی آدمی اس طرف آنے کی ہمت بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک رات کیا ہوا کہ ٹھیک بارہ بجے کے وقت دوسرے گاؤں سے ایک شعلہ بلند ہوا اور اس گاؤں کی طرف چلا۔ تھوڑی دیر میں پچھم کی طرف سے ایک شعلہ اُٹھا اور وہ بھی اس گاؤں کی طرف چلا اور پھر دونوں شعلے مل گئے۔ اس کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ اب روز رات کے وقت بارہ بجے دو شعلے ناچتے ہوئے چلتے تھے۔ ایک پورب سے اور دوسرا پچھم اور دونوں اس گاؤں میں آ کر مل جاتے تھے۔ کسی نے کہا۔ بھوت ہیں۔ کسی نے کہا پریت ہیں اور تم تو جانتے ہی ہو کہ مرنے کے بعد انسان بھوت پریت بن جاتے ہیں اور یہاں تو ہزاروں آدمی ٹھٹھرے پڑے تھے۔ جب مَیں نے پہلی بار اُن بھوتوں کو دیکھا تو میرا دل کانپ اُٹھا۔ مَیں ڈرپوک آدمی نہیں ہوں لیکن بھوت پریت سے تو سبھی ڈرتے ہیں۔"

بیٹے نے باپ کو ٹوک دیا۔ "یوں نہیں ہوا تھا۔ مَیں سناتا ہوں۔ مَیں نے تو اُن شعلوں کو پکڑا تھا۔"

"سچ! تم نے اُن شعلوں کو پکڑ لیا؟" مَیں نے حیرت سے پوچھا

بوڑھے نے خوش ہو کر کہا۔ "میرا بیٹا بڑا بہادر ہے۔" اور نوجوان ماہی گیر کا سینہ اور چوڑا ہو گیا اور بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اُٹھیں۔

اُس نے بہت گمبھیر لہجے میں کہا کہ "کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان بھوتوں کو پکڑ لے۔ ارد گرد کے تمام گاؤں تھر تھر کانپتے تھے۔ کوئی کہتا تھا بھوت ہیں۔ کوئی کہتا تھا پریت ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ انگریزوں نے ایسے بم بنائے ہیں

جورات بھر خود بخود پہرہ دیتے رہتے ہیں اور دشمن کو پہچان کر اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ بات ہی ایسی تھی۔ اس سے پہلے چیٹ گاؤں کے کسی آدمی نے شعلوں کو چلتے نہیں دیکھا تھا۔ میرے دل میں کچھ اور ہی آئی۔ مَیں نے کہا کہ جان رہے یا جائے، مَیں ضرور پتہ لگاؤں گا کہ یہ شعلے کیا ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں؟"

چاند اتنی دیر میں کافی اُونچا ہو گیا تھا اور اُس کی کرنوں کی پھوار ہوا کے جھونکوں کے ساتھ زمین پر گر رہی تھی۔ رات ٹھنڈی ہو چلی تھی۔ دونوں ماہی گیروں نے ایک چلم اور بھری اور باری باری اُس کا کش لے کر میری طرف بڑھا دی۔

"مَیں کئی دن تک منصوبے باندھتا رہا لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں تیار ہو گیا۔ مَیں نے اپنی لنگوٹ کس کر باندھ لی اور ہاتھ میں بلم لے لیا اور رات کے گیارہ بجے سے جا کر راستے میں بیٹھ گیا جہاں سے وہ دونوں شعلے گزرتے تھے۔ میرا دل سینے سے نکل کر میرے کانوں میں آ گیا تھا اور اُس کی دھڑکن سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ مَیں جس پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا، اُس کی شاخیں میرے سر پر چڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ اب مجھے کچل دیں گی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف گھاس میں دبکے ہوئے کیڑے مکوڑوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں یا کبھی کبھی کتے رونے لگتے تھے۔ گیدڑ بولنے لگتے تھے یا پیڑوں پر بیٹھے گدھ اپنے پَر پھڑپھڑانے لگتے۔ گیارہ بجے، سوا گیارہ بجے، ساڑھے گیارہ بجے، پونے بارہ بجے۔ بس اب بارہ بجنے ہی والے تھے اور میرے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے اور خون معلوم ہو رہا تھا رگوں کو پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔

ٹھیک اُس وقت جب شہر کے گھنٹے نے بارہ بجائے تو مَیں نے دیکھا کہ ذرا دور میرے سامنے زمین سے ایک شعلہ اُٹھا اور میری طرف چلنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے دوسری طرف سے ایک اور شعلہ اُٹھا اور وہ بھی میری طرف بڑھنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں۔ دونوں شعلے میرے قریب آتے جا رہے تھے اور مَیں آنکھیں پھاڑے ہوئے اپنے سامنے سے آتے ہوئے شعلے کو دیکھ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اُس کی چمک بہت تیز تھی۔ تھوڑی دیر بعد مَیں نے محسوس کیا کہ وہ شعلہ زمین پر نہیں چل رہا بلکہ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ ہوا میں معلق شعلہ میرے قریب آتا گیا۔ میرا بدن سُن ہو گیا۔ زبان منہ میں اینٹھ گئی۔ بلم کو چھوا تو وہ کئی من کا معلوم ہوا۔ میرے پیر زمین نے پکڑ لئے تھے اور اب مجھ میں اُٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ مَیں نے عمر میں پہلی بار یہ محسوس کیا کہ مَیں بزدل ہوں۔ مگر اب کیا ہوتا؟ موت میرے سر پر آ گئی تھی اور وہ شعلہ مجھ سے دو تین گز کے فاصلے پر تھا اور مَیں اُس کے راستے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یکا یک میرے جسم میں ایک آگ سی لگ گئی۔ خون جو میری رگوں میں جم گیا تھا، پھر تیزی سے دوڑنے لگا اور کسی نے مجھے زمین سے اُوپر اُچھال دیا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔۔ کون ہے؟"

نوجوان ماہی گیر چپ ہو گیا اور بوڑھا ماہی گیر اپنی پھٹی ہوئی قمیض پر ایک پھٹی صدری پہننے لگا۔ رات کی خنکی

بڑھ رہی تھی۔ ہم شاید سمندر کے قریب پہنچ رہے تھے کیونکہ بوڑھا ماہی گیر کشتی میں لیٹے ہوئے چپوؤں کو اِدھر اُدھر لگا رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے بھی بھیگے ہوئے تھے اور اُن میں ہلکے سے نمک کا ذائقہ تھا۔

مَیں نے حیرت اور شوق سے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

نوجوان ماہی گیر نے اپنی چلم سے دو تین لمبے لمبے کش اور لئے اور پھر دریا میں چلم اُلٹ دی۔

''ہاں تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا 'کون ہے؟' اس کے ساتھ فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی اور زمین پر بہت سارے انگارے بکھر گئے۔ میرے سامنے ایک ننگ دھڑنگ عورت کھڑی تھی جس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔''

''عورت؟'' مَیں نے پوچھا جیسے مجھے یقین نہ آیا ہو۔

''ہاں عورت... جوان عورت۔ ایسی ہی کوئی بیس برس کی اور سر سے پاؤں تک ننگی۔ مَیں نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ اُس نے اپنے کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہیں کی بلکہ میرے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگی اور میرا سینہ اُس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ کوئی دس گز کے فاصلے پر انگاروں کا ایک ڈھیر اور پڑا تھا اور اندھیرے میں ایک پرچھائیں سی بھاگتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا 'تو کون ہے؟' اور سسکیوں کے سوا کوئی جواب نہیں ملا۔ مَیں نے پھر پوچھا۔ 'تو کون ہے؟' لیکن وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ آخر مَیں نے اُس کا چہرا اپنے کندھے سے اُٹھایا اور اُسے غور سے دیکھا۔ ارے یہ تو چیرو تھی۔ عبداللہ چاچا کی بیٹی۔ مَیں نے کہا۔ 'چیرو تجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہ رو کیوں رہی ہے؟ منہ سے بولتی کیوں نہیں مَیں بھلا تیرا کیا بگاڑوں گا؟ مَیں گنیش ہوں گنیش مچھیرا۔'

''ہاں!'' اُس نے سسکی لیتے ہوئے کہا

''مجھے بڑی شرم آ رہی تھی کہ ایک ننگی عورت میری گود میں ہے مَیں نے بہت کوشش کی لیکن آنکھیں بند نہیں کر سکا۔ ستاروں کی روشنی میں مَیں نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ بے... خوبصورت تھی جیسے کوئی اپسرا۔

''وہ اپنے گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ عمر بیس برس کی ہو گی تھی لیکن اب تک بیاہ نہیں ہوا تھا۔ اُس کے باپ کے پاس بیاہ کرنے کے لئے روپیہ تھا ہی نہیں۔ گاؤں کے تمام لڑکوں کی رال اُس پر ٹپکتی تھی اور جس کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھ لیتی تھی، یا ذرا سا مسکرا دیتی تھی، اُس کا دل کئی دن تک دھڑکتا رہتا تھا۔ مَیں نے بھی اُسے کئی بار دیکھا تھا اور دل میں یہ سوچتا تھا کی کاش وہ مچھیری ہوتی یا مَیں مسلمان ہوتا۔ مَیں اُس سے ضرور شادی کر لیتا لیکن مشکل یہ تھی کہ مَیں مچھیرا تھا اور وہ مسلمان۔ لیکن آج رات کو بارہ بجے گاؤں کی یہ سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی جس پر ہر جوان لڑکا اپنی جان چھڑکتا تھا، اکیلی اور ننگی میری گود میں تھی۔ چاروں طرف سے سڑی ہوئی لاشوں کی بو آ رہی تھی۔ درختوں پر گدھ اپنے پروں کو پھڑ پھڑا رہے تھے، کتے رو رہے تھے اور گیدڑ بول رہے تھے۔ اور چیرو میرے سینے پر سر رکھے ہوئے تھی۔

''مَیں چیرو کو لے کر کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔ مَیں نے سوچا کہ اُسے جی بھر کر رو لینے دو۔ جب اُس کے دل

کے سارے آنسو بہہ جائیں گے تب بات کروں گا۔"

بوڑھے ماہی گیر نے آواز دی۔ "سمندر آ گیا۔ چپو سنبھال لو۔" گنیش پیچھے اور اُس کا باپ آگے بیٹھ گیا اور چپو چپا چپ چلنے لگے۔ مَیں بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ دریا کی انفرادیت غائب ہو چکی تھی اور اب ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ سمندر پر ایک غنودگی طاری تھی۔ لہریں آہستہ آہستہ سانسیں لے رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے بڑے ہلکے تھے۔ ہماری کشتی پورب کی طرف مڑ گئی تھی اور چاند ہمارے سر پر چمک رہا تھا۔ ایک خوبصورت چہرے کی طرح جو مکان کی سب سے اُونچی منزل کی کھڑکی سے جھانک رہا ہو۔ اور راہگیروں پر اپنے حسن کی بارش کر رہا ہو۔ دونوں ماہی گیر بڑی پھرتی اور صفائی سے چپو چلا رہے تھے۔ اُن کے جسم ایک ساتھ آگے جھکتے تھے اور پھر سیدھے ہو جاتے تھے۔ سیدھے ہوتے وقت اُن کے کندھے بلند ہوتے تھے اور سینے تن جاتے تھے۔ چپو بھی اُن کے ہاتھ معلوم ہوتے تھے جو سمندر تک پھیلے ہوئے تھے اور موجوں کو اس طرح کاٹ رہے تھے جیسے ہنسا دھان کے پکے کھیتوں کو کاٹتا ہے۔ اُن کے بازوؤں کی جنبش ایک خاموش ہم آہنگی اور ترنم تھا جو سمندر کی موجوں کے ترنم سے مل گیا تھا۔

وہ دونوں بڑی دیر تک کشتی کھیتے رہے۔ یہاں تک کہ چاند پچھم کی طرف ڈھل گیا اور ایک گول نکیا سمندر کی سطح کے قریب لرزنے لگی۔ باپ اور بیٹا دونوں تھک کر چور ہو گئے اور ستانے کے لئے انہوں نے پھر چپو نکال کر کشتی میں لٹا دیئے۔ گنیش نے اپنی ہتھیلیاں ملیں۔ بوڑھے ماہی گیر نے پھر چلم بھری اور کشتی کی ایک دیوار سے سہارا لے کر لیٹ گیا۔ بادبان میں بھری ہوئی ہوا کشتی کو آہستہ آہستہ چلا رہی تھی۔

مَیں نے گنیش کو آواز دی۔ وہ مسکرانے لگا۔ "تم چہرو کے بارے میں سوچ رہے ہو گے؟"

"ہاں"

"میرے دل میں بھی چہرو ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کا نام گلی چہر تھا اور وہ ایک بہت غریب لڑکی تھی۔ سب لوگ اُسے چہرو کہتے تھے۔ قحط میں اُس کے ماں باپ، بھائی بہن، سب مر گئے۔ وہ اکیلی رہ گئی۔ اُس زمانے میں تو بھیک بھی نہیں ملتی تھی۔ فاقے کرنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کے سوا چارہ ہی کیا تھا لیکن چہرو خوب صورت تھی۔ اُس کی ایک سپاہی سے آشنائی ہو گئی۔ کوئی پنجابی سپاہی تھا اور وہ دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ ملنے کی یہ انوکھی ترکیب نکالی۔ رات کے بارہ بجے دونوں ننگے ہو جاتے تھے اور سروں پر آگ کی تھالی بھر کر رکھ لیتے تھے اور اُس گاؤں میں چلے جاتے تھے جہاں کسانوں کی لاشیں سڑ رہی تھیں۔"

لیکن وہ اس طرح کیوں ملتے تھے؟"

مَیں نے بھی چہرو سے یہی سوال کیا کہ تو نے یہ کیا تماشہ کیا ہے۔ رات کے بارہ بجے ننگی ہو کر چڑیلوں کی طرح کیوں نکلتی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ لوگ سچ مچ مجھے چڑیل اور میرے سپاہی کو بھوت سمجھیں۔ مَیں نے ...

ساتھ نکاح کیوں نہیں کر لیتی؟ تو اُس نے بتایا کہ وہ ایک بار اپنے سپاہی کے ساتھ کیمپ گئی تھی تو فوجی افسروں نے اُسے دیکھ لیا اور سپاہی کو سزا دی۔ پھر فوجی ٹھیکیداروں نے اُس کے پاس آدمی بھیجے کہ چل تجھے بڑے افسروں کے پاس لے چلیں گے لیکن وہ بڑے افسروں کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ کوئی بیسوا تھوڑی تھی۔ اُسے سچ مچ اپنے سپاہی سے محبت تھی۔ اس لئے رات کے بارہ بجے جب تمام گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے گھروں میں چھپ جاتے تھے تو وہ اپنے سر پر آگ سے بھری ہوئی تھال رکھ کے نکلتی تھی اور اپنے سپاہی سے مل کر واپس چلی جاتی تھی۔ سپاہی اُس کا کھانے اور رہنے کا خرچ دیتا تھا۔ جب مَیں نے یہ سنا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ مَیں نے اُس سے معافی مانگی لیکن اُس نے کہا کہ "اب مَیں اپنے سپاہی سے نفرت کرنے لگی ہوں" مَیں نے پوچھا۔ "کیوں؟" تو بولی کہ "وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ڈرپوک کہیں کا؟ وہ تو کہو کہ تم تھے اور تم مجھے جانتے ہو۔ کوئی اور ہوتا تو کیا ہوتا؟ اور تم نے بھی مجھے ننگا دیکھا ہے۔ بتاؤ تمہیں میرا جسم دیکھنے کا کیا حق ہے؟ مَیں تمہاری بیوی نہیں ہوں تمہاری معشوقہ نہیں ہوں۔ تم نے میرے جسم پر اپنی نگاہیں کیسے ڈالیں؟" یہ کہہ کر چہرو مجھ سے لڑنے لگی۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور اُس نے اپنے خوبصورت بالوں سے اپنا سینہ چھپا لیا تھا۔ مَیں نے کہا چلو مَیں تم کو گھر پہنچا آؤں لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ "کیا سمجھتے ہو مَیں ڈرتی ہوں مَیں خود چلی جاؤں گی۔ جہاں میرا دل چاہے گا وہاں جاؤں گی۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔" وہ دیر تک کھڑی ہوئی سانس لیتی رہی اور پھر خود ہی بڑی نرمی سے بولی۔ "تم کسی سے کہو گے تو نہیں؟" مَیں نے وعدہ کیا تو وہ مسکرائی۔ اس سے میری ہمت بڑھی۔ اور مَیں نے کہا۔ "چہرو مَیں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ مجھ سے بیاہ کرو گی؟" وہ بہت زور سے ہنسی قہقہہ مار کر جس کی آواز سن کر کتے پھر رونے لگے۔ اور گدھ اپنے پَر پھڑ پھڑانے لگے۔ مَیں نے کہا۔ "چہرو مَیں سچ مچ تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ دو برس سے مَیں تمہارا دیوانہ ہوں"۔

چہرو پھر سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی۔ "تم نے پہلا کیوں نہیں بیاہ کی بات کی۔ مجھے دو وقت کھانا دے سکو گے؟ میری بہن دس برس کی بیاہی تھی لیکن اُس کے میاں نے اُسے ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا۔ میری ماں نے مرنے سے پہلے اپنے تین برس کے بیٹے کو گھر سے دھکیل دیا، ایک مٹھی بھر چاول کے لئے میرا باپ گلا گھونٹنا چاہتا تھا۔ بتاؤ تم مجھ سے بیاہ کر کے مچھلی اور بھات کہاں سے دو گے؟ آج تم نے مجھے ننگا دیکھا ہے تو تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی لیکن اس محبت سے تم چاول نہیں خرید سکو گے۔ چاول۔۔۔ چاول۔۔۔ دو روپیہ سیر بک رہا ہے۔۔۔ دو روپیہ سیر۔" یہ کہتی ہوئی وہ چلی گئی۔ چہرو چلی گئی اور اُس کا خوبصورت جسم اندھیرے میں کھو گیا۔ میرے سامنے انگاروں کا ڈھیر پڑا تھا جو رفتہ رفتہ بجھتے جا رہے تھے۔ وہ راتوں رات کہیں نکل گئی اور آج تک واپس نہیں آئی۔ اس قصے کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ مَیں اپنے دل میں چہرو کی یاد لئے بیٹھا ہوں۔ جب بہت اُداس ہوتا ہوں تو کشتی لے کر دریا میں نکل جاتا ہوں۔ جسمانی محنت سے دل کا درد دُور ہو جاتا ہے۔"

گنیش تھوڑی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر خاموشی سے چپو چلانے لگا۔ اُس کا بوڑھا باپ خراٹے لے رہا تھا اور سمندر کی موجیں سسک رہی تھیں۔

مَیں بھی لیٹے لیٹے سو گیا۔ گنیش رات بھر اکیلا چپو چلاتا رہا۔ جب صبح میری آنکھ کھلی تو سورج نکل رہا تھا۔ سمندر کی موجیں ناچ ناچ کر گیت گا رہی تھیں۔ ہمارے پیچھے سبز رنگ کا زمردیں سمندر تھا اور سامنے سنہرے رنگ کا سمندر جس کے کنارے کوکس بازار کا دلکش ساحل پھیلا ہوا تھا۔ سپاری کے نازک درخت سر اُٹھائے کھڑے تھے جیسے ابھی سمندر سے نہا کر نکلے ہوں اور دھوپ میں اپنے بال سکھا رہے ہوں۔ دونوں ماہی گیر تیز تیز چپو چلا رہے تھے اور کشتی کوکس بازار کے ننھے سے دریا کے دہانے میں داخل ہو رہی تھی۔

اب ہم پتلے سے دریا کے اندر تھے اور ہمارے دونوں طرف کالے رنگ کی کیچڑ اور پھر سنہرے رنگ کا ساحل تھا۔ ایک طرف ہزاروں موٹریں اور توپیں کھڑی تھیں۔ دوسری طرف ہوائی اڈے پر سینکڑوں جہاز بڑی بڑی ٹڈیوں کی طرح اپنا سر اُٹھائے ہوئے کھڑے تھے۔ کئی جہاز سر پر منڈلا رہے تھے۔ جہاز توڑ توپیں اپنے دہانے آسمان کی طرف اُٹھائے ہوئے جاپانی جہازوں کا انتظار کر رہی تھیں اور بہت سے سپاہی، افسر اور حرد وردیت پر چل پھر رہے تھے۔ بیچ دریا میں لکڑی کا ایک پُل بنا ہوا تھا جس کے پاس کئی کشتیاں اور سمپانیں تیر رہی تھیں۔ ہماری کشتی بھی پُل سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

یکا یک گنیش کی زبان سے نکلا۔ "چھرو"

مَیں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ پُل پر ایک دبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی۔ اُس نے زرد مخمل کی پتلون اور سبز مخمل کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اُس کے کٹے ہوئے بال سمندر سے آنے والی ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ بھویں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں سورج کی کرنوں کی سی تیزی تھی۔ مَیں نے پھر نظر بھر کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے رخسار پاؤڈر اور رنگ سے گلابی ہو رہے تھے۔ اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ایک بڑی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی اور دا ہنے میں ایک فوجی بید تھا۔

اُس نے بید سے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بھدر لوک" اور اُس کی آنکھوں میں ایک وحشی چمک آ اُٹھی۔

بوڑھے ملاح نے جلدی سے کہا۔ "پرمٹ دکھاؤ۔"

مَیں نے جلدی سے پرمٹ نکالا اور کشتی میں کھڑے ہو کر چھرو کی طرف دیکھا لیکن اُس نے پرمٹ کی طرف دیکھا بھی نہیں اور مجھ سے کہا۔ "کشتی سے نیچے اُترو۔"

میں نے پُل پر چڑھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اُس نے اپنے بید سے ایک ٹھوکا دے کر کہا۔۔۔۔

چڑھو، کشتی سے اُترو۔"

لیکن نیچے سیاہ رنگ کی کیچڑ تھی مَیں حیران تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

گنیش نے کہا۔ "چھرو تو کتنی بدل گئی ہے؟ دیکھتی نہیں نیچے کتنا کیچڑ ہے۔"

"دیکھ رہی ہوں۔" چھرو نے گنیش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ اسے نیچے اُتارو۔ یہ بھدر لوک ہے اور بھدر لوک کو پُل پر چڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسے کیچڑ پر چلاؤ تاکہ اس کے سفید کپڑے لت پت ہو جائیں۔ جلدی کرو، دوسری کشتیاں آ رہی ہیں۔"

چھرو کی آواز میں ایک قسم کا وقار تھا۔ آنکھوں میں وہی وحشی چمک۔ گنیش اور بوڑھے ملاح کے چہروں پر پریشانی تھی۔ مَیں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا کئی فوجی کشتیاں آ رہی تھیں۔

مَیں کیچڑ میں چلنے کو تیار ہو گیا اور اپنے جوتے اُتارنے لگا۔ گنیش نے اپنے مضبوط بازوؤں کی جنبش سے میرا سارا سامان اُٹھا کر ساحل پر پھینک دیا۔ بوڑھے ملاح نے کہا۔ "چھرو! تو بڑی افسر ہو گئی ہے اور ہم سب کو بھول گئی ہے۔" پھر میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہ بھدر لوک نہیں ہیں۔ بمبئی سے آئے ہیں۔ غریبوں کی سیوا کرتے ہیں۔"

آخری جملہ سُن کر چھرو کو غصہ آ گیا۔ اُس کے ہونٹ تلخی سے اینٹھ گئے اور اُس نے اپنی وحشی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ "سب بھدر لوک ایک سے ہوتے ہیں اور غریبوں کی سیوا کرتے ہیں چاچا! مَیں تمہیں بھولی نہیں ہوں۔ اپنی ماں کی کوکھ کو بھی نہیں بھولی ہوں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مَیں کون ہوں؟ تم مچھیرے ہو اور مَیں کسان کی لڑکی ہوں۔ مَیں ہر بھدر لوک کو اس کیچڑ میں چلاتی ہوں۔ تم نے اسے سمندر میں ڈبو کیوں نہیں دیا۔ بھدر لوک کہیں کا؟"

مَیں اتنی دیر میں کیچڑ میں اُتر چکا تھا۔ اور جیب سے روپے نکال کر کشتی کا کرایہ ادا کر رہا تھا۔ میرے پیر گھٹنوں گھٹنوں تک سیاہ کیچڑ میں دھنس گئے تھے۔ پُل پر کھڑی چھرو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اور گنیش اُسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جب مَیں کیچڑ سے گزر کر ساحل پر پہنچا تو چھرو کا قہقہہ بلند ہوا۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر گنیش کو پُل کے اُوپر چڑھا لیا اور اُس سے ہنس ہنس کر آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرنے لگی۔

گنیش نے پکار کر باپ سے کہا۔ "بابا! تم جاؤ، مَیں یہیں رہوں گا۔"

بوڑھے ملاح نے ملامت بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا اور بولا۔ "پاگل مت بن بیٹا۔ چھرو تیرے کام کی نہیں رہ گئی ہے۔" چھرو نے مسکرا کر گنیش کے رخسار پر اپنی ہتھیلی سے ایک ہلکی سی تھپکی دی اور اُسے سہارا دے کر پُل سے نیچے کشتی میں اُتارنے لگی۔ گنیش نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کود کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں چپو اُٹھا لئے

بھدر لوک: بنگالی زبان میں درمیانی طبقے کے سفید پوش آدمی کو بھدر لوک کہتے ہیں

اور انہیں تیز تیز چلاتا ہوا کشتی کو نکال لے گیا۔ چیرو کی نگاہیں دور تک اُس کا تعاقب کرتی رہیں۔

مَیں ایک میلے تولیے سے اپنے پیروں کی کیچڑ پونچھ رہا تھا کہ چیرو ٹیلے سے اتر کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی اور پوچھنے لگی۔ ''تم کہاں سے آئے ہو؟ بمبئی سے؟''

''جہنم سے'' مَیں نے جل کر جواب دیا۔

''مَیں کبھی کبھی بھدر لوک کو پیٹ بھی دیتی ہوں اپنے بید سے۔'' چیرو ونجی کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

مَیں نے گردن اُٹھا کر اُس عجیب و غریب لڑکی کی طرف دیکھا اُس کی آنکھوں کی چمک میں بلا کا جادو تھا۔ اور پیشانی پر نفرت اور شرارت سے پڑی ہوئی ہلکی ہلکی شکنیں اُس کے خوبصورت بیضاوی چہرے کی معصومیت وقار کا اضافہ تھی۔ مَیں اُس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ گنیش کی کہانی نے میرا شوق اور بڑھا دیا تھا لیکن چیرو کے تیور بڑے خطرناک تھے اور مجھے زبان کھولنے کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے۔

''مجھے گالی کیوں دیتی ہو؟ مَیں بھدر لوک نہیں ہوں۔'' مَیں نے جھجکتے ہوئے کہا

''اچھا تم بھدر لوک گالی سمجھتے ہو؟ وہ ہنسی۔ ''مگر تمہارے کپڑے تو ویسے ہی ہیں۔''

''تمہارے کپڑے؟''

''یہ تو مَیں نے بھدر لوکوں کو جلانے کے لئے پہنے ہیں۔'' مجھے اچھے تھوڑی لگتے ہیں''

''اور چہرے پر رنگ جو تم نے پوت رکھا ہے؟''

''روزی کمانے کے لئے۔''

مَیں اُس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ یہ بے حیائی تھی؟ بے باکی تھی یا انتقام کا جذبہ؟ مَیں کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

''اچھا تم بھدر لوک نہیں ہو اور غریبوں کی سیوا کرتے ہو؟ اُس نے بڑے طنز سے پوچھا۔'' کالا بازار کرتے ہو یا لڑکیاں بیچتے ہو۔''

اُس کے ماتھے کی شکنیں اور گہری ہو گئیں اور تیوروں پر بل پڑ گئے۔ ہونٹوں پر ایک تلخ سی ہنسی آئی اور وہ مجھے نفرت اور حقارت سے دیکھتی ہوئی چلی گئی اور مَیں سوچتا رہ گیا کہ یہ کیسی لڑکی ہے؟ جس میں کسانوں کی بو باس تک باقی نہیں رہ گئی ہے۔

یہ بغاوت اور انتقام نہیں ہے۔ صرف نراج اور آوارگی ہے۔ یہ پارے سے بنی ہوئی لڑکی جس کی رگوں میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں خود اپنی ذات سے انتقام لے رہی ہے۔ اپنی فطرت اور اپنی نسوانیت سے بغاوت کر رہی ہے۔ جیسے سمندر کی کوئی بے تاب موج طوفان کی آغوش سے نکل کر ساحل پر آ پڑی ہو اور اپنے تھپیڑے سے خشک ریت کو سمندر بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ننھے خاک کے ذرے اُسے اپنا رزق سمجھ کر ایک ایک گھونٹ کر کے پی جائیں گے۔

کوکس بازار میں ہر ایک کی زبان پر چیرو منجھی کا نام تھا۔ چیرو چوبیس برس کی کسان لڑکی تھی جس نے مزدوری کرتے کرتے مزدوروں کی سرداری حاصل کر لی تھی اور اب منجھی کہلاتی تھی۔ جس نے تھامی اور بازو اور کچھا ترک کر کے انگریزی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ جو اپنے حسن کی وجہ سے فوجی افسروں کے منہ چڑھی ہوئی تھی، جو کسی سفید پوش آدمی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جو ہر ایک کی بے عزتی کر دیتی تھی۔ جو درجنوں شریف آدمیوں کو کیچڑ میں چلا چکی تھی۔ عورتیں خاص طور سے اُس سے نفرت کرتی تھیں لیکن مرد کچھ للچائے ہوئے لہجے میں اُس کی مذمت کرتے تھے۔

دوسرے دن مَیں نے اُسے ایک جیپ میں گزرتے دیکھا۔ اُس کی گود میں پھولوں کا ایک بڑا سا گچھا رکھا تھا۔

تیسرے دن وہ مجھے ایک چرنگ کے پاس کھڑی ہوئی مل گئی اور مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔

مَیں نے کہا۔ ''کیسی ہو چیرو؟''

''کیسی ہوں؟'' اُس کی آنکھیں پھر چمک اُٹھیں ''اچھا یہ بتاؤ مَیں پتلون اور جیکٹ پہن کر کیسی لگتی ہوں؟''

''بالکل انگلستان کی شہزادی معلوم ہوتی ہو۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اُس کے دونوں رخساروں میں دو چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے اور خوبصورت دانتوں کی قطار چمکنے لگی۔ اتنے میں ایک فوجی ٹرک آیا۔ چیرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور اُچک کر اُس میں بیٹھ گئی۔ جب ٹرک چلا تو کھڑی تھی اور اُس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے اور بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ گاڑی کے پہیوں سے اُڑنے والی سرخ دھول نے جو سپاری کے درختوں تک بلند ہو گئی تھی، اُسے ڈھانپ لیا۔

شام کو سارے کوکس بازار میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہر شخص یہ کہہ رہا تھا کہ چیرو کو یہاں سے نکال دو۔ اُس نے رامو روڈ پر ٹرک سے اُتر کر کسی شریف آدمی کو مارتے مارتے لہولہان کر دیا تھا۔ ساری بستی اُس کے خلاف ہو گئی تھی لیکن فوج کا خوف انہیں زبانی احتجاج سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔

رات کو خبر آئی کہ فوجی افسروں نے اُسے سزا دی ہے اور اب وہ ساحل کے علاقے سے باہر بستی میں نہیں نکلنے پائے گی۔ لوگ اطمینان کا سانس لے کر سو گئے اور پھر چیرو کے افسانے مزے لے لے کر بیان کرنے لگے

صبح ساحل پر چیرو مزدوروں کی ایک ٹولی کو کچھ ہدایت دے رہی تھی۔ اُس وقت سمندر میں پانی چڑھ رہا تھا اور لہریں دوڑ دوڑ کر ساحل کا منہ چوم رہی تھیں۔ بڑی بڑی سوگز لمبی لہریں روئی کے گالوں کی طرح بہتی ہوئی اور اپنی چاندی اُچھالتی ہوئی آتی تھیں اور ریت پر جھاگ چھوڑ کر چلی جاتی تھیں۔ چیرو ایک نیلے رنگ کا چست لباس پہنے ہوئے تھی اور ابھی ابھی سمندر سے نہا کر نکلی تھی۔ اُس کے دونوں بازو، آدھی رانیں اور پنڈلیاں ننگی تھیں جن پر سمندر کے نمک کا باریک

تھامی: رنگین دھوتی کو کہتے ہیں جو چٹ گاؤں کی مسلمان عورتیں باندھتی ہیں۔ بازو چولی یا انگیا کو کہتے ہیں اور کچھا دوپٹے کو۔

چرنگ: لکڑی کا بنا ہوا ایک طرح کا جھونپڑا جو بیلک کے ستانے اور بے گھر لوگوں کے رات بسر کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ (رین بسیرا)

ہوا وہ جما ہوا تھا۔ بھیگے ہوئے بال اُلجھے ہوئے تھے اور چہرے کا گندمی رنگ سمندر کے نمکین پانی [illegible] نکل کر نکھر آیا تھا۔ میں نے پہلی بار اُس کے سڈول جسم کی دلکشی کا اندازہ کیا۔

وہ مجھے دیکھ کر ایک بار تن گئی اور اُس کا سینہ سمندر کی کسی لہر کی طرح بلند ہو گیا۔ "کیا تم بھی مزدوری چاہتے ہو؟ میں نے کل شام تمہاری ہی طرح کے ایک بھدر لوک کو پیٹا تھا جو مجھے سڑک کے کنارے کھڑا گھور رہا تھا۔ کیا تمہاری بھی شامت آئی ہے؟"

"تمہیں بھدر لوک سے اتنی نفرت کیوں ہے؟"

"تم سے مطلب؟ تم ہوتے کون ہو؟"

"میں کیسے بتاؤں جب تم سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی ہو؟"

میں حیران رہ گیا۔ اُس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دوڑتی ہوئی بالکل ساحل کے کنارے پہنچ گئی جہاں سمندر کی موجیں ریت کا منہ دھو رہی تھیں۔ وہ بھیگی ہوئی ریت پر بیٹھ گئی۔ اپنے پیر سمندر کی طرف پھیلا دیئے اور کہنیاں نرم مخملیں ریت پر ٹیک دیں۔

"مجھے ایک بات بتاؤ گے؟" اُس نے ایسی محبت سے پوچھا جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔

"پوچھو؟"

"گنیش نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"ہاں وہ تم سے محبت کرتا ہے۔"

اُس کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا۔ اور آنکھوں میں بے انتہا نرمی اور لطافت آ گئی جیسے کسی نے جادو کے زور سے اُس کی وحشت اور خشونت کو بدل دیا ہو اور وہ بے انتہا حسین ہو گئی۔ سمندر کی موجیں اُس کے پیروں کو چوم رہی تھیں اور ہوا کی غیر مرئی انگلیاں اُس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

وہ بڑی دیر تک اپنے دونوں ہاتھوں سے ریت کے گھروندے بناتی رہی اور بگاڑتی رہی۔ مجھے اس ریت سے بڑی محبت ہے۔ میں اسی سے پیدا ہوئی ہوں۔ گنیش بھی اسی سے پیدا ہوا ہے۔ میں اکثر آ کر اس ریت کی گود میں لیٹ جاتی ہوں اور گھنٹوں خواب دیکھتی رہتی ہوں۔ بڑے بڑے دھان کے کھیت کاٹ رہی ہوں اور دھان کی بالیاں سمیٹ سمیٹ کر کھلیان لگا رہی ہوں۔ میں کٹے ہوئے کھیتوں کی منڈیروں پر گاتی ہوئی گھوم رہی ہوں، زمین گا رہی ہے، آسمان رہا ہے، ہوائیں گا رہی ہیں اور دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے جس میں گنیش بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے جال میں بڑی بڑی مچھلیاں تڑپ رہی ہیں جنہیں دیکھ کر چھوٹے چھوٹے بچے تالیاں بجا بجا کر ہنس رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں۔

وہ چپ ہوگئی۔ اور ریت کے گھروندے کو اپنی مٹھی میں اُٹھا لیا۔

"مَیں گنیش سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن اُس کا باپ موجود تھا۔ بڈھا کھوسٹ کہتا ہے کہ مَیں گنیش کے قابل نہیں رہ گئی ہوں اور وہ اپنے باپ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ بزدل کہیں کا۔ دیکھو نا مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔" اُس نے آخری جملہ بچوں کی طرح کہا۔

"مگر تم خود جوا سے چھوڑ کر چلی آئیں؟"

"محبت کرنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے بزدل آدمیوں سے بڑی نفرت ہے۔ مَیں ایسے آدمی پسند کرتی ہوں جو ہنستے ہوئے موت کے منہ میں چلے جائیں۔ دیکھو سمندر میں طوفان آ رہا ہے۔ پانی گزوں اُچھل رہا ہے۔ اگر مَیں گنیش سے اس وقت کشتی کھینے کے لئے کہوں تو وہ کبھی تیار نہ ہوگا۔ کنارے کھڑا ہوا جال پھینکے گا۔ مچھیرا ہے نا مچھیرا؟ مجھے بھی مچھلی کی طرح پکڑنا چاہتا ہے۔ بتاؤ مَیں مچھلی تو نہیں ہوں۔ بولو کیا مَیں مچھلی ہوں؟"

"نہیں"

"مَیں مچھلی نہیں ہوں۔ مَیں عورت ہوں چہرو ہوں۔ گل چہرہ ہے میرا نام۔ مجھے کوئی مچھلی کی طرح نہیں پکڑ سکتا۔"

ایک مزدور دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ "چہرو بچّھی! چہرو بچّھی! تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔"

"کہہ دو نہیں آتی"

"وہ بوتھی ڈانگ جا رہے ہیں۔ موٹر میں بیٹھے ہیں۔"

"بس کہہ دو نہیں آتی۔ مَیں بوتھی ڈانگ نہیں جاؤں گی۔ مَیں سمندر میں جا رہی ہوں۔"

مزدور چلا گیا۔ مَیں نے پوچھا۔ "کس نے بلایا ہے؟"

"کوئی نہیں۔ وہ لال منہ کا بندر ہے۔ اُس کا تبادلہ ہو گیا ہے اور مجھے بوتھی ڈانگ لے جانا چاہتا ہے۔ مَیں نہیں جاتی۔ اُس کے جیسے ہزاروں یہاں ملیں گے۔ کوئی مَیں ڈرتی تھوڑی ہوں۔ کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔ آؤ۔ طوفان میں کشتی چلائیں بڑا مزہ آئے گا۔"

مَیں کہنا چاہتا تھا کہ کشتی اُلٹ جائے گی لیکن اس ڈر سے چپ رہا کہ وہ مجھے بزدل سمجھے گی۔

اُس نے ایک نازک سی سمپان کا انتخاب کیا۔ اور پُل پر چڑھ کر اُس میں کود گئی۔

مَیں نے پوچھا۔ "مَیں بھدر لوک ہوں۔ کیا کیچڑ میں چل کر آؤں؟"

"پُل سے ہو کر آ جاؤ۔ تم بھدر لوک نہیں ہو۔ جب تم میرے کہنے سے بغیر احتجاج کئے کیچڑ میں چلنے کو تیار ہو گئے تب ہی سمجھ گئی تھی کہ تم بھدر لوک نہیں ہو۔"

اُس نے چپو سنبھال لئے اور سمپان کھینے لگی۔ اُس کے ہاتھ بڑی مشاقی سے چل رہے تھے۔ جب سمندر کا

پانی چڑھ رہا ہو، اُس وقت کشتی کھینا مذاق نہیں ہے۔ میرا دل کانپ رہا تھا کہ کہیں سمپان اُلٹ نہ جائے لیکن چھرو بڑے اطمینان سے چپو چلا رہی تھی۔

"تمہیں چپو چلانا آتا ہے؟"

"ہاں بمبئی میں سمندر میں کشتی کھے چکا ہوں۔"

"اور تیرنا بھی آتا ہے؟"

"ہاں کچھ یوں ہی سا۔"

"پھر ڈر کی کوئی بات نہیں۔" یہ کہہ کر وہ چپوؤں کو اور زیادہ تیز چلانے لگی۔

کھلا ہوا سمندر جوش کھائے پانی کی طرح اُبل رہا تھا اور ہماری سمپان غصے میں بھری ہوئی موجوں پر ایک سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ موجوں کے تھپیڑے بڑے سخت تھے اور سمپان بُری طرح ڈگمگانے لگی تھی۔ ایک موج کشتی کے اُوپر سے گزر کر ہمیں بھگو گئی۔

مَیں نے کہا۔ "چپو مجھے دے دو۔"

"تم مجھ سے اچھے چپو نہیں چلا سکتے۔"

"تم سمپان واپس لے چلو۔ اُلٹ جائے گی۔"

"تم ڈر رہے ہو؟"

مَیں نے لپک کر چپو پکڑ لئے۔ چھرو نے انہیں میرے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ایک بار سمپان پھرکی کی طرح ناچ اُٹھی اور ایک بڑی سی غضبناک موج نے آکر اُسے دس بارہ فٹ اُوپر اُٹھالیا اور ایک زبردست جھٹکے سے ساحل پر پھینک دیا۔ ایک دوسری موج ہمارے اُوپر سے گزر گئی۔ اور سمندر غرانے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ چھرو کہاں گری اور مَیں کہاں گرا، جب موج ہمارے اُوپر سے گزر چکی تو مَیں ریت پر پڑا ہوا تھا اور چھرو مجھ سے کئی گز دور کھڑی ہوئی تھی اور کشتی موجوں کے تھپیڑوں میں تھی۔ ایک چپو ریت میں دھنسا ہوا تھا اور دوسرا آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے ہوئے فریاد کر رہا تھا۔ اُس نے پکار کر پوچھا۔ "چوٹ تو نہیں لگی؟"

"نہیں ریت بہت نرم ہے۔" مَیں نے جواب دیا حالانکہ میرے گھٹنے اور کہنیاں چھل گئی تھیں۔ چھرو پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی اس دنیا کو اسی طرح اُٹھا کر پھینک دے۔ جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو مَیں خوشی سے دیوانی ہو جاتی ہوں اور مَیں سوچتی ہوں یہ طوفان بڑھتا جائے گا، یہاں تک کہ آسمان اور زمین کے بیچ میں صرف سمندر ہی سمندر ہوگا۔ اس کی نیلی موجوں میں ہم تم گنیش، چاند، سورج، ستارے سب ڈوب جائیں گے۔"

مَیں نے کہا۔ "تم پگلی ہو چمپا!"

"ہاں مَیں بھی پگلی ہوں۔ تم بھی پگلے ہو جو میرے پاس بیٹھے ہو۔ گنیش بھی پگلا ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہے اور وہ لاکھوں کسان اور مچھیرے سب پگلے تھے جو چار دانہ چاول کے لئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ صرف بھدر لوک پگلا نہیں ہے۔ باقی سب پگلے ہیں۔"

"تمہیں بھدر لوک سے اتنی نفرت کیوں ہے؟" مَیں نے موقع پا کر پھر پوچھا۔

چمپا ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اُس کی نظروں کی وحشی چمک اُس کی آنکھوں میں واپس آ گئی۔

"جانتے ہو مَیں کیا کرتی ہوں؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔ "مَیں اپنا جسم بیچتی ہوں۔ اجنبی آدمی، تم پہلے شخص ہو جس سے مَیں اس طرح باتیں کر رہی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں مَیں بہت خوبصورت ہوں۔ مجھے بھی اپنی صورت اور اپنا جسم بہت اچھا لگتا ہے۔ اور مَیں اسے بیچتی ہوں۔ ایک رات کے تیس روپے لیتی ہوں اور فوجی افسر مجھے اس سے زیادہ روپے دیتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو گے کہ یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ نہیں مَیں تو کسان کی بیٹی ہوں۔ دھرتی کی طرح پاک۔ مَیں نے یہ پیشہ کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن جب میرے ماں باپ مر گئے اور سارا گاؤں اُجڑ گیا اور مَیں ہزاروں لاشوں کے بیچ میں اکیلی رہ گئی اور لاشوں کو نوچ نوچ کر کھانے والے کتے مجھے اپنے دانت پیستے تھے تو گیارہ دن کے فاقوں کے بعد مَیں لڑکھڑاتی ہوئی اپنے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئی، مٹھی بھر چاول بھیک مانگنے کے لئے۔ وہ چاول کا دھان مَیں نے پچھلی فصل میں اپنے ہاتھوں سے کاٹا تھا۔ زمیندار کے گھر میں چاول بھرا ہوا تھا۔ لاشوں کی طرح بوریاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ اس کا بیوپار کرتا تھا۔ کالے بازار کا بیوپار جہاں وہ ہمارے کھیتوں کا پیدا کیا ہوا چاول ساٹھ روپے من بیچ رہا تھا۔ مَیں گیارہ دن کی بھوکی تھی اور دنیا میں کوئی سہارا نہیں تھا۔ کئی بار مَیں نے سڑی ہوئی لاشوں کا گوشت کھانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گھن آ گئی۔ مَیں نے زمیندار سے مٹھی بھر چاول مانگے۔ اُس نے پوچھا کیا قیمت دوگی؟ مگر میرے پاس کیا تھا۔ مَیں نے کہا خیرات دے دو۔ اُس نے کہا مَیں کوئی خیراتی اسکول اور یتیم خانے چلا رہا ہوں؟ چپٹ گاؤں میں میرا خیراتی لنگر خانہ چل رہا ہے۔ آخر کہاں تک خیرات دوں؟ مَیں نے پوچھا پھر مَیں کیا کروں؟ چپٹ گاؤں تک جانے کی سکت نہیں ہے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، اُس نے کہا۔ "تمہارے پاس جوانی ہے، خوبصورت چہرہ ہے۔ بھرا ہوا جسم ہے۔ اِسے کہیں جا کر بیچ آؤ۔"

لیکن میرا جسم چاول کی بوری تو نہیں تھا جو مَیں اُسے بیچ دیتی۔ مَیں وہاں سے بھاگ آئی۔ لیکن دو دن کے بعد جب مَیں تیرہ دن کی بھوکی تھی، مَیں اپنا جسم لاش کی طرح گھسیٹ کر زمیندار کے پاس لے گئی۔ مَیں نے کہا۔ مَیں اپنا جسم مٹھی بھر چاول میں بیچنے آئی ہوں۔ اِسے خریدو گے؟ وہ خفا ہو گیا۔ بھدر لوک بڑے عزت والے ہوتے ہیں۔ اُس نے کہا مَیں کوئی دلال ہوں؟ مَیں نے کہا۔ مَیں اپنا جسم کہاں بیچنے جاؤں؟ مجھ سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔ زمیندار نے اپنے گھر

سے نکال دیا۔ اُس کا بیٹا جو مجھے گھسیٹ کر باہر لایا تھا، سیر بھر چاول میں میرا جسم لے گیا۔ تب سے مَیں محسوس کرتی ہوں کہ میرا جسم میرے پاس نہیں ہے۔ میری جوانی نہیں ہے۔ میری خوبصورتی نہیں ہے۔ یہ سب تو سیر بھر کچے چاول میں بک چکی ہیں۔ اس کے بعد مجھے ایک سپاہی ملا۔ وہ ڈرپوک تھا۔ پھر گنیش ملا۔ وہ بھی بزدل نکلا۔ اور اب کوکس بازار میں میری حکومت ہے۔ یہاں جتنے آدمی ہیں سب بزدل ہیں۔ یہاں بہت سے بھدر لوگ آتے ہیں۔ اپنا بیوپار کرنے کے لئے۔ فوجی ٹھیکہ لینے کے لئے۔ مَیں انہیں کیچڑ میں چلاتی ہوں۔ کبھی کبھی کسی کو پیٹ بھی دیتی ہوں۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اُلٹ کر میرے ایک تھپڑ مار دے۔ انہیں روپے کی ہوس اور لالچ نے بزدل بنا دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مَیں فوجی افسروں کے منہ چڑھی ہوں اور وہ مجھے تھپڑ مار کر انہیں ناراض نہیں کر سکتے۔ انہیں روپیہ کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے گاؤں کی بہو بیٹیاں لا کر فوجی افسروں کے ہاتھ بیچ جاتے ہیں۔ تم سمندر کے راستے واپس مت جانا اراکان روڈ سے ہو کر جانا۔ چٹ گاؤں سے اسی میل دور ہے لیکن یہاں سے چٹ گاؤں تک تین لاکھ عورتیں ہیں جو میری طرح پیشہ کر رہی ہیں اور اُن کی کمائی بھدر لوگ کھا رہے ہیں۔ تم بھدر لوگ نہیں ہو۔ اس لئے میری بات سمجھ جاؤ گے۔ وہ کہتے ہیں چہرو مانجھی بدمعاش ہے، چہرو مانجھی آوارہ ہے، چہرو مانجھی بیسوا ہے۔ لیکن بھدر لوگ مجھ سے زیادہ آوارہ ہیں، وہ سب بیسوا ہیں، دلال ہیں۔ اُن کی عزت، اُن کا مذہب، اُن کا دیوتا سب کچھ روپیہ ہے۔ اس کے لئے وہ اپنی ماؤں کو بیچ ڈالیں، اپنی بیٹیوں کو بیچ ڈالیں۔ اُن کی عزت اور شرافت صرف اُن کے کپڑوں میں ہے۔ کیا بمبئی میں بھی بھدر لوگ ہوتے ہیں؟"

"بھدر لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں" مَیں نے جواب دیا

"پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے ان سے بڑی نفرت ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

سورج کی کرنیں بہت تیز ہو گئی تھیں۔ چہرو مانجھی کے گندمی رنگ چہرے پر پسینے کے موتی چمک رہے تھے۔ سمندر کی موجیں اُس کے قدم چوم رہی تھیں اور ہوا کی غیر مرئی انگلیاں اُس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور جیسے کوئی غنودگی کے عالم میں باتیں کر رہا ہو، زیرِ لب آہستہ آہستہ کہا:

'جب یہاں سے جانا تو گنیش سے کہہ دینا کہ مَیں اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔ مَیں اِس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔

☆☆☆

(لکھنؤ کی پانچ راتیں، انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کے جلسے میں پڑھا گیا، ماہنامہ افکار کراچی سردار جعفری نمبر نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء)

نصرت جبیں

سردار جعفری بحیثیت نثر نگار

ادبی اظہار کی دو بڑی واضح شکلیں ہیں ایک نثر اور دوسری شاعری۔ شاعری میں براہ راست بات نہ کہہ کر اشاروں اور کنایوں میں کہی جاتی ہے۔ لیکن نثر کا دائرہ اس سے مختلف ہے۔ نثر ایک عام چیز ہے، جس کو ہر شخص استعمال کرتا ہے۔ انسان ابتدائے آفرینش سے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرنے لے لئے یا اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے نثر سے کام لیتا رہا ہے۔ نثر کا تعلق چونکہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے ہے اس لیے اس کے بے شمار موضوعات ہیں اور تمام موضوعات کے لیے ایک ہی انداز نہیں ہے بلکہ اپنے میدان کی وسعت اور موضوعات کے تنوع اور رنگارنگی کے لحاظ سے ہر موضوع اور ہر مقصد کی وضاحت کے لیے نثر کا مخصوص اور منفرد لہجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعی اعتبار سے نثر کو مختلف ناموں اور قسموں میں بانٹ سکتے ہیں۔ (۱) بول چال کی نثر (۲) علمی نثر (۳) ادبی نثر۔

بول چال کی نثر جذبات وخیالات کی ترسیل کا کام انجام دیتی ہے۔ عام معنوں میں اس کو عوامی بولی کے نام سے پکارا جا سکتا ہے۔ اس نثر میں الفاظ سادہ طریقہ پر ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس میں خیال کی بلندی اور فکر کی گہرائی اس حد تک نہیں ہوتی کہ بات کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنادے۔ علمی نثر نثر کی بہت سادہ اور صاف شکل ہے۔ اس کے ذریعہ علوم وفنون کی اشاعت ہوتی ہے۔ اس کا کام معلومات بہم پہنچانا ہے اس لیے اس کو معلوماتی نثر بھی کہا جا سکتا ہے اور خالص نثر بھی۔ ادبی نثر نثر کی ایک اہم مخصوص اور اعلیٰ قسم ہے، جس کا تعلق براہ راست ادب سے ہے۔ یہ عام طور پر اعلیٰ خیالات کی حامل ہوتی ہے۔ اس میں بیان کی پوری صلاحیتیں اور ذہن وفکر کو متاثر کرنے اور لطافت بخشنے کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ اپنی ایمائیت، تخیل، ابہام اور زور بیاں جیسی متعدد خصوصیات کے ذریعہ اپنی پہچان کراتی ہے۔ ادبی نثر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک خالص ادبی نثر جس کو سادہ نثر بھی کہتے ہیں اور دوسری تخلیقی ادبی نثر جس میں افسانہ، ناول، انشائیہ اور اسی نوع کی دوسری اصناف نثر بھی شامل ہیں۔ سادہ ادبی نثر میں تحقیق، تنقید اور تجزیہ کی زبان شامل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ رنگینی بیاں جذباتی اظہار اور حسن آفرینی سے مبرا ہو مگر لفظوں کا اچھا استعمال، جملوں کی صحیح ترتیب، زبان کا فطری لوچ اور آہنگ اس میں بھی ہونا ضروری ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کی آمیزش سے سادہ ادبی نثر وجود میں آتی ہے۔ مگر اعلیٰ ادبی نثر کے لیے حسن آفرینی، جمال اور جذبہ بھی ضروری ہے۔ بشرطیکہ لہجہ منطق ودلالت سے بھرپور ہو۔ اُردو نثر کی بھی صورتیں ہیں جس کو ہر ادب اختیار کرتا ہے اور جس کی تشکیل وترقی میں مختلف تحریکات نے

اہم خدمات انجام دی ہیں۔

علی سردار جعفری کثیر الجہات فنی شخصیت کے حامل تھے۔ شعر وادب کے علاوہ دیگر فنون کی ترقی اور فروغ کے لیے بھی اُن کی تخلیقی اور ترغیباتی سرگرمیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ادب وفن کے ساتھ ساتھ وہ صحافت اور سیاست کے میدان میں بھی سرگرم عمل رہے۔ نظم ونثر دونوں میں اُن کا ادبی اثاثہ اور عملی زندگی میں اُن کا کام بہت گراں مایہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تعداد کے اعتبار سے اُن کی نثری تصانیف شعری تصانیف سے کم ہیں لیکن اُن کے مضامین اور تنقیدی کتابیں اس بات کی شاہد ہیں کہ اُن کی نثری تحریریں نہ صرف اُن کے زمانے کی علمی، ادبی اور سماج صورت حال کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ مصنف کے تنقیدی اور فکری شعور اور بصیرت کی بھی غماز ہیں۔

سردار جعفری کے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا تھا۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہی افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے جن میں بیشتر ضائع ہو گئے اور چند جو باقی بچے وہ حلقۂ ادب لکھنؤ کی توجہ سے ۱۹۳۸ء میں "منزل" کے نام سے منظر عام پر آئے۔ اُس دور میں پہلی بار ادب کو بالراست انداز میں زندگی کے ساتھ ساتھ لگ کر چلنے کی راہوں پر ڈالا گیا تھا۔ چنانچہ اُس دور کی شاعری، ناول نویسی، افسانہ نگاری، رپورتاژ وغیرہ تمام اصناف ادب وشعر کے مواد کا تنوع دراصل زندگی کا سچا اور زندہ احاطہ تھا۔ "حسن بیاں کی خاطر بڑھا بھی لیتے ہیں زیب داستاں کے لیے" تو بالکل الگ ہی بات ہے۔ البتہ یہ ادب صرف اور محض زیب داستاں کی خاطر ہوائیاں چھوڑنے والا ادب نہیں تھا، یہ نظریاتی ادب تھا جو آج بھی ہے اور جس کی بنیاد پریم چند کہ اس مقولہ پر رکھی گئی کہ "ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا"۔ یہ حسن کا معیار کیسے بدلے گا اس کی وضاحت بھی انہوں نے اپنے خطبے میں کر دی تھی۔

سردار جعفری نے اپنی تخلیقات میں اس معیارِ حسن کو اپنا مطمحِ نظر بنایا اس لیے اُن کے افسانوں میں نہ عشق وعاشقی کی چاشنی ہے، نہ ہجر کی نہ کٹنے والی راتیں، نہ وصال کے لمحات کے لیے اضطراب، نہ رومانی فضا ہے نہ کہانی کہنے سے پہلے طولانی تمہید، نہ کردار نگاری کے لیے زبان دانی کے مظاہرے۔ یہ افسانے سیدھے سادے بیانیہ انداز کے ہیں۔ جن میں ہزار رنگ اور ہزار زاویے دکھاتی زندگی ہے۔ اس لیے اگر سردار جعفری کے افسانوں میں حسن، دلکشی اور رعنائیاں دیکھنی ہیں تو اُس دور میں کی جانے والی زندگی کے اضمحلال اور اضطراب کی عکاسی میں دیکھیے جس کی بہترین مثال اُن کا مشہور افسانہ "چیرو مانجھی" ہے۔ ہر چند کہ آج علی سردار جعفری کے افسانوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور انہیں بحیثیت نقاد اور شاعر کے پہچانا جاتا ہے مگر اس کے باوجود سردار جعفری کے تخلیقی سفر میں افسانوں کا ایک اہم مقام ہے۔

"منزل" کے علاوہ اُن کی نثری تخلیقات "لکھنؤ کی پانچ راتیں" "ترقی پسند ادب"، "اقبال شناسی"، "پیغمبران سخن"، "ترقی پسند تحریک کی نصف صدی" اور "غالب کے سومنات خیال" ہیں۔ یہ کتابیں دو قسم کی تحریروں سے آراستہ ہیں۔ "لکھنؤ کی پانچ راتیں" مصنف کے قلبی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ یہ خود نوشت بھی ہے اور رپورتاژ بھی۔

دوسری تصنیفات مصنف کی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اُس کے حسنِ اکتساب، جستجو، عمیق مطالعہ اور جودتِ طبع کا عکس و نقش ہیں۔

بحیثیت نقاد سردار جعفری کے سفر کا آغاز ۱۹۵۰ء میں اُس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے شہرے دور کی تکمیل کر چکی تھی۔ سردار جعفری نے اپنے تنقیدی مضامین کے لیے توضیحی نثر کا استعمال کیا۔ توضیحی نثر سے مراد وہ نثر ہے جس میں کسی خیال کی وضاحت کی جائے۔ خیال ایک مجرد حقیقت ہے۔ اس مجرد حقیقت کا اظہار ہم جن صوتی علامتوں کی مدد سے کرتے ہیں وہ الفاظ کہلاتے ہیں۔ الفاظ کے تانے بانے سے فقرے اور جملے بنتے ہیں اور اس طرح خیال ظہور میں آتا ہے۔ گویا الفاظ کی ایک منطقی ترتیب توضیح خیال کے لیے اولین شرط قرار پائی۔ اب جہاں تک خیال کی ساخت کا تعلق ہے یہ مشتمل ہے دو چیزوں پر۔ ایک دعویٰ دوسرے دلیل۔ دعویٰ اگر دلیل سے عاری ہے تو خیال وضاحت سے محروم رہ جائے گا۔ یہ تو ہوئے وہ لوازم جن کے بغیر توضیح خیال ممکن ہی نہیں۔ اب لکھنے والے کا کمال ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا کرے۔ نثری اسلوب کے اسی وصف کو کمیت الفاظ کے اعتبار سے ایجاز اور کیفیت الفاظ کے لحاظ سے بلاغت کہتے ہیں۔ گویا توضیحی نثر کی چار بنیادی خصوصیات قرار پائیں۔ وضاحت، ترتیب، استدلال، ایجاز اور بلاغت۔ وضاحت اور استدلال کے بہت سے طریقے ہیں، جن میں سے ایک خطابت بھی ہے۔ علی سردار جعفری نے اپنی نثر کے لیے خطیبانہ اسلوب کو ہی منتخب کیا۔ الفاظ کا آہنگ، جملوں کا زیر و بم، تشبیہوں سے بیان کی دلکشی بڑھانا، استفہامیہ لہجہ فنِ خطابت کے ناگزیر اجزا ہیں۔ سردار جعفری نے ان میں سے بیشتر وسائل سے کام لے کر اپنی تحریروں میں خطابت کا سحر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

خطابت حقائق کے بیان پر اکتفا کرنے کے بجائے حقائق کے تئیں اپنے رویہ پر اصرار سے عبارت ہے۔ مخاطب کو آزادانہ فیصلہ دینے کے بجائے خطابت اسے اپنا ہم خیال بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے اور علی سردار جعفری کے یہاں یہ رویہ بہت زیادہ موجود ہے۔ وہ اپنی باتوں کو دلیلوں سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

"ترقی پسند ادب پر پروپیگنڈے کا الزام زیادہ تر ہیئت پرست حلقوں کی طرف سے آتا ہے۔ اور اس الزام کو اس سے تقویت پہنچتی ہے کہ ترقی پسند ادیب کھلم کھلا یہ کہتے ہیں کہ ادب کے سامنے ایک مقصد ہونا چاہئے اور ادب جانبدار ہوتا ہے۔ مقصد اور جانبداری اگر پروپیگنڈہ نہیں تو کیا ہے؟ لیکن کیا دنیا کے ادب میں ایک بھی مثال ایسی ملے گی جو بے مقصد اور غیر جانبدار ہو؟ ادیب کچھ چیزوں کو اچھا سمجھتا ہے، کچھ چیزوں کو بُرا۔ اچھی چیزوں کی اچھائی بیان کرتا ہے، بُری چیزوں کی بُرائی۔ کوئی ادیب کھل کر بیان کرتا ہے تو کوئی اشارے کرتا ہے۔ لیکن یہ تو اندازِ بیاں کا فرق ہوا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ فنی اعتبار سے اچھے یا بُرے ادب کا فرق ہوا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکل سکتا ہے کہ وہ ادب غیر جانبدار اور بے مقصد ہے؟ جیسے ہی ادیب اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے وہ جانبدار ہو جاتا ہے۔ ہیئت پرست ادیب کہتے ہیں کہ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ادیب کس کا جانبدار ہے۔ ترقی پسند ادیب کہتے ہیں کہ ہمیں اس سے یقیناً

بحث ہے کہ ادیب کس کا جانبدار ہے۔ حسن عسکری فاشزم کے جانبدار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ادیب تخلیق کے وقت اپنی سماجی حیثیت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اس لیے وہ آمدرے ژید کے مداح ہیں جس نے نازی جرمنوں کے ساتھ اُس وقت تعاون کیا جب وہ اُس کے وطن فرانس کو غلام بنا کر فرانسیسی عوام کے خون کی ندیاں بہا رہے تھے۔ حسن عسکری اور ژید کے برعکس جوش ملیح آبادی اور کرشن چندر عوام کے جانبدار ہیں۔ اِس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ فاشزم، سامراج، ظلم اور استحصال کی جانبداری ادب ہے لیکن عوام کی جانبداری پروپیگنڈہ ہے۔ حسن عسکری کے مطابق منٹو ادیب ہیں، فنکار ہیں کیونکہ وہ ظالم اور مظلوم میں فرق نہیں کرتے۔ کرشن چندر پمفلٹ باز ہیں نعرے باز ہیں کیونکہ وہ ظالم اور مظلوم میں فرق کرتے ہیں۔"

یہ اقتباس خطیبانہ طرز کی بہترین مثال ہے۔ اس میں اپنی رائے اور اس کی اصابت پر اصرار ملتا ہے۔ اس عبارت کے آخری فقرے اس مخصوص خطیبانہ رجحان کے مظہر ہیں جس کو طنز و تعریض کہا جاتا ہے۔

"حسن عسکری کے مطابق منٹو ادیب ہیں، فنکار ہیں کیونکہ وہ مظلوم اور ظالم میں فرق نہیں کرتے اور کرشن چندر پمفلٹ باز ہیں نعرے باز ہیں کیونکہ وہ ظالم اور مظلوم میں فرق کرتے ہیں۔"

یہاں سردار جعفری حسن عسکری پر طنز کرتے ہیں کیونکہ حسن عسکری کے مطابق ادیب پر کوئی سماجی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اس لیے وہ منٹو کو بڑا فنکار اور کرشن چندر کو نعرے باز اور پمفلٹ باز مانتے ہیں۔

اس نثر کی دوسری خوبی استفہام ہے۔

مقصد اور جانبداری اگر پروپیگنڈہ نہیں تو کیا ہے؟

کیا دنیا کے ادب میں ایک بھی مثال ایسی ملے گی جو بے مقصد اور غیر جانبدار ہو؟ اس طرح کے استفہامیہ جملوں سے سردار جعفری نے نثر میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی خطیبانہ اسلوب کی فنی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ سردار جعفری کی نثر میں جملوں کی ترتیب کے وہ مختلف ڈھنگ بھی مل جاتے ہیں جن میں الفاظ کے جوڑے ایک خاص سلیقے سے بنائے جاتے ہیں۔ جس کو علم بیان کی اصطلاح میں موازنہ نگاری کہتے ہیں جیسے:

"محض چند سکوں، چند پیالوں اور چند بوسوں کی آرزو نہیں ہے۔ بلکہ ایک نا آفریدہ گلشن کی تمنا ہے، جس کے نشاط تصور نے نغمہ سنجی پر مجبور کر دیا ہے۔"

یہ انداز بیاں خطابت ہی کی پیداوار ہے۔ نثر میں اثر آفرینی کے لیے کبھی کبھی اس انداز بیاں کو استعمال کیا جاتا ہے تاکہ قاری تحریر کے تاثر کو پوری طرح قبول کریں۔ سردار نے اپنی بات کو پُر زور اور پُر اثر بنانے کے لیے شاعرانہ اسلوب بھی استعمال کیا ہے۔ غالب کی تعریف میں انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے اس سے نثر کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ انہوں نے بہت منضبط اور مرتب انداز میں الفاظ کا استعمال کیا ہے جس سے جملے زیادہ مربوط اور مستحکم ہو جاتے ہیں۔

"اس شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے صرف لفظی معنوں سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے۔ شعروں کو بار بار پڑھنا بھی ضروری ہے۔ پھر لفظ حرفوں کے مجموعہ کی شکل میں نہیں بلکہ تصویروں کی شکل میں پہچانے جائیں گے۔ آدمیوں کے چہروں کی طرح وہ آہستہ آہستہ مانوس ہوں گے اور اپنی شخصیت ظاہر کریں گے۔ لفظوں کا صوتی لوچ محسوس ہوگا اور اُن کے باہمی ٹکراؤ کی جھنکار سے کان آشنا ہوں گے تب جا کر معنوی ترنم اور داخلی آہنگ کے دروازے کھلیں گے۔ اس طرح لفظی مفہوم سے گزر کر شاعرانہ مفہوم تک پہنچنے کا راستہ ملے گا اور وہ وجدانی کیفیت پیدا ہوگی جہاں وفا کا لفظ محبوب کی زلفوں کی طرح مہک اُٹھے گا اور سرو چراغاں کرتا نظر آئے گا۔ عشق ذوق اور عمل بن جائے گا۔ حسن محبوب حسنِ کائنات میں تبدیل ہو جائے گا۔ ناز وہ آدرش بن جائے گا جس کے حصول کے لیے دل و جان کی بازی لگانا خوش مذاقی کی دلیل ہے۔ شمشیر و سناں کا جلال اور انداز و ادا کا جمال جلوہ گر ہوگا۔ فراق کا درد آرزو کی لطافت میں تبدیل ہو جائے گا اور وصال لذت طلب کی سرشاری میں۔ شوق ایک قوت تخلیق بن کر اُبھرے گا اور جستجو بن جائے گا جس کی راہیں کبھی زنداں کی زنجیریں روکیں گی اور کبھی دیر و حرم کی دیواریں۔ جنہوں نے اپنے اندر شوق کی درماندگی کو سجا رکھا ہے اور میخانہ مکمل انسانیت اور مکمل آزادی کی منزل بن کر اُبھرے گا۔ پھر "دیوان غالب" کے ہر ورق پر اس کے تخیل کی مخلوق انگڑائیاں لینے لگے گی۔ اس کے سراپا ناز محبوب آنکھوں کے سامنے مسکرائیں گے اور دنیا زیادہ خوبصورت ہو جائے گی اور انسان زیادہ قابلِ احترام۔"

جلال و جمال، فراق و وصال، دیر و حرم وہ علامتیں ہیں جن کو اکثر شاعر اپنی شاعری میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن سردار جعفری نے ان علامتوں کو نثر میں استعمال کر کے نثر کے حُسن میں اضافہ کیا ہے۔ ان علامتوں میں معانی کی وہ وسعتیں پنہاں ہیں جن کی گہرائی میں جا کر ہی ہم مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں۔ حروف عطف اور مترادفات کا بکثرت استعمال خطابت کا مخصوص طریقہ کار ہے۔ سردار جعفری نے اپنی نثر میں جوش و ولولہ کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے ان دونوں چیزوں کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ شمشیر و سناں، انداز و ادا، دشت و صحرا، دیر و حرم جیسے الفاظ کا استعمال ان کی نثر کے زورِ بیاں کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ الفاظ کی تکرار بھی خطابت کا لازمہ ہے۔ اور سردار جعفری نے اپنی نثر میں الفاظ کی تکرار سے بھی جوش و ولولہ اور زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن انہوں نے خطابت کی اس خوبی کا استعمال نثر میں بہت کم کیا ہے۔ کہیں کہیں الفاظ کی تکرار کے نمونے مل جاتے ہیں۔ جیسے:

"غالب کی شاعری میں ترک دنیا، ترکِ لذت اور ترک طلب کے مضامین شاذ و نادر ہی ملیں گے۔"

ترک دنیا، ترک لذت اور ترک طلب جیسے الفاظ عبارت کو خطابت سے قریب تر کر دیتے ہیں

علی سردار جعفری نے جہاں فنِ خطابت کی بیشتر فنی خصوصیات کو اپنی نثر میں استعمال کر کے جوش و ولولہ اور بیان میں زور پیدا کیا ہے وہیں الفاظ کا شکوہ، لہجہ کی گونج، تشبیہ و کنایہ کا استعمال، جملوں کی نحوی ساخت کا استعمال اُن کی نثر

کو شاعرانہ نثر کی سرحدوں میں داخل کر دیتے ہیں۔ میر کی شاعری کی تعریف میں الفاظ کے تضادات سے نثر میں ایک خوبصورت کیفیت پیدا کی ہے۔

"میر کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صد رنگ گلستاں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ بلبل بھی ہے اور صیاد بھی۔ نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی، زندہ رہنے کی امنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانے کے بھول جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے۔"

اقبال شناسی میں اقبال کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس منزل پر پہنچ کر اقبال کی شاعری بے انتہا حسین اور زوردار ہو جاتی ہے۔ اس میں سیلاب کا بہاؤ اور آبشاروں کی روانی آ جاتی ہے۔ اور ایک ایسا آہنگ پیدا ہوتا ہے جس کی مثال ایک ہزار برس کی فارسی شاعری اور اُردو شاعری کی روایت میں نہیں ہے۔ اس کے سامنے کوئی منزل منزل نہیں ہے، کوئی حد حد نہیں۔ بے قراری اور آگے بڑھے جانے کا جذب۔ جب کسی حسین چہرہ پر نظر پڑتی ہے تو دل اس سے زیادہ خوبصورت محبوب کے لیے تڑپ اُٹھتا ہے۔ شرر سے ستارے اور ستاروں سے آفتاب بن رہے ہیں۔ فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی، سکون و قرار موت کا دوسرا نام ہے۔"

اس اقتباس میں "سیلاب کا بہاؤ" اور "آبشاروں کی روانی" جیسے الفاظ عبارت میں ایک شان پیدا کر دیتے ہیں۔ منزل منزل نہیں، حد حد نہیں بے قراری اور تڑپ ایسے الفاظ ہیں جو عبارت میں خوبصورتی پیدا کر دیتے ہیں، یہ دونوں اقتباس سردار جعفری کے شعری اسلوب کی بہترین مثال ہیں۔

سردار جعفری نے اپنی نثر میں تشبیہات کا استعمال کیا ہے لیکن دوسرے نثر نگاروں کی طرح نثر کی آرائش و زیبائش کے لیے نہیں بلکہ جملے کی معنی خیزی اور تہہ داری کو بڑھانے کے لیے کیا ہے۔

"غالب نے یقیناً اس عقیدے سے بڑا ہر جائی نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے جو اُس کی شاعری میں خونِ بہار کی طرح دوڑ رہا ہے۔"

اس جملے میں سردار جعفری نے جو تشبیہ استعمال کی ہے اس سے جملے کی معنی خیزی اور تہہ داری میں اضافہ ہو گیا ہے۔

سبطِ حسن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سبطِ حسن سر سے پاؤں تک عشق کا مجسمہ، کسی افسانوی سرزمین کے شہزادے کی طرح جو یادوں کے محلوں اور بارہ دریوں میں سوئی ہوئی شہزادیوں کو جگا لاتے ہیں۔ حسین چہرہ، جامہ زیب جسم نفیس

ترشے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں اور نہایت مہذب اور سلجھی ہوئی زبان۔"

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نثر نگار کو برمحل تشبیہات کے انتخاب کا غیر معمولی ملکہ حاصل ہے لیکن پھر بھی انھوں نے اپنی نثر میں تشبیہات کا زیادہ استعمال نہیں کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سردار جعفری کا اسلوب تشبیہوں استعاروں کا محتاج نہیں ہے۔ نثری اسلوب کا یہ رجحان قابل ستائش ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نثر نگار کا ذخیرۂ الفاظ وسیع ہو اور اس کو الفاظ کے انتخاب کا ملکہ بھی ہو تو تخیلی پیکروں کا سہارا لیے بغیر بھی نثر میں وہ حسن اور دلکشی پیدا کی جاسکتی ہے جس کی خاطر عام طور پر غیر محتاط نثر نگار تشبیہ اور استعارہ کی بہتات کر کے نثر کو شعر کی سرحدوں میں داخل کر دیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وضاحت کے بجائے نثری اسلوب میں وہ ابہام پیدا ہو جاتا ہے جو شاعری کے لیے جائز ہے لیکن نثر کے لیے نہیں۔

سردار جعفری کے یہاں سادہ ادبی نثر کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادبی نثر بھی ملتی ہے۔ تخلیقی ادبی نثر، ادبی نثر کی ہی ایک شکل ہے لیکن اس میں افسانہ، ناول، انشائیہ اور اسی نوع کی دوسری تصانیف شامل ہیں جبکہ سادہ ادبی نثر میں تحقیق، تنقید اور تجزیہ کی زبان شامل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ رنگینیٔ بیاں، جذباتی اظہار اور حسن آفرینی سے مبرا ہو۔ مگر اعلیٰ ادبی نثر کے لیے حسن آفرینی، اجمال اور جذبہ بھی ضروری ہے۔ اور یہ تینوں خوبیاں سردار جعفری کی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں موجود ہیں۔ یہ ایک خودنوشت ہے جس میں رنگا رنگ بزم آرائیوں کی داستان ہے۔ اس کتاب کا آغاز پڑھنے والے کو اس کے حسن اور تاثیر کا احساس دلاتا ہے۔

"مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرشِ بریں سے وحی الہام لے کر کاغذ کی سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کاغذوں کو دنیا نظم، افسانہ، مقالہ اور کتاب کہہ کر آنکھوں سے لگاتی ہے اور ان سے روحانی تسکین حاصل کرتی ہے۔"

جس کتاب کا آغاز ہی ان خوبصورت ہاتھوں کی تعریف سے ہو جو تخلیق کرتے ہیں تو سوچئے ان ہاتھوں نے اس کتاب میں کتنے خوبصورت انشائیے تحریر کیے ہوں گے۔ انشائیے چونکہ بیانیہ نثر کے ذیل میں آتے ہیں اس لیے ان انشائیوں میں ہمیں بیانیہ نثر کی بیشتر خصوصیات ملتی ہیں۔ بیانیہ نثر وہ ہے جس میں کسی خاص واقعہ شخص یا شے کا بیان ہو۔ واقعات اشیا اور اشخاص کا بیان شخصی بھی ہو سکتا ہے اور فرضی بھی۔ بیانیہ نثر کی خوبی یہ ہے کہ واقعات ہوں یا مفروضات، بیان تجریدی سے زیادہ حقیقی ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ واقعہ نگار صرف اچھا، برا، شاندار، معمولی جیسے مجرد توصیفی الفاظ پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ بلکہ واقعہ یا شے کو اس طرح بیان کرتا ہے جس طرح دیکھا یا سنا ہے۔ اس لیے واقعہ نگار کو تفصیل میں جانا پڑتا ہے اور جزئیات کا بیان اس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں سردار جعفری نے اپنی پانچ راتوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"باغوں کے کنارے گزرتی ہوئی ٹھنڈی اور خاموش شاہ نجف روڈ پر جو ہمارے گھر سے بہت دور نہیں تھی، ہم سب سے پہلے ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ کے گھر پہنچے۔ وہ مجازؔ کی شاعری کے بڑے مداح تھے اور اس پرچے میں مجازؔ کی نئی نظم چھپی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب خود تو گھر پر موجود نہیں تھے لیکن اُن کے چھوٹے بھائی نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی۔ چائے پینے کے بعد ہم نے سگریٹ جلایا اور اُن کو 'نیا ادب' کا پرچہ پیش کیا۔ انہوں نے بڑے شوق سے رسالہ لیا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر حاضر کر دیا۔ ہمارے پاس واپس کرنے کے لیے چھ روپے نہیں تھے۔ انہوں نے پانچ کا نوٹ دیا لیکن ہمارے پاس تو ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے پانچ کا نوٹ بھی واپس لے لیا اور دوسرے دن نوکر کے ہاتھ چار روپے بھیجنے کا وعدہ کر کے ہمیں رخصت کیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوئے باہر نکل آئے۔ اُن کا یہ فقرہ بڑی دیر تک ہمارے کانوں میں گونجتا رہا۔ 'آپ تینوں کے پاس ایک روپیہ بھی نہیں ہے۔' شام ڈھل کر رات ہو چکی تھی اور فضا میں رات کی رانی کی خوشبو پھیل گئی تھی۔ سڑک سنسان تھی اور مَیں سبطِ حسن دونوں خاموش تھے اور مجازؔ زیرِ لب گنگنا رہا تھا۔"

"لکھنؤ کی پانچ راتیں" کی نثر سادہ اور دلکش ہے۔ اس میں خطیبانہ، شاعرانہ اور بیانیہ نثر کی متعدد خصوصیات کے امتزاج نے نثر میں ایک نئی شان اور ایک منفرد انداز پیدا کر دیا ہے۔

سردار جعفری کی نثری تحریروں میں اُن کے مضامین بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ خاص طور سے "لمحوں کے چراغ" اور "دیکھو تو کس شان سے آئی ہے حیات" بہت اہم ہیں۔ اس میں پانچ ہزار برس کی ہندوستانی تہذیب کی اشتراکہ تعمیر کی کہانی ہے۔ جس مضمون کے لیے پانچ ہزار صفحات بھی کم تھے اس کو سردار نے بیس بائیس صفحات میں بہت خوبصورتی سے قلمبند کر دیا ہے۔ یہ مضامین نثری خوبی "اجمال" کی بہترین مثال ہیں۔

مختصر یہ کہ سردار جعفری ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ اُن کی نثری تخلیقات تعداد میں کم ہوتے ہوئے بھی بہت اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ ان سے سردار جعفری کی تنقیدی بصیرت کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اُن کی نثری خوبیاں بھی سامنے آتی ہیں جن کی بنا پر ان کو بہترین نثر نگار قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ناقدین اور اربابِ نظر نے جتنی توجہ اُن کی شاعری کی طرف کی اُتنی نثر نگاری کی طرف نہیں کی حالانکہ سردار جعفری نے نظم و نثر دونوں کو یکساں کوشش سے نکھارا اور سنوارا ہے۔ شعری اسلوب کی طرح ہی اُن کا نثری اسلوب بھی ایک انفرادیت رکھتا ہے جو اُن کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ اُن کے کردار کی صحیح تصویر اور اُن کے خیالات و نظریات کا عکس ہے۔ وضاحت، سادگی، استدلال، جوش، ولولہ، لہجہ کا وقار اور بلند آہنگی سردار جعفری کی نثر کا شناخت نامہ ہے۔ ☆☆☆

(ماہنامہ آج کل نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۱)

آنند نرائن مُلّا

"پیراہن شبنم"

علی سردار جعفری کو مَیں انداز اً ستائیس یا اٹھائیس سال سے جانتا ہوں۔ یہ اُس زمانے میں لکھنو یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی لکھنو شاخ کے سرگرم رُکن۔ میرا حافظہ، اگر غلطی نہیں کرتا تو وہ شاید اُس ادبی انجمن کے سکرٹری تھے۔ اس انجمن کے جلسے مرحومہ رشید جہاں کے مکان پر ہوتے تھے اور گو اُس زمانے میں بھی یہ شعر کہتے تھے لیکن اُس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک پُر جوش، باحوصلہ اور باعمل اشتراکیت پر ایمان لانے والے نوجوان کارکن زیادہ ہیں اور شاعر کم۔ اراکین انجمن ترقی پسند مصنفین کے امیرِ کارواں اُس وقت بظاہر تو جوشؔ ملیح آبادی تھے لیکن اُن کے محبوب ترین شاعر دراصل مجازؔ مرحوم تھے اور اُس کے بعد جذبیؔ اور جاں نثار اخترؔ کا نام آتا تھا۔ کسے خبر تھی کہ چند سال بعد سردارؔ ان سب کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائے گا اور دنیائے شعر میں اپنا مخصوص اور بلند مقام خالی اپنے وطن ہی میں حاصل نہ کرے گا بلکہ اُس کی شاعرانہ عظمت اپنے ملک کے باہر بھی تسلیم کی جائے گی۔

سردارؔ مجھ سے بارہ یا تیرہ سال چھوٹے ہیں۔ اگر زندگی میں جمود نہ ہو تو یہ عرصہ ادبی قدروں کو بدل دینے کے لئے بہت کافی ہے۔ موجودہ دَور تو اتنا برق رفتار ہو چکا ہے کہ صبح کا مستقبل شام آتے آتے ماضی بن چکا ہوتا ہے۔ ایسے میں سردارؔ کی شاعری کا میرے دَور کی شاعری سے موضوعاتِ سخن، اندازِ بیاں، علامات اور تخلیق حسن کے نظریات، چاروں اعتبار سے مختلف ہونا ناگزیر تھا۔ ایک سردارؔ کیا آج کے دَور کے سب شاعر اپنے اپنے انداز میں نئے تخلیقی تجربے کر رہے ہیں اور جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ شاعری گمراہی ہے اور انحطاط ادب کی دلیل ہے۔ وہ بڑی حد تک اپنی پرانی مٹتی ہوئی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور بدلتی ہوئی زندگی کی زندہ قدریں قبول کرنے کو راضی نہیں۔

موجودہ دَور کے شعراء کی طرف جب بھی میرا خیال جاتا ہے تو میرے ذہن میں پہلا نام سردارؔ ہی کا آتا ہے کہ یہ میری پسند کی بات ہے۔ شاید اس پسند کی وجہ یہ ہے کہ سردارؔ کی اور میری محض ادبی قدریں ہی نہیں بلکہ انسانی قدریں

بھی بہت کچھ مشترک ہیں اور گو آج وہ دھارے پر ہے اور مَیں کنارے سے لگ چکا ہوں۔ لیکن پھر بھی ہماری نظریں ایک ہی اُفق کی طرف اُٹھتی ہیں۔ ہم نے ایک ہی خواب دیکھا ہے اور اپنی بساط بھر اسی طرف اپنی کشتیاں بڑھا کر اوروں کو بھی اس خواب کو حقیقت بنانے کی دعوت دی ہے۔

آج زندگی کا ہر فن کار سے خالی یہی تقاضا نہیں ہے کہ وہ زندگی کی ناانصافیوں اور غلط نظریوں کی وجہ سے جو انسانی مشکلیں اور محرومیاں ہیں، اُن کو سمجھے بلکہ اُن کے خلاف آواز بھی اُٹھائے اور جہد بھی کرے۔ صحیح مفہوم میں آج کے شاعر کو مجاہد بھی ہونا ضروری ہے۔ لیکن شاعر کا جہد میدانِ جنگ میں نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شاعر بھی تلوار اُٹھالے لیکن یہ فعل اُس کا بحیثیت ایک شہری کے ہوگا بحیثیت ایک فنکار کے نہیں کیونکہ اصل لڑائی تو دلوں اور ذہنوں میں لڑی جارہی ہے۔ اور تلوار اس نزاع میں کام نہیں دیتی۔ سردارؔ کی زندگی میں ایک مقام ایسا آیا تھا جب مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں سردارؔ کے دل میں جو شہری ہے وہ شاعر کے ہاتھ سے قلم چھین کر تلوار نہ اُٹھالے لیکن شکر ہے کہ یہ نوبت نہیں آئی اور سردار نے قلم کو ہی تلوار بنالیا۔ سردار کے ارتقائے فن میں یہ ایک اہم منزل تھی ور اس مقام سے گزرنے کے بعد اس کا شعور جو پہلے ہی سے بیدار تھا اور زیادہ پختہ ہوا اور اُس کے لہجے میں تندی کی جگہ وہ نرمی آگئی جس نے اُسے ساری نوعِ انسان کے قریب کردیا۔ ''پیراہنِ شرر'' تک پہنچتے پہنچتے یہ قلم کی تلوار اب اُس کے ہاتھ میں ''شاخِ گُل'' بن چکی ہے۔ اور وہ نظریاتی غبار کی سطح سے اُبھر کر کرہ نور پر پہنچ گیا ہے۔ اب اُس کے پیام میں ایک پیمبرانہ حلاوت ہے اور اُس کی نِشتر بھی زخمِ انساں کے لئے مرہم۔ آج اُس کی منزل کا تعین اس مجموعے کا آخری شعر کرتا ہے۔

کم ظرفیِ گفتار ہے دشنام طرازی ۔۔۔ تہذیب تو شائستگیِ دیدۂ تر ہے

''یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ سماجی نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت خود بخود بدل جاتی ہے۔ بدی ختم ہو جاتی ہے اور نیکی کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف سے مفر نہیں کہ سماجی نظام کی تبدیلی جو ضروری بھی ہے اور ناگزیر بھی ناکافی ہے۔ معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور اُن کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خود غرضی، غلط احساسِ برتری اور اس قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و دماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔ اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہوسکتی ہیں''

جب سے انسان نے متمدن زندگی میں قدم رکھا ہے وہ امن کا جویا رہا ہے۔ لیکن ابھی تک اُس کی قسمت میں ایک کے بعد دوسری جنگ آتی چلی گئی ہے۔ انسان کا بڑھتا ہوا علم ہر آنے والی جنگ کو جنگِ گزشتہ سے اور زیادہ ہولناک اور تباہ کن بناتا چلا جارہا ہے اور آج یہ نوبت آگئی ہے کہ نوعِ انساں کے مرنے جینے ہی کا سوال سامنے آگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان کی عقل (جو اُس کی ذاتی غرض اور حرص کا دوسرا نام ہوکر رہ گئی ہے) اُس کے دل (جو جذبۂ اخوت کا دوسرا نام ہے) کو پیچھے چھوڑ کر اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ اب اُس کی آواز بھی نہیں سن سکتی۔

نموکی طاقت ابھی دلوں میں ہے یا اسے زیست کھو چکی ہے
ضمیر انساں میں آنچ باقی ہے یا یہ لوسرد ہو چکی ہے

آج ہر فنکار کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ عقل اور دل کا یہ فاصلہ اور بڑھنے نہ دے بلکہ انہیں قریب لانے کی کوشش کرے اور ضمیرِ انساں کو جھنجھوڑ کر اس انسانی اخوت کی لَو کو بجھنے نہ دے بلکہ ہوا دے دے کر اُسے شعلہ ءِ جوالہ بنا دے۔

اگر اس نظر سے اُردو شعری ادب کا جائزہ لیا جائے تو سردار کا مقام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ ''پیراہنِ شرر'' کی زیادہ تر نظمیں نوعِ انساں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ سردار کا بیدار شعور اور ساتھ ہی ساتھ الفاظ کا فنکارانہ حسنِ انتخاب ان نظموں کو ادبی شہ کار بنا دیتا ہے۔ اور اس کے احساس کی صداقت اور خلوص اُس کے لہجے کو وہ دردمندی بھی عطا کر دیتا ہے جو بعض نظموں کو انسانی دستاویز کا درجہ دے دیتا ہے۔ ان نظموں میں سردار ایک معلم اور فلسفی بن کر نہیں بلکہ ایک دوست بن کر سامنے آتا ہے۔ اور چونکہ غمِ مشترک میں اپنا ساتھی ہے لہذا اُس کی آواز میں ایک بے پناہ کشش اور اُس کے پیام میں پائندہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ظریف مرحوم نے شاعر کے بارے میں کہا تھا۔

تو معالج نفسِ امارہ کی بیماری کا ہے تو ذریعہ قوم اور ملت کی بیداری کا ہے

مَیں نے بھی اپنے مجموعہ ءِ کلام ''میری حدیثِ عمرِ گریزاں'' میں ایک عظیم فنکار کی تعریف یوں کی تھی:

''مَیں تو اُس فن کار کو عظیم فن کار سمجھتا ہوں جو نوعِ انساں کی اکائی بن کر انسانی درد و غم سہے اور اس غم کا مکمل احساس ہونے کے باوجود اُس کی ذات میں اتنی لوچ اور اس کے فن میں اتنی سکت ہو کہ وہ اس زہر کو امرت بنا کر پی جائے۔ اپنے دل و دماغ کی معصومیت، تازگی اور حُسن کو برقرار رکھے اور پھر دانائی کی چوٹیوں سے کُلِ نوعِ انساں کو جس میں گمراہ انسان بھی شامل ہوں، ایک طفلِ معصوم کے میٹھے اور سریلے بولوں میں پکارے اور منزلِ انسانیت کی طرف قدم بڑھانے کا پیغام دے۔''

''پیراہنِ شرر'' کی ان نظموں میں سردار نے اگر یہ مقام حاصل نہیں کر لیا ہے تو اُس مقام سے بہت دور بھی نہیں ہے۔

زندگی اور ادب دونوں ایک سلسلہ ءِ لامتناعی ہیں دونوں اُفق در اُفق آگے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے یہ سلسلہ ختم ہونے والا نہیں۔ میرا خیال تو ایسا ہے کہ وہ نظامِ حیات کبھی بھی مرتب نہ ہو سکے گا جس سے خوب تر کا جذبہ کچھ نگاہوں میں نہ ہو۔ یہ خوب تر کی خواہش ہی ارتقائے زندگی کا راز ہے۔ عظیم فنکار وہی ہے جس کا دیدہ ءِ بینا اس خوب تر کو دیکھ سکے اور کاروانِ انساں کو خوب تر منزل کی طرف گامزان ہونے پر آمادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور سختیاں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ لیکن ایک سچا شاعر ان سے ڈر کر اپنی آواز اُٹھانے سے گریز نہیں کرتا۔ غالبؔ کے اس شعر میں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اور چکبست کے اس شعر میں۔

نظر کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں   میرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

اور فیض کے اس قطعے میں۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو غم کیا ہے؟
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں مَیں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا؟ کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں مَیں نے

اور سردار کے "پیراہنِ شرر" کے ان اشعار میں۔

کھڑا ہے کون یہ "پیراہنِ شرر" پہنے
بدن ہے چُور تو ماتھے سے خون جاری ہے
کوئی دِوانہ ہے لیتا ہے سچ کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک

باوجود "اندازِ بیاں" اور علامات کے نمایاں فرق کے ایک حیرت انگیز خاندانی مشابہت ہے۔ ایک کرب جو دَور بہ دور سینہ بہ سینہ منتقل چلا آ رہا ہے۔ لیکن سردار کی آواز یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اُس کی نگاہِ بینا ایک درخشاں مستقبل کی بشارت بھی دیتی ہے۔ اس مجموعے کی آخری نظم 'امانتِ غم' میں سردار کہتا ہے۔

امانتِ غمِ انساں ، امانتِ غمِ دل
یہ اک چراغ ہے قندیلِ مہر و مہ کی طرح
جو یہ نہ ہو تو زمانے میں روشنی کیوں ہو؟

اُٹھو کہ جشنِ دل و جاں منایا جائے گا
ہر اک چمن میں یہی گُل کھلایا جائے گا
یہ گُل جو دردِ محبت امانتِ غم ہے

یہ گل جو شوخ بھی خوں گشتہ بھی ملول بھی ہے

خدائے عشق بھی ہے امن کا رسول بھی ہے

انسان کے دل کی آرزو ناموافق ماحول سے لڑنے کے لیے ایک شاعر کا پیام بن کر ہمیشہ ہونٹوں تک آتی رہی ہے۔ غالبؔ کے کاغذی پیرہن سے لے کر سردارؔ کے "پیراہنِ شرر" تک یہ آرزو نہ جانے کتنے لباس پہن کر گھڑی گھڑی سامنے آئی ہے لیکن جو چیز "پیراہنِ شرر" کو طرۂ امتیاز بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ اس پیراہنِ شرر کے نیچے ایک پیراہنِ شبنم بھی ہے۔ ممکن ہے کہ اس سلگتی ہوئی دنیا کو یہ پیراہنِ شبنم ابھی سالوں میسر نہ ہو لیکن ایک سچے فنکار کا حوصلہ اس خیال سے پست نہیں ہوتا۔ وہ تو اِس عقیدے پر عمل کرتا ہے۔

ہمارے لئے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے

فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

(ماہنامہ افکار کراچی سردار جعفری نمبر)

☆☆☆

پرکٹی تتلی (ناول)	ہنس راج رہبرؔ		۳۰روپے
احساس (شاعری) ہنس راج رہبرؔ	مرتب: نند کشور وکرم		۱۰۰روپے
نئی صدی اور ادب (تحقیق و تنقید)	دیویندر اِسر		۱۲۰روپے
ادب کی آبرو (تحقیق و تنقید)	دیویندر اِسر		۷۰روپے
مستقبل کے روبرو (تنقید)	دیویندر اِسر		۳۰روپے
خوشبو بن کے لوٹیں گے (ناولٹ)	دیویندر اِسر		۵۰روپے
یادوں کے کھنڈر (ناول)	نند کشور وکرم		۹۰روپے
آوارہ گرد (افسانے)	نند کشور وکرم		۸۰روپے
انیسواں ادھیائے (تجزیاتی ناول)	نند کشور وکرم		۱۲۰روپے
حبیب جالب۔ شخصیت اور شاعری	نند کشور وکرم		۱۵۰روپے
دیویندر اِسر (عالمی اُردو نمبر)	نند کشور وکرم		۱۵۰روپے
احمد ندیم قاسمی۔ شخصیت اور فن	نند کشور وکرم		۲۰۰روپے
دھند میں اُگا پیڑ (ناولٹ)	آشا پربھات		۸۰روپے
عالمی اُردو ادب ۹۷ء تا ۲۰۰۰ء	نند کشور وکرم	فی جلد	۲۰۰روپے
عالمی اُردو ادب ۹۲ء تا ۱۹۹۶ء	نند کشور وکرم	فی جلد	۱۵۰روپے

سجاد ظہیر

"ایک خواب اور"

"ایک خواب اور" اُردو کے ممتاز و معروف ترقی پسند شاعر سردار جعفری کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے۔ یہ مجموعہ سردار جعفری کے آخری مجموعہ کلام "پتھر کی دیوار" کے تقریباً دس سال بعد شائع ہوا ہے۔ اور اِس طرح اِس میں اُن کے آخری دس سال یعنی ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۳ء کے آخر تک کا کلام جمع ہے۔ مجموعے کی کتابت، طباعت اور سرورق روشن اور دیدہ زیب ہے۔

سردار جعفری کی شاعری جدید اُردو شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادب کی وہ تحریک جو اُردو میں ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہے اور جس کا آغاز آج سے تقریباً تیس سال پہلے ہوا تھا نسبتاً طویل مدت میں کئی پُر پیچ راستوں سے گزری ہے۔ اُس پر قومی اور بین الاقوامی واقعات اور تاریخ کا اثر پڑا ہے۔ کبھی اس پر شدت اور جوش کی والہانہ کیفیتیں طاری ہوئی ہیں، کبھی خیال و نظر کی ایسی گتھیوں میں پھنسی ہے جن میں شوریدگی زیادہ اور بصیرت کم تھی۔ اور کبھی انفرادی اور اجتماعی شعور اور نفسیاتی کیفیتوں کا اُس میں ایسا حسین، پُر اثر اور صناعانہ اظہار ہوا ہے کہ اُس نے فن کی سب سے بلند چوٹیوں کو چھولیا ہے۔ جعفری کی شاعری میں ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُردو کی ترقی پسند ادبی خلاقی اپنے پورے آب و تاب اور اپنے تمام پیچ و خم کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔ گزشتہ تیس سال میں جعفری نے جو شعری تخلیقات پیش کی ہیں، اس کا ابتدائی سرا اقبال اور جوش کی شاعری کے ساتھ ملتا ہے جو اس صدی کی بیسویں اور تیسویں دہائی تک نظریاتی اعتبار سے ہماری شاعری پر حاوی تھے۔ لیکن جب تیسویں دہائی اور اُس کے بعد کے زمانے میں قومی اور بین الاقوامی اور اشتراکی تحریکوں اور نظریات کا عروج ہوا اور ہمارے ملک کی قومی آزادی کی تحریک بھی اس سے متاثر ہوئی اور مزدوروں، کسانوں اور انقلابی دانشوروں نے اس تحریک کو بائیں طرف موڑ دیا تب اُردو شاعری کے میدان میں اس کا سہرا سردار جعفری کے سر ہے کہ انہوں نے اپنے تمام ہم عصروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ واضح اور شعوری طور پر اس کام کو سرانجام دیا۔

بعض لوگ یقیناً اس بات پر چیں بجبیں ہوں گے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جعفری مبلغ اور خطیب زیادہ ہیں اور شاعر کم۔

ایسے معترض خود ترقی پسند حلقے میں بھی موجود ہیں لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو یہ دراصل کافی پرانی بحث ہے، البتہ جدید زمانے میں یہ ہمارے سامنے نئی طرح سے ضرور آئی ہے۔ جعفری پر اس قسم کا اعتراض کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو ان خیالات، تصورات و نظریات سے ہی اختلاف کرتے ہیں، جو سردار جعفری کے ہیں۔

ظاہر ہے کہ سردار جعفری کی ایسی شاعری جس میں اس قسم کے انقلابی نظریات کا اتنے جوش اور یقین کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے، اُن قدامت پرستوں کے لئے جو شاعری کو تفریح اور تفنن اور سطحی لذت اندوزی کا وسیلہ سمجھتے ہیں، بہت ہی تکلیف دہ ہوگی لیکن کوئی بھی ایماندار نقاد شاعری کی ایک صنف کی حیثیت سے اس قسم کی شاعری کو اُس کا مناسب مقام دینے سے گریز نہیں کر سکتا۔ لیکن آج کل ایسے بھی لوگ ہیں جو شاعری کو باطنی کیفیات، مبہم اور پیچیدہ نفسیاتی واردات اور ان کے ظہار کے لئے نئے اسلوب، نئے استعاروں، انوکھے اور غیر مانوس انداز بیاں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم اس قسم کی نئی فنی کاوش کو، اگر وہ کامیاب ہو، مسترد نہیں کر سکتے۔ نئے زمانے میں فرد اور جماعت یقینی طور پر نئے حالات، زندگی کے نئے رشتوں اور تعلقات سے دو چار ہیں اور ان کا اظہار نئے انداز میں کیا جا رہا ہے اور کیا جائے گا۔ مشکل یہ ہے کہ بعض لوگ اس نئی باطنیت کو ہی اور اس نئے طرز اظہار کو ہی شاعری کا اصل اور واحد جوہر سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کا یہ میدان اس قدر وسیع ہے کہ اگر اس میں ایک طرف باریک نگاری کی گنجائش ہے جس طرح کہ مصوری میں چھوٹے چھوٹے نازک اور لطیف خیا توروں (MINIA TURES) کی تو دوسری طرف وسیع سطحوں پر توانا اور مضبوط خطوں اور رنگوں کے امتزاج سے بنائی ہوئی تصویروں کی بھی ہے۔ میکسیکو کے عوام کی انقلابی جدوجہد کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ وہاں کے آرٹسٹوں نے وہاں کی عمارتوں کی دیواروں پر بڑی بڑی اور عوام کے انقلابی مزاج سے ہم آہنگ بے حد زوردار اور پُر جوش تصویریں (دیواری یا میورال تصویر کشی) بنانے کا فن اختراع کیا ہے اور اب اسے عالمگیر مقبولیت حاصل ہے۔ سردار جعفری کی بڑی نظموں میں ایسی ہی بڑی دیواری مصوری کی سی کیفیت ہے۔ اُن کے خط واضح اور توانا ہیں، اُن کا آہنگ بلند اور پُر جوش ہے۔ اور یقینی طور پر اپنے بہترین معنوں میں اُن کا انداز خطیبانہ ہے اس لئے کہ وہ ہمارے عوام کے بڑے بڑے مجمعوں میں سنانے کے لئے بھی کہی گئی ہیں اور یہ اُن کی خوبی ہے اُن کی کمزوری نہیں۔ کیا مولانا روم کی مثنوی کا، میر انیس کے مرثیوں کا، اقبال کے شکوے کا، شیکسپیئر کے ڈراموں کا انداز خطیبانہ نہیں؟ یہ سب تخلیقات بھی عوام کے مجمعوں میں سنانے کے لئے کہی گئی تھیں۔ جعفری کی طویل نظمیں اسی صنف کی ہیں، اُن میں سادگی، روانی اور خلوص ہے اور وہ سننے والوں پر سیدھا اور براہِ راست اثر ڈالتی ہیں اور کامیاب ہیں۔

سردار جعفری کے نئے مجموعے "ایک خواب اور" میں اُن کی بعض نظمیں پہلے دور کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ گہرے شعور اور زیادہ پختگی کا پتہ دیتی ہیں۔ بیس سال شعر لکھنے کے بعد اور تیس سال کی جمہوری اور اشتراکی تحریک کے

تجربے کے بعد سردار جعفری سے اس قسم کی پختگی کی امید بھی کی جا سکتی تھی، نئی دنیا بنانے کی جدو جہد میں ہم کو بہت سے تلخ تجربے بھی ہوئے ہیں۔ خود اشتراکی تحریک کبھی اندھے کٹرپن اور کبھی موقع پرستانہ ڈھیلے پن کا شکار ہوئی ہے۔ ہم نے معروضی حقیقتوں کو دیکھنے اور سمجھنے سے گریز بھی کیا ہے۔ اپنی غلطیوں کو مان کر اپنی اصلاح کرنے میں دیر بھی لگائی ہے۔ ان کیفیتوں کا ہی اظہار 'ایک خواب اور' کے عنوان کی نظم میں ہے۔ اس نظم کے یہ دو شعر جو ایک بار پڑھنے کے بعد دل پر نقش ہو جاتے ہیں (چونکہ وہ ایک تلخ حقیقت کا اظہار ہونے کے باوجود بے حد سچے ہیں) اثر پذیری میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔

دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب
در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح اُن سے گریزاں ہے جواب

لیکن اس سخت اور کڑوی بات کو محسوس کرنے کے اور کہنے کے باوجود انسان اور انسانیت اور اس عہد کے بلند ترین نصب العین اشتراکیت کے حصول کی کاوش اب بھی اُن کے امید پرور سینے میں بینارہ نور کی طرح روشن ہے اور وہ نظم کو اس شعر پر ختم کرتے ہیں۔

پھینک پھر جذبہء بیتاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند

آپ خود "ایک خواب اور" خرید کر پڑھیے اور جدید اُردو شاعری کے اس بلند پایہ نمونے سے لطف اندوز ہو جیے۔ البتہ اُن لوگوں کو ضرور اس مجموعے کو پڑھ کر دھچکا لگے گا جنہوں نے آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے یہ اعلان کرنا شروع کر دیا تھا کہ ترقی پسند ادبی تحریک ختم ہو گئی ہے۔ ☆☆☆ (ماہنامہ افکار کراچی سردار جعفری نمبر)

ایک خواب اور

۱۰۲ مختصر نظمیں، غزلیں اور قطعات اور کچھ متفرق اشعار

انتساب	سلطانہ کے نام
اشاعت اول	مارچ ۱۹۶۵ء
ناشر	حلقہء ادب ممبئی

علی جاوید

"نئی دنیا کو سلام" اور علی سردار جعفری

"نئی دنیا کو سلام" نہ صرف علی سردار جعفری کی ذہنی تازگی کی ایک بہترین مثال ہے بلکہ ان کے ذہنی جدت طرازی کا ایک اعلیٰ ادبی نمونہ بھی۔ یہ طویل نظم اس وقت وجود میں آتی ہے جب اردو کی ادبی روایت میں آزاد نظم کو کوئی ادبی مقام حاصل نہیں ہوا تھا اور آزاد نظم کی تاریخ میں سردار جعفری نے یہ پہلا تخلیقی تجربہ قاری کے سامنے پیش کیا تھا۔ یعنی اردو شاعری کی تاریخ میں اس طرح کے ہیئتی تجربے یکسر معیوب تھے۔ ظاہر ہے اس جوکھم بھرے اقدام کا اندازہ خود سردار کو بھی تھا۔ مختصر سے پیش لفظ میں انھوں اس بات کا اعتراف بھی کیا اور دعویٰ بھی کہ "اردو زبان میں اس طرح کی کوئی چیز اب تک نہیں لکھی گئی ہے"۔ خود آگہی ان کی شخصیت کا ایک ناگزیر جزو ہے۔ ادبی انکسار کے تحت وہ اپنے ناقدین کو اختلاف کا موقع تو دیتے ہیں لیکن اپنے مفروضے پر قائم رہتے ہوئے کسی طرح کے سمجھوتے کی گنجائش نہیں رکھتے۔ خود اعتمادی کی اسی منزل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عدم نے کہا تھا:

غرورِ مے کشی کی کون سی منزل ہے یہ ساقی

کھنک ساغر کی آواز خدا معلوم ہوتی ہے

اسی لیے سردار جعفری کہتے ہیں "یہ نظم پیش کرتے ہوئے مجھے تھوڑی سی جھجک ہو رہی ہے۔ جھجک کی وجہ خود اعتمادی کی کمی نہیں بلکہ نظم کا نیا پن ہے۔ کیوں کہ اس سماج میں ہر نئی چیز شک اور شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کا موضوع بھی نیا ہے اور تکنیک بھی نئی"۔ اور بھی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں "زندگی سے متعلق میرا زاویۂ نگاہ بھی دوسرے شعرا سے مختلف ہے، اس لیے میں نے اکثر اشاروں کی جگہ تفصیلات سے کام لیا ہے۔ اشاروں اور کنایوں کا وقت بھی کبھی آجائے گا۔"

اس نظم کے تعلق سے سجاد ظہیر کی 'روشنائی' سے یہ واقعہ نقل کرنا بے محل نہ ہوگا:

"اردو اور ہندی کی بنیادی قربت کا اندازہ اور اس بات کا تجربہ کہ ہندی داں عوام کو اردو سے مغائرت نہیں ہے (بشرطیکہ انھیں غلط بیانیاں کر کے بھڑکایا نہ جائے) ہمیں کانفرنس کے کوی سمیلن میں ہوا۔ کوی سمیلن الہ آباد کے سنگیت ودیالیہ کے ہال میں ہوا جس میں آٹھ نو سو کا مجمع تھا۔ ہندی کے بڑے اور نامور کوی سمترا نندن پنت، نرالا، نریندر شرما، سُمن وغیرہ وہاں پر موجود تھے۔ انھوں نے اپنی اپنی کویتائیں سنائیں جن میں سے بعض مقبول ہوئیں اور بعض کو لوگوں نے خاموشی اور اکتاہٹ کے اظہار کے ساتھ سنا۔ ہر مشاعرے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ہندی کے ترقی پسند رفیقوں نے اصرار کیا کہ سردار جعفری بھی اپنا کلام سنائیں۔ سردار جعفری نے اس زمانے میں اپنی طویل نظم 'نئی دنیا کو سلام' نئی نئی کہی تھی۔ انھوں نے تحت اللفظ میں اس کے چند حصے سنائے۔ حاضرین نے نہ صرف اسے دلچسپی سے سنا بلکہ ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس نظم سے متاثر بھی ہو رہے ہیں۔ ہر چند منٹ کے بعد کسی زوردار بند یا خوبصورت مصرعے کے خاتمے پر زوردار تالیاں بجتیں۔ اس وقت بالکل یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مجمع اردو دانوں کا نہیں ہندی دانوں کا ہے۔ اردو مشاعروں میں شاید اس سے کسی قدر ہی زیادہ شعر فہمی کا اظہار ہوتا ہوگا۔ جب جعفری ختم کر کے بیٹھے تو جتنی تحسین و آفریں انھیں نصیب ہوئی کسی دوسرے ہندی کوی کو اس سمّیلن میں اتنی نہیں ہوئی۔ کانفرنس میں ہندی اور اردو کے مسئلہ پر بحث کے دوران میں بعض اشخاص کی تنگ نظری کے مظاہرے سے ہم کو کسی قدر رنج ہوا تھا، ہندی کوی سمّیلن میں اردو کے ایک نوجوان شاعر کے اس اعزاز اور عام مقبولیت سے وہ دور ہو گیا اور ہمیں اس بات کا اور بھی زیادہ یقین ہو گیا کہ مستقبل، ماضی پرست اور تفرقہ پرداز رجعت پرستوں کے ہاتھ نہیں۔" (۴۰۹-۴۰۸)

'نئی دنیا کو سلام' کے بارے میں خود وہ کہتے ہیں کہ "یہ منظوم تمثیل نہیں بلکہ تمثیلی نظم ہے۔ اس کے کردار نہیں، علامتیں ہیں۔ کہانی پلاٹ نہیں بلکہ مبہم سا خاکہ ہے، جس کو میں نے رنگ بھرنے کے لیے بنایا ہے۔ واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات، تاثرات اور احساسات پیش کیے ہیں۔ جاوید

اور مریم (میاں بیوی) جدوجہد کی علامتیں اور فرنگی ظلم کی علامت ہے۔

وہ خود اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ اس نظم کا سب سے اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ آنے والی نئی دنیا اور مستقبل کی علامت ہے۔ مریم اس بچے کو اپنے بطن میں پال رہی ہے جسے اس بات پر فخر ہے کہ آنے والے دور کے مستقبل کو جنم دینے والی ہے اور یہ فخر صرف ایک عورت کو حاصل ہے جس کے تحت اس میں فاتحانہ خوداعتمادی اور وقار پیدا ہوتا اور فطرت کے اس عظیم انفرادی عطیے پر وہ پھولے نہیں سماتی اور اس میں ہر شے پر قادر ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے جو سماج میں اس کے وقار کو بلند تر کرتا ہے۔

'نئی دنیا کو سلام' جاوید اور مریم (میاں بیوی) کی ایسی کہانی ہے جو نہ صرف ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں بلکہ اپنے سماجی منصب سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر جاوید کو پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے۔ مریم چوں کہ حاملہ ہے، اس لیے جاوید مرنے سے پہلے اپنے ہونے والے بچے کو ایک خط لکھتا ہے جس میں ایک نئے ہندوستان کی تصویر ہے۔ وہ اپنے بچے کی ولادت کے ساتھ نئے ہندوستان کی آمد کا خواب دیکھتا ہے جس کے عوام تمام مصائب سے آزاد ہوں گے۔ شاعر کا سیاسی اور سماجی شعور یہاں اس بات کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ محنت کش عوام سرمایہ داری کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ اور ان کی نجات کا راستہ صرف متحد ہو کر استحصال کرنے والی قوتوں کے خلاف جنگ میں ہے۔ جس زمانے میں یہ نظم لکھی گئی اس کے منظر نامے کو سامنے رکھیے تو یہ نظم ہمیں یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ یہ دنیا عالمی جنگ کے بحران سے ابھی باہر نکلی ہے۔ فضا میں سیاہی اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے بموں سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہے۔ اس پس منظر میں نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں

کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اٹھائے ہوئے

سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مار سیاہ

سیاہ چمن میں سیہ پھول مسکرائے ہوئے

سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل رہی ہے زمیں

سیہ عقاب، سیہ آسماں پہ چھائے ہوئے

سیاہ کیڑوں کی مانند رینگتی مخلوق

سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے
سیہ نشان بدن پر سیاہ کوڑوں کے
سیاہ زخم سیہ درد کو جگائے ہوئے
ضمیر عہدِ غلامی کی تیرگی ہے یہ رات
جو پھر رہی ہے اُجالے سے منہ چھپائے ہوئے

کہاں ہے روشنیِ صبحِ انقلاب کہاں؟
ضمیرِ حضرتِ انساں کا آفتاب کہاں؟

اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی منظرنامے کو سامنے رکھیے اور علامتوں پر غور کیجیے۔ پھریرے کا رنگ سیاہ ہے۔ رات کی سیاہی، سیاہ زلفیں اور ان سے لپٹے ہوئے کالے ناگ۔ سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین ہل رہی ہے جو علامت ہے جبر واستبداد کی۔ یہ ہٹلر کے گھوڑے کی ٹاپیں بھی ہو سکتی ہیں اور برطانوی سامراج واد کی بھی۔ اس اندھیرے میں آسمان پر بھی سیاہی طاری ہے جہاں سیاہ عقاب چھائے ہوئے ہیں جو جاپان پر گرائے گئے بموں کا دھواں بھی ہو سکتا ہے۔ پہاڑوں پر بھی سیاہی طاری ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ان پہاڑوں نے اپنے سینے اس طرح تان رکھے ہیں کہ کہیں بھی امان ملنی مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وادیوں، صحراؤں اور دریاؤں نے بھی لوہے کی سیاہ دیوار کھڑی کر دی ہے۔ محنت کش عوام اور کھیت مزدور چوں کہ پریشان حال ہیں، اس لیے ان پر چھائی ہوئی افسردگی سے ایسا لگتا ہے کہ سارے دشت اور کھیتوں کو بھی سیاہی نے ڈس لیا ہے۔ فیکٹریوں کی چمنیوں سے صرف سیاہ دھواں ہی نہیں نکل رہا ہے بلکہ فیکٹریاں بھی سیاہی کا شکار ہیں۔ اسی زمانے میں محمد احمد شباب کراوری کی نظم کا ایک بند یاد آ رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ملوں کی یہ چمنیاں جو ہر دم چتا کی مانند جل رہی ہیں
یہ آدمی کو دھواں بنا کر ہوا کے اندر اگل رہی ہیں
یہ کارخانے کہ جن میں انساں کی قسمتیں آج ڈھل رہی ہیں
یقیں یہ تقدیر کے پجاری کی تیوریاں بھی بدل رہی ہیں
کہ سوئی قسمت کے ٹھیکیداروں کا اب جنازہ نکل رہا ہے

بہت بڑا انقلاب کوئی فضا کے اندر مچل رہا ہے

مزاج انساں بدل چکا ہے، دماغ انساں بدل رہا ہے

مایوسی اور تباہی کا یہ عالم ہے کہ چراغ سے نکلنے والی روشنی کی لویں بھی سیاہ پڑ گئی ہیں اور تباہی کی دیوی نے عوام کی حالت ایسی کر دی ہے کہ جیسے گھروں میں قید سیاہ کیڑے رینگ رہے ہوں۔ حسیناؤں کی جبینیں سیاہ پڑ گئی ہیں جو سیاہ دوپٹوں کے آنچل میں ڈھکی ہیں اور جن کے جسم پر سیاہ لباس ہیں جو سوگ کی علامت ہے۔

ظالموں نے اس قدر قہر برپا کیا ہے کہ ماؤں کی چھاتی کا دودھ سیاہ پڑ گیا ہے اور ان کی گود میں بچے بھی سیاہ پڑ گئے ہیں۔ تاریک فضا میں زہر میں بجھے تاریکی کے تیر دلوں کو چھلنی کر رہے ہیں۔ ظالموں کے سیاہ ہاتھ معصوموں کی سیاہ گردنوں پر ہیں اور ان کے جسم پر کوڑوں کے سیاہ نشان ہیں اور ان کے بدن پر زخموں کی سیاہی بربریت کی داستان کہہ رہی ہے۔ چاروں طرف کی تاریکی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دور غلامی اور بے ضمیری کا دور ہے۔ اسی لیے اس عالم میں ہر شخص روشنی سے کترا رہا ہے اور غیرت و ندامت سے سیاہی میں اپنا منہ چھپائے پھر رہا ہے۔ ایسے میں شاعر کو صبح انقلاب کی روشنی کی تلاش ہے جو انسان کے ضمیر کو غیرت اور عظمت انسانی کا نور عطا کرے۔ اسی اندھیرے سے دو شکلیں ابھرتی ہیں۔ یہ شکلیں جاوید اور مریم کی ہیں جو دولہا، دولہن کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔

غور طلب ہے کہ اردو شاعری میں پہلی بار عورت کی ایسی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جو عظمتِ انسانی کے تحفظ کے لیے مرد کے شانہ بہ شانہ اس جدوجہد میں کسی قدر پست یا کمزور نہیں ہے۔ اس موقعے پر مجاز کے خوابوں کی اس انقلابی عورت کی تصویر بھی ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہے جس کے آنچل کو انقلابی پرچم کی شکل میں دیکھنے کی تمنا ہے۔

جاوید، مریم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو مجھ سے اس قدر کیوں شرما رہی ہے۔ بھلا گل کو نسیم سحر سے حجاب کیسا؟ اس منظر نامے سے ابھرنے والی تصویر میں صرف مرد اور عورت کے عشقیہ جذبات نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے آنے والے زمانے کا خواب ہے۔ جاوید مریم کی پلکوں میں حیا اور رُخ پر حسن و محبت کا جو ہالہ دیکھ رہا ہے وہ اس کے خوابوں کے ہندوستان کی تصویر ہے۔ ہندوستان کا روشن مستقبل ہی اس کی زندگی کا اُجالا ہے۔ وہ کہتا ہے:

ترے رُخ پر یہ حسن و محبت کا ہالہ
یہی ہے مری زندگی کا اُجالا

جو ہاتھوں کو رنگ حنا مل گیا ہے
ہتھیلی پہ گویا کنول کھل گیا ہے
محبت کی راتوں کی قندیل تو ہے
جوانی کے خوابوں کی تکمیل تو ہے

مریم زیرِ لب مسکراتی ہے تو شاعر کہتا ہے:

تری مسکراہٹ میں کیا دل کشی ہے
یہ پھولوں پہ سوئی ہوئی چاندنی ہے
مگر روح کی پیاس کیوں کر بجھے گی ؟
سمندر سے کیا صرف شبنم ملے گی؟

یہاں سمندر سے پیاسے کو شبنم ملنے کا خیال نہ صرف اقبال کی یاد کو تازہ کرتا ہے بلکہ وہ اپنی مریم یعنی ہندوستان کو ہر اعتبار سے خوش حال دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا صرف یہی نصب العین ہے کہ غلام ہندوستان آزاد ہو، نہ صرف انگریزوں کی بربریت سے بلکہ ہر طرح کے استحصال سے۔ اسے غلامی سے پہلے کے ہندوستان کی یاد آتی ہے اور کہتا ہے:

ہمارے دلوں کی ہے حسرت پرانی
ہماری شراب محبت پرانی
وہ گزری ہوئی شام ہے یاد اب تک
وہ ہے میرے سینے میں آباد اب تک
دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا
فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
سمجھ کر نگاہوں کا پیغام ہم نے
محبت کا پہلا پیا جام ہم نے
اسی جام نے ہم کو سرشار رکھا

ہماری تمنا کو بیدار رکھا
جدائی میں بھی صبر کرنا سکھایا
ہمیں آگ پر سے گزرنا سکھایا

یعنی یہاں شاعر ماضی سے عہد حاضر کی طرف آتا ہے۔ غلامی کی زنجیر توڑ کر آزادی کا خواب دیکھتا ہے۔ اسی آزادی کی جدو جہد میں اپنے صبر و استقلال کا ذکر بھی کرتا ہے اور آزمائشوں سے گزرنے کا بھی۔ وہ "گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے" والے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ مریم کو دیکھتا ہے اور مریم اسے۔ مریم کی آنکھوں سے دو چمکتے ہوئے آنسو ٹپکتے ہیں۔ وہ کہتی ہے:

مری ساری دولت محبت کے آنسو

لیکن سردار ان محبت کے آنسوؤں میں نہ خود ڈوبتے ہیں اور نہ اپنی مثالی عورت کو ڈوبنے دیتے ہیں۔ یہاں ان کا وہ مارکسی نظریہ انھیں تقویت بخشتا ہے جس کے تحت عورت سماج کی دبی کچلی شے نہیں۔ وہ مرد کے شانہ بہ شانہ انقلابی سرگرمیوں میں اس کی شریک ہی نہیں بلکہ کہیں تو مرد سے بھی برتری حاصل کرتی ہے۔ اس کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، اس لیے وہ مرد سے کئی معنوں میں افضل بھی ہے۔ وہ کہتی ہے:

یہ مانا محبت کی منزل ہے عورت
تڑپتا مچلتا ہوا دل ہے عورت
'پر اس کے زمان و مکاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'
ابھرتی ہوئی وقت کے ساحلوں سے
گزرتی ہے وہ کتنی ہی منزلوں سے
کبھی جام بن کر چھلکتی ہے عورت
کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت
تبسم نہیں صرف، تلوار بھی ہے
وہ نغمہ نہیں صرف، جھنکار بھی ہے
محبت کی مسند پہ حسن و جوانی

شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی
وہ شمع شبستاں ہے نورِ سحر ہے
وہ ہر گام پر مرد کی ہم سفر ہے
مگر سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ ماں ہے
وہ تخلیق کے دل کا سوزِ نہاں ہے
جس آنچل کو بچے پہ وہ ڈالتی ہے
جس آغوش میں طفل کو پالتی ہے
اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ
وہ آغوش تہذیب کا گاہوارہ

یہاں سردار جعفری عورت کی وہ تصویر پیش کرتے ہیں جس کی بنیاد ہزاروں سال کی تہذیبی وراثت پر بھی ہے۔ یہاں عورت ایک دبی کچلی اور کمزور مخلوق نہیں ہے جس کا ثبوت ہر دور کی تاریخ میں نمایاں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "جب تک عورت کو معاشی آزادی نہیں ملے گی اور وہ وسیع سماجی آزادی میں اپنا حصہ حاصل نہیں کرے گی، تب تک عشق اور حسن دونوں بیمار رہیں گے"۔ اور یہی وہ عورت ہے جو 'نئی دنیا کو سلام' میں نئی نسل کی پرورش کرتی نظر آتی ہے جس پر اس کے شوہر کو فخر ہے۔ وہ کہتا ہے:

کونپل تھی کل، اب ہے پھولوں کی ڈالی
تو ہے میرے بچے کی ماں بننے والی

اور آنے والے ہندوستان کا مستقبل مریم کی کوکھ میں انگڑائیاں لے رہا ہے جس کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

رگ و پے میں کوئی سمایا ہوا ہے
مری روح پر رنگ چھایا ہوا ہے
کوئی دل میں انگڑائیاں لے رہا ہے
مرے خون میں کشتیاں کھے رہا ہے
ہو ناچتا ہے رگیں ٹوٹتی ہیں
مرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں

نظم کی تیسری تصویر آزادی اور انقلاب کے خوابوں کی تصویر ہے۔ صرف سخن فہمی میں ہی نہیں بلکہ شعر گوئی میں بھی سردار جعفری اقبال سے کس قدر متاثر ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کے شعر سے آغاز کرتے ہیں.

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

مریم پھٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑوں سے اپنے ہونے والے بچے کے لیے ایک کرتا سی رہی ہے اور کپڑے کے یہ ٹکڑے کئی رنگوں کے ہیں۔ پھٹے ہوئے کپڑے کے ٹکڑوں سے ہندوستانی عوام کی حالت زار کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، لیکن مفلسی کے اس عالم میں زندگی کے مختلف رنگ ہیں جو پیوندکاری میں بھی رنگا رنگی کا ثبوت ہے۔ وہ چمن جس میں بلبل کا نغمہ گونج رہا ہے، جس کے اک اک شرار میں ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں، جس کی نیلگوں فضاؤں پر بشر کے نام کاسکہ ہے، جو کہکشاں کے دوش پر سوار ہے اور ساتھ میں یہی آدمی توہمات کی سیاہی بھی ڈھو رہا ہے اور خوشی کی مے میں اپنے غموں کو ڈبو رہا ہے اور وہ زمین جو بہشت کی مانند ہے اسی زمین پر غلام قوم کی زندگی گھٹی ہوئی ہے.

مگر غلام قوم کی گھٹی ہوئی ہے زندگی
مثالِ شمعِ مفلسی بجھی ہوئی ہے زندگی
سیاہیوں کے درمیاں گھری ہوئی ہے زندگی

اگرچہ یہ جہانِ آب و گِل بہت حسین ہے
مگر غموں سے چور چور شیشۂ زمین ہے

اسی عالم میں شور بلند ہوتا ہے نعروں کا اور بندوقوں کے چلنے کی آوازیں آتی ہیں۔ مریم کہتی ہے

ہر طرف شورِ محشر بپا ہے
شہر میں جانے کیا ہو رہا ہے

جاوید داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے:

دیکھ اس ننھی منّی سی جان کو

جو ترے دل کے نیچے ترے نرم اور گرم پہلو کے گہوارے میں
بے خبر سو رہی ہے
جس کے جسم اور جاں کی ترے خون سے
پرورش ہو رہی ہے
جب وہ دنیا میں آئے گا تو ممتا کی محبت
تیرے شفاف سینے سے اک دودھ کی نہر بن کر بہے گی

جب وہ سوتے میں دیکھے گا، پریوں کے خواب
اور آہستہ سے، زیر لب مسکرائے گا، تو تجھ کو معلوم ہوگا، کہ ان ننھے
معصوم ہونٹوں میں، دنیا کے سارے خزانے سمٹ
آئے ہیں

لیکن اس ملک میں جس کو ہندوستان کہتے ہیں
یہ خوشی بھی میسر نہیں ہے
ہر طرف کال کی آندھیاں چل رہی ہیں
خاک سے اٹھ رہے ہیں وباؤں کے کالے بگولے

اور پھر تو بھی مریم
میری مریم
میرے بچے کی ماں
تو بھی بنگال کی سینکڑوں عورتوں کی طرح اپنے روتے ہوئے
لال کو، دل کے ٹکڑے کو، سنسان راہوں کی جلتی

ہوئی خاک پر ڈال کر بھاگ جائے گی ان قحبہ خانوں
میں، جن میں کہ روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے
کی خاطر جواں عصمتیں گوشت کے لوتھڑوں کی طرح
بک رہی ہیں

اسی مایوسی کے عالم میں امید کی کرن نظر آتی ہے اور جاوید کہتا ہے:

گولیاں سنسناتی ہیں اڑتے ہیں پرچم
بادشاہی کے گھر میں ہے ماتم
موت کی چھاؤں میں زندگی رقص فرما رہی ہے

اور مریم مرحبا کہتی ہے۔ جاوید عہدِ نو کا اعلان کرتا ہے جو دولتیں، برکتیں، راحتیں اور لذتیں لے کر آرہا ہے۔ انقلابیوں کے نعرے فضا کو معطر کر رہے ہیں اور سب کے دلوں میں ایک نئے سویرے کا خواب مچل رہا ہے اور ملک کے سنگ اور خشت میں، سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں، کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ ہندوستانی عوام مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ حسیں بوستاں ہمارا ہے اور ہمیں جینے کا حق یعنی آزادی چاہیے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نظم میں مریم ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو زندگی کی دوڑ میں ہر قدم پر اپنے شوہر کے ساتھ ہے۔ وہ بالائے بام پر نہیں ہے اور نہ ہی چلمن سے جھانک رہی ہے۔ وہ سماجی حقائق سے آنکھیں ملا کر تمام مسائل کا مقابلہ کرتی ہے۔ برطانوی حکمرانوں کی طرف سے جاوید اور مریم پر بغاوت کا مقدمہ چلتا ہے۔ فرنگی مریم سے پوچھتا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے تو وہ کہتی ہے کہ جب سے فرنگی آئے ہیں، گھر کی ساری برکتیں اٹھ گئی ہیں۔ وہ کہتی ہے:

تم نے پھولوں کو کھلنے، ہواؤں کو چلنے سے روکا
تم نے چشموں کو بہنے سے، فواروں کو رقص کرنے سے روکا
اور دریاؤں میں زہر گھولا

جاوید کہتا ہے:

پھر بھی تم امن و تہذیب و اخلاق کا نام لے کر

اک نیا جال پھیلا رہے ہو

ساری دنیا کو بہکا رہے ہو۔

برطانوی حکومت کی طرف سے جاوید کو پھانسی اور مریم کو قید کی سزا سنانے پر مریم کہتی ہے:

ایسے ایوان عدل و صداقت پہ لعنت

ایسی ظالم حکومت پہ لعنت

جاوید کو موت کی سزا ہونے پر مریم کو اس بات کا ملال ہے کہ اس کو بھی جاوید کی طرح اپنی جاں نثار کرنے کا موقع کیوں نہیں ملا۔ وہ تمنا کرتی ہے کہ کاش میرا لہو بھی کام آتا۔ اس کی آنکھوں میں موت کا خوف نہیں ہے بلکہ انقلاب کی خاطر قربانی کا جذبہ ہے۔ کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی میں یقین رکھنے والا جاوید مریم کو سمجھاتا ہے۔ خدمت ملک و قوم کے طریقے صرف جان دینے کے نہیں بلکہ اور بھی ہیں۔ یعنی مریم کے سامنے آج سب سے بڑا انقلابی فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی کوکھ میں پل رہے اس روشن مستقبل کو جنم دے اور اس کی پرورش کرے۔ کیوں کہ

کل کا انداز کچھ اور ہوگا

بزم میں اک نیا راگ ہوگا

جنگ ہوگی نہ پیکار ہوگی

تو مسرت سے سرشار ہوگی

وہ مستقبل کے ہندوستان میں کارخانوں سے نغموں کے طوفان کی آمد اور غریبوں کے سوکھے زرد چہروں پر زندگی اور آسودگی کا رنگ دیکھتا ہے۔ پھانسی پر چڑھتے وقت مریم کو ہر طرف اندھیرا نظر آتا ہے لیکن جاوید اس کو ڈھارس بندھاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس اندھیرے کے پیچھے ایک نیا سویرا چھپا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مریم اہل وطن کو یہ بتائے کہ مرتے وقت اس کے چہرے پر موت کا خوف نہیں تھا۔ اور یہ منظر ہمیں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کی یاد دلاتا ہے۔

چھٹا منظر مریم کے نوحے سے شروع ہوتا ہے جو ہندوستان پر شہید ہوئے سپاہی کو یاد کرتی ہے جس کی صورت دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ یہاں وہ اپنے عاشق جاوید کی شکل دیکھنے کی منتظر نہیں ہے بلکہ اس کے خوابوں کی تعبیر کی منتظر ہے۔ اسی انتظار اور نوحہ خوانی کے عالم میں نامہ بر آتا ہے جس کے پاس جاوید کا

علی سردار جعفری

ُخری پیغام ہے، جو اس کے بچے کے نام ہے جو ابھی بھی مریم کے بطن میں ہے۔ نامہ بر کہتا ہے کہ وہ بچہ جو
س کے پہلو میں نہاں ہے وہی عہد نو کا مبارک نشان ہے، جو آنے والے ہندوستان کی نئی نسل ہے۔ وہ بتاتا
ہے کہ اس کے شوہر نے مرتے مرتے اس کا نام لیا پھانسی کی رسی چوم کر آنے والی سحر کی خبر بھی دی۔ وہ
پریشان نہیں تھا بلکہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی کیوں کہ اس کا دل امیدوں اور امنگوں سے لبریز تھا اور
روشن مستقبل پر یقین کامل رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ظلم کی رات ختم ہوگی اور نیا سویرا، نئی خوشیاں لے کر
آئے گا اور تمام محنت کش اور امن پسند لوگ آزاد ہندوستان کی ہوا میں سانس لیں گے۔ اس میں تھوڑی
دیر ہو سکتی ہے کیوں کہ ابھی اس کے نقش و نگار بن رہے ہیں اور جس کا سارا زمانہ انتظار کر رہا ہے۔ اسے
اس بات کا یقین ہے کہ اس کا بچہ وہ سب کچھ حاصل کرے گا جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے:

جہانِ کہن کا یہ دستور ہے
سیاہی کے آغوش میں نور ہے
اگر دل میں ہے آرزو کا سرور
تو ہے زندگی نغمہ و رنگ و نور

سردار جعفری کا مستقبل میں یقین جاوید کی شکل میں کسی بھی قیمت پر آدمی کو ہار ماننے سے روکتا ہے
اور اس کی ہمت کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ زندگی کی محرومیوں سے مایوس نہیں ہوتا اور ہر دور کے انسان کو سعی
پیہم کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ ہزاروں سال کا بار گراں اٹھائے ہوئے ہماری انسانی تہذیب جن ادوار سے
گزرتی ہے وہ اپنے پیچھے نہ صرف ماضی کی داستانیں چھوڑتی ہے بلکہ زندگی کے نئے رموز سے پردہ بھی اٹھاتی
ہے۔ زندگی کی شمعیں روشن کرتی ہے۔ اس کے پیچھے چنگیز، نادر اور تیمور کی داستان کے ساتھ غلاموں اور
کنیزوں کی لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں ہیں جو کبھی اسپارٹکس کی شکل میں تو کبھی فرہاد و منصور کی شکل میں
زندگی کو روشنی بخشتی اور دنیا کو جمود سے بچاتی ہیں۔ ہزاروں سال کا بار گراں اٹھائے اس نسل انسانی کو نئے
افق سے نئے قافلوں کی آمد کا انتظار ہے، جنھوں نے چراغ وقت کی لو سے انقلاب کے لشکر سجا رکھے ہیں اور
جن کے پاؤں زمین پر ضرور ہیں لیکن ان کی نظریں آسمان کی بلندیوں پر لگی ہیں۔ جن کی ہتھیلیوں میں
آفتاب اور مہتاب کی روشنی ہے اور اس کرۂ ارض کو تابناک بنا رہے ہیں۔ شاعر دعوت دیتا ہے:

اٹھو اور اٹھ کے انھیں قافلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گرد سفر بنائے ہوئے

آرزوئے تشنہ لبی

خشکیٔ لب ہے نہ اب دیدۂ تر باقی ہے
جانے کیا ہوگئے وہ عہدِ گزشتہ کے رفیق
وقت نے چھین لیا بھوک کا فاقوں کا غرور

وہ جو اُٹھے تھے زمانے کو بدلنے کے لیے
ایسے بدلے ہیں کہ حیراں ہیں نگاہیں سب کی
زیرِ پا مخملِ آسودہ خرامی کا ہے فرش
زیب تن خلعتِ پشمینۂ دریوزہ گری
دل ہے یا تمغۂ خوں گشتۂ آوازِ ضمیر

جن میں تلوار تھی اُن ہاتھوں میں اب ساغر ہیں
جن میں شفقت تھی اُن آنکھوں میں رعونت اب ہے
اور اُن سوکھے ہوئے ہونٹوں کو تر رکھتے ہیں
چند خیرات میں بخشی ہوئی مَے کے جرعے
دوستو جراتِ شعلہ طلبی لے کے اُٹھو
آج پھر آرزوئے تشنہ لبی لے کے اُٹھو

۱۹۶۶ء

آنسوؤں کے چراغ

ہندوستان کے شرنارتھیوں اور
پاکستان کے مہاجرین کے نام

مَیں سُن رہا ہو
وہ سسکیاں جو زمیں کے سینے میں
داغِ غم بن گئی ہیں
وہ ہچکیاں جن کے سخت پھندے
رباب و بربط کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں
وہ آہیں جو ظالموں کے ڈر سے
دلوں میں محبوس ہوگئی ہیں
وہ چیخیں جو مادرِ وطن کی
جراحتوں کے ہجوم میں جا کے کھوگئی ہیں
وہ گیت جو نوحہ و فغاں کے
سیاہ خانوں میں چھپ گئے ہیں
وہ نغمے جو فریب کاری کے سبز باغوں میں سو گئے ہیں
وہ سازشیں جن کا زہر کام و دہن کو بیکار کر چکا ہے
وہ عہد ے جن کا نکیلا نشتر رگوں کے اندر اُتر چکا ہے

وہ عہد و پیماں
کہ جن کے حرفوں سے وقت و تاریخ کی جبیں پر
سیاہ دھبے پڑے ہوئے ہیں

(۲)

یہ کون ظالم ہے جس نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
یہ کیا ہوا کہ یک دم سے محفل میں سارے ساتھی کے لاگ بدلے
قدامتوں کے کھنڈر میں ماضی کے بھوت دیوانہ وار ناچے
بہار کے سرخ آنچلوں سے خزاں کے بیمار رنگ برسے

سحر کی رنگین وادیوں میں سیہ بگولے مچل رہے ہیں
ہزاروں سورج نکل نکل کر گہن کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں
ہرے بھرے کھیت گرم شعلوں کے پیرہن میں دہک رہے ہیں
شگوفے لپٹے ہوئے دھوئیں کے سیہ کفن میں سلگ رہے ہیں
کٹے ہوئے ہاتھ اپنی باہوں سے راہ روکے کھڑے ہیں
پھٹے ہوئے آنچلوں کے ٹکڑوں میں عصمتوں کی جوان لاشیں
چھدی ہوئی دھرم اور مذہب کے تنجروں میں دلوں کی قاشیں
کٹی ہوئی چھاتیوں کی نس نس سے خوں بن کے رس رہا ہے

(۳)

یہ رات کس قدر بھیانک
یہ خواب کس قدر پریشاں
ہزاروں سہمی ہوئی نگاہیں
بلکتی آنکھیں سسکتی پلکیں

اندھیری شب میں
کروڑوں اشکوں کے جھلملاتے چراغ لے کر
ہجوم میں قاتلوں کے انصاف کے فرشتے کو ڈھونڈتی ہیں

مگر مَیں یہ پوچھتا ہوں تم سے
شریف بہنو!
غیور ماؤ
تمہاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے
یہ آنسوؤں کا وفور کیوں ہے؟

مَیں جانتا ہوں
تمہارے سینے میں، دل میں،
زخموں میں کتنے آنسو بھرے ہوئے ہیں
تم اُن کی بوندوں سے آسمان و زمیں کا دامن بھگو چکی ہو
تم اس طلاطم میں وندھیا اور ہمالیہ کو ڈبو چکی ہو
مگر یہ خونابہ بار آنکھوں کی بہتی گنگا
زمیں پہ پھیلے ہوئے لہو کے سیاہ دھبے نہ دھو سکے گی
یہ جھلملاتے ہوئے دیے ہیں
جو ظلم کے جھکڑوں، مصیبت کی آندھیوں میں نہ جل سکیں گے
تم ان کی مدھم سی روشنی میں
حسین انصاف کے فرشتے کو کب تلک ڈھونڈتی رہو گی
کہ وہ بھی اس مقتلِ وطن میں
تمہاری ہی طرح زخم خوردہ ہے اور آوارہ پھر رہا ہے

(۴)

یہ کس سے فریاد کر رہی ہو؟
یہ کس کو آواز دے رہی ہو؟
تم اپنے زخموں کی راکھیاں لے کے کس کی محفل میں جا رہی ہو

تمہارے یہ راہبر نہیں ہیں
تمہارے یہ دادگر نہیں ہیں
یہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کو
سیاسی پردوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے مداری
سفید ریشم کی ڈوریوں پر نچا رہے ہیں
یہ سامراجی بساطِ شطرنج کے پیادے ہیں جن کو شاطر
ہزاروں چالوں سے شاہ و فرزیں بنا بنا کر چلا رہے ہیں
یہی تو ہیں وہ جنھوں نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
انھیں نے محفل کے ساز بدلے
انھیں نے سازوں کے راگ بدلے
یہی تو ہیں جو تمہارے اشکوں سے اپنے موتی بنا رہے ہیں
یہ قصر وہ ہے کہ جس کی دیوار و در میں
صدیوں کی لعنتیں بس کے رہ گئی ہیں
یہ تاج وہ ہے کہ جس کی ضو میں
وطن کے چہرے کا رنگ تحلیل ہو گیا ہے
یہ تخت وہ ہے کہ جس کے پائے
ہمارے دل میں گڑے ہوئے ہیں
یہ فرش وہ ہے جہاں فرنگی کے بھوت دن رات چل رہے ہیں
یہاں شہیدوں کا خوں چھلکتا ہے موجِ رنگِ شراب بن کر
یہاں بلکتا ہے دردِ دل کا سرود و چنگ و رباب بن کر
یہاں امیدوں کے پھول اور آرزو کے غنچے نہ کھل سکیں گے
یہاں تمہیں عدل اور انصاف کے فرشتے نہ مل سکیں گے
یہ ظالموں کا محل ہے یہ قاتلوں کا مسکن ہے یہ لٹیروں کی انجمن ہے

(۵)

شریف بہنو، غیور ماؤ
تمہارے بھائی
تمہارے بیٹے
تمہارے فریاد سن رہے ہیں
ملوں سے کھیتوں سے اور کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں
وہ دیکھو اُن کے جوان سینوں میں
عدل اور انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے
نگہ میں بجلی چمک رہی ہے
اندھیرے شب سے پرے شفق کی سنہری مینا چھلک رہی ہے
وہ اپنے سینوں کا سوز لائیں
مَیں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے
کہ جس کے منحوس دامنوں میں
گناہ پروان چڑھ رہے ہیں

☆☆

(۴)

یہ کس سے فریاد کر رہی ہو؟
یہ کس کو آواز دے رہی ہو؟
تم اپنے زخموں کی راکھیاں لے کے کس کی محفل میں جا رہی ہو

تمہارے یہ راہبر نہیں ہیں
تمہارے یہ دادگر نہیں ہیں
یہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کو
سیاسی پردوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے مداری
سفید ریشم کی ڈوریوں پر نچا رہے ہیں
یہ سامراجی بساطِ شطرنج کے پیادے ہیں جن کو شاطر
ہزاروں چالوں سے شاہ و فرزیں بنا بنا کر چلا رہے ہیں
یہی تو ہیں وہ جنھوں نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
انہیں نے محفل کے ساز بدلے
انہیں نے سازوں کے راگ بدلے
یہی تو ہیں جو تمہارے اشکوں سے اپنے موتی بنا رہے ہیں
یہ قصر وہ ہے کہ جس کی دیوار و در میں
صدیوں کی لعنتیں بس کے رہ گئی ہیں
یہ تاج وہ ہے کہ جس کی ضو میں
وطن کے چہرے کا رنگ تحلیل ہو گیا ہے
یہ تخت وہ ہے کہ جس کے پائے
ہمارے دل میں گڑے ہوئے ہیں
یہ فرش وہ ہے جہاں فرنگی کے بھوت دن رات چل رہے ہیں
یہاں شہیدوں کا خوں چھلکتا ہے موجِ رنگِ شراب بن کر
یہاں بلکتا ہے درد دل کا سرود و چنگ و رباب بن کر
یہاں امیدوں کے پھول اور آرزو کے غنچے نہ کھل سکیں گے
یہاں تمہیں عدل اور انصاف کے فرشتے نہ مل سکیں گے
یہ ظالموں کا محل ہے یہ قاتلوں کا مسکن ہے یہ لٹیروں کی انجمن ہے

(۵)

شریف بہنو، غیور ماؤ
تمہارے بھائی
تمہارے بیٹے
تمہارے فریاد سن رہے ہیں
ملوں سے کھیتوں سے اور کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں
وہ دیکھو اُن کے جوان سینوں میں
عدل اور انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے
نگہ میں بجلی چمک رہی ہے
اندھیرے شب سے پرے شفق کی سنہری مینا چھلک رہی ہے
وہ اپنے سینوں کا سوز لائیں
میں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تمتماتی سی سانس اندھیرے کو پھونک دیں گے
کہ جس کے منحوس دامنوں میں
گناہ پروان چڑھ رہے ہیں

اُردو

ہماری پیاری زبان اُردو

ہمارے نغموں کی جان اُردو

حسین و دلکش و جوان اُردو

زبان وہ دھل کے جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے

اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے

جو شعر و نغمہ کے خلد زاروں میں آج کوئل سی کوکتی ہے

اسی زباں میں ہمارے بچوں نے ماؤں سے لوریاں سُنی ہیں

جوان ہو کر اسی زباں میں کہانیاں عشق نے کہی ہیں

اسی زباں کے چمکتے ہیروں سے علم کی جھولیاں بھری ہیں

اسی زباں سے وطن کے ہونٹوں نے [illegible] پایا

اسی سے انگریز حکمرانوں نے خودسری کا جواب پایا

یہ اپنے نغمات پُر اثر سے دلوں کو بیدار کر چکی ہے

یہ اپنے نعروں کی فوج سے دشمنوں پہ یلغار کر چکی ہے

ستمگروں کی ستمگری پر ہزارہا وار کر چکی ہے

کوئی بتاؤ وہ کون سا موڑ ہے جہاں ہم جھجک گئے ہیں

وہ کون سی رزم گاہ ہے جس میں اہلِ اُردو بک گئے ہیں

وہ ہم نہیں ہیں جو بڑھ کے میداں میں آ کے ہیں اور ٹھٹھک گئے ہیں

یہ وہ زباں ہے کہ جس نے [illegible] کی تیرگی کے دیے جلائے

یہ وہ زباں ہے کہ جس کے شعلوں سے جل گئے پھانسیوں

کے سائے

فرازِ دار و رسن سے بھی ہم نے [illegible] کے گیت گائے

کہا ہے کس نے کہ ہم اپنے پیارے وطن میں بھی بے وطن رہیں گے

زبان چھن جائے گی ہمارے دہن سے ہم بے سخن رہیں گے

ہم آج بھی کل کی طرح دل کے ستار پر نغمہ زن رہیں گے

یہ کیسی بادِ بہار ہے جس میں شاخِ اُردو نہ پھل سکے گی

وہ کیسا روئے نگار ہوگا نہ زلف جس پر مچل سکے گی

ہمیں وہ آزادی چاہیے جس میں دل کی مینا اُبل سکے گی

ہمیں یہ حق ہے ہم اپنی خاکِ وطن میں اپنا چمن سجائیں گے

ہماری ہے شاخِ گل تو پھر کیوں نہ اُس پہ ہم آشیاں بنائیں

ہم اپنے انداز اور اپنی زباں میں اپنے نہ گیت گائیں

کہاں ہو متوالو آؤ بزمِ وطن میں ہے امتحاں ہمارا

زبان کی زندگی سے وابستہ آج سود و زیاں ہمارا

ہماری اُردو رہے گی باقی اگر ہے ہندوستاں ہمارا

چلے ہیں گنگ و جمن کی وادی میں ہم ہوائے بہار بن کر

ہمالیہ سے اُتر رہے ہیں ترانۂ آبشار بن کر

رواں ہیں ہندوستاں کی رگ رگ میں خون کی سُرخ دھار بن کر

[illegible] نعرہ انقلاب تحریک آزادی کا سب سے مشہور نعرہ اُردو زبان ہی کی دین ہے۔

[illegible] اُردو کے متعدد ادیب اور شاعر قید فرنگ میں رہے ہیں

[illegible] کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

خدا کے حضور میں

"اے اَنفس و آفاق میں پیدا تری آیات"
"حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات"
دنیا میں ترے نام پہ برپا ہے قیامت
ژولیدہ ہیں اربابِ بصیرت کے خیالات
ہے دھرم سیاست کے مداری کا کھلونا
مذہب کو بنا رکھا ہے یاروں نے خرافات
سینوں میں نہیں اِسمِ محمدؐ کا اُجالا
کانوں میں تو آوازِ اذاں آتی ہے دن رات
جپتے ہیں تیرے دھیان سے جب رام کی مالا
کچھ اور بگڑ جاتے ہیں اس ہند کے حالات
ہیں اور بھی مخصوص امامانِ سیاست
مردانِ خود آگاہ نہ رندانِ خوش اوقات
انساں کو بنا دیتے ہیں انسان کا دشمن
جب ہند کی تاریخ پہ لکھتے ہیں مقالات
نفرت ہے ہر اِک حرف تو لعنت ہے ہر اک لفظ
خوں ریز ہے ہر غمزہ، تو خونخوار ہے ہر بات
یہ نقش و نگار، در و دیوار شکستہ
فرسودہ روایات کی فرسودہ حکایات
ماضی کے پرستاروں کے ڈنکوں کی صدائیں
گم ہو گئے مستقبلِ انسان کے نغمات
سٹہ ہے کہ پوجا ہے کہ مجرا کہ عبادت
اب قبلۂ حاجات ہیں ٹینکوں کی عبادات
ناداری و رسوائی ہے تصویرِ بشر کی
کی جاتی ہے فاقوں سے غریبوں کی مدارات
دے سکتے نہیں نان کا سوکھا ہو ٹکڑا
اُٹھتے ہیں چکانے کو جو صدیوں کے حسابات
ہر چیز ہے ڈوبی ہوئی سیلابِ بلا میں
تھمنے ہی کو آتی نہیں تقریروں کی برسات
بہتی ہے گلی کوچوں میں اب خون کی گنگا
شمشیر بکف پھرتے ہیں سڑکوں پہ فسادات
فرزیں بھی انہیں کے ہیں، پیادے بھی انہیں کے
شے پڑتی ہے لیکن نہیں ہوتی ہے کبھی مات
کب ڈوبے گا یہ ظلم و تشدد کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

فرشتوں کا گیت

"نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

مغرب شعلہ آرزو، کب سے ہے گرم جستجو
منزل شوق سے ہے دور مشرق ست گام ابھی

خوف سے سر جھکے ہوئے درد سے دل دکھے ہوئے
شعلہء جاں بجھے ہوئے، ذوقِ جنوں ہے خام ابھی

ہمت کم نہ پی سکی جامِ شرابِ آرزو
روح اسیرِ دامِ جہل، فکر و خرد غلام ابھی

وہم کہن میں مبتلا، علمِ نوی سے بے نیاز
سارے جہاں میں صبح ہے اُن کے دلوں میں شام ابھی

وسعتِ صحنِ آسماں، حسنِ فضائے بیکراں
کھول نہ سکا بال و پر طائرِ زیرِ دام ابھی

فرمان خدا

"اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو"
"کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو"

"جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی"
"اُس کھیت کے ہر خوشہء گندم کو جلا دو"

لیتے ہیں مرا نام جو طاقت کی ہوس میں
ان لوگوں کو ایوانِ سیاست سے اُٹھا دو

جو باعث فتنہ ہے وہ گھر میرا نہیں ہے
"میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو"

گر دل کے چراغوں میں کوئی نور نہیں ہے
"بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو"

انسان سے انسان ہے محروم ابھی تک
انسان کو انسان کی تصویر دکھا دو

چھایا ہے دماغوں پہ جہالت کا اندھیرا
جو روح پہ پردے ہیں تعصب کے ہٹا دو

کافر ہو کہ مومن ہو، وہ مخلوق ہے میری
تقسیم جو کرتی ہے وہ دیوار گرا دو

ہر چند یہاں سجدہ گہہِ اہلِ نظر ہے
اس خاک کو سجدہ گہہِ افلاک بنا دو

اقبالؔ کا پیغام حیاتِ ابدی ہے
اقبالؔ کا پیغام زمانے کو سنا دو

اس عہد میں ہیں علم و ہنر برقِ تجلی
انساں کے لئے ایک نیا طور بنا دو

نفرت کا بہت زہر پلایا ہے ابھی تک
اب پیار کی مَے پیار کے ساغر سے پلا دو

مسجد ہو کہ مندر ہو فقط کعبہء دل ہے
انسان کی تنویر کے فانوس جلا دو

بنیاد نئی عشق کے میخانے کی ڈالو
اور گردشِ افلاک کو پیمانہ بنا دو

لازم تو نہیں منبر و محراب کا سایہ
سجدوں کی حدیں وسعتِ گیتی سے ملا دو

بجلی کی طرح سر پہ گرے ظلم و ستم کے
وہ طرزِ نوا شاعرِ ہندی کو سکھا دو

☆☆☆

الوداع

الوداع اے سُرخ پرچم سرخ پرچم الوداع
اے نشانِ عزمِ مظلومانِ عالم الوداع

اے لباسِ آبروئے ابنِ آدم السّلام
اے ردائے سر برہنہ بنتِ مریم الوداع

اے فراتِ تشنہ کامانِ جہادِ زندگی
قلزمِ تشنہ لبی کی موجِ برہم الوداع

اے جلالِ کاوۂ آہن گر ضحاک کش[1]
اے زوالِ نخوتِ اسکندر و جم الوداع

آفتابِ بطنِ گیتی[2] کی شعاعِ شب شکن
اے مطلعِ انقلابِ دورِ عالم الوداع

اے خس و خاشاکِ گلشن کے لیے برقِ تپاں
روئے گل پر پرتوِ خورشید شبنم الوداع

اے غرورِ دستِ محنت اے شکوہِ بے نوا
حشر تک دنیا کرے گی تیرا ماتم الوداع

تو نے دیکھا ہے عروج اور تو نے دیکھا ہے زوال
کاش پھر آئے نہ خونباری کا موسم الوداع

دیدۂ پُرنم سے کل دل نے کہا تھا "مرحبا"
کہہ رہی ہے آج لیکن چشمِ پُرنم "الوداع"

جس کی چنگاری کا اک شعلہ تھی انگڑائی تری
دل میں روشن ہے وہ آتش خانۂ غم الوداع

رزم گاہِ خیر و شر میں یاد آئے گی تری
ہم ہیں اب اور لشکرِ ابلیسِ اعظم الوداع

۱۔ فردوسی کے شاہنامے میں ایک خونخوار بادشاہ ضحاک کا ذکر ہے جس کے شانوں پر دو سانپ تھے۔ وہ روزانہ دو انسانوں کا مغز کھاتے تھے۔ اس خونخوار بادشاہ کی سفاکی کے خلاف ایک لوہار نے بغاوت کی جو کاوہ آہن گر کے نام سے مشہور ہے۔ اُس نے اپنے پیر پر بندھے ہوئے چمڑے کو بھرے دربار میں نوچ کر اپنا پرچم بنایا تھا جو ایران کا قومی پرچم بن گیا اور درفشِ کاویانی کے نام سے معروف ہوا۔ ضحاک کو قتل کرنے کے لیے جو لشکر گیا تھا، اس کا پرچم آہن گر کا پرچم تھا۔

۲۔ اشارہ ہے اقبال کے شعر کی طرف جو انقلابِ روس کی تہنیت کا شعر ہے:

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا　　آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟　　(ستمبر ۱۹۹۱ء)

اودھ کی

خالد حسین

گزرتی برسات آتے جاڑوں کے نرم لمحے
ہواؤں میں تتلیوں کی مانند اُڑ رہے ہیں
مَیں اپنے سینے میں دل کی آواز سن رہا ہوں
رگوں کے اندر لہو کی بوندیں مچل رہی ہیں
میرے تصور کے زخم خوردہ
اُفق سے یادوں کے کارواں یوں گزر رہے ہیں
کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسماں سے
چمکتے تاروں کے مسکراتے ہجوم گزریں
مَیں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں
جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر
کہاں ہیں وہ دل نواز بانہیں
وہ شاخِ صندل
کہ جس پہ انگڑائیوں نے اپنے حسیں نشیمن بنا لئے ہیں
مَیں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں
مری بہن نے مجھے لکھا ہے
ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں اب بھی نہار رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں
ابھی وہ اپنی سریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہے ہیں
مَیں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں
جیسے مجھ کو اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولھوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی
چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں
یہ سادگی کس قدر حسیں ہے
مَیں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں
جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں اُٹھا لوں
اور اس کی شاداب لہلاتی جبیں کو
ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں

☆☆☆

ایک خواب اور

خواب اب حسنِ تصور کے اُفق سے ہیں پرے
دل کے اِک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب

اور تعبیروں کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
تشنگی آبلہ پا، شعلہ بکف، موجِ سراب

یہ تو ممکن نہیں بچپن کا کوئی دن مل جائے
یا پلٹ آئے کوئی ساعتِ نایابِ شباب

پھوٹ نکلے کسی افسردہ تبسم سے کرن
یا دمک اُٹھے کسی دستِ بریدہ میں گلاب

آہ پتھر کی لکیریں ہیں کہ یادوں کے نقوش
کون لکھ سکتا ہے پھر عمرِ گزشتہ کی کتاب

بیتے لمحات کے سوئے ہوئے طوفانوں میں
تیرتے پھرتے ہیں پھوٹی ہوئی آنکھوں کے حباب

تابشِ رنگِ شفق، آتشِ روئے خورشید
مَل کے چہرے پہ سحر آئی ہے خونِ احباب

جانے کس موڑ پہ کس راہ میں کیا بیتی ہے؟
کس سے ممکن ہے تمناؤں کے زخموں کا حساب

آستینوں کو پکاریں گے کہاں تک آنسو؟
اب تو دامن کو پکڑتے ہیں لہو کے گرداب

دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب

در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح اُن سے گریزاں ہیں جواب

سرکشی پھر مَیں تجھے آج صدا دیتا ہوں
مَیں ترا شاعرِ آوارہ و بے باک و خراب

پھینک پھر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند

☆☆☆

پتھر کی دیوار

کیا کہوں بھیانک ہے
یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری
کچھ پتہ نہیں چلتا
پھول بھی ہیں سائے بھی
خاک بھی ہے پانی بھی

آدمی محبت بھی
گیت بھی ہیں آنسو بھی
پھر بھی ایک خاموشی
روح و دل کی تنہائی
ایک طویل سناٹا
جیسے سانپ لہرائے

ماہ و سال آتے ہیں
اور دن نکلتے ہیں
جیسے دل کی بستی سے
اجنبی گزر جائے

چیختی ہوئی گھڑیاں
زخم خوردہ طائر ہیں
نرم رو سبک لمحے
منجمد ستارے ہیں
رینگتی ہوئی تاریخیں
روز و شب کی راہوں پر
ڈھونڈتے ہیں چشم و دل
نقشِ پا نہیں ملتے
زندگی کے گلدستے
زیبِ طاقِ نسیاں ہیں

پتیوں کی پلکوں پر
اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر
دھوپ پَر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں
پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر
دودھ جذب ہو جائے

روشنی کے گالوں پر
تیرگی کے ناخن کی
سیکڑوں خراشیں ہیں

پتھروں کی دیواریں
بارکوں کی تعمیریں
اژدہوں کے پیکر ہیں
جو نئے اسیروں کو
رات دن نگلتے ہیں
ان کے پیٹ کی دوزخ
کوئی بھر نہیں سکتا

پتھروں کی دیواریں

بھوک کا بھیانک روپ
چکیوں کے بھدے راگ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں
دال کے پیالوں میں
زرد زرد پانی ہے
چاولوں کی صورت پر
مفلسی برستی ہے
سبزیوں کے زخموں سے
پیپ سی ٹپکتی ہے

پتھروں کی دیواریں

درد و غم کے پیروں میں
آنسوؤں کی دیواریں
بے بسی کی محفل میں
حسرتوں کی تقریریں
رسیوں کی گانٹھوں میں
بازوؤں کی گولائی
نیم جان قدموں میں
بیڑیوں کی شہنائی
ہتھکڑی کے حلقوں میں
ہاتھ کسمساتے ہیں
پھانسیوں کے پھندوں میں
گردنیں تڑپتی ہیں

پتھروں کی دیواریں

جو کبھی نہیں روتیں
جو کبھی نہیں ہنستیں
ان کے سخت چہروں پر
رنگ ہے نہ غازہ ہے
کھردرے لبوں پر صرف
بے حسی کی مہریں ہیں

پتھروں کی دیواریں

پتھروں کے فرش اور چھت
پتھروں کی محرابیں
پتھروں کی پیشانی
پتھروں کی آنکھیں ہیں
پتھروں کے دروازے
پتھروں کی انگڑائی
پتھروں کے پنجوں میں
آہنی سلاخیں ہیں

اور ان سلاخوں میں
حسرتیں ، تمنائیں
آرزوئیں ، امیدیں
اشک، پھول اور شبنم
چاند کی جواں نظریں
دھوپ کی سنہری زلف
بادلوں کی پرچھائیں
صبح و شام کی پریاں
موسموں کی لیلائیں
سولیوں پہ چڑھتی ہیں
اور اس اندھیرے میں
سولیوں کے سائے میں
انقلاب پلتا ہے
تیرگی کے کانٹوں پر
آفتاب چلتا ہے

پتھروں کے سینے میں
سُرخ ہاتھ اُگتے ہیں
ہاتھ ہیں کہ تلواریں
رات کے اندھیرے میں
جیسے شمع جلتی ہیں
انگلیاں فروزاں ہیں
بارکوں کے کونوں سے
سازشیں نکلتی ہیں
خامشی کی نبضوں میں
گھنٹیاں سی بجتی ہیں

جانے کیسے قیدی ہیں
کس جہاں سے آئے ہیں
ناخنوں میں کیلیں ہیں
ہڈیاں شکستہ ہیں
نوجوان جسموں پر
پیرہن ہیں زخموں کے
جگمگاتے ماتھے پر
خون کی لکیریں ہیں
اشک، آگ کے قطرے
سانس تند آندھی ہے
بات ہے کہ طوفاں ہے
ابروؤں کی جنبش میں
عزم مسکراتے ہیں
اور نگہ کی لرزش میں

حوصلے مچلتے ہیں
تیوریوں کی شکنوں میں
نقشِ پا بغاوت کے
جتنا ظلم سہتے ہیں
اور مسکراتے ہیں
جتنا دُکھ اُٹھاتے ہیں
اور گیت گاتے ہیں
جبر اور بڑھتا ہے
ظالموں کی شدت پر
ظلم چیخ اُٹھتا ہے
ان کے لب نہیں ہلتے
اُن کے سر نہیں جھکتے
دل سے آہ کے بدلے
اِک صدا نکلتی ہے
انقلاب زندہ باد

خاکِ پاک کے بیٹے
کھیتیوں کے رکھوالے
ہاتھ کارخانوں کے
انقلاب کے شہپر
کوہسار کے شاہیں
پتھروں کے کوروں پر
آندھیوں کی راہوں پر
بجلیوں کی بارش میں
گولیوں کے طوفاں میں
سر اُٹھائے بیٹھے ہیں

انقلاب ساماں ہے
ہند کی فضا ساری
نزع کے ہے عالم میں
یہ نظامِ زرداری
وقت کے محل میں ہے
جشنِ نو کی تیاری
جشنِ عام جمہوری
اقتدارِ مزدوری
غرقِ آتش و آہن
بے کسی و مجبوری
مفلسی و ناداری
تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ کب
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہوجائے
انقلاب آ جائے

☆☆☆

تمہارا شہر

تمہارا شہر تمہارے بدن کی خوشبو سے
مہک رہا تھا، ہر اک بام تم سے روشن تھا
ہوا تمہاری طرح ہر روش پہ چلتی تھی
تمہارے ہونٹوں سے ہنستی تھیں نرم لب کلیاں
عطا ہوئی تھی سحر کو تمہاری سیم تنی
ملی تھی شام و شفق کو تمہاری گل بدنی

تمہارا نام تصور بھی تھا تخیل بھی
یقیں بھی، شوق بھی، امید بھی، تمنا بھی
سجی تھی زلفِ جواں آرزو کے پھولوں سے
"امیدوار تھے ہر سمت عاشقوں کے گروہ"

مگر یہ کیا ہے کہ ہر کوچہ آج ویراں ہے
گلی گلی میں ہیں فولاد پا سیہ عفریت
چمن چمن میں سڑی لاش کا تعفن ہے
ہوائیں گرم ہیں، بارود کا اندھیرا ہے
خبر نہیں کہ یہاں سے کدھر کو جانا ہے

تمہارا شہر تمہارے بدن کی خوشبو کو
ترس رہا ہے، ہر اک بام تیرہ ساماں ہے
نہ روشنی ہے، نہ نکہت، نہ نغمہ ہے نہ نوا
ہر اک روش پہ ہوا چل رہی ہے نوحہ کناں
سحر کی گل بدنی ہے، لہو کا پیراہن
نہ شام ہے نہ سحر، صرف ایک سیاہ کفن

تمہارے شہر کی عریانیوں کو ڈھانپتا ہے
خبر نہیں کہ یہاں سے کدھر کو جانا ہے
وہ اِک جلوس سا اِک موڑ پر نظر آیا
کوئی عظیم جنازہ گزرنے والا ہے
ہوا میں نالہ و فریاد کی ہے کیفیت
ہر اک آنکھ میں آنسو، ہر ایک ہونٹ پہ آہ
دلوں کا نوحہ، غم سسکیوں میں ڈھلتا ہے
وہ درد ہے کہ کوئی کھل کے رو نہیں سکتا

مگر جنازہ کہیں بھی نظر نہیں آتا
کفن فروش بھی ہیں، گورکن بھی ہیں لیکن
کوئی بتا نہیں سکتا کہ کس کی میت ہے
کوئی بتا نہیں سکتا کدھر گیا تابوت
کوئی بتا نہیں سکتا کہاں ہے قبرستان

چلو قریب سے دیکھیں یہ بدنصیب ہیں کون؟
کلرک ہیں جو ابھی دفتروں سے نکلے ہیں
تمام ایک سی شکلیں ہیں ہندسوں کی طرح
کسان ہیں جو ابھی کھیتیوں سے پلٹے ہیں
نکل کے آئے ہیں مزدور کارخانوں سے
اور اُن کی پشت پہ افسردہ کھولیوں کی قطار
سروں پہ اُڑتے دھوئیں کے سیاہ رنگ علم
برہنہ بچوں کے رونے کی دردناک صدا
جلوسِ غم ہے جنازہ بدوش چلتا ہے
مگر جنازہ کدھر ہے نظر نہیں آتا
خبر نہیں کہ یہاں سے کدھر کو جانا ہے ☆☆

حسین تر

کل ایک تو ہوگی اور اِک مَیں
کوئی رقیب رفیق صورت
کوئی رفیقِ رقیب ساماں
مرے ترے درمیاں نہ ہوگا

ہماری عمرِ رواں کی شبنم
تری سیہ کاکلوں کی راتوں
میں تار چاندی کے گوندھ دے گی
ترے حسین عارضوں کے رنگیں
گلاب بیلے کے پھول ہوں گے
شفق کا ہر رنگ غرق ہوگا
لطیف و پُر کیف چاندنی میں

تری کتابِ رُخِ جواں پر
کہ جو غزل کی کتاب ہے اب
زمانہ لکھے گا اِک کہانی
اور اَن گنت جھریوں کے اندر
مری محبت کے سارے بوسے
ہزار لب بن کے ہنس پڑیں گے

ہم اپنی بیتی ہوئی شبوں کی
سلونی پرچھائیوں کو لے کر
ہم اپنے عہدِ طرب کی شام و
سحر کی رعنائیوں کو لے کر
پرانی یادوں کے جسمِ عریاں
کے واسطے پیرہن بنیں گے

پھر ایک تو ہوگی اِک مَیں
کوئی رقیب رفیق صورت
کوئی رفیقِ رقیب ساماں
مرے ترے درمیاں نہ ہو ہوگا
ہوس کی نظروں کو تیرے رُخ پر
جمالِ نو کا گماں نہ ہوگا
فقط مری محسن آزمودہ
نظر یہ تجھ کو بتا سکے گی
کہ تیری پیری کا حُسن تیرے
شباب سے بھی حسین تر ہے

☆☆☆

دولتِ دنیا کا حساب

تم کہ ہو محتسبِ سیم و زر و لعل و گہر
مجھ سے کیا مانگتے ہو دولتِ دنیا کا حساب
چند تصویریں بتاں، چند حسینوں کے خطوط
چند ناکردہ گناہوں کے سلگتے ہوئے خواب

ہاں مگر اپنی فقیری میں غنی ہیں ہم لوگ
دولتِ دردِ دل و دردِ جگر رکھتے ہیں
خشکیِ لب ہے تو کیا دیدۂ تر رکھتے ہیں
اپنے قبضے میں نہیں اطلس و سنجاب و سمور
جسم پر پیرہنِ شمس و قمر رکھتے ہیں
گھر تو روشن نہیں الماس کے فانوسوں سے
قصر و ایواں کو جلا دیں وہ شرر رکھتے ہیں
جو زمانے کو بدل دے وہ نظر رکھتے ہیں

اِس خزانے میں سے جو چاہو اُٹھا لے جاؤ
اور بڑھ جاتا ہے یہ مال جو کم ہوتا ہے
ہم پہ ہر طرح زمانے کا کرم ہوتا ہے
شاخِ گل بنتا ہے جو ہاتھ قلم ہوتا ہے

☆☆☆

راج نراج

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
غالب

سنا ہے بندوبست اب سب بہ اندازِ دگر ہوں گے
ستم ہوگا محافظ، شہر بے دیوار و در ہوں گے
سزائیں بے گناہوں کو ملیں گی بے گناہی کی
کہ فردِ جرم سے مجرم کی منصف بے خبر ہوں گے
فقط مخبر شہادت دیں گے ایوانِ عدالت میں
فقط تیر و تبر، شمشیر و خنجر معتبر ہوں گے
سجائی جائے گی بزمِ عزا ایذا رسانوں سے
کفن پہنائیں گے جلاد، قاتل نوحہ گر ہوں گے
فلک تھرا اُٹھے گا جھوٹے ماتم کی صداؤں سے
یتیموں اور بیواؤں کے نالے بے اثر ہوں گے
منایا جائے گا جشنِ مسرت سونے کھنڈروں میں
اندھیری رات میں روشن چراغِ چشمِ تر ہوں گے

جو یہ تعبیر ہوگی ہند کے دیرینہ خوابوں کی
تو پھر ہندوستاں ہوگا، نہ اس کے دیدہ ور ہوں گے

☆☆☆

صبحِ فردا

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اِسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبحِ آزادی
یہ سرحد خون کی، اشکوں کی، آہوں کی، شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اُگائی تھیں

یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے تلملائے تھے
یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھلملائے تھے
یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اُگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار، میداں میں نکلتی ہے
مَیں اِس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

(۲)

یہ سرحد پھول کی، خوشبو کی، رنگوں کی بہاروں کی
دھنک کی طرح ہنستی، ندیوں کی طرح بل کھاتی
وطن کے عارضوں پر زلف کی مانند لہراتی
مہکتی، جگمگاتی ایک دولہن کی مانگ کی صورت
کہ جو بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے
مگر سیندور کی تلوار سے، صندل کی انگلی سے

یہ سرحد دلبروں کی، عاشقوں کی، بیقراروں کی
یہ سرحد دوستوں کی، بھائیوں کی، غم گساروں کی
سحر کو آئے خورشیدِ درخشاں پاسباں بن کر
نگہبانی ہو شب کو آسماں کے چاند تاروں کی
زمیں پامال ہو جائے بھرے کھیتوں کی یورش سے
سپاہی حملہ آور ہوں درختوں کی قطاروں کے

خدا محفوظ رکھے اس کو غیروں کی نگاہوں سے
پڑیں نظریں نہ اس پر خوں کے تاجر تاجداروں کی
نہ کچل دیں اس کو فولادی قدم بھاری مشینوں کے
کرے یلغار اس پر ضرب کاری دستکاروں کی
اُڑیں چنگاریاں کے پھول پتھر کے کلیجے سے
جھکے تیشوں کی محرابوں میں گردن کوہساروں کی
لبوں کی پیاس ڈھالے اپنے ساقی اپنے پیمانے
چمک اُٹھیں مسرت سے نگاہیں سوگواروں کی
محبت حکمراں ہو، حسن قاتل، دل مسیحا ہو
چمن میں آگ برسے شعلہ پیکر گل عذاروں کی
وہ دن آئے کہ آنسو ہو کے نفرت دل سے بہہ جائے
وہ دن آئے یہ سرحد بوسۂ لب بن کے رہ جائے

(۳)

یہ سرحد منچلوں کی، دل جلوں کی، جاں نثاروں کی
یہ سرحد سرزمینِ دل کے بانکے شہ سواروں کی
یہ سرحد کج کلاہوں کی، یہ سرحد کج اداؤں کی
یہ سرحد گلشنِ لاہور و دلی کی ہواؤں کی
یہ سرحد امن و آزادی کے دل افروز خوابوں کی
یہ سرحد ڈوبتے تاروں، اُبھرتے آفتابوں کی
یہ سرحد خوں میں لتھڑے پیار کے زخمی گلابوں کی

مَیں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

☆☆☆

فریب

ناگہاں شور ہوا
لو شبِ تارِ غلامی کی سحر آ پہنچی
انگلیاں جاگ اٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہ زن ہار گئے
راہ رو جیت گئے

قافلے دور تھے منزل سے، بہت دور، مگر
خود فریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے
چن لیا راہ کے روڑوں کو حذف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہ زن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں

ہم نشیں یہ تھا فرنگی کی فراست کا طلسم
رہبرِ قوم کی ناکارہ قیادت کا فریب
ہم نے آزردگیِ شوق کو منزل جانا
اپنی ہی گردِ سرِ راہ کو محمل جانا
گردشِ حلقۂ گرداب کو ساحل جانا

اب جدھر دیکھو اُدھر موت ہی منڈلاتی ہے
درودیوار سے رونے کی صدا آتی ہے
خواب زخمی ہیں، امنگوں کے کلیجے چھلنی
میرے دامن میں ہیں زخموں کے دہکتے ہوئے پھول
خوں میں لتھڑے ہوئے پھول
میں جنہیں کوچہ و بازار سے چن لایا ہوں
قوم کے راہبرو! راہزنو!
اپنے ایوانِ حکومت میں سجالو ان کو
اپنے گلدانِ سیاست میں لگالو ان کو

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی
تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
چند سکوں کے عوض، چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموسِ شہیدانِ وطن بیچ دیا
باغباں بن کے اُٹھے اور چمن بیچ دیا

(۲)

کون آزاد ہوا؟
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادرِ ہند کے چہرے پہ اُداسی ہے وہی

خنجر آزاد ہیں سینوں میں اُترنے کے لئے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گزرنے کے لئے

چور بازاروں میں بدشکل چڑیلوں کی طرح
قیمتیں کالی دکانوں پہ کھڑی رہتی ہیں
ہر خریدار کی جیبوں کو کترنے کے لئے

کارخانوں پہ لگا رہتا ہے
سانس لیتی ہوئی لاشوں کا ہجوم
بیچ میں اُن کے پھرا کرتی ہے بیکاری بھی
اپنا خونخوار دہن کھولے ہوئے

اور سونے کے چمکتے سکے
ڈنک اُٹھائے ہوئے پھن پھیلائے
روح اور دل پہ چلا کرتے ہیں
ملک اور قوم کو دن رات ڈسا کرتے ہیں

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمائے کے دلالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

بالیاں دھان کی گیہوں کے سنہرے خوشے
مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح
اجنبی دیس کے بازاروں میں بک جاتے ہیں
اور بدبخت کسانوں کی بلکتی ہوئی روح
اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

ہم کہاں جائیں کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم
کس کو سمجھائیں، غلامی کے گنہگار ہیں ہم

طوق خود ہم نے پہنا رکھا ہے ارمانوں کو
اپنے سینے میں جکڑ رکھا ہے طوفانوں کو

اب بھی زندانِ غلامی سے نکل سکتے ہیں
اپنی تقدیر کو ہم آپ بدل سکتے ہیں

(۳)

آج پھر ہوتی ہیں زخموں سے زبانیں پیدا
تیرہ و تار فضاؤں سے برستا ہے لہو
راہ کی گرد کے نیچے سے اُبھرتے ہیں قدم

تارے آکاش پہ کمزور حبابوں کی طرح
شب کے سیلاب سیاہی میں بہے جاتے ہیں
پھوٹنے والی ہے مزدور کے ماتھے سے کرن
سُرخ پرچم افقِ صبح پہ لہراتے ہیں

☆☆

فیض کے نام

کل تھا جب مَیں جیل میں تنہا
پتھر کے تابوت کے اندر
خاموشی کے سرد کفن میں
لپٹے ہوئے تھے نغمے میرے
کالی سلاخوں کے جنگل میں
دوستوں کی اور محبوبوں کی
کھوئی ہوئی تھیں سب آوازیں
تیرے نغمے ساتھ تھے میرے

اور تیری آواز کی شبنم
گھانس کے لب تر کر جاتی تھی
گل کے کٹورے بھر جاتی تھی
شام کی رنگت بن کر اکثر
روئے جہاں پر چھا جاتی تھی
چاندنی کا ملبوس پہن کر
آم اور املی کے پیڑوں پر
تھک کر جیسے سو جاتی تھی
اور مَیں تیرے نازک میٹھے
پیارے گیتوں کا گلدستہ

اپنے دھڑکتے دل سے لگائے
خوابوں کی نیلی وادی میں
آہستہ آہستہ چلتا
جیل سے باہر آجاتا تھا
ظلم کے دل پر چھا جاتا تھا

آج مگر تو قید ہے ساتھی
(کیسی ہے یہ قید کی دنیا؟
قلب و نظر کی محرومی ہے
تاریکی اور تنہائی میں
پتھر کی خاموش ہنسی ہے)

آج ہے جب تو جیل میں تنہا
مَیں اپنی آواز کا شعلہ
اور اپنی للکار کی بجلی
گیتوں کے ریشم میں رکھ کر
تیری خاطر بھیج رہا ہوں
یہ میری آواز ہے لیکن
صرف میری آواز نہیں ہے
جوشؔ، فراقؔ، آنندؔ اور بیدیؔ
عصمتؔ، ساحرؔ، کرشنؔ اور کیفیؔ
میری زباں سے بول رہے ہیں
ہند کے سارے لکھنے والے

ناچنے والے، گانے والے
اپنی محبت کے گلدستے
تیری جانب بھیج رہے ہیں
جلتی ہوئی یہ شاخ اُٹھا لے
دیکھ اس میں کیا پھول کھلے ہیں
شعلۂ بجلی، نغمہ بن کر
بچھڑے ساتھی آن ملے ہیں
دور ہے گو لاہور کی بستی
اُونچی زنداں کی دیواریں
ایک جھوٹے آئین کی سرحد
تپتا جنگل، جلتا پربت
دل اور روح کے بیچ میں حائل
پھر بھی کوئی دیوار نہیں جو
زخموں کو تقسیم کرے گی

میرے ہاتھ میں ہاتھ ہے تیرا
تیرے ہاتھ میں ہاتھ ہے میرا
سانس کا زیر و بم ہے یکساں
ہم آہنگ ہے چاپ قدم کی
ایک ہی جادہ ایک ہی منزل
ایک ہی لیلیٰ ایک ہی محمل
ایک ہی مقصد ایک ہی حاصل
میٹھا رہے راوی کا پانی

ٹھنڈی رہیں گنگا کی لہریں
گائے کے تھن سے دودھ کی دھاریں
ساون بھادوں بن کر برسیں
سبز رہیں کھیتوں کے آنچل
بجتی رہے بادل کی چھاگل
دل میں ہوک نہ اُٹھنے پائے
پیٹ میں بھوک نہ اُگنے پائے
گیہوں کا ہر خوشہ سر پر
زریں تاج پہن کر آئے
ماؤں کے سینے دودھ سے چھلکیں
ہنستی رہیں بچوں کی پلکیں
زلفوں کے گہرے سائے میں
رنگ برنگے آویزوں کے
ننھے ننھے جگنو چمکیں
چولہے دہکیں، روٹیاں مہکیں
شاخیں لہکیں، چڑیاں چہکیں
باہیں کھنکیں، چوڑیاں گائیں
شانوں پر آنچل لہرائیں
امن و اماں کا جشن منائیں

اپنا مقصد ایک ہے ساتھی
اس مقصد کے آگے سارے
ظالم، دشمن، ڈاکو، قاتل

سہمے ہیں، گھبرائے ہوئے ہیں
بستی بستی، جنگل جنگل
ظلم کے بادل چھائے ہوئے ہیں
زنجیروں کے کالے حلقے
ناگ ہیں پھن پھیلائے ہوئے ہیں

ظلم سے لیکن ڈرنا کیسا؟
موت سے پہلے مرنا کیسا؟
"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے"
"بول زباں اب تک تیری ہے"
بول کہ کس قاتل کا دامن
خونِ بہاراں سے رنگیں ہے
کس کی گردن میں ڈالر کے
سونے کی زنجیر پڑی ہے
کس نے امریکہ کے ہاتھوں
خاکِ وطن کو بیچ دیا ہے
بیٹی اور بہن کے آنچل
ماں کے کفن کو بیچ دیا ہے
کون ہے جو جنگی شعلوں میں
پاکستان کو جھونک رہا ہے
کون ہے جو اقبال کے دل میں
ظلم کی کیلیں ٹھونک رہا ہے
شاعر کی آواز کو کس کا
خونیں پنجہ گھونٹ رہا ہے
ریشم کے رومال میں کس کے
رنگ لہو کا چھوٹ رہا ہے
جیلوں کی دیوار میں یہ کون
انسانوں کے دل چُنتا ہے
کون ہے جو قانون سے اپنے
مکڑی کا جالا بُنتا ہے
کون اُجالے سے خائف ہے
کون انسانوں سے ڈرتا ہے
سورج کی کرنوں سے ہراساں
جنتا کی نظروں سے پریشاں
کس نے عدالت کا دروازہ
سنگینوں سے روک دیا ہے
یہ کس نے انصاف کے منہ میں
ظلم کا کپڑا ٹھونس دیا ہے

"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے"
"بول زباں اب تک تیری ہے"
"تیرا ستواں جسم ہے تیرا"
"بول کہ جاں اب تک تیری ہے"

☆؟

کربلا

(ایک رجز)

پھر العطش کی ہے صدا
جیسے رجز کا زمزمہ
پھر ریگِ صحرا پر رواں
ہے اہلِ دل کا کارواں
نہرِ فرات آتش بجاں
راوی و گنگا خونچکاں
کوئی یزیدِ وقت ہو
یا شمر ہو یا حُرملہ
اُس کو خبر ہو یا نہ ہو
روزِ حساب آنے کو ہے
نزدیک ہے روزِ جزا
اے کربلا! ہے کربلا!

(۲)

گونگی نہیں ہے یہ زمیں
گونگا نہیں ہے آسماں
گونگے نہیں حرف و بیاں
گونگی اگر ہے مصلحت
زخموں کو ملتی ہے زباں
وہ خود جو رزقِ خاک تھا
تابندہ ہے پائندہ ہے
صدیوں کی سفاکی سہی
انسان اب بھی زندہ ہے
زندہ ہے اعجازِ فغاں
ہر ذرّہ پامال میں
دل کے دھڑکنے کی صدا
اے کربلا! اے کربلا!

(۳)

عرشِ رعونت کے خدا
ارضِ ستم کے دیوتا
یہ ٹین اور لوہے کے بُت
یہ سیم و زر کے کبریا
بارود ہے جن کی قبا
راکٹ کی لَے جن کی صدا
طوفانِ غم سے بے خبر
یہ کم سواد و کم ہنر
نکلے ہیں لے کر اسلحہ
لیکن جل اُٹھا زیرِ پا
ریگِ نواحِ کاظمہ
ریگِ نواحِ نینویٰ
اندھی ہے مشرق کی ہوا
شعلہ فلسطیں کی فضا
اے کربلا! اے کربلا!

(۴)

یہ مدرسے دانش کدے
علم و ہنر کے میکدے
ان میں کہاں سے آگئے؟
یہ کرگسوں کے گھونسلے

یہ جہل کی پرچھائیاں
لیتی ہوئی انگڑائیاں
دانش ورانِ بے یقیں
غیروں کے دفتر کے امیں
الفاظ کے خوانچہ سرا
ان کے تصرف میں نہیں
خونِ بہارِ زندگی
ان کے تصرف میں نہیں
خونِ حیاتِ جاوداں
برہم ہے ان سے رنگِ گل
آزردہ ہے بادِ صبا
اے کربلا! اے کربلا!

(۵)

لیکن یہی دانش کدے
ہیں عشق کے آتش کدے
ہیں حسن کے تابش کدے
پلتے ہیں جن کی گود میں
لے کر انوکھا بانکپن
عصرِ رواں کے کوہ کن
میرے جوانانِ چمن
بلبل نوا، شاہیں ادا
اے کربلا! اے کربلا!

(۶)

اے غم کے فرزندو اُٹھو
اے آرزو مندو اُٹھو
زلفوں کی گلیوں میں رواں
دل کی نسیمِ جانفزا
ہونٹوں کی کلیوں میں جواں
بوئے گل و بوئے فنا
آنکھوں میں تاروں کی چمک
ہاتھوں میں سورج کی دمک
دل میں جمالِ شامِ غم
رُخ پر جلالِ بے نوا
گونجی ہوئی زیرِ قدم
تاریخ کی آوازِ پا
شمشیر ہیں دستِ دعا
اے کربلا! اے کربلا!

(۷)

پیاسوں کے آگے آئیں گے
آئیں گے لائے جائیں گے
آسودگانِ جامِ جم
سب صاحبانِ بے کرم
کھل جائے گا سارا بھرم
جھک جائیں گے تیغ و علم
پیشِ سفیرانِ قلم
رخشندہ ہے روحِ حرم
تابندہ ہے روئے صنم
سردار کے شعروں میں ہے
خونِ شہیداں کی ضیا
اے کربلا! اے کربلا! ☆☆☆

کون دشمن؟

یہ ٹینک، توپ، یہ بمبار، آگ، بندوقیں
کہاں سے لائے ہو کس کی طرف ہے رُخ ان کا
دیارِ وارث و اقبال کا یہ تحفہ ہے
جگا کے جنگ کے طوفاں زمینِ نانک سے
اُٹھے ہو برق گرانے کبیر کے گھر پر؟

غلام تم بھی تھے کل تک، غلام ہم بھی تھے
نہا کے خون میں آئی تھی فصلِ آزادی
ابھی تو صبح کی پہلی ہوائیں سنکی ہیں
ابھی شگوفوں نے کھولی نہیں ہے آنکھ اپنی
ابھی بہار کے لب پر ہنسی نہیں آئی
نہ جانے کتنے ستارے بجھی سی آنکھوں کے
نہ جانے کتنے فسردہ ہتھیلیوں کے گلاب
ترس رہے ہیں ابھی رنگ و روشنی کے لیے

ہمارے پاس ہے کیا دردِ مشترک کے سوا

مزا تو جب تھا کہ مل کر علاجِ جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیرِ گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو پھر جشنِ آشیاں کرتے

مگر تمہاری نگاہوں کا طور ہے کچھ اور
یہ بہکے بہکے قدم اُٹھ رہے ہیں کس جانب؟
کدھر چلے ہو یہ شمشیر آزمانے کو؟
سمجھ لیا ہے جسے تم نے ملک کی سرحد
وہ سرحدِ دل و جاں ہے، ہمارا جسم ہے وہ
حسیں، بلند، مقدس، جوان، پاکیزہ
ہے اس کا نام خیابانِ جنتِ کشمیر
ہے اس کا نام گلستانِ دلی و پنجاب
ہم اس کو پیار سے کہتے ہیں لکھنو بھی کبھی
تم اس کو تیغ کے ہونٹوں سے چھو نہیں سکتے
ادب سے آؤ کہ غالب کی سرزمین ہے یہ
ادب سے آؤ کہ ہے میر کا مزار یہاں
نظام، کاکی و چشتی کے آستانے ہیں
جھکا دو تیغوں کے سر بارگاہِ رحمت میں

ہمارے دل میں رفاقت بھی اور پیار بھی ہے
تمہارے واسطے یہ روح بے قرار بھی ہے
اگرچہ کہنے کو جی چاہتا نہیں لیکن
جوابِ اہلِ ہوس، تیغ آب دار بھی ہے

ادھر بہن ہے کوئی، کوئی بھائی، کوئی عزیز
گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار کوئی
رفیقِ محبس و زنداں، رفیقِ دار کوئی
ہماری طرح سے رسوائے کوئے یار کوئی
لبوں پہ جن کے تبسم ہے عہدِ رفتہ کا
نظر میں خواب ہیں بیتے ہوئے زمانے کے
دلوں میں نور چراغِ امیدِ فردا کا
وہ سب جو غیر نظر آ رہے ہیں، اپنے ہیں
ادھر بھی حلقۂ یاراں، ہجومِ مشتاقاں
اُدھر بھی چاہنے والوں کی کچھ کمی ہی نہیں
ہزاروں سال کی تاریخ ہے ثبوت اس کا
کھڑے ہیں سینوں پہ زخموں کے گل کھلائے ہوئے
دیارِ ہیر کی یادوں سے دل جلائے ہوئے
چناب و جہلم و راوی سے دل لگائے ہوئے
ہمارے بیچ میں حائل ہیں آگ کے دریا
تمہارے اور ہمارے لہو کے ساگر ہیں
بہت بلند ہیں یہ نفرتوں کی دیواریں
ہم اُن کو ایک نظر میں گرا بھی سکتے ہیں
تمام ظلم کی باتیں بھلا بھی سکتے ہیں
تمہیں پھر اپنے گلے سے لگا بھی سکتے
مگر یہ شرط ہے تیغوں کو توڑنا ہوگا
لہو بھرا ہوا دامن نچوڑنا ہوگا
پھر اُس کے بعد نہ تم غیر ہو نہ غیر ہیں ہم

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اُس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

گفتگو

گفتگو بند نہ ہو

بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

ہوں جو الفاظ کے ہاتھوں میں ہیں سنگِ دشنام
طنز چھلکائے تو چھلکایا کرے زہر کے جام
تیکھی نظریں ہوں ترش ابروئے خمدار رہیں
بن پڑے جیسے بھی دل سینوں میں بیدار رہیں
بے بسی حرف کو زنجیر بہ پا کر نہ سکے
کوئی قاتل ہو مگر قتلِ نوا کر نہ سکے

صبح تک ڈھل کے کوئی حرفِ وفا آئے گا
عشق آئے گا بصد لغزشِ پا آئے گا
نظریں جھک جائیں گی، دل دھڑکیں گے لب کانپیں گے
خاموشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی

اور پھر حرف و نوا کی نہ ضرورت ہوگی
چشم و ابرو کے اشاروں میں محبت ہوگی
نفرت اُٹھ جائے گی، مہمان مروّت ہوگی

ہاتھ میں ہاتھ لئے سارا جہاں ساتھ لئے
تحفۂ درد لئے پیار کی سوغات لئے
ریگزاروں سے عداوت سے گزر جائیں گے
خوں کے دریاؤں سے ہم پار اُتر جائیں گے

گفتگو بند نہ

بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

☆☆

سردار جعفری

ایک غیر مطبوعہ

مرثیہ

[انیسؔ نے اپنی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں اپنے بچپن اور جوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیسؔ کی سُنی تھی۔ مَیں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے منبر پہ بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا۔ سلام اور مرثیوں کے علاوہ ویسے بھی مجھے بے شمار شعر یاد تھے۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ مَیں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دیے تھے ــــــ ان کی زبان، تشبیہ، استعارے، ترتیب ہر چیز انیسؔ کی تھی۔ (پھر بھی وہ میری ابتدائی شاعری تھی۔)

میرا خیال تھا کہ وہ مرثیے گم ہو چکے ہیں لیکن میرے بھتیجے حسن مہدی جعفری کے پاس پانچ نامکمل مرثیے مل گئے ہیں۔ جو میرے ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک مرثیے کے ۳۲ بند "آجکل" کے انیسؔ نمبر کے لئے نذر کر رہا ہوں۔ یہ میرا خراج تہنیت اور خراج عقیدت ہے۔ یہ غالباً میرا پہلا مرثیہ ہے جو مَیں نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں کہا تھا۔

(سردار جعفری)

(۱)

آتا ہے کون شمعِ امامت لئے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ ہدایت لئے ہوئے
ہاتھوں میں جامِ سرخ شہادت لئے ہوئے
لب پر دعائے بخششِ امت لئے ہوئے
پھیلی ہے بو فضا میں شہِ مشرقین کی
آتی ہے کربلا میں سواری حسین کی

(۲)

زہرا بھی ساتھ ہیں حسن مجتبیٰ بھی ساتھ
جعفر بھی ساتھ ساتھ ہیں مشکل کشا بھی ساتھ
حمزہ بھی ہیں جناب رسولِ خدا بھی ساتھ
تنہا نہیں حسین کہ ہیں انبیاء بھی ساتھ
شورِ درود اُٹھتا ہے سارے جہان سے
برسا رہے ہیں پھول ملک آسمان سے

(۳)

گھوڑے پہ آگے آگے ہیں خود شاہِ کربلا
ہیں گرد سب عزیز و رفیقانِ باوفا
ابرار و پاک بین و حق آگاہ و پارسا
پھیلی ہوئی ہے چہروں کی چاروں طرف ضیا
پوری بہار پر ہے گلستاں بتول کا
چھوٹا سا قافلہ ہے یہ آلِ رسول کا

(۴)

بر میں قبائیں سر پہ عمامے بندھے ہوئے
تیغیں کمر میں پہلو میں خنجر لگے ہوئے
دانتوں میں ہونٹ رانوں میں گھوڑے دبے ہوئے
بازو بھرے بھرے ہوئے سینے تنے ہوئے
کمسن ہیں کچھ ضعیف ہیں، کچھ نوجوان ہیں
پیشانیوں پہ سجدۂ حق کے نشان ہیں

(۵)

ہمت پہ ولولوں پہ شجاعت کو ناز ہے
طاعت گزاریوں پہ عبادت کو ناز ہے
صورت پہ دستِ صانعِ قدرت کو ناز ہے
بازو میں زور وہ ہے کہ قوت کو ناز ہے
نقشے ہیں اک مصورِ زریں نگار کے
بکھرے ورق ہیں مصحفِ پروردگار کے

(۶)

اکبر ہیں اک شبیہِ رسالت مآب کی
ہیں روشنی نگاہِ بنِ بوتراب کی
شرمندہ نورِ رخ سے کرن آفتاب کی
چہرے سے ٹپکی پڑتی ہے سرخی شباب کی
عارض کے گرد سبزۂ خط کی بہار ہے
روشن چراغِ عابدِ شب زندہ دار ہے

(۷)

قاسم میں آن بان امامِ حسن کی ہے
قوت کلائی میں شہِ خیبر شکن کی ہے
چہرے پہ آب و تاب رسولِ زمن کی ہے
زلفوں میں بو بھری ہوئی مشکِ ختن کی ہے
عارض کے بوسے لیتا ہے نور آفتاب کا
چہرہ نہیں ہے پھول کھلا ہے گلاب کا

(۸)

بھائی امامِ پاک کا اک نوجوان ہے
تیور میں جس کے حیدرِ صفدر کی شان ہے
قبضے میں تیغ دوش پہ ترچھی کمان ہے
رکھا ہوا زمین پہ اک آسمان ہے
عاشق ہے ابنِ فاتحِ بدر و حنین کا
دل میں خدا کا نام ہے لب پر حسین کا

(۹)

ہیں فوج میں حسینؑ کے دو گلعذار بھی
پر کمسنی کے ساتھ ہیں یہ ہوشیار بھی
عابد بھی، متقی بھی ہیں، پرہیزگار بھی
غازی بھی صف شکن بھی ہیں اور شہسوار بھی
ساتھ اپنے اُن کو لائی ہے بیٹی بتول کی
اُس کے پسر ہیں جو ہے نواسی رسول کی

(۱۰)

اُن کے سوا کچھ اور بھی بدر و ہلال ہیں
عبداللہ و محمد و حیدر کے لال ہیں
بیٹے کئی عقیل کے بھی خوردسال ہیں
مسلم کے دو پسر ہیں جو یوسف جمال ہیں
ظاہر ہے صاف چہروں کی یہ آب و تاب سے
طفلی کے دن ہیں کھیل رہے ہیں شباب سے

(۱۱)

خوش ہیں کہ راہِ منزلِ صبر و رضا پہ ہیں
دامانِ پاکِ قتل گہہ نینوا پہ ہیں
کہتا ہے کون تختۂ ارضِ بلا پہ ہیں
غازی ہیں پشتِ زیں پہ تو گھوڑے ہوا پہ ہیں
ٹاپوں کے زیرِ عکس جو دشت و جبال ہیں
بکھرے ہوئے زمین پہ لاکھوں ہلال ہیں

(۱۲)

غازی ہیں سب سروں کے کٹانے کا شوق ہے
نیزوں کا شوق، برچھیاں کھانے کا شوق ہے
پردیس میں گھروں کے لٹانے کا شوق ہے
راہِ خدا میں خوں میں نہانے کا شوق ہے
ہنس ہنس کے کہہ رہے ہیں کہ منزل قریب ہے
ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں ساحل قریب ہے

(۱۳)

پہنچے جو کربلا کی زمیں پر شہِ انام
دیکھا کہ ہے یہ ایک عجب پُر فضا مقام
پُر کیف وہ ہوائیں وہ سبزے کا اہتمام
ساحل بنا تھا تختۂ باغِ ارم تمام
چشمہ رواں تھا دشت میں آبِ حیات کا
رہ رہ کے موجیں لیتا تھا دریا فرات کا

(۱۴)

صحرائے کربلا کی زمیں لالہ زار تھی
موسم تھا گل کا اوج پہ فصلِ بہار تھی
دنیا نمونۂ ورقِ زرنگار تھی
ہر ایک شے سے قدرتِ حق آشکار تھی
تھیں بہرِ سیر خلد سے حوریں جھکی ہوئی
پریاں کھڑی تھیں سرو گلستاں بنی ہوئی

(۱۵)

کونپل نے سر اُٹھایا تھا شوقِ نمود میں
کلیوں نے آنکھ کھولی تھی بزمِ وجود میں
پتّے تھے مست حمدِ خدائے ودود میں
شاخیں جھکی ہوئی تھیں رکوع و سجود میں
سجادے گُل کے فرشِ زمیں پر بچھے ہوئے
لاکھوں تھے سبز پوش نمازی کھڑے ہوئے

(۱۶)

ڈالی ہر اک درخت کی پھولی پھلی ہوئی
ہر ہر دلہن کی مانگ میں افشاں چنی ہوئی
پانی پہ سبز سبز وہ شاخیں جھکی ہوئی
نرگس کی تھیں امام پہ آنکھیں لگی ہوئی
لالہ کے ہر مقام پہ روشن چراغ تھے
کلیاں کھلی تھیں غنچوں کے دل باغ باغ تھے

(۱۷)

پھیلے ہوئے تمام گلستاں میں پھول تھے
صحرا کی آستین و گریباں میں پھول تھے
میداں میں پھول، کوہ کے داماں میں پھول تھے
وادی میں پھول دشت و بیاباں میں پھول تھے
یہ گل نہیں تھے ٹکڑے تھے یاقوتِ خام کے
جلوے بکھر گئے تھے کسی لالہ فام کے

(۱۸)

چاروں طرف کھلے تھے شگوفے بہشت کے
کلیاں تھیں سب بہشت کی، غنچے بہشت کے
کیاری ہر اک بہشت کی، پودے بہشت کے
شاخوں پہ گا رہے تھے پرندے بہشت کے
تھے جشن بادشاہِ جہاں کے ورود کے
دریا بلند کرتا تھا نعرے درود کے

(۱۹)

زینب کے دونوں لال تھے خوش کوہسار سے
قاسم تھے باغ باغ گلوں کے نکھار سے
اکبر نہال مستیِ سروِ بہار سے
عباس کی لڑی ہوئی آنکھیں کچھار سے
ساحل جو کر رہا تھا اشارہ حسین کو
موجوں نے ہاتھ اُٹھا کے پکارا حسین کو

(۲۰)

بس چلتے چلتے راہ میں گھوڑا ٹھہر گیا
حائل تھا اُس کی راہ میں دریائے باصفا
لپٹا ہوا سموں سے تھا میدانِ کربلا
دیتا تھا اُس کو آلِ محمد کا واسطہ
کہتا تھا آگے لے کے نہ جانا امام کو
مہمان مَیں بناؤں گا شاہِ انام کو

(۴۱)

بولی زمینِ دشت کہ مولا نثار ہوں
آقا کی مہربانی کی امیدوار ہوں
مدت سے ایک حرفِ غمِ انتظار ہوں
لیکن فریب خوردۂ لیل و نہار ہوں
ہو جاؤں مس اگر کفِ پائے امام سے
بڑھ جائے آبرو مری دارالسلام سے

(۴۲)

فرمایا غم یہ تجھ سے اُٹھایا نہ جائے گا
مہمان بے کسوں کو بتایا نہ جائے گا
آفت سے غم زدوں کو بچایا نہ جائے گا
یہ زخم وہ ہے دل پہ جو کھایا نہ جائے گا
پہرے یہاں پہ بیٹھیں گے ہفتم کی رات سے
پانی بھی ہم نہ پائیں گے نہرِ فرات سے

(۴۳)

محشر یہاں پہ ہوگا عاشور کو بپا
ٹاپوں سے گونج جائے گا میدانِ کربلا
ہل جائے گا دلیروں کے نعروں سے نینوا
ہوگی غضب کی جنگ، قیامت کا معرکہ
کاٹے یہاں پہ جائیں گے رشتے حیات کے
سوئیں گے میرے شیر کنارے فرات کے

(۴۴)

ہوگا شہید اکبرِ شیریں سخن یہیں
پامال ہوگا قاسمِ گل پیرہن یہیں
کھائے گا تیر اصغرِ غنچہ دہن یہیں
بس مختصر یہ ہے کہ لٹے گا چمن یہیں
یہ داغ بھی رہے گا دلِ روزگار میں
اُجڑے گا باغِ فاطمہ زہرا بہار میں

(۴۵)

ایسا نہ ہو کہ سب کہیں دشتِ بلا تجھے
دنیا سمجھ لے بانیٔ ظلم و جفا تجھے
سارا جہاں پکار اُٹھے بے وفا تجھے
الزام یہ لگائے نہ خلقِ خدا تجھے
تیری نظر نے کھا لیا کنبہ بتول کا
ویران تو نے کر دیا روضہ رسول کا

(۴۶)

ظلم و ستم ہوا کیا تو دیکھتی رہی
سیّد کا گھر لٹا کیا تو دیکھتی رہی
غربت میں سر کٹا کیا تو دیکھتی رہی
دامن ترا رنگا کیا تو دیکھتی رہی
بے کس کا خون ہو گیا تیری زمین پر
دھبے لگے ہوئے ہیں تری آستین پر

(۲۷)

کانپی یہ سن کے کرب وبلا کی زمیں تمام
کی عرض رو کے پیشِ امامِ فلک مقام
اے دیں کے بادشاہ شہنشاہِ خاص وعام
سینے پہ میرے قتل نہ ہوں گے یہ لالہ فام
یوں بے گناہ خون بہایا نہ جائے گا
مولا یہ بار مجھ سے اُٹھایا نہ جائے گا

(۲۸)

فرمایا تو ضیا ہے رخِ کائنات کی
ساحل پہ تیرے ٹھہرے گی کشتی نجات کی
ہوگی یہیں پہ فاش حقیقت حیات کی
قائم یہیں پہ ہوں گی مثالیں ثبات کی
ٹپکے گا اس زمیں پہ لہو بے گناہ کا
اُبھرے گا نقشِ پاک یہیں لاالٰہ کا

(۲۹)

آگے بڑھوں یہاں سے نہیں اختیار میں
گزرا ہے یہ مشیتِ پروردگار میں
دریائے خوں بہے گا ترے لالہ زار میں
دھبے لگیں گے دامنِ فصلِ بہار میں
چہرے پہ خون سرخ شہیداں ملے ہوئے
آئے گی صبح چاک گریباں کئے ہوئے

(۳۰)

ہوگا غروب ماہِ امامت اسی جگہ
لائے گا رنگ خونِ شہادت اسی جگہ
پائے گی خلق درسِ ہدایت اسی جگہ
پنہاں ہے رازِ بخششِ امت اسی جگہ
بولی زمیں خدا کے ہے سب اختیار میں
کیا دخل مجھ کو مرضیِ پروردگار میں

(۳۱)

راضی ہوں خونِ پاک کی دولت ملے مجھے
رنگیں قبائے خونِ شہادت ملے مجھے
قبریں یہاں بنیں یہ سعادت ملے مجھے
لاشوں کی پاسبانی کی عزت ملے مجھے
بڑھ جائے میرا اوج کہیں آسمان سے
زائر یہاں پہ آئیں جو ہندوستان سے

(۳۲)

تیار ہوں لہو میں نہانے کے واسطے
ٹاپوں کے زخم سینے پہ کھانے کے واسطے
کوئی نہ ہو جو قبر بنانے کے واسطے
موجود ہوں مَیں لاش اُٹھانے کے واسطے
اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

[ناتمام]

(ماہنامہ آج کل نئی دہلی جولائی ۱۹۷۵ء)

مشرق و مغرب

تیرا قاتل بھی وہی ہے مرا قاتل بھی وہی
زیست کی جہد بھی اور جہد کا حاصل بھی وہی

زندگی ایک، زمیں ایک ہے، انسان بھی ایک
فکر کا بحر بھی، جذبات کا طوفان بھی ایک
وہی سورج ہے وہی چاند ہے تارے ہیں وہی
نیلے آکاش کے گلرنگ کنارے ہیں وہی

شرق سے غرب تلک وقت کی پرواز ہے ایک
دل جو سینوں میں دھڑکتے ہیں تو آواز ہے ایک
ہیرؔ مغموم ہے پنجاب کے میدانوں میں
جولیٹؔ روتی ہے انگلینڈ کے افسانوں میں

عشق کو بخش دیا ذوقِ تماشا ہم نے
حرفِ دل شعلۂ عارض سے تراشا ہم نے
باغِ مشرق ہو کہ مغرب ہو، ہوا ایک سی ہے
سرد یا گرم، بہر حال فضا ایک سی ہے

ایشیا والے سے یورپ کی زمیں کھنچ کے نہ مل
میری سوغات بھی دل ہے تری سوغات بھی دل
جس نے لوٹا ہے ہمیں، جس نے ستم ڈھایا ہے
ارضِ مغرب نہیں مغرب کا وہ سرمایا ہے
اور سرمایہ نہ ہندی ہے نہ برطانی ہے
یہ مرے اور ترے خون کی ارزانی ہے

ٹیمس اور سین میں جمنا کی سی بے تابی ہے
موج ڈینوب میں گنگا کی سی بے خوابی ہے
ایسا کچھ فرق نہیں دونوں گلستانوں میں
آہو رم خوردہ ہیں تیرے بھی بیابانوں میں
چشمے مغرب کے ہیں مشرق کے غزالہ کی طرح
نیلگوں سلسلۂ کوہ ہمالہ کی طرح
جنگلوں میں وہی آوارہ ہوا گاتی ہے
کسی بھٹکے ہوئے رہرو کی صدا آتی ہے

کلیاں کھلتی ہیں سنورتے ہوئے گیسو کے لئے
تتلیاں اُڑتی ہیں بکھری ہوئی خوشبو کے لئے
پریاں موسم کی ہواؤں میں مچل جاتی ہیں
رُت بدلتے ہی قبائیں بھی بدل جاتی ہیں
کشتیاں خوش ہیں سمندر کی گزرگاہوں سے
تیرے ساحل بھی جواں رہتے ہیں ملاحوں سے
تیری محرابیں بھی تہذیب کی انگڑائی ہیں
تیری آغوش میں بھی دہلی و شنگھائی ہیں

ایک جادو کا اثر گردشِ ایام میں ہے
زندگی یاں بھی طلسمِ سحر و شام میں ہے

شب کو جلتے ہیں کنول صبح کو بجھتے ہیں چراغ حرفِ حق بھی ہے یہاں اور رسن و دار بھی ہے
مسکراتے ہیں شبستاں میں جوانی کے ایاغ لذتِ شوق بھی ہے، جرأتِ کردار بھی ہے

صبح در کھلتے ہیں محبوب کی بانہوں کی طرح ہم حقیقت سے کبھی دور جو ہو جاتے ہیں
راہرو ملتے ہیں راہوں میں نگاہوں کی طرح کچھ مظاہر کے طلسمات میں کھو جاتے ہیں
دن کے نظاروں کو آنکھوں میں چھپا لیتی ہیں زہر سا نفرت و نخوت کا پیا کرتے ہیں
کھڑکیاں رات میں پلکوں کو جھکا لیتی ہیں یوں ہی انسانوں کو تقسیم کیا کرتے ہیں

دودھ مغرب کے بھی سینے میں رواں ہوتا ہے
ہند و ایراں کی طرح طفل جواں ہوتا ہے
راستے دوڑ کے اسکولوں میں مل جاتے ہیں
بچے پھولوں کی طرح گھاس میں کھِل جاتے ہیں
یاں بھی جو آنکھ ہے عالم کی تماشائی ہے
ہر نظر لذتِ دیدار کی شیدائی ہے
دل کا آہنگِ حسیں تیرے بھی نغمات میں ہے
کیفیت روح کی رنگوں کے طلسمات میں ہے
خیر ہو لندن و پیرس کے ہنر داروں کی
خیر ہو روم کے، یونان کے بُت کاروں کی
تیرے بازار میں یوسف بھی زلیخائیں بھی
تیرے ویرانوں میں مجنوں بھی ہیں لیلائیں بھی

زورِ افلاس کا، دولت کی فراوانی بھی
یاں قبا پوشی بھی ہے، چاک گریبانی بھی

گیسو کالے ہیں مرے دیس کے محبوبوں کے
اور بادل ہیں سنہری ترے معشوقوں کے
آنکھیں نیلی ہیں تری شوخ حسیناؤں کی
جھیلیں کاجل کی مرے آئینہ سیماؤں کی

مختلف کچھ ہیں تراشیں ترے پیراہن کی
شکلیں کچھ اور مرے جیب مرے دامن کی
اصلیت نکہتِ گُل کی نہیں گلدانوں سے
مَے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیمانوں سے

بوئے گل ایک سی ہے، بوئے وفا ایک سی ہے
میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے

۱۔ ٹیمس دریا جس کے کنارے لندن آباد ہے
۲۔ سِین۔ فرانس کا دریا جس کے دونوں طرف پیرس آباد ہے
۳۔ ڈینیوب۔ یورپ کا مشہور دریا جو کئی ممالک سے گزرتا ہے

میرا سفر

پھر اِک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کملائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا کی ہر تتلی اُڑ جائے گی
اِک کالے سمندر کی تہہ میں کلیوں کی طرح کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح ہنستی ہوئی ساری شکلیں کھو جائیں گی
خوں کی گردش، دل کی دھڑکن، سب راگنیاں سو جائیں گی
اور نیلی فضا کی مخمل پر ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی
یہ میری جنت، میری زمیں، اس کی صبحیں، اس کی شامیں
بے جانے ہوئے، بے سمجھے ہوئے، اِک مشتِ غبارِ انساں پر
شبنم کی طرح رو جائیں گی
ہر چیز بھلا دی جائے گی یادوں کے حسیں بت خانے سے
ہر چیز اُٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے
سردار کہاں ہے محفل میں
لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی، اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

سرسبز ہتھیلی پر لے کر شبنم کے قطرے تولوں گا
مَیں رنگِ حنا، آہنگِ غزل، اندازِ سخن بن جاؤں گا
رخسارِ عروسِ نو کی طرح ہر آنچل سے چھن جاؤں گا
جاڑوں کی ہوائیں دامن میں جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں کے تلے سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سنہریاں سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے
مَیں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
مَیں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل میں
مستقبل کے پیمانے میں
مَیں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں مَیں
مَیں مر کے اَمر ہو جاتا ہوں

☆☆☆

نومبر میرا گہوارہ

۱۔ رقصِ تخلیق

جب کہیں پھول ہنسے
جب کوئی طفل سرِ راہ ملے
رات کی شاخِ سیہ رنگ پہ جب چاند کھلے
دل یہ کہتا ہے حسیں ہے دنیا
چیتھڑوں ہی میں سہی ماہ جبیں ہے دنیا
دستِ صیاد بھی ہے بازوئے جلاد بھی ہے
رقصِ تخلیقِ جہانِ گزراں جاری ہے

۲۔ کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ

نومبر میرا گہوارہ ہے یہ میرا مہینہ ہے
اسی ماہِ منور میں
مری آنکھوں نے پہلی بار سورج کی سنہری روشنی دیکھی
مرے کانوں میں پہلی بار انسانی صدا آئی
مرے تارِ نفس میں جنبشِ بادِ صبا آئی
مشامِ روح میں
مٹی کی خوشبو پھول بن کر مسکرا اٹھی
لہو نے گیت گایا

شمعِ ہستی جگمگا اٹھی
یہ لمحہ میلادِ آدم تھا
میں ستر سال پہلے اس تماشا گاہِ عالم میں
اِک آفاقی کھلونا تھا
ہوا کے ہاتھ سہلاتے تھے میرے نرم بالوں کو
مری آنکھوں میں راتیں نیند کا کاجل لگاتی تھیں
سحر کی پہلی کرنیں چومتی تھیں میری پلکوں کو
مجھے چاند اور تارے مسکرا کر دیکھتے تھے
موسموں کی گردشیں جھولا جھلاتی تھی
بھری برسات میں بارش کے چھینٹے
گرمیوں میں لو کے جھونکے
مجھ سے ملنے ایسے آتے
وہ کہتے تھے ہمارے ساتھ آؤ
چل کے کھیلیں باغ و صحرا میں
مری ماں اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی ننھے سے کھلونے کو
مری حیرت کی آنکھیں
اُس محبت سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں
جس آئینے میں پہلی بار میں نے
اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا

وہ چہرہ کیا تھا؟
سورج تھا، خدا تھا یا پیمبر تھا
وہ چہرہ جس سے بڑھ کر خوب صورت

کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا
کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا
کہ وہ اِک ماں کا چہرہ تھا
جو اپنے دل کے خوابوں، پیار کی کرنوں سے روشن تھا
وہ پاکیزہ، مقدس سینۂ زریں
وہ اُس میں دودھ کی نہریں
وہ موجِ کوثر و تسنیم تھیں
یا شہد و شبنم تھیں
اُنہیں کی چند بوندیں آج اعجازِ سخن بن کر
اُنہیں کی چند بوندیں سحرِ حرف و جادوئے لفظ و بیاں بن کر
مرے ہونٹوں سے خوشبوئے زباں بن کر
سرِ لوح و قلم آتی ہیں تو شمشیر کی صورت چمکتی ہیں
حسینوں کے لئے وہ غازۂ رخسار و عارض ہیں
کھنکتی چوڑیوں، بجتی ہوئی پائل کو اِک آہنگ دیتی ہیں
زمیں کی گردشوں، تاریخ کی آوازِ پا میں ڈھلتی جاتی ہیں

جو اب میری زباں ہے
میرے بچپن میں وہ میری ماں کی لوری تھی
یہ لوری اِک امانت ہے
مرا ہر شعر اب اس کی حفاظت کی ضمانت ہے

۳۔ اقرا...... علم الانساں بالقلم

میرا پہلا سبق اقراء
ہے تحسینِ قلم جس میں
ہے تکریمِ قلم جس میں
قلم تحریکِ ربانی
قلم تخلیقِ انسانی
قلم تہذیبِ روحانی
قلم میں شاخِ طوبیٰ بھی ہے انگشتِ حنائی بھی
میرے ہاتھوں میں آ کر رقص کرتی ہیں
ہزاروں دائروں میں چاند اور سورج کی محرابیں
درخشاں علم اور حکمت کی قندیلیں
ہلالِ نو کا سینہ ماہِ کامل کا خزینہ ہے

مری انگلی نے پہلے خاک کے سینے پہ حرفِ اولیں لکھا
پھر اس کے بعد تختی پر قلم کا نقشِ ثانی تھا
قلم انگشتِ انسانی کا جلوہ ہے
عروجِ آدمِ خاکی کا دلکش استعارہ ہے

۴۔ فطرت کی فیاضیاں

مجھے سورج نے پالا
چاند کی کرنوں نے نہلایا
ہر اک شے تھی مجھ سے مانوس
مجھ سے بات کرتی تھی
درختوں کی زباں
چڑیوں کے نغمے مَیں سمجھتا تھا

ہوا میں تتلیاں پرواز کرتی تھیں
مَیں اُن کے ساتھ اُڑتا تھا
مری مٹھی میں جگنو جگمگاتے تھے
مَیں پریوں کے پرستانوں میں جاتا تھا
اندھیرا کانپتا تھا بجلیوں کے تازیانوں سے
مَیں اس پر مسکراتا تھا
گرجتے بادلوں سے دوستی تھی
خاک پر چلتے ہوئے کیڑوں پہ بے حد پیار آتا تھا
ہر اِک شے جیسے میری ذات تھی میری حقیقت تھی
انا الحق کی صداقت تھی
ہرے نیلے سنہری سرخ انڈے
آشیانوں میں پرندوں کے
وہ سب میرے کھلونے تھے
مَیں آفاقی کھلونا تھا
مَیں خود فطرت تھا، فطرت میری ہستی تھی
اسی فطرت نے میرے خوں میں لاکھوں بجلیاں بھر دیں
مسیں بھیگیں رگ و پے میں جنوں کا بانکپن آیا
مرے آگے نئے رنگوں میں دنیا کا چمن آیا
اِک شمشاد و پیکر لے کے فردوسِ بدن آیا

جدھر دیکھو اُدھر برنائیاں ہیں
جدھر دیکھو اُدھر رعنائیاں ہیں
شفق رنگ سر... میں بھیگی ہوئی پرچھائیاں ہیں

مرے لغزیدہ لغزیدہ قلم نے
ایک رنگیں اور خوشبودار کاغذ پر
بڑی مشکل سے رُکتے رُکتے حرفِ عشق لکھا
اور کسی کی بارگاہِ حسن میں بھیجا
حیا کی شمع جل اُٹھی حریم دلربائی میں
گھمایا سر جھکا کر دیر تک کنگن کلائی میں

۵۔ ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

کہاں سے آئی ہو؟
کون ہو تُم؟ نہ گل نہ خوشبو
مگر تمہارا وجود خود روحِ گلستاں ہے
وہ کائناتِ سرور جس کا
خود اپنا سورج ہے چاند اپنا
مَیں کائناتِ سرور میں سانس لے رہا ہوں
شکنتلا ہے یہاں نہ ہیلن
نہ ہیر ہے اور نہ جولیٹ ہے
فقط تمہارے بدن کا موسم
جو میری نظروں کی نرم بارش میں
رنگ اور نور بن گیا ہے
کوئی نہیں تم سے بڑھ کے دنیائے دلبری میں
کوئی نہیں مجھ سے بڑھ کے دنیائے عاشقی میں
اِیک سے تُم حسین تر ہو

ہر ایک سے مَیں عظیم تر ہوں

تمہارے ہونٹوں کے خم میں جو لفظ بن رہے ہیں
وہ میرے سینے میں پھول کی طرح کھل رہے ہیں
تمہاری "ہاں" اِک گلاب ہے تازہ و شگفتہ
کہ جس سے ایوانِ جاں معطر
"نہیں" یہ ننھی سی اِک کلی ہے
جو دل کی نازک سی شاخ میں سو رہی ہے
خوابِ بہار بن کر
یہ خواب تعبیر کے گلستاں کا منتظر ہے
تمہارے دلکش بدن کے رنگوں میں مضطرب ہے
تمہاری آنکھوں سے جھانکتا ہے
تمہاری سانسوں میں کانپتا ہے
مجھے "نہیں" کی کلی عطا ہو
کہ جس سے "ہاں" کا گلاب مہکے
تمہارے شہرِ جمال میں
میرے دل کا کاسہ
بھٹک رہا ہے
تُم اپنے ہونٹوں کا شہد
آنکھوں کے پھول
ہاتھوں کے چاند دے دو
یہ مفلسی کی سیاہ راتیں وجود پر طنز کر رہی ہیں

زمین کا رنگ تم زمیں کا جمال تم ہو
زمیں کی دولت
زمیں کی بیٹی
تُم اپسراؤں سے اور حوروں سے پاک تر ہو
کہ وہ تصور کے آسمانوں کی پتلیاں ہیں
تمام وہم و گماں کے پیکر
مگر تُم اس خاک کی چمک ہو
کہ جس کی نس نس میں
سیب انگور اور گیہوں کی فصل کا خوں رواں دواں ہے
سحر کا سورج تمہارے ماتھے کو چومتا ہے
بدن میں شبنم کی روشنی ہے

ہوائیں جو میری رازداں ہیں
وہ میرے ہونٹوں سے لفظ لے کر
تمہارے کانوں کی سیپیوں میں
گہر کی مانند ڈالتی ہیں
مَیں مسکراتا ہوں
تُم بھی ہنستی ہو
اور دونوں
نئی تمناؤں کے جزیروں میں گھومتے ہیں
نہ کوئی محکوم ہے نہ حاکم
نہ کوئی قانون ہے نہ تختی
بس ایک زنجیرِ زلف، شمشیرِ دلربائی

۶۔ ورق ناخواندہ

مَیں ایک ورق ہوں
لکھا ہے کس نے
پڑھا ہے کس نے
ہر اک درخت اِک قلم ہے ہر شاخ اِک قلم ہے
سمندروں کی دوات
ندیوں میں پگھلی چاندی کی روشنائی
فضا کے سیّال نیلگوں سے
ہواؤں کے ہاتھ لکھ رہے ہیں
ستاروں کا نور لکھ رہا ہے
زمین کا رقص لکھ رہا ہے
زمین کی پشت سے نکلتا گلابی سورج
سنہری کرنوں سے لکھ رہا
گزرتے لمحات اپنے تیروں سے لکھ رہے ہیں
گزرتی تاریخ اپنے نیزوں سے لکھ رہی ہے
تمام احباب لکھ رہے ہیں
تمام اغیار لکھ رہے ہیں
حریفوں کے خنجروں پہ خوں ہے
سیاست مکر و فن کی تلوار لکھ رہی ہے
مہکتے زخموں کے پھول الفاظ بن گئے ہیں
تبسم لطفِ یار کا حرف ہے غنچۂ شگفتہ
حسد کے خاروں کی نوک میں جنبشِ قلم ہے
زبانِ دشنام لکھ رہی ہے
زبانِ بدنام لکھ رہی ہے
زبان ناکام لکھ رہی ہے
مگر مرا دل مرا جنوں بھی تو لکھ رہا ہے
مَیں اِک ورق ہوں
تمام احساس ناتمامی
مگر مکمل کتاب جیسے
جو پڑھ سکو تو مجھے بتانا کہ اس صحیفے میں کیا لکھا ہے؟

۷۔ صحیفۂ کائنات

یہ دو ورق ہیں
زمین اور آسمان پر
صحیفۂ کائنات تحریر ہو رہا ہے
فسانۂ ہستی کا نیستی کا
فسانہ نیکی کا اور بدی کا
فسانہ ظلمت کا روشنی کا
فسانۂ کائنات تحریر ہو رہا ہے
جو کل کلی تھی
وہ آج گُل ہے
جو آج گُل ہے
وہ کل ثمر ہے

ہر اِک شے وقت کی ہواؤں کی زد پہ
اِک شمعِ رہگزر ہے

جو بجھ رہی ہے
جو جل رہی ہے
وجود پر ناز کر رہی ہے

ہواؤں کے تند و تیز جھونکے
جب آندھیوں کا لباس پہنے
اُترتے ہیں غارتِ چمن پر
تو شاخِ گل اپنا سر جھکا کر سلام کرتی ہے
اور پھر سر اُٹھا کے ہنستی ہے
اور کہتی ہے...... مجھ کو دیکھو
مَیں فطرتِ لازوال کا رنگِ شاعری ہوں
وجود کا رقصِ دلبری ہوں
جسے مٹانے کی کوششیں ہیں
وہ مٹ سکا ہے نہ مٹ سکے گا
یہ رنگ صحنِ چمن سے اُبلے گا
مقتلوں سے طلوع ہو گا

۸۔ حرفِ بد

مرے خلاف اُٹھایا قلم حریفوں نے
مرا غرور بڑھا اور سر بلند ہوا
یہی سلیقہ ہے بس حرفِ بد سے بچنے کا
کہ اپنی ذات کو اتنی بلندیاں دے دو
کسی کا سنگِ ملامت وہاں تک آنہ سکے
صدائے کوئے ملامت تلاش کرتی ہے
مگر نوائے بہار آشنا کو پانہ سکے
چراغِ علم و ہنر کو کوئی بجھانہ سکے

جیو تو اپنے دل و جاں کے میکدے میں جیو
خود اپنے خونِ جگر کی شراب ناب پیو
جہاں کے سامنے جب آؤ تازہ رو آؤ
حضورِ محتسب و شیخ میں سبو لاؤ
جو زخم خوردہ ہے وہ نغمۂ گلو لاؤ
دلِ شکستہ میں بڑھنے دو روشنی غم کی
یہ روشنی تو ہے میراث ابنِ آدم کی
یہ روشنی کہ جو تلوار بھی سپر بھی ہے
مری نگاہ میں پیمانۂ ہنر بھی ہے

۹۔ حسد

حسد کی آنکھوں کا رنگ دیکھو
جو دل کے اندر بھرے ہوئے ہیں
وہ زہر آلود سنگ دیکھو
جو ہاتھ میں ہیں وہ پھول دیکھو
جو روح میں ہیں ببول دیکھو
لبوں پہ جو ہے وہ حرف دیکھو
حقیر کتنا ہے ظرف دیکھو
کہ دوست ہے
اور دوست کے منہ پہ بات کہنے سے ڈر رہا ہے
وجود ظاہر میں ہے مکمل

مگر وہ اندر بکھر رہا ہے
وہ اپنی نفرت کا زہر لے کر
خود اپنے خوں میں اُتر رہا ہے
وہ تنگ دل بھی ہیں تنگ جاں بھی
تنگ ضمیر اور تنگ زباں بھی
خبر نہیں اس کو وہ کہاں ہے
کہ ہر طرف ایک شخص ایسا نظر کے اندر بسا ہوا ہے
کہ جس کے سائے سے کانپتا ہے
جب اپنا قد اُس سے ناپتا ہے
تو اپنے خنجر کو تولتا ہے
حسد کا مارا ہوا یہ بندہ غریب شہر دیارِ خود ہے
شرافتِ نفس مر چکی ہے بچارہ خویش آشنا نہیں ہے
مگر اسی دوست کی بدولت
مَیں خود کو پہچاننے لگا ہوں
مَیں اس کا احسان مانتا ہوں
خدا کرے اس کا دل کہیں سے
سکوں کی دولت تلاش کرلے

ابن مریم کو کیا تم نے سرِ دار بلند
اور وہ زندہ ہے
تشنگی تم نے محمدؐ کے نواسے کو دی
چشمۂ فیضِ حسینؓ ابن علیؓ جاری ہے
ابن مریم نہ حسینؓ ابن علیؓ ہوں لیکن
خوں میں ہے خونِ شہادت کی حرارت پنہاں
وہ جو صدیوں سے دہکتا ہوا انگارہ ہے
اور سینے میں مرے
ایک نہیں سینکڑوں لاکھوں دل ہیں
وہ کسی دیس کا دل ہو کہ کسی قوم کا دل
وہ کسی فرد بشر کا دل ہو
زخم خوردہ ہو کہ نغموں سے بھرا
میرے سینے میں دھڑکتا ہے میرا دل بن کر
کتنے دل قتل کرو گے آخر؟
کتنے جلتے ہوئے تاروں کو بجھا سکتے ہو؟
کتنے خورشیدوں کو نیزوں پہ اُٹھا سکتے ہو؟
قتل کرتے کرتے خود تم کو جنوں ہو جائے گا
(نامکمل تخلیق)

☆☆☆

۱۰۔ قاتل کی شکست

اس کمیں گاہ میں ہیں کتنے کماندار بتاؤ
تیر کتنے ہیں سیہ ترکش میں
گن کے دیکھو تو ذرا
کون سا تیر ہے مخصوص مرے دل کے لئے

نیند

(اپنے بچے کی پہلی سالگرہ پر)

رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی؟
دن کی خشمگیں نظریں
کھو گئیں سیاہی میں
آہنی کڑوں کا شور
بیڑیوں کی جھنکاریں
قیدیوں کی سانسوں کی
تند و تیز آوازیں
جیلروں کی بدکاری
گالیوں کی بوچھاریں
بے بسی کی خاموشی
خامشی کی فریادیں
تہہ نشیں اندھیرے میں
شب کی شوخ دوشیزہ
خاردار تاروں کو
آہنی حصاروں کو
پار کر کے آئی ہے
بھر کے اپنے آنچل میں
جنگلوں کی خوشبوئیں
ٹھنڈکیں پہاڑوں کی
میرے پاس لائی ہے

رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی؟

نیلگوں جواں سینہ
نیلگوں جواں باہیں
کہکشاں کی پیشانی
نیم چاند کا جوڑا
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم مہکتی ہیں
اور زمیں کے ہونٹوں پر
نرم شبنمی بوسے
موتیوں کے دانتوں سے
کھلکھلا کے ہنستے ہیں
رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی؟

رات پینگ لیتی ہے
چاندنی کے جھولے میں
آسمان پر تارے
ننھے ہاتھوں سے
بُن رہے ہیں جادو سا
جھینگروں کی آوازیں
کہہ رہی ہیں افسانہ

دور جیل کے باہر
بج رہی ہے شہنائی
ریل اپنے پہیوں سے
لوریاں سناتی ہے
رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی؟

روز رات کو یوں ہی
نیند میری آنکھوں سے
بے وفائی کرتی ہے
مجھ کو چھوڑ کر تنہا
جیل سے نکلتی ہے
بمبئی کی بستی میں
میرے گھر کا دروازہ
جا کے کھٹکھٹاتی ہے
ایک ننھے بچے کی
انکھڑیوں کے بچپن میں
میٹھے میٹھے خوابوں کا
شہد گھول دیتی ہے
ایک حسیں پری بن کر
لوریاں سناتی ہے
پالنا ہلاتی ہے
رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی؟
(سنٹرل جیل ناسک)

☆☆☆

ہاتھوں کا ترانہ

اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں
اِن ہاتھوں کو تسلیم کرو

تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی اِن سے ہے
تہذیب کی اور تمدن کی بھرپور جوانی اِن سے ہے
دنیا کا فسانہ اِن سے ہے، انساں کی کہانی اِن سے ہے
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

صدیوں سے گزر کر آئے ہیں یہ نیک اور بد کو جانتے ہیں
یہ دوست ہیں سارے عالم کے، پر دشمن کو پہچانتے ہیں
خود شکتی کا اوتار ہیں یہ کب غیر کی شکتی مانتے ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

ہیں زخم ہمارے ہاتھوں کے یہ پھول جو ہیں گلدانوں میں
سوکھے ہوئے پیاسے چلو تھے جو جام ہیں اب میخانوں میں
ٹوٹی ہوئی سو انگڑائیوں کی محرابیں ہیں ایوانوں میں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

راہوں کی سنہری روشنیاں بجلی کے جو پھیلے دامن ہیں
فانوس حسیں ایوانوں کے جو رنگ و نور کے خرمن ہیں
یہ ہاتھ ہمارے جلتے ہیں یہ ہاتھ ہمارے روشن ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

خاموش ہیں یہ خاموشی سے سو بربط و چنگ بناتے ہیں
تاروں میں راگ سلاتے ہیں طبلوں میں بول چھپاتے ہیں
جب ساز میں جنبش ہوتی ہے تب ہاتھ ہمارے گاتے ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بت کر دیں کالکھ کو چھوئیں تو کاجل ہے
مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے، چاندی کو چھوئیں تو پائل ہے
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

بہتی ہوئی بجلی کی لہریں، سمٹے ہوئے گنگا کے دھارے
دھرتی کے مقدر کے مالک محنت کے افق کے سیارے
یہ چارہ گرانِ دردِ جہاں، صدیوں سے مگر خود بیچارے
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

تخلیق یہ سوزِ محنت کی، اور فطرت کے شہکار بھی ہیں
میدانِ عمل میں لیکن خود، یہ خالق بھی معمار بھی ہیں
پھولوں سے بھری یہ شاخ بھی ہیں اور چلتی ہوئی تلوار بھی ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ ہاتھ نہ ہوں تو مہمل سب تحریریں اور تقریریں ہیں
یہ ہاتھ نہ ہوں تو بے معنی انسانوں کی تقدیریں ہیں
سب حکمت و دانش، علم و ہنر، ان ہاتھوں کی تفسیریں ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ کتنے سبک اور نازک ہیں یہ کتنے سڈول اور اچھے ہیں
چالاکی میں اُستاد ہیں یہ اور بھولے پن میں بچے ہیں
اس جھوٹ کی گندی دنیا میں بس ہاتھ ہمارے سچے ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ سرحد سرحد جڑتے ہیں اور ملکوں ملکوں جاتے ہیں
بانہوں میں بانہیں ڈالتے ہیں اور دل سے دل کو ملاتے ہیں
پھر ظلم و ستم کے پیروں کی زنجیرِ گراں بن جاتے ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

تعمیر تو اِن کی فطرت ہے، اِک اور نئی تعمیر سہی
اِک اور نئی تدبیر سہی، اِک اور نئی تقدیر سہی
اِک شوخ و حسیں خواب اور سہی اِک شوخ و حسیں تعبیر سہی
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

مختصر نظمیں

اجنبی آنکھیں

ساری شامیں اُن میں ڈوبیں
ساری راتیں ان میں کھوئیں
سارے ساغر اُن میں ٹوٹے
ساری مَے
غرق اُن آنکھوں میں ہے
دیکھتی ہیں وہ مجھے لیکن بہت بیگانہ وار ☆

ایک بات

اِس پہ بھولے ہو کہ ہر دل کو کچل ڈالا ہے
اِس پہ پھولے ہو کہ ہر گُل کو مسل ڈالا ہے
اور ہر گوشۂ گلزار میں سناٹا ہے
کسی سینے میں مگر ایک فغاں تو ہوگی؟
آج وہ کچھ نہ سہی کل کو جواں تو ہوگی

وہ جواں ہو کے اگر شعلۂ جوالا بنی
وہ جواں ہو کے اگر آتشِ صد سالہ بنی
خود ہی سوچو کہ ستم گاروں پہ کیا گزرے گی؟ ☆

ایک نظم

جو آسماں پہ چمکتا ہے وہ قمر ہے کچھ اور
جسے ہم اپنا کہیں وہ قمر زمیں پہ ہے
وہ جس کے حسن سے روشن جبیں ستاروں کی
وہ جس کے حسن سے رنگینیاں بہاروں کی
وہ حسن پھول میں، ذرّے میں آفتاب میں ہے
وہ حسن حرف میں، نغمے میں ہے، کتاب میں ہے
وہ حسن شعلے میں، شبنم میں ہے، شراب میں ہے
وہ حسن جس سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

☆

پیاس بھی ایک سمندر ہے

پیاس بھی ایک سمندر ہے سمندر کی طرح
جس میں ہر درد کی دھار
جس میں ہر غم کی ندی ملتی ہے
اور ہر موج
لپکتی ہے کسی چاند کے چہرے کی طرف

☆

پیاس کی آگ

مَیں کہ ہوں پاس کے دریا کی تڑپتی ہوئی موج
پی چکا ہوں مَیں سمندر کا سمندر پھر بھی
ایک اِک قطرۂ شبنم کو ترس جاتا ہوں
قطرۂ شبنمِ اشک
قطرۂ شبنمِ دل، خونِ جگر
قطرۂ نیم نظر
یا ملاقات کے لمحوں کے سنہری قطرے
جو نگاہوں کی حرارت سے ٹپک پڑتے ہیں
اور پھر لمس کے نور
اور پھر بات کی خوشبو میں بدل جاتے ہیں
مجھ کو یہ قطرۂ شاداب بھی چکھ لینے دو
دل میں یہ گوہرِ نایاب بھی رکھ لینے دو
خشک ہیں ہونٹ مرے، خشک زباں ہے میری
خشک ہے درد کا، نغموں کا گلو
مَیں اگر پی نہ سکا وقت کا یہ آبِ حیات
پیاس کی آگ میں ڈرتا ہوں کہ جل جاؤں گا ☆

پیراہنِ شرر

کھڑا ہے کون پیراہنِ شرر پہنے
بدن ہے چور تو ماتھے سے خون جاری ہے
زمانہ گزرا کہ فرہاد و قیس ختم ہوئے
یہ کس پہ اہلِ جہاں، حکمِ سنگ باری ہے؟
یہاں تو کوئی بھی شیریں ادا نگار نہیں
یہاں تو کوئی بھی لیلےٰ بدن بہار نہیں
یہ کس کے نام پہ زخموں کی لالہ کاری ہے

کوئی دِوانہ ہے، لیتا ہے سچ کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک
ہے بات صاف سزا اُس کی سنگ باری ہے ☆

تمہارے ہاتھ

تمہارے نرم، حسیں، دلنواز ہاتھ نہیں
مہک رہے ہیں مرے ہاتھ میں بہار کے ہاتھ
مہک رہی ہیں ہتھیلی میں انگلیوں کی لویں
تڑپتی نبض کہے جا رہی ہے پیار کی بات
پگھل رہی ہے رُخِ آتشیں پہ ہجر کی شام
نکل رہی ہے سیہ زلف سے وصال کی رات ☆

تو مجھے اتنے پیار سے نہ دیکھ

تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ
تیری پلکوں کے نرم سائے میں
دھوپ بھی چاندنی سی لگتی ہے

جب بھی تیرا نام لیا

جب ترا نام لیا دل نے، تو دل سے میرے
جگمگاتی ہوئی کچھ وصل کی راتیں نکلیں
اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے چراغ
سر جھکائے ہوئے کچھ ہجر کی شامیں گزریں
قافلے کھو گئے پھر درد کے صحراؤں میں
درد جو تیری طرح نور بھی ہے نار بھی ہے
دشمنِ جاں بھی ہے، محبوب بھی، دلدار بھی ہے ☆

چاند کو رخصت کردو

میرے دروازے سے اب چاند کو رخصت کردو
ساتھ آیا ہے تمہارے جو تمہارے گھر سے
اپنے ماتھے سے ہٹادو یہ چمکتا ہوا تاج
پھینک دو جسم سے کرنوں کا سنہری زیور
تم ہی تنہا مرے غم خانے میں آسکتی ہو
ایک مدت سے تمہارے ہی لئے رکھا ہے
میرے جلتے ہوئے سینے کا دہکتا ہوا چاند
دلِ خوں گشتہ کا ہنستا ہوا خوش رنگ گلاب ☆

چنڈالکا

یہ خاکِ پاک جو گوتم کے قدموں سے منور ہے
شراوستی کی بستی ہے

چنڈالکا ایک اچھوت لڑکی جو مہاتما بدھ کے ایک چیلے آنند پر عاشق ہوگئی تھی اور اُس کے عشق میں دیوانی ہوکر گوتم بدھ کے آشرم تک پہنچ گئی تھی اور پھر وہیں کی ہوکر رہ گئی۔

یہاں اِک سادہ و معصوم دل
روشن ہوا تھا عشق کے پاکیزہ شعلوں سے
دُھواں اُٹھا
بدن سے عود و عنبر کی مہک آئی
وہ خوشبو
اب بھی آوارہ ہے جنگل کی ہواؤں میں ☆

غم کا ہیرا

غم کا ہیرا
دل میں رکھو
کس کو دکھاتے پھرتے ہو؟
یہ چوروں کی دنیا ہے ☆

لمحوں کے چراغ

وہ نیند کی طرح نرم سبزہ
خوابوں کی طرح رمیدہ شبنم
پھولوں کی طرح شگفتہ چہرے
خوشبو کی طرح لطیف باتیں
کرنوں کی طرح جواں تبسم
شعلے کی طرح دہکتی خواہش
تاروں کی طرح چمکتی آغوش
ساغر کی طرح چھلکتے سینے
سب قافلہء عدم کے راہی

وادیٔ عدم میں چل رہے ہیں
تاریکیوں کے کھلے ہیں پرچم
لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں
ہر لمحہ حسیں اور جواں ہے
ہر لمحہ فروغ جسم و جاں ہے
ہر لمحہ عظیم جاوداں ہے☆

نذرِ اختر الایمان

رواں ہے کشتیِ عمر رواں آہستہ آہستہ
خیال و خواب ہوگا یہ جہاں آہستہ آہستہ
جو اُٹھتا ہے دل و جاں سے دھواں آہستہ آہستہ
بجھی جاتی ہے کوئی کہکشاں آہستہ آہستہ

نسیم تیری قبا

نسیم تیری قبا، بوئے گل ہے پیراہن
حیا کا رنگ ردائے بہار اُڑھاتی ہے
تیرے بدن کا چمن ایسے جگمگاتا ہے
کہ جیسے سیل سحر، جیسے نور کا دامن
ستارے ڈوبتے ہیں چاند جھلملاتا ہے☆

نوالہ

ماں ہے ریشم کے کارخانے میں
باپ مصروف سوتی مل میں ہے
کوکھ سے ماں کی جب سے نکلا ہے
بچہ کھولی کے کالے دل میں ہے
جب یہاں سے نکل کے جائے گا
کارخانوں کے کام آئے گا
اپنے مجبور پیٹ کی خاطر
بھوک سرمائے کی بڑھائے گا
ہاتھ سونے کے پھول اُگلیں گے
جسم چاندی کا دھن لٹائے گا
کھڑکیاں ہوں گی بینک کی روشن
خون اُس کا دیئے جلائے گا
یہ جو ننھا ہے بھولا بھالا ہے
صرف سرمائے کا نوالہ ہے
پوچھتی ہے یہ اُس کی خاموشی
کوئی مجھ کو بچانے والا ہے؟☆☆☆

متفرق اشعار

آستیں خون میں تر پیار جتاتے ہو مگر
کیا غضب کرتے ہو خنجر تو چھپاؤ صاحب!

☆

اپنی بے باک نگاہوں میں سمایا نہ کوئی
اور وہ ہیں کہ ہر اِک تازہ خدا سے خوش ہیں

☆

تصور اپنا، اپنی آرزو، شوقِ فضول اپنا
لب اُس کے، عارض اُس کے نکہتِ زلفِ دراز اُس کی
خموشی ایک گو بانگِ بہارِ عاشقانہ ہے
تبسم اُس کی غزلیں، روحِ روشن ہے بیاض اُس کی

☆

تیرگی پھر خونِ انساں کی قبا پہنے ہوئے
دے رہی ہے صبحِ نو کا کم نگاہوں کو فریب

☆

تیری دلبری کا تحفہ، یہ ستارہ بار آنکھیں
مئے شوق سے چھلکتی خوش و پُر خمار آنکھیں
مرے دل پہ سایہ افگن، مری رح و جاں میں روشن
یہ فرشتہ گیر زلفیں، یہ خدا شکار آنکھیں
رہے تا ابد سلامت یہ دِل و نظر کی جنت
یہ سدا بہار پیکر، یہ سدا بہار آنکھیں

☆

جب سے انسان کی عظمت پہ زوال آیا ہے
ہے ہر اِک بُت کو یہ دعویٰ کہ خدا ہو جیسے
ایک آواز سی ہے وقت کے سناٹے میں
دلِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا ہو جیسے میں

ہے اُفق تا بہ اُفق خونِ شہیداں کی شفو
کسی شعلے کے لپکنے کی ادا ہو جیسے
دِل کو اِس طرح سے چھوتی ہے کسی حسن کی یا
عارضِ گل پہ لبِ بادِ صبا ہو جیسے

☆

خدا حسین و جمیل ہے اور تمہاری آنکھوں میں جلوہ گر ہے
وہ موجِ رنگِ بہار ہم جس سے گلفشاں ہو مری نظر میں

☆

کم ظرفیِ گفتار ہے دشنام طرازی
تہذیب تو شائستگیِ دیدۂ تر ہے

☆

ہر منزل اِک منزل ہے نئی اور آخری منزل کوئی نہیں
اِک سیلِ روانِ دردِ حیات اور درد کا ساحل کوئی نہیں
ہر گام پہ خوں کے طوفاں ہیں، ہر موڑ پہ بسمل رقصاں ہیں
ہر لحظہ ہے قتلِ عام مگر کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں

☆

مصحفِ رُخ پہ جو زلف نے لکھا بسم اللہ
آئی زنجیر کے حلقوں کی صدا، بسم اللہ

☆

یہ کون آیا شبِ وصل کا جمال لئے
تمام عمرِ گزشتہ کے ماہ و سال لئے
ہزار رنگِ خزاں کا بدن پہ پیراہن
زوالِ حسن میں بھی حسنِ لازوال لئے

☆

یہ ہے آرزو چمن کی کوئی لُوٹ لے چمن کو
یہ تمام رنگ و نکہت ترے اختیار میں ہے
ترے ہاتھ کی بلندی میں فروغِ کہکشاں ہے
یہ ہجومِ ماہ و انجم ترے انتظار میں ہے

☆☆☆

قطعات

دور ۔ ے ختم ہوا، ختم ہوئی صحبتِ شب
ہو چکی صبح مگر رات ابھی باقی ہے
ایسا لگتا ہے کہ بچھڑی ہے ابھی مل کے نظر
ایسا لگتا ہے ملاقات ابھی باقی ہے

☆

دل تیرے لیے ہے پھر، زخمِ تازہ کی سوغات
آج ظلم پر اپنے پھر کوئی پشیماں ہے
کیا عجب سحر تک خود آفتاب بن جائے
اک چراغ پلکوں پر شام سے فروزاں ہے

☆

تمام رات اندھیرے کا جسم جلتا رہا
تمام رات چٹختا رہا سیاہ بلور
تمام رات ستاروں کی طرح پلکوں پر
لرزتے اشک سناتے رہے حکایتِ نو

☆

درد دریا ہے ایک بہتا ہوا
جس کے ساحل بدلتے رہتے ہیں
وہی تلوار اور وہی مقتل
صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

☆

ابھی جواں ہے غمِ زندگی کا ہر لمحہ
دھڑک رہا ہے دلِ بے قرار کی صورت
حسین و شوخ ہے مستقبلِ بشر کا خیال
کسی تبسمِ بے اختیار کی صورت

☆

ہر منزل اک منزل ہے نئی اور آخری منزل کوئی نہیں
اک سیلِ رواں دردِ حیات اور درد کا ساحل کوئی نہیں
ہر گام پہ خوں کے طوفاں ہیں، ہر موڑ پہ بسمل رقصاں ہیں
ہر لحظہ ہے قتلِ عام مگر کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں

☆

خلیق انجم

سردار جعفری

[illegible]

جب کہیں پھول ہنسے

جب کوئی طفل سرِ راہ ملے

رات کی شاخِ سیہ رنگ پہ جب چاند کھلے

دل یہ کہتا ہے حسیں ہے دنیا

چیتھڑوں ہی میں سہی ماہ جبیں ہے دنیا

دستِ صیاد بھی ہے، بازوئے جلاد بھی ہے

رقصِ تخلیقِ جہانِ گزراں جاری ہے

یہ سردار جعفری کی منظوم سوانح عمری "نومبر میرا گہوارہ" کا وہ ابتدائی بند ہے جس میں انہوں نے شاعرانہ انداز میں اپنی ولادت کا ذکر کیا ہے۔

یہ ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء کا قصہ ہے۔ جب علی سردار جعفری کا جنم ہوا۔ بیسویں صدی نے ابھی مشکل سے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا تھا کہ اُس کے سر پر پہلی جنگِ عظیم کے بادل منڈلانے لگے۔ اس رقصِ صیاد اور بازوئے جلاد کے سائے میں رقصِ تخلیقِ جہانِ گزراں جاری تھا۔ عالمی جنگ کی شرر افشانیوں اور ہولناکیوں کے دم توڑتے توڑتے روس میں انسانی تاریخ کا ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ یعنی اشتراکی نظام کے انار چھوٹ پڑے۔ جنگ کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ اور انسانیت کے لئے ایک حسین مستقبل کا خواب۔ یہ تھی وہ مٹی جس سے سردار جعفری کا خمیر اُٹھا تھا۔ چنانچہ سردار نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز اس شعر سے کیا۔

اُٹھ اُٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے — دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا

کہا جاتا ہے کہ سردار جعفری کا یہ سب سے پہلا شعر ہے۔

انقلاب اور بغاوت کا تصور اپنے آپ میں بڑا رومانی ہے۔ یہ بے وقت لہو گرم رکھنے کا بہانہ بھی ہے۔ اور ذریعہ بھی۔ سردار جعفری کا شمار بیسویں صدی کے چند باغی شاعروں میں ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد ابھی بھی خاصی ہے جو سردار جعفری کو اُردو کا سب سے بڑا باغی شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم سردار جعفری کے باغیانہ رجحان پر آسانی کے ساتھ غور کرنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۱۳ء ہی میں سردار جعفری کے ساتھ اور نہ جانے کتنے لوگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ لیکن شدتِ احساس، زندگی کے ساتھ والہانہ وابستگی، مظلوم انسانوں کے ساتھ دلی ہمدردی، انسانیت کو روشن مستقبل کی طرف لے جانے کا خواب، خواب کو تعبیر کی منزل کی طرف پہنچانے کا عرفان، ایک واضح نظریۂ حیات، تخلیقی جوہر اور بات کے فنکارانہ اظہار پر قدرت، یہ تمام چیزیں جب ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں تو سردار جعفری پیدا ہوتا ہے۔ کسی ملک کی تاریخ میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

سردار جعفری نے جب ہوش سنبھالا تو آزادی کے متوالے غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ زنجیروں کی جھنکار سے پورے ہندوستان کی فضا گونج رہی تھی۔ جدوجہدِ آزادی آخری منزل میں داخل ہونے والی تھی۔ سردار بھی اسی تاریخی جنگ میں کود کر جیل بھرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ سردار ترقی پسند ادیب تھے۔ اُن کی ذہنی ساخت و پرداخت میں مارکس اور لینن کی فکر اور فلسفے نے اہم رول ادا کیا تھا، اس لئے ہندوستان آزاد ہونے کے بعد انہوں نے خود کو نا آسودہ پایا۔ اس لئے اُن کے جیل جانے کا سلسلہ انگریز حکومت کے زمانے میں شروع ہوا تھا وہ اب بھی جاری رہا۔ سردار کی لڑائی صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے خلاف نہیں تھی، بلکہ اُن سرمایہ داروں کے خلاف تھی جو ہر زمانے اور ہر خطۂ زمیں پر انسانیت کے دشمنوں کے روپ میں موجود تھے اور اُن کے خلاف بغاوت سردار کا ایمان تھا:

بغاوت عزت و پندار نخوت کی اداؤں سے
بغاوت بوالہوس ابلیس صورت پارساؤں سے
بغاوت اپنی آزادی کی نعمت کھونے والوں سے
بغاوت عظمتِ رفتہ کے اُوپر رونے والوں سے

بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اُٹھانے سے
بغاوت ایک انسان کے سوا سارے زمانے سے

سردار جعفری کی نظم "فریب" اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے جو انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے گئی:

ناگہاں شور ہوا

لو شبِ تارِ غلامی کی سحر آ پہنچی
انگلیاں جاگ اُٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہ زن ہار گئے
راہ رو جیت گئے
قافلے دور تھے منزل سے، بہت دور مگر
خود فریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے
چُن لیا راہ کے روڑوں کو خزف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہ زن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں

پابند نظم کے مقابلے میں آزاد نظم بلاشبہ شاعر کو قافیے اور ارکانِ بحر کے تعین کی قید سے آزادی دلاتے ہوئے اظہار کی کچھ سہولتیں مہیا کرتی ہے لیکن آزاد نظم میں کی گئی انقلابی شاعری کا آہنگ اگر اپنے اندر قافیے کی موسیقی کو شکست دینے کی قوت پیدا کر لے تو یہ ایک ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ عرب کے قصیدہ گو شعراء مبالغے کو شعر کا حسن قرار دیتے تھے۔ یوں بھی شاعری کے بارے میں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ شاعری کا اظہار حقائق کا نہیں بلکہ عرفان حقائق کا نام ہے۔ تخلیق کار کے سیاق و سباق کے بغیر اس کی کسی تخلیق کو محض رومانی قرار دینا نہیں۔ پرانے زمانے میں جب راجپوت میدانِ جنگ میں پوری طرح سج دھج کے ساتھ جاتے تھے، اُن کے بارے میں کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ جب آپ موت سے پنجہ لڑانے جا رہے ہیں اور جب آپ کی واپسی یقینی نہیں ہے تو پھر میک اپ کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن یہ میک اپ اور سج دھج ضروری تھی اُن جانبازوں کا حوصلہ بلند کرنے کے لئے۔ اس لئے سراسر رومانیت اور رومانیت کا غازہ ان دونوں میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ اس گفتگو کے بعد اب ذرا ''فریب'' نظم کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمائے کے دلالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

بالیاں دھان کی گیہوں کے سنہری خوشے

مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح

اجنبی دیس کے بازاروں میں بک جاتے ہیں

اور بدبخت کسانوں کی بلکتی ہوئی روح

اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

سردار جعفری کے ہاں انقلاب کا تصور محض برائے انقلاب نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک انقلاب ایک ایسی گھاٹی ہے جس سے گزر کر ہم ایک خیابانِ رنگ و نکہت میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ تبدیلی آنی لازمی ہے لیکن کب اور کیسے؟ یہ کہنا مشکل ہے چنانچہ سردار اپنی انقلابی سرگرمیوں میں اس خیابانِ رنگ و نکہت کا خواب دیکھتے ہوئے چلتے ہیں۔ سردار جعفری نے خیابانِ رنگ و نکہت اور دیوِ استبداد کے طلسم کو بجائے خود خیابانِ رنگ و نکہت سمجھ لینے میں واضح فرق کیا ہے۔ شاید یہی وہ منزل ہے جہاں جگر جیسا غزل گو شاعر بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل — شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

سردار نے اپنی نظم "رومان سے انقلاب تک" میں یہی بات کہی ہے :

ساتھیو اب میری انگلیاں تھک چکی ہیں

اور میرے ہونٹ دکھنے لگے ہیں

آج مَیں اپنے بے جان گیتوں سے شرمسار ہوں

میرے ہاتھوں سے میرا قلم چھین لو

اور مجھے ایک بندوق دے دو

تاکہ مَیں اپنے نغموں میں فولاد اور بارود کا زور بھرلوں

۱۹۹۱ء میں پاکستان کے انگریزی اخبار ڈان میں سردار جعفری کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا۔ انٹرویو میں حسن عابدی نے نے سردار سے سوال کیا تھا کہ آپ کی شاعری اگرچہ مواد کے اعتبار سے انقلابی ہے لیکن آپ نے خواب کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے ایک مجموعے کا نام بھی "ایک خواب اور" ہے۔ اس سوال کا جو جواب سردار نے دیا، اُس میں بنیادی نکتہ یہ تھا کہ وہ خواب دیکھنے پر شرمندہ نہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ انسان کو برابر خواب دیکھتے رہنا چاہئے، انہیں تازہ رکھنا چاہئے تاکہ اُن کے حصول کی جدوجہد جاری رہے۔ سردار کا یہ بھی خیال تھا کہ خواب ہماری تحریروں میں ایک گہرا جمالیاتی احساس پیدا کرتے ہیں۔ یہاں سردار جعفری کی نظم "یلغار" کا تذکرہ ضروری ہے جس کا عنوان ہی "میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب" سے زیادہ گرج دار ہے اور جس بحر میں یہ نظم کہی گئی ہے اُس کے تیور رجزیہ ہیں لیکن اس کے باوجود نظم میں احساسِ جمال کی یہ خوشبوئیں ملاحظہ ہوں۔

کہاں ہیں لاؤ ہماری نازک مزاج سارنگیاں کہاں ہیں
سرود اور دلربا کی آواز کی حسیں تتلیاں کہاں ہیں
ستار کے تار میں لرزتی ہوئی جواں بجلیاں کہاں ہیں
ہمارے طبلوں کے بول کی دل نواز سرمستیاں کہاں ہیں
ہم اپنی تہذیب کی حفاظت کا دل سے اقرار کر رہے ہیں

ہم آج یلغار کر رہے ہیں

نسیم شیراز زلفِ بنگال کی گھٹاؤں سے کھیلتی ہے
ہوا بخارا کی ہے جو کشمیر کی ہواؤں سے کھیلتی ہے
نگار دہلی نگار چیں کی حسیں اداؤں سے کھیلتی ہے
صدائے چکن نوائے حافظ مری نواؤں سے کھیلتی ہے
اسیر اب تک تھیں جن میں قومیں وہ سرحدیں پار کر رہے ہیں

ہم آج یلغار کر رہے ہیں

یہ درست ہے کہ جب سردار جھنجلاہٹ کے ساتھ ظلم اور بربریت کیخلاف غم اور غصے کا اظہار کرتے ہیں تو خود اُن کی شاعری بھی HORROR SHOW کا سماں باندھ دیتی ہے:

ہڈیاں جلتی ہیں اور خوں کے اُبلتے ہیں کڑھاؤ
ایک آسیب ہے سرمایہ پرستی کا سماج
سر کٹی، ہاتھ کٹی، پاؤں کٹی لاشوں سے
زندگی موت کے دربار کو دیتی ہے خراج

اس کا جواز سردار یہ پیش کرتے ہیں کہ وہ شاعری میں فرسودہ اور پامال تشبیہوں کے مقابلے میں ایسی تشبیہوں کے استعمال کو ترجیح دیتے ہیں جو گرد وپیش میں بکھری پڑی ہیں۔ اس اعتبار سے تخلیقی زبان کے سلسلے میں اُن کا کہنا ہے:

"میری تمام کوشش یہ ہے کہ زیادہ آدمیوں کے لئے اپنی شاعری کو آسان بنا سکوں۔ اس کوشش میں میں ان حدود کو توڑ دینا چاہتا ہوں جو بول چال کی زبان اور "شاعرانہ" زبان کے بیچ حائل ہیں۔ جہاں میں ان حدود کو نہیں توڑ پاتا اور بول چال کی زبان میں میں اپنا مطلب ادا کرنے سے قاصر رہتا ہوں وہاں "شاعرانہ" زبان بھی استعمال کر لیتا ہوں۔ یہ دراصل بول چال کی زبان کا

عجز نہیں بلکہ میری تربیت کا قصور ہے۔"

زبان اور اظہار سے متعلق سردار کے اس موقف کا سلسلہ اس بحث سے جا ملتا ہے جو بیان اور خطیبانہ شاعری کے رد و قبول کے بارے میں ہماری تنقید میں چلتی آ رہی ہے۔ سردار اُن شاعروں میں ہیں جن کا مخاطب ایک واضح شکل و صورت میں ان کے سامنے موجود ہے۔ اس لئے انہیں یہ طے کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ اُن کا مخاطب کون سی زبان سمجھتا ہے۔ اور اگر کبھی وہ شعر میں ایسی زبان استعمال کرتے ہیں، جو اُن کے مخاطب کی ذہنی سطح سے اُوپر کی چیز ہے تو اس کے لئے وہ خود اپنے آپ کو قصور وار گردانتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُن کے ہاں جہاں کہیں بول چال کی زبان کے بجائے شاعرانہ زبان کا استعمال ہے، وہ خود ان کے عجز کلام کی علامت ہے۔ سردار اس بات کو مانیں یا نہ مانیں مگر یہ حقیقت ہے، جس کے دل ہی دل میں وہ بھی قائل ہوں گے کہ اُن کے کلام میں جو جمالیاتی آہنگ ہے، شکست رنگ کی جو جھنکار ہے، احساس لطیف کی میٹھی میٹھی جو چٹکیاں ہیں، وہ اُن کے قاری کی تو نہیں یا اُن کے مخاطب کے قابو سے باہر کی چیز ہے۔ اس لئے عام آدمی کے نقطۂ نظر سے ہر جگہ نہیں تو کہیں کہیں سردار کی شاعری اس ملکہ حسن کی مثال ہو جاتی ہے جس پر دل تو فریفتہ ہوتا ہے لیکن اُس سے آنکھ ملانے، اُس سے باتیں کرنے، اُسے چھونے یا اس سے اظہار مطلب کی باتیں تو کیا، اُس کا تصور تک دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ رات کی تعریف میں سردار کی نظم "موسموں کا گیت" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

رات کی مانگ میں تاروں کی سنہری افشاں
تاجِ مہتاب سے کچھ اور بھی روشن ہے جبیں
پیرہن چاند کی کرنوں کا چمکتا ریشم
اتنا شفاف کہ بادل کا کہیں نام نہیں
ہنستی ہیں دیکھ کے منہ چاند کے آئینے میں
پڑتی ہے سانولے مکھڑے پہ تبسم کی پھوار
ایسا لگتا ہے کہ نو عمر ہے، دوشیزہ ہے
ابھی آنے کو ہے بھرپور جوانی کی بہار

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاعرانہ زبان کے مقابلے میں بول چال کی زبان استعمال تو کی جا سکتی ہے اور بے شک یہ بڑا کمال بھی ہے اور قدرت اظہار کا ثبوت بھی۔ لیکن مستقبل کے خواب بُنتے ہوئے سردار جعفری احساس لطیف کے

جس خیابانِ رنگ ونکہت کی سیر خود کرتے ہیں کیا وہ سیر اپنے مخاطب کو بھی کرا سکتے ہیں؟ اس بحث سے قطع نظر سردار جعفری کے خلوص نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا، اب یہ بات علاحدہ ہے کہ وہ خود ہی نظمیں کہتے رہے اور پھر خود ہی جیل جاتے رہے۔ اُن کی نظموں کو سننے اور پڑھنے والوں نے جیل کی کتنی ہوا کھائی، ہم نہیں کہہ سکتے۔ دراصل کسی قوم کو ایک رات میں نہیں بدلا جا سکتا، اس کے لئے مدتوں تک ایک کے بعد ایک کتنے ہی سردار جعفریوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنے بھائی نے ''ایک خواب اور'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے خطیبانہ انداز کو جائز قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"یقینی طور پر اپنے بہترین معنوں میں ان کا انداز خطیبانہ ہے ....کیا مولانا روم کی مثنوی کا، میر انیسؔ کے مرثیوں کا، اقبالؔ کے شکوے کا،شیکسپیئر کے ڈراموں کا انداز خطیبانہ نہیں؟ یہ سب تخلیقات بھی عوام کو مجمعوں میں سنانے کے لئے کہی گئی تھیں۔ جعفری کی طویل نظمیں اسی صنف کی ہیں۔ان میں سادگی،روانی اور خلوص ہے اور وہ سننے والوں پر سیدھا اور براہ راست اثر ڈالتی ہیں اور کامیاب ہیں۔

(افکار کراچی، سردار جعفری نمبر ص ۴۲۵)

انقلاب مثبت تبدیلی کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ جعفری کے ہاں اس تبدیلی کا اشاریہ ان کے خواب ہیں۔ انصاف کے خواب، مظلوموں کی قسمت بدلنے کے خواب، امن، دوستی اور آشتی کے خواب.... لیکن خوابوں کا معاملہ قصہ حاتم طائی کا سا ہے۔ جہاں کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا سوال بڑے اور اہم سوال کو ایک طرف دھکیل کر اپنی ترجیح کے ساتھ سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ برصغیر کے مخصوص حالات میں، اور یہ اُس وقت کی بات ہے جب اشتراکی نظام ابھی بکھرا بھی نہیں تھا۔ سردار جعفری نے صبح فردا کا خواب دیکھا تھا۔ یہ ''صبح فردا'' عالمی سطح کا سُرخ سویرا نہیں تھا بلکہ وہ یہ خواب تھا جو انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اُگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
مَیں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

اگر اُردو میں کبھی ایماندار نقاد پیدا ہوئے تو وہ یہ فیصلہ کریں گے کہ سردار کس مرتبے کے شاعر ہیں۔ میں تو بس اتنا ہی کہوں گا کہ علی سردار جعفری ایک Genuine شاعر ہیں۔

(مجلہ مجلس فروغ اُردو ادب دوحہ ذ ئی ۱۹۹۸ء)

رضوان احمد

سردار جعفری

دشتِ جنوں کا آخری مسافر

میں نے سردار جعفری کو پڑھا کم ہے انہیں دیکھا زیادہ ہے۔

اس امر کی تفصیل یہ ہے کہ جب بھی کسی مشاعرے یا مخصوص نشست میں انہیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو اُن کی شاعری کم سُنی، اُن کے چہرے پر نظر زیادہ گڑی رہی۔ اُن کے چہرے میں بڑی جاذبیت ہے۔ وہ مجسم شاعر ہیں۔۔ اُن کی پریشان زلفیں دیکھ کر لوگ کتنی پریشانیاں بھول جاتے ہیں۔ زلفوں کے پیچ وخم سے زمانے کے پیچ وخم کا احساس ہوتا ہے، مگر سردار جعفری کے چہرے پر کبھی کوئی پریشانی نہیں دیکھی۔ وہ صرف نام کے سردار نہیں، واقعی سردار ہیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے اُن کو اب سے تیس سال قبل پٹنہ میں دیکھا تھا۔ اگرچہ اسے میں ملاقات نہیں کہہ سکتا۔ ملک کے قحط زدہ علاقوں کی مدد کے لئے نامور ادباء اور شعراء کا وفد پورے ملک کا دورہ کر رہا تھا۔ مختلف شہروں میں اُن کے پروگرام تھے۔ ان میں پٹنہ بھی شامل تھا۔ پٹنہ کے رویندر بھون میں یہ پروگرام ہوا تھا جس کی صدارت بہار کے وزیر اعلیٰ آنجہانی کرپوری ٹھاکر نے کی تھی۔ اس وفد میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، اندیور، سجاد ظہیر، امرت رائے، مجروح وغیرہ شامل تھے۔ اسی وفد میں سردار جعفری صاحب بھی آئے تھے۔ ہمارے درمیان ایک ایسی شخصیت تھی جس کے تمام ادباء سے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ تھے مرحوم سہیل عظیم آبادی۔ انہوں نے ہی ہم جیسے نئے ادیبوں کو ان قد آور ادباء سے متعارف کروایا تھا۔ لیکن ہم سب تو اس وقت تک بحیثیت ادیب بالکل گمنام تھے، مگر تمام ادباء بہت خلوص سے ملے اور ہماری ہمت افزائی بھی کی۔

اس کے بعد سے ہی میرے اندر سردار جعفری کی شاعری پڑھنے کی خواہش بیدار ہوئی، حالانکہ مَیں ان کی چیزیں شاعر، شاہراہ، آج کل اور نیا دَور وغیرہ میں پڑھتا رہا تھا مگر سب سے پہلے پیراہن شرر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا حرف اول ہی پڑھ کر مَیں چونک پڑا۔

"دوسروں کے نفس سے پہلے اپنے نفس سے جہاد ضروری ہے۔ معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور اُن کے خاتمے کے لئے لڑنا برحق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خودغرضی، غلط احساسِ برتری اور اس قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل ودماغ کی صفائی بھی برحق ہے، اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم کی جاسکتی ہیں۔

(پیراہن شرر۔ حرف اول)

مَیں نوجوان تھا۔ اِن الفاظ نے میرے ذہن میں ہلچل مچادی۔ مَیں نے بے انصافی کے خلاف لڑنے کا عہد کیا مگر ہر قدم پر مَیں یہ محسوس کرتا تھا کہ سردار جعفری نے دوسروں کے نفس سے لڑنے سے پہلے اپنے نفس سے لڑنے کی ترغیب دی ہے۔

۱۹۶۷ء میں اُردو۔ ہندی ادیبوں نے ہندوستان گیر دَورے کے بعد ایک منشور پر دستخط کئے تھے جس میں یوپی۔ بہار، مہاراشٹر۔ مدھیہ پردیش، ہریانہ، پنجاب میں اُردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ مگر اس منشور کی اشاعت کے بعد اس کی شدت سے مخالفت شروع ہوگئی۔ ہندی کے دو رسائل ہفتہ وار دھرم یگ اور ماہنامہ ساریکا، اس کی مخالفت میں آگے آگے تھے۔ اُردو کے خلاف متعدد مضامین شائع ہوئے، جن میں راہی معصوم رضا اور امرت رائے پیش پیش تھے۔ راہی معصوم رضا تو اُردو کے زبان ہونے سے ہی منکر تھے اور امرت رائے جنہوں نے منشور پر دستخط کئے تھے، انہوں نے بھی اُردو کو مطعون بنایا تھا۔ اس پوری بحث میں بار بار اس بات کا ذکر آرہا تھا کہ ۱۹۴۸ء میں آل انڈیا ہندی کانفرنس الہ آباد میں سردار جعفری نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اُردو کے لئے ہندی رسم الخط بھی لائے ہیں جو اس وقت بھی اُن کی جیب میں موجود ہے۔ اس کانفرنس میں اُن کی باتوں کا گرم جوشی سے خیر مقدم ہوا تھا۔

تقسیم کے بعد اُردو پر بُرا وقت پڑا تھا۔ حالات بے حد خراب تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب اُردو نہیں بچے گی۔ ایسے میں ہی اُردو کے سربرآوردہ ادیبوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر ہندی والے اُردو کے کمل کلاسکی ادب کو ہندی میں منتقل کرلیں تو اُردو کا رسم الخط ہندی کیا جاسکتا ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ لوگ بار بار یہ تو کہتے ہیں کہ مَیں نے اُردو کے لئے دیوناگری رسم الخط کی تجویز رکھی مگر اس کے ساتھ جو شرائط تھیں اُن کا ذکر کوئی نہیں کرتا اور

انہی شرائط کو ہندی والوں نے قبول نہیں کیا۔ مَیں نے ایک اور سوال پوچھا کہ اس خط پر کن کن ادیبوں کے دستخط تھے؟ تو انہوں نے بتایا کہ اس پر دو درجن سے زائد اُردو ادباء کے دستخط تھے، جن میں جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، مجروح سلطان پوری، شاہد لطیف، عصمت چغتائی، آل احمد سرور تک شامل تھے۔

مَیں نے اُن سے ایک اور سوال پوچھا تھا کہ وہ ترقی پسند ہونے کی وجہ سے باغیانہ ذہن رکھتے ہیں لیکن ایمرجنسی کے دوران انہوں نے سپر کیوں ڈال دی اور سرکاری رائٹرز فورم کے رکن کیوں بن گئے؟ اُن کا کہنا تھا کہ انہوں نے آزادیٔ فکر کو گروی نہیں رکھا تھا۔ اُنہوں نے اپنے کئی اشعار اور نظمیں سنائیں جو انہوں نے ایمرجنسی کے دوران لکھی تھیں اور جن میں قائدین پر گہرا طنز تھا۔ نیشنل رائٹرز فورم میں شرکت کے سلسلے میں اُن کا خیال تھا کہ ملک پر فسطائی طاقتیں حاوی ہونے کی سعی کر رہی تھیں جن کو کمزور کرنا ضروری تھا۔

بہرحال انہوں نے میرے تمام سوالات کے جواب بہت تفصیل سے اور مکمل کردئے اور اس کے بعد سے ہی سردار جعفری کے متعلق میرا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ مجھ پر بھی بہت شفقت اور کرم فرمانے لگے۔

اس کے بعد سے تو دہلی، بمبئی، حیدرآباد، لکھنؤ وغیرہ میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور مجھے بارہا اُن کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں باتیں کرنے اور انہیں جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اور وہ دن تو میری زندگی کا یادگار دن ہے جب مجھے اُن کے ساتھ ساتھ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کا غالب انعام ملا تھا۔

۲۱ جولائی ۱۹۸۹ء کی تاریخ تھی۔ ادیبوں کا جھرمٹ تھا۔ اختر الایمان، سردار جعفری، شمس الرحمٰن فاروقی، رام لعل، کالی داس گپتا رضا۔ پروفیسر عبدالمغنی وغیرہ کے ساتھ ساتھ یہ حقیر فقیر بھی تھا جسے اس سال کا صحافت غالب ایوارڈ ملا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کی چیئر پرسن بیگم عابدہ احمد اور سکریٹری محمد شفیع قریشی (موجودہ گورنر مدھیہ پردیش) ادباء کی تواضع میں پیش پیش تھے۔ مَیں ایک جانب کھڑے ہو کر سردار جعفری صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ اُن سے بہت عرصے کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اُن کی صحت بھی ان دنوں کچھ خراب چل رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کی کافی باتیں ہوئیں وہ اپنے آئندہ پروجیکٹوں کے بارے میں بتانے لگے کہ لکھنے پڑھنے کے علاوہ وہ ٹی وی سیریل بنانے پر بھی توجہ دے رہے ہیں۔

اِدھر کئی برسوں کے وقفے کے بعد پٹنہ میں ملاقات ہوئی، جب وہ بہار قانون ساز کونسل کے چیئرمین اور میرے کرم فرما پروفیسر جابر حسین صاحب کی دعوت پر ایک لیکچر دینے کے لئے تشریف لائے۔ چونکہ یہ غالب دوصدی پروگرام تھا اس لئے اس کے لحاظ سے انہوں نے غالب کی مثنوی چراغ دیر پر ایک بے حد عالمانہ خطبہ دیا۔ اب یہ خطبہ غالب کے 'سومنات خیال' کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ جعفری صاحب کا قیام گورنر بہار ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کے ساتھ راج بھون میں تھا۔ مَیں نے اُن سے ملنے کا وقت مانگا تو انہوں

نے اگلے دن ناشتے پر بلایا۔ میں نے انہیں بتایا کہ گورنر ڈاکٹر قدوائی میرے ہموطن ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ ہم لوگوں کا تعلق بہت پرانا ہے۔ میرے پٹنہ آنے کا انہیں پتہ چلا تو انہوں نے مجھے فون کر کے کہا میرے ساتھ قیام کرنا۔

وہ کافی بیمار تھے۔ اُن کی صحت خراب تھی اگلے دن جابر صاحب کے گھر پر نشست میں بھی اُن سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے علالت کے باوجود کافی چیزیں سنائیں۔

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اِک دل کے سوا

راستے بند ہیں سب کوچہء قاتل کے سوا

شارب ردولوی

انسان دوستی

سردار جعفری کے کلام کا بنیادی محور

سردار جعفری کی شاعری کلاسیکی اقدار اور ترقی پسند فکر کے خوبصورت امتزاج کی شاعری ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کی ادبی و شعری فکر کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ ان زاویوں کو نگاہ میں رکھے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ ہماری کلاسیکی روایت میں ایک بڑی روایت تصوف کی روایت رہی ہے، جس کا بنیادی محور وہ مثلث ہے جس کا ایک زاویہ خالقِ کائنات، دوسرا کائنات اور تیسرا زاویہ انسان ہے۔ فارسی کی وہ شاعری جو ہم نے ادبی اور تہذیبی روایت کے طور پر پائی اس میں بھی اس مثلث کی بڑی اہمیت ہے، جس نے انسان دوستی، محبت اور مساوات کو عقائد اور مذہبی روایات سے زیادہ اہمیت دی اور انسان سے محبت اور اس کے جذبات کے احترام کو ہی بہترین عبادت قرار دیا۔ سردار کی میرؔ اور کبیر پسندی کے پس پردہ بھی وہی انسان دوستی کا جذبہ کارفرما ہے جو ان کی شاعری کا جزو لازم ہے۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں انسان کا تصور بالعموم ایک مجبور اور بے بس انسان کا تصور ہے جسے کوئی اختیار نہیں ہے اور جو مجبور محض ہے۔ وہ صرف زندگی کا بوجھ اٹھا کر چلنے والا ایک بے بس انسان ہے لیکن ترقی پسند فکر نے اس نئے انسان کا تصور دیا جو مجبور ہونے کے ساتھ باغی بھی ہے اور اپنی تقدیر خود بنانا چاہتا ہے، جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کائنات کو زیادہ خوبصورت زیادہ دلکش اور زیادہ حسین بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہی انسان سردار کی فکر کا مرکز و محور ہے۔ آج انسان علم کے نئے نئے دروازے وا کرتا جا رہا ہے اور رازہائے تخلیق سے ہر روز نئے پردے اٹھاتا جا رہا ہے جو ان لوگوں کو بھی جو خدا کے قائل نہیں ہیں، خالق کائنات کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر رہا ہے اور ساتھ ہی انسان کی ہنرمندی کا پرچم بلند کر رہا ہے۔

سردار انسان کی اسی عظمت کے نغمہ خواں ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ:

"اس نامکمل کائنات کو وقت اور انسان دونوں مل کر تکمیل کی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یہ منزل کبھی نہیں آئے گی کیوں کہ ناتمامی فطرت کا اٹل قانون ہے لیکن اس منزل کا تصور، شوق کو مہمیز کرتا رہے گا اور انسان کو آداب خداوندی سکھاتا رہے گا۔"

سردار کے تصور انسان کو ان کے اس اقتباس سے بڑی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ تکمیل کائنات کے قائل نہیں۔ اس لیے کہ تکمیل ارتقا کی دشمن اور اختتام کی علامت ہے اور کائنات ارتقا کا نام ہے۔ یہاں پر غالب کا ایک شعر اس کی بڑی اچھی تفسیر پیش کر سکتا ہے:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

غالب نے بھی ارتقائے کائنات کے تسلسل کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے اور کائنات کے سلسلہ میں نئی دریافتوں کو 'آرائش جمال' سے تعبیر کیا ہے۔

سردار جعفری کے پہلے مجموعہ کلام 'پرواز' سے لے کر تو مبر۔ میرا گہوارہ' تک نصف صدی سے زائد کے شعری سفر میں ایک ہی جذبہ ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے، وہ انسان، اس کے کرب اور اس کے مسائل سے ہمدردی اور جذبۂ انسانیت ہے۔ انسان کی مجبوریوں کے بارے میں تقریباً سبھی شعرا نے کسی نہ کسی انداز میں اظہار خیال کیا ہے لیکن ان کے یہاں وہ بہت سے موضوعات میں سے ایک موضوع ہے جو کبھی کہیں نظر آ جاتا ہے۔ سردار جعفری نے تسلسل کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ اس نے اسے ان کے کلام کا بنیادی محور بنا دیا ہے۔ وہ اپنی ابتدائی شاعری میں ایک باغی نوجوان نظر آتے ہیں جو عہد پارینہ کی داستانوں سے بھی بغاوت کرتا ہے اور عظمتِ رفتہ پر رونے والوں سے بھی، جو حکومت سے بھی بغاوت کرتا ہے اور "سامراجی نظم و قانون و سیاست" سے بھی، جو دکھ درد کو برداشت کرنے والے جذبے سے بھی بغاوت کرتا ہے لیکن صرف ایک انسان ہے جس سے بغاوت نہیں کرتا:

بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے
بغاوت ایک انساں کے سوا سارے زمانے سے

دراصل انسان کی یہ بغاوت بھی ان کی انسانیت اور انسانوں سے محبت کی علامت ہے۔ اس لیے کہ جن باتوں سے وہ بغاوت کرتے ہیں انھوں نے ہی انسان کو مجبور و معذور بنا رکھا ہے اور اس سے ایک باعزت زندگی

گزارنے کا حق چھین لیا ہے۔ یہ بغاوت بھی برائے بغاوت یا صرف ایک نعرہ نہیں بلکہ انسان کے دکھ درد سے ہمدردی کا جذبہ ہے۔ ان کی مشہور نظم 'نئی دنیا کو سلام' اردو شاعری میں ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں موضوع اور ہیئت کے ساتھ اظہار و بیان کے جو تجربے کیے گئے ہیں اور کلاسیکی لفظیات کو نئے مفاہیم اور نئی پیکر تراشی سے آراستہ کیا گیا ہے اس نے اس کے بیانیہ یا مقصدی ہونے کے باوجود اسے نئی شعری توانائی سے آراستہ کر دیا ہے۔ اس نظم پر کوئی بھی اعتراض کیا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے اردو شاعری میں وسعت اظہار کے کتنے ہی نئے دروازے کھول دیے۔ یہ نظم بھی بنیادی طور پر انسان کے فکر و عمل کی آزادی اور انسانیت کی بلند مثالی کو پیش کرتی ہے:

کتنی دلچسپ ہے یہ کہانی

مٹ کے بنتی ہے پھر زندگانی

ساری انسانیت اک تڑپتا ہوا شعلہ ہے

اور افراد چنگاریاں ہیں

جن کے سینوں میں کتنے ہی بیباک و بیتاب شعلے

پرورش پا رہے ہیں

اور تڑپتے ہوئے شعلے سے

جتنی چنگاریاں پھوٹتی ہیں

اس طرح زندگی

گل بہ آغوش چنگاریوں سے

ہر گھڑی

اک نیا اور مہکتا ہوا لہراتا بنے لیے گوندھتی ہے۔

(نئی دنیا کو سلام)

سردار انسانیت پر زبردست یقین رکھنے والے شاعر ہیں، وہ کبھی کسی عالم میں مایوسی یا ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری کوششیں صرف ایک حد تک کام کرتی ہیں اور اس کے بعد ہم نہیں رہتے۔ لیکن موت بھی ان میں کسی طرح مایوسی یا ناامیدی نہیں پیدا کرتی، وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانیت کی تعمیر کا یہ سلسلہ ہمارے نہ رہنے کے بعد بھی اسی طرح چلتا رہے گا:

ہم ہیں معمار انسانیت کے
اپنے آباء واجداد معمار تھے
ہم بھی معمار ہیں
آنے والے زمانے کی نسلیں بھی معمار ہوں گی
زندگی کا فلک بوس ایواں اسی طرح بنتا رہا ہے
اور بنتا رہے گا
ہم جہاں اپنی صناعیاں ختم کر کے چلے جائیں گے
کل وہیں سے نئے عہد کے حوصلہ مند صناع
اپنے فن اور صنعت کا آغاز کریں گے

کل کے دن ہم نہ ہوں گے مگر
زندگی مسکراتی رہے گی
اپنی شمعیں جلاتی رہے گی
آسمانوں کا فیروزی رنگ اتنا ہی دلکش رہے گا
اور افق کی جبیں روشنی سے چمکتی رہے گی۔

(نئی دنیا کو سلام)

ان کا یقین ہے کہ زندگی اور انسانیت کل بھی رنگ و نور کی دلکشی کی طرح یوں ہی باقی رہے گی اور اگر اس میں کوئی فرق آئے گا تو یہ آئے گا کہ آج جو غریبی کی ذلت، مصیبت، جہالت، عداوت کی زنجیریں انسان کو جکڑے ہوئے ہیں، وہ ٹوٹ جائیں گی اور زندگی کی مغموم آنکھوں میں خوشیوں کی روشنی چمکنے لگے گی۔

زندگی کا ایک مخصوص تصور بلکہ تسلسل زندگی کا تصور سردار جعفری کا محبوب ترین موضوع ہے۔ اس پر انھوں نے طرح طرح سے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ بار بار نئے نئے استعاروں اور علامتوں میں اس بات کو دہراتے ہیں۔ انسان کے لیے موت کا خوف ہمیشہ ہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف رہا ہے۔ اس خوف نے نہ جانے کتنے توہمات پیدا کیے ہیں اور انسان ازل سے اس پر قابو پانے کے لیے کوشاں ہے۔ سردار موت کی

حقیقت سے انکار نہیں کرتے لیکن تسلسلِ زندگی کا تصور دے کر اور بار بار اس کا ذکر کر کے وہ ذہنوں پر حاوی تصورِ مرگ اور خوفِ مرگ کو پسپا کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک نئے انداز میں زندگی کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں:

موت جب آ کے کوئی شمع بجھا دیتی ہے
زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

ماں کی آغوش میں ہنستا ہوا اک طفلِ جمیل
جس طرح ذہنِ ازل میں ہو ابد کی تخئیل
دیکھ لیں وہ جو سمجھتے ہیں کہ فانی ہے حیات
زندگانی کے طرب ناک تسلسل کی دلیل

ان اشعار میں شمع اور کنول کی خوبصورت رعایت ہی نہیں بلکہ بچے کے لیے کنول (پھول) کا استعارہ جو اس کی شادابی، دلکشی اور مسرت بیزی کا خوبصورت اظہار ہے، شعر کے جمالیاتی کیف کو دوگنا کر دیتا ہے۔ اسی طرح آغوشِ مادر میں طفلِ جمیل' کے تبسم کی تشبیہ ذہنِ ازل میں ابد کی تخئیل سے دینا سردار کی انفرادیت کی بہترین مثال ہے۔

زندگی کے تسلسل کا تصور اردو شاعری کے لیے نیا نہیں ہے۔ بعض شعرا کے یہاں تلاش کرنے پر اس طرح کے شعر مل جائیں گے:

موت اک ماندگی وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

لیکن اس طرح کا اظہار بس رسماً آگیا ہے۔ کسی نے اسے نہ تو اپنا موضوع بنایا نہ اپنی فکر کے ایک اہم پہلو کی طرح پیش کیا اور نہ اسے جمالیاتی احساس اور جذبے کی بھرپور شدت کے ساتھ اپنی فکر کا حصہ بنایا ہے۔ اس موضوع پر صرف اردو ہی میں نہیں میرے خیال میں تمام ہندوستانی ادبیات میں سب سے اچھی نظم سردار جعفری کی "میرا سفر" ہے۔ اس کی امیجری اور اس کے استعارات، نظم میں خیال کا ارتقا اور بہاؤ اس قدر خوبصورت ہے کہ جیسے جیسے الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں ذہن میں ان کی تصویریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ اس نظم

کے عنوان کے ساتھ سردار نے رومی کا مصرع "ہچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم" درج کیا ہے۔ یعنی رومی کے اس خیال کو لے کر انھوں نے زندگی کے وسیع کینوس پر حیات و ممات کی رنگ آمیزی کی ہے۔ اس کی امیجری اور خوبصورت استعاروں کے ذریعہ تسلسل حیات اور زندگی کے فلسفہ کو سردار جعفری کس طرح پیش کرتے ہیں، چند اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ بھی
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی

اس زمین پر جب سے زندگی کا وجود ہوا ہے اور جب سے حیات انسانی کی کونپلیں اس سے پھوٹی ہیں، زندگی اور موت کا سلسلہ جاری ہے۔ اور آج تک کوئی اس راز پر سے پردہ نہیں اٹھا سکا ہے کہ اس انسان کو اپنی ذہانتوں، علمی سربلندیوں، بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود اچانک کیا ہو جاتا ہے اور وہ کہاں چلا جاتا ہے اور اس کے بعد جو تاریکی ہے اس میں کیا ہے۔ لیکن سردار زندگی کے ختم ہو جانے کے قائل نہیں۔ ان کے خیال میں یہ اسی طرح چلتی رہتی ہے اور ہر اختتام دراصل ایک نئی شکل میں نمودار ہوتا ہے:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
جب کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی

میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں کھولوں گا

جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی

(میرا سفر)

اس پوری نظم میں جن استعارات سے سردار نے پیکروں کی تشکیل کی ہے وہ شعری اظہار پر ان کی قدرت کی مثال ہیں لیکن نظم کی اس جمالیاتی دلکشی کے ساتھ اس غیر دلچسپ موضوع کو شعری وسیلۂ اظہار میں بدل دینا بھی سردار ہی کا حصہ ہے۔ زندگی کے لامتناہی سلسلہ کو یہ استعاراتی زبان اور یہ تشبیہیں سردار ہی دے سکتے تھے:

میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں

سردار کے لیے سب سے عظیم چیزیں انسان اور انسانیت ہیں۔ وہ اسی کے نغمہ خواں ہیں اور اسی کی زندگی کی بات کرتے ہیں جو محرومیوں کا شکار ایک عام انسان ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ زندگی اس وقت تک حسین کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک عام انسان کو مظلومی اور جبر سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ 'امن کا ستارہ' میں وہ اسی انسان کو اپنا "آدرش" اور دین و ایمان بتاتے ہیں۔ ان کی وہ نظمیں جن میں براہِ راست اس موضوع کا ذکر

نظمیں ہے ان میں بھی استعارات اور علامتیں اسی انسانیت، محبت، صلح جوئی کی خواہش کی طرف اشارہ ہیں اور اسی کے لیے وہ اس 'صبح فردا' کے منتظر ہیں جو صرف محبت کا پیغام سنائے اور جو بارود کی بو کے بجائے پھولوں کی خوشبو بکھیر دے۔ یہ نظم بھی اپنے موضوع کی اہمیت کے ساتھ جمالیاتی اظہار کا بے حد پر اثر نمونہ ہے:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد خون کی اشکوں کی آہوں کی شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

یہ سرحد صرف 'گلشن لاہور و دلی' کی سرحد نہیں بلکہ اس میں ہر اس سرحد کا درد پوشیدہ ہے جس پر ہر روز نوجوانوں کے تازہ خون سے رنگ بھرا جاتا ہے اور یہ نظم انسان دوستی اور محبت کی وہ آرزو ہے جو سرحدوں کو پھول کی خوشبو اور رنگوں کی بہاروں سے بھر دے اور اسے کج اداؤں، کج کلاہوں، منچلوں، دلبروں اور عاشقوں کی سرحد بنا دے۔ انسانیت کا یہ نغمہ خواں سرحدوں پر کب سے اس صبح کا انتظار کر رہا ہے۔

سردار کا سب سے بڑا دکھ انسان کا مصائب و آلام کا شکار ہونا ہے جس کا سبب سماجی اور معاشی نابرابری، ناانصافی، نفرت اور ہوس ہے۔ انسان کا انسان پر یہ جبر صرف کسی نظام حکومت کی بات نہیں ہے اور نہ اس کے بدل جانے سے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ انسان کی تقدیر بدل جائے گی۔ کسی نظام کی تبدیلی سے کچھ ناانصافیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے، اس کی زندگی نہیں بدل سکتی۔ ہمارے سامنے ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد کی پچاس سالہ تاریخ ہے۔ اس عرصہ میں مجبوروں کے لیے استعمال ہونے والی بعض اصطلاحات ضرور بدل گئیں لیکن ان کی حالت نہیں بدلی۔ آج سردی ہو یا گرمی فٹ پاتھ پر سونے والوں کی تعداد پہلے سے کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔ آج رنگ و نسل اور ذات پات کے جھگڑوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔ آج ظلم کے حربے اور زیادہ سخت

ہو گئے ہیں۔ سردار انسان کی اس بے بسی کے خلاف آواز کا نام ہے جو انسان کی افسردہ شاموں کو خوشگوار بنادینے والے کو اپنا دل نذر کرنے کو تیار ہیں:

کیا کوئی ایسا ہے جو ہونٹوں کی افسردہ شاموں کو
صبح تبسم عطا کرے
پیاس کے پیلے برگ خزاں کو
فصل گل کی مے میں ڈبو دے
کیا کوئی ایسا ہے جو بھیگی آنکھوں سے
آنسو کے قطرے چن لے

جو دھرتی کی بھوک مٹائے
اس کا آنچل گیہوں کے خوشوں سے بھر دے
انساں کی تفریق مٹا کر
انساں کی تخلیق کرے
کیا کوئی ایسا ہے جس کی پلکوں پر
میرے خوابوں کا یہ عکس ملے

(چھوٹا سا دل، لہو پکارتا ہے)

اس سلسلہ میں سردار جعفری نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت 'پیراہن شرر' 'حرف اول' میں جن الفاظ میں کی ہے وہ بہت اہم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سماجی ناانصافی یا سماجی نظام کی تبدیلی انسانی فطرت کو نہیں بدل سکتی جس میں ہوس اور خود غرضی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس کے لیے ذہنوں اور فکروں کو بدلنے اور ان کے تعصبات کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"... معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خود غرضی، غلط احساس برتری اور اسی قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و دماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔ اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہو سکتی ہیں۔"

سردار نے اسی فکر اور ذہن کو تبدیل کرنے اور ان میں نفرتوں کی جگہ محبتوں کے گلاب کھلانے کی

کوشش کی جوان کے کلام میں ہر جگہ استعارے اور علامتیں بدل بدل کر در آئی ہے۔ وہ کل پر یقین اور اپنی کوششوں پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر کوشش کے پیچھے ایک نئی تازگی اور ایک نئی توانائی نظر آتی ہے اور وہ پہلے سے اور زیادہ خوش رنگ اور دلکش الفاظ میں اپنی بات دہراتے جاتے ہیں:

امانتِ غمِ انساں امانتِ غمِ دل
یہ اک چراغ ہے قندیلِ مہر و مہ کی طرح
جو یہ نہ ہو تو زمانے میں روشنی کیوں ہو

یہ کل جو درد محبت امانت غم ہے
یہ کل جو شوخ بھی خوں گشتہ بھی ملول بھی ہے
خدائے عشق بھی ہے امن کا رسول بھی ہے

زندگی اور انسان سے بھی محبت سردار کی شاعری میں دلنوازی کی نہ جانے کتنی شکلوں میں دکھائی دیتی ہے۔ 'اودھ کی خاک حسین' میں بھی محبت کہیں سیاہ چکی سے سفید آٹے کے راگ بن کر نکلتی ہے اور کہیں 'سنہری چولہوں میں آگ کے پھول' کھلنے میں نظر آتی ہے:

سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہری چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھویں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں

زندگی سے ایسی والہانہ محبت اور اس کے رنگوں کی ایسی تصویر کشی، ایسی متحرک اور دلکش امیجری اردو شاعری میں کمیاب نہیں نایاب ہے۔ سردار کو اپنے موضوع کے اظہار پر جو قدرت اور اظہار کی جمالیات پر جو گرفت ہے وہ ان کی نظموں کو ایک نازک اور لطیف احساس میں تبدیل کر دیتی ہے، موضوع ان کا خواہ کچھ بھی ہو۔

□□

(ص۲۰۱۔۱۱۰ ا، اُردو دنیا، ستمبر ۲۰۰۰ء)

شمیم حنفی

سردار جعفری کی شاعری

سردار جعفری کی شاعری پر ایک مضمون میں ان تمام مسئلوں پر اظہار خیال کرنا جن سے یہ شاعری عبارت ہے اور جو سردار جعفری کی حسیت اور اظہار کے تعین کا وسیلہ بنتے ہیں، وہ بھی اس طرح کہ مضمون کے مصنف اور قاری دونوں کے ذہن کو یہ بحث کسی نتیجہ خیز نقطے تک لے جاسکے، میرے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو بہتوں کی طرح میرے اندر بھی ایک شدید قسم کا ردعمل پیدا کرتا ہے۔ یہ تو خیر ایک اچھی بات ہے، کیوں کہ جو شاعری پڑھنے والے میں کسی بامعنی ردعمل کو ہوا نہ دے سکے، وہ سنجیدہ غور و فکر کی متحمل بھی نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے جعفری اپنے ترقی پسند معاصرین مثلاً مخدوم اور مجاز اور فیض اور اپنے غیر ترقی پسند معاصرین مثلاً میراجی، راشد، مجید امجد اور اخترالایمان کی بہ نسبت میرے لیے زیادہ مشکل یوں ٹھہرتے ہیں کہ ان کی شاعری قدم قدم پر اصولی اور نظریاتی مباحث کے دروازے کھولتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ راشد، فیض، میراجی، مجید امجد اور اخترالایمان کے مقابلے مں بہت سہل الفہم اور غیر رسمی شاعرانہ حربوں سے خاصی حد تک آزاد ہونے کے باوجود، اور اس حقیقت کے باوجود بھی کہ جعفری کی نظموں میں ان کی حسیت کے ماخذ اور مراکز تک رسائی نسبتاً آسان بھی ہے جعفری کی شاعری سوالات بہت اٹھاتی ہے۔ ادب کی ماہیت اور ادیب کے مجموعی رول کی بابت جعفری نے اپنے تمام معاصرین سے زیادہ لکھا ہے۔ مقدار کے لحاظ سے ان کا اپنا تخلیقی سرمایہ بھی شاید اپنے سبھی معروف ہمعصروں سے زیادہ ہے۔ اور کم سے کم اس معاملے میں تو شک اور قیاس کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ تخلیقی اور فکری سطح پر ہمارے زمانے کے پورے ادبی معاشرے کا احاطہ کرنے والے کچھ سوالوں اور بنیادی نوعیت رکھنے والے کچھ

مباحث میں عملی شرکت کے اعتبار سے جعفری ہمیشہ دوسروں سے آگے رہے ہیں۔ اختلافات میں زیادہ الجھے ہیں۔ اشتعال آمیز باتیں زیادہ کہی ہیں۔ اور اپنے اتقانات کی طرح اپنے مفروضات کے سلسلے میں بھی ادعائی قسم کا رویہ زیادہ شدومد کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ وہ اپنے حلقے کے شارح اور مفسر بھی رہے ہیں۔ ایک سرگرم وکیل اور مبلغ بھی اور اس معاملے میں ان کا رویہ خاصا پرجوش بیاس وارانہ اور جذباتی بھی رہا ہے۔

اسی لیے جعفری دوسروں کے مقابلے میں اعتراض اور مذمت کا نشانہ بھی زیادہ بنے۔ کم و بیش ہر چھوٹے بڑے نے، ترقی پسندی کی نظریاتی بنیادوں کو ہدف بنانے کا سب سے آسان راستہ یہی دریافت کیا کہ پہلے جعفری سے کچھ حساب کرلیا جائے۔ رول ماڈل سامنے ہو تو جدال پسندی ہوا میں ہاتھ چلانے کی بے معنی مشقت سے بچ جاتی ہے۔ یہاں اس واقعے کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ جعفری کے بعد کی نسل کا معمولی فرق کے ساتھ، جعفری کے ساتھ وہی سلوک رہا ہے جیسے جعفری نے پنے پیش روؤں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ زیادتی کے مرتکب دونوں ہوئے ہیں۔ مگر سردار جعفری کی ادبی زندگی کے اولین دور سے وابستہ رویوں نے ان کے بارے میں کچھ سنگین قسم کی غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کے نتیجے میں سردار جعفری کی شاعری کو ابھی تک اس کے حقیقی تناظر میں رکھ کر دیکھا نہیں جاسکا۔ اس طرح کی اکاذکا کوشش ہوئی تھی تو جدیدیت اور ترقی پسندی کی کشمکش میں گم ہوگئی۔

میراجی نے منتخب نظموں (۱۹۴۱) کے دیباچے میں لکھا تھا: "صحیح اور صحت مندانہ ترقی پسندی، مختصر لفظوں میں خیال افروزی کا دوسرا نام ہے۔ جو ادب خیال افروز ہوگا، وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہمیں ایک قدم آگے بڑھانے پر مجبور کردے گا"۔ میراجی کی اس تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے محمد صفدر نے اپنے مضمون (بے راہ روی کی ضرورت) میں راشد، فیض، جعفری اور ان کے بعد کی نسل کے بعض شعرا کے حوالے سے یہ رائے قائم کی تھی کہ یہ شاعری ایک طرف تو اقبال کی مابعد الطبیعات کے خلاف ہے دوسری طرف اس بے یقینی کی کیفیت کے خلاف جو جدید تر شاعری میں انفرادیت، تنہائی اور تشنج کے طور پر نمودار ہوئی ہے۔ خود جعفری نے اقبال کی مابعد الطبیعات سے کنارہ کشی کا جو رویہ شروع میں اختیار کیا تھا، اس سے بہ ظاہر یہی گمان ہوتا تھا کہ اردو کی بنیادی شعری روایت اور اقبال کے مجموعی نظام فکر سے الگ وہ کسی تیسری جہت کی تلاش میں ہیں۔ جہاں تک اقبال کے مابعد الطبیعات اور نئی نسل کی بے یقینی سے اختلاف کا تعلق ہے، یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔ جعفری اور ان کے ترقی پسند معاصرین، بہرحال ایک واضح تخلیقی نصب العین اور ایک معینہ نظام فکر میں یقین رکھتے ہیں جو نہ تو اقبال کی شاعری سے مناسبت رکھتا ہے نہ نئی نسل کے مزاج سے۔ لیکن اقبال کی مابعد الطبیعات سے عدم مطابقت کو اقبال کی روایت سے انکار کے طور پر دیکھنا صحیح نہیں ہے۔

اب آیئے نئی نسل اور جعفری کے سوال پر گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر (۱۹۷۹ء) میں تخلیق کی نئی سمت کے عنوان سے جعفری نے اس عہد کی ادبی صورت حال کا ذکر یوں کیا ہے کہ:

"اس وقت ادب میں دو آوازیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ ایک آواز کا موضوع تہذیب کی نشاۃ الثانیہ ہے اور اس کا محور اور مرکز انسان ہے جو تاریخ میں پہلی بار عالم گیر پیمانے پر آزادی کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ صرف معاشی اور سیاسی آزادی نہیں ہے بلکہ وہ روحانی آزادی بھی ہے، جو انسان کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے۔ دوسری آواز کا موضوع تہذیب کا زوال ہے اور اس میں انسان شکست خوردہ اور حقیر ہے، بے بس اور مجبور ہے، یقین کی روشنی سے محروم ہے اور نجات کے تصور سے بھی بے خبر۔"

گویا کہ پھر وہی بات کہ سردار جعفری کی شاعری (ترقی پسند شاعری) اپنی پیش رو روایت اور اپنے بعد کی روایت، دونوں سے الگ، شعور کے ایک تیسرے منطقے سے تعلق کی نشاندہی کرتی ہے۔ فتح محمد ملک نے نئی شاعری اور جدید شاعری کی شناخت کا تعین کرتے ہوئے اس بات کی شکایت کی تھی کہ فیض اور سردار جعفری کو ترقی پسندی کے نمائندہ شاعر کی حیثیت اسی لیے حاصل ہوئی کہ یہ دونوں اقبال کے پھیلتے ہوئے اثرات کی راہ میں 'فکری سطح پر حائل ہوئے اور اقبال سے یکسر الگ ہو کر اپنی بوطیقا مرتب کی۔ ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس میں اقبال کی عدم شرکت کے واقعے کو فتح محمد ملک نے ۱۹۳۶ء کے آس پاس کی ادبی سیاست، روایت اور ترقی پسندی کی آویزش کے حوالے سے یہ سمت دینے کی کوشش کی ہے کہ چوں کہ اقبال نے بین الاقوامی صورت حال کا مطالعہ ایک خاص مشرقی انداز نظر کے ساتھ کیا تھا اس لیے وہ اپنے بعد کی نسل کے لیے قابلِ قبول نہ ہو سکے۔ دوسری طرف (عجیب بات ہے کہ) وہ اقبال کو "بین الاقوامی ادبی فضا میں سانس لینے والے" اور "پھیلتے ہوئے اثرات" کے شاعر کی حیثیت سے بھی دیکھتے ہیں۔

یہاں سردار جعفری کی شاعری اور ان کی حسیت سے مربوط کچھ مسئلوں کے جائزے میں اقبال کا تذکرہ میں نے ایک خاص مقصد اور مجبوری کے تحت کیا ہے۔ بادی النظر میں جعفری کے شعری رویے اور ان کا فکری مزاج اقبال سے کسی طرح کی مناسبت نہیں رکھتا۔ اقبال کے تہذیبی تصورات اور ان کی شعریات کے بارے میں جعفری نے اپنی ابتدائی تحریروں میں جن باتوں پر زور دیا ہے ان سے بھی یہی تاثر ابھرتا ہے کہ جعفری کی شاعری کے عناصر اور سرچشمے اقبال سے یکسر لاتعلق ہیں اور ان کی تخلیقی اور فکری اساس بالکل مختلف ہے۔ اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ جعفری کی شاعری کے خلاف جو گہرا تعصب ہمیں نئی تنقید میں

عام دکھائی دیتا ہے اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ شروع سے اب تک جعفری کی شاعری کو اس کے صحیح سیاق میں رکھ کر دیکھا نہیں جاسکا۔ ایک عام مفروضہ یہ قائم کرلیا گیا کہ جعفری کی شاعری (ترقی پسند شاعری) اپنی روایت سے تصادم اور ایک شدید قسم کی نظریاتی کشمکش، ایک طویل فکری فاصلے، ایک مختلف شعریات کا پتہ دیتی ہے۔ یہ مفروضہ حقیقت کے کے بجائے صرف ایک تاثر پر مبنی ہے اور اس تاثر کی تشکیل میں خود جعفری بھی اپنے معترضین سے کم سرگرم نہیں رہے ہیں۔ جعفری کی نثر نے ان کی شاعرانہ حیثیت کے خلاف خاصی گرد اڑائی ہے۔

ترقی پسند شاعروں سے قطع نظر، اپنے غیر ترقی پسند، ہمعصروں کے مقابلے مں بھی جعفری نے نثر میں اپنے موقف کی وضاحت کہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ ترقی پسند ادب پر ان کی کتاب کے علاوہ ان کے مضامین، اداریے، بحثیں، مقدمات، ان کی اپنی شاعری کے جواز اور پس منظر کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ جعفری کی شاعری کو پڑھتے وقت میرے ذہن میں یہ سوال بار بار پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس شاعری کے تخلیقی مفہوم اور مرتبے کا تعین خود جعفری کے نثری بیانات اور وضاحتوں کی مدد سے کیا جانا چاہیے؟۔ میرا اپنا جواب نفی میں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جعفری کی شاعری کا حقیقی سیاق شعریات کے جن اصولوں، ہماری اپنی روایت کے جن اوصاف اور ہمارے معاشرتی نظام سے مربوط جن قدروں کی روشنی میں متعین کیا جانا چاہیے تھا، ہمارے زمانے کی حسیت نے انھیں زیادہ اہمیت نہیں دی اور خود جعفری نے ان اصولوں، قدروں اور اوصاف کو قبول کرنے کے باوجود ان سے زیادہ زور نظریاتی مباحث کی وضاحت پر صرف کیا۔ اپنی مرکزی شعری روایت سے بنورشتہ جعفری کا ہے، وہ راشد، فیض، مخدوم، میراجی، مجید امجد، اخترالایمان میں سے کسی کا نہیں ہے۔ اور اقبال سے اپنی ارادت کا بہت موثر اظہار (اقبال پر اپنی نظم میں) کرنے کے باوجود، فیض کی حسیت اور اقبال کی حسیت میں اشتراک کے اتنے پہلو نہیں نکلتے جتنے کہ اقبال کے تصورات سے جارحانہ اختلافات رکھنے کے باوجود، جعفری کے تخلیقی مزاج اور ان کی شاعری کے مجموعی نظام سے نکلتے ہیں۔

آزادی کے بعد کی اردو نظم سے متعلق اپنے ایک مضمون میں وحید اختر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ نئی نظم کے اسالیب اور مزاج کی تشکیل میں دو روایتیں، دوسرے تمام ماخذ اور سرچشموں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ ایک کا سلسلہ میراجی تک جاتا ہے، دوسری کا سردار جعفری تک۔ وحید اختر کا خیال تھا کہ تجربہ پسندی اور ہیئت پرستی کے حصار شوق سے باہر کی نئی نظم، جس کے واسطے سے نئے طرز احساس کی فکری بنیادوں تک پہنچا جاسکتا ہے، وہ سردار جعفری کی قائم کردہ روایت سے مربوط ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ غور

طلب بات یہ ہے کہ نئی نظم کو فکری اساس مہیا کرنے والے تمام قابلِ ذکر شاعروں راشد، فیض، میراجی، اختر الایمان اور مجید امجد کے برعکس جعفری کی شاعری نے بین الاقوامی تصورات اور تجربوں سے متاثر ہونے کے بعد بھی اپنی مشرقیت کو بچائے رکھا۔ شاعروں کی اس صف سے (شاید) ایک اکیلی آواز جو آزاد نظم کی قبولیت سے انکار میں اٹھی، وہ سردار جعفری کی تھی۔ جعفری بھی سجاد ظہیر کی طرح آزاد نظم کو انحطاطی میلانات کی پروردہ سمجھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ 'پتھر کی دیوار' (۱۹۵۳ء) کی نظموں میں آزاد نظم کے اسی اسلوب کو ایک نیا تخلیقی اعتبار ملا۔ ۱۹۳۶ء تک، جس وقت جعفری نے آزاد نظم کے خلاف آواز اٹھائی، وہ سمجھتے تھے کہ "بعض نوجوان (روایت کی پاس داری کو بے جا قیود کا نام دے کر) بلینک ورس کی طرف راغب ہو گئے ہیں، ایسی چیزیں پیش کر رہے ہیں جو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبہ ہیں (مضمون اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات، علی گڑھ میگزین، ۱۹۳۶ء) اس رائے کی شدت پسندی میں کچھ حصہ جوانی کے جوش کا بھی ہوگا۔ علاوہ ازیں، لارنس کا یہ خیال کہ لوگ تجربوں سے ڈرتے ہیں اور نامانوس غذا کی طرح نامانوس خیال کو قبول کرنے میں بھی وقت لگتا ہے، اس واقعے پر بھی صادق آتا ہے۔ بہر نوع، جعفری کے تخلیقی سفر میں اس واقعے کی حیثیت محض ضمنی ہے اور اس کی بنیاد پر ادب کے معاملے میں ان کی قوتِ فیصلہ کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں۔ اس کے برعکس، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ نئے تجربوں سے جہاں ڈرتے رہنا اچھا نہیں، وہیں ہر نئے تجربے کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لینا بھی تعریف کے قابل نہیں ہے۔ مزید برآں، جیسا کہ اس بحث کے شروع میں عرض کیا گیا، جعفری اپنی روایت کی پہچان کے معاملے میں اپنے تمام ممتاز معاصر نظم گویوں — راشد، فیض، اختر الایمان، مجید امجد، میراجی سے آگے ہیں۔ کلاسیکیت سے ان کا روز افزوں شغف، اقبال کی طرف ان کی مراجعت انھیں دراصل اس سلسلے کا شاعر بناتی ہے جو جوش، اقبال، اکبر سے ہوتا ہوا حالی تک پہنچتا ہے۔ اس سلسلے کے پس منظر میں اردو مثنوی، مرثیے اور ایک حد تک غزل کی روایت بھی پھیلی ہوئی ہے۔

اپنے تہذیبی اور معاشرتی شعور کو ڈی کولونائز (DECOLONIZE) کرنے کا چلن ابھی کل کی بات ہے۔ بصورتِ دیگر صرف انگریزی صندوقوں میں علم کے خزانوں کو دریافت کرنا اور اپنے اجتماعی ورثے اور اپنے نسلی حافظے کی ہنسی اڑانا، ایک عام واقعہ تھا جس سے ہمیں کچھ فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن جس کے ہاتھوں ہم نے نقصان بہت اٹھایا۔ مجھ میں وہ حوصلہ نہیں کہ اردو کی مرکزی شعری روایت سے مربوط ان سب شاعروں کو جن کا سایہ اردو کی جدید / نئی نظم کے پس منظر میں ایک حد تک دھندلا چکا ہے، (اختر الایمان، حفیظ، جوش وغیرہ) انھیں تخلیقی لحاظ سے پس ماندہ کہوں اور ان کے نام قلم زد کر دوں۔ ہم جنھیں دوسرے درجے کا شاعر

سمجھتے ہیں، انھوں نے کسی نئی روایت کی بنیاد چاہے نہ ڈالی ہو، لیکن اپنی روایت کے تحفظ اور تسلسل کا فریضہ بہ قول ایلیٹ یہی MAJOR-MINOR شعرا انجام دیتے ہیں۔ جعفری کے فنی شعور میں رفتہ رفتہ جو تبدیلی پیدا ہوئی اور جس کی شہادت ہمیں 'نئی دنیا کو سلام' (۱۹۴۸ء)، 'ایشیا جاگ اٹھا' (۱۹۵۰ء) اور 'پتھر کی دیوار' (۱۹۵۳ء) میں ملتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جعفری تک شاعری کے نئے اسالیب، اظہار کے نئے طریقے بتدریج روشن ہوئے، ایک تخلیقی رمز کے طور پر۔ اس معاملے میں ان کے یہاں کسی طرح کی عجلت پسندی نظر نہیں آتی۔ وہ نئے اسالیب کو قبول بھی کرتے ہیں تو اپنی روایت اور اپنے شعور میں پیوست مشرقیت کے ساتھ۔ چنانچہ نئی ہیئتوں اور اسالیب اظہار سے مانوس ہونے کے بعد بھی انھوں نے اپنے تہذیبی علائم، تمثالوں، شبیہوں، تلمیحوں اور صدیوں کے آزمودہ شعری وسیلوں سے اپنی دلچسپی ختم نہیں ہونے دی۔ مثال کے طور پر، محض وضاحتاً ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ نئی نظم کی بوطیقا میں خیال کے تدریجی ارتقا، نظم کی نامیاتی وحدت، تجربے کی کلیت کے تصور پر اس طرح اصرار کیا گیا کہ اس تصور نے ایک شعری قانون کی حیثیت اختیار کرلی۔ مغربی معیاروں کے مارے ہوئے ایک نقاد (کلیم الدین احمد) نے اقبال کی شاہکار نظموں میں بھی یہ نقص ڈھونڈ نکالا کہ اِن نظموں سے بند کے بند حذف کر دیجیے جب بھی نظم کی ترکیب میں فرق نہیں آئے گا اور پڑھنے والے کو ادھورے پن کا ذرا بھی احساس نہیں ہوگا۔ ایک بنیادی سچائی جو بھلا دی گئی یہ تھی کہ نئے تخلیقی تجربے، وقت کی تبدیلی اور روایت کے ارتقا کے ساتھ، لازماً پرانے تجربوں کا متبادل نہیں بنتے، یا انھیں REPLACE نہیں کرتے۔ ضروری نہیں کہ ہر نئے خیال کو اختیار کرنے سے پہلے آپ پرانے خیال سے دستبردار ہو جائیں۔ انسانی شعور اور احساسات کی سرزمین پر نئے تجربوں کے لیے جگہیں اس طرح نہیں بنائی جاتیں۔ نیا زمانہ کبھی کبھی پرانے نظام میں شامل اس طرح بھی ہوتا ہے کہ کسی طرح کے شور شرابے اور توڑ پھوڑ کے بغیر اس کے لیے گنجائش نکال لی جاتی ہے۔ کچھ پانے کے لیے، ادب اور آرٹ کی روایت میں کچھ کھونے کی شرط ضروری نہیں۔ خیر، یہ ایک الگ بحث ہے اور فی الوقت اس کی طرف بس اتنا اشارہ کافی ہے۔ جعفری کی شاعری کے حوالے سے، یہاں عرض یہ کرنا ہے کہ اس منظرنامے میں نئے تجربوں کی دستک کے ساتھ ساتھ پرانے تجربوں کی سرگوشی بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ جعفری کے شعری طریقِ کار، طرزِ احساس، فنی مقاصد کا سلسلہ کہیں ٹوٹتا نہیں۔ وہ شبیہ سازی کو، راشد کے برعکس، عیاشی نہیں سمجھتے۔ ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی روش سے کنارہ کش نہیں ہوتے۔ وہ اپنے آدرش تک نئی مغربی تنقید، اور یورپ کے نئے ادبی میلانات کی مدد سے نہیں پہنچنا چاہتے۔ اپنی بری بھلی دنیا کو تیاگ کر نئی دنیا کا باسی بننے کی طلب نے ہمیں پچھلی دو صدیوں میں خاصا خراب

اور رسوا کیا ہے۔ یہاں سردار جعفری کی نظموں سے مثالیں پیش کرنے اور اس سیدھے سادے نکتے کی وضاحت کے لیے ان نظموں کے فقیہانہ تجزیے کی ضرورت نہیں۔ جعفری کے دو ایک بیانات پر نظر ڈالنا کافی ہو گا۔ مثلاً:

"تکرار، ایک تخلیقی ذہن کی خصوصیت ہے۔ اردو غزل کی ہی مثال موجود ہے
جس میں کوئی دو صدیوں سے تشبیہات اور استعارے دہرائے جاتے رہے ہیں۔
میں نہیں سمجھتا کہ علامہ اقبال سے زیادہ کسی اور شاعر نے اپنے آپ کو دہرایا
ہو گا۔"

(افکار، کراچی: سردار جعفری نمبر)

"نقاد کی جو تربیت ہوتی ہے، اور خاص طور سے یورپ کی تنقیدی کتابیں پڑھ پڑھ
کر، وہ میری تربیت نہیں ہے۔ میں نے پرانے شعرا کا جائزہ لیا۔ اس میں غالب اور
میر کے علاوہ کبیر بھی ہیں۔ میرا بائی بھی ہے، رومی بھی ہیں، حافظ بھی ہیں...
میں ان کا جائزہ اس نظر سے لیتا ہوں کہ میں اپنی شاعری کے لیے معیار بنا سکوں۔
تلاش کر سکوں، اپنی شاعری کی تربیت کے لیے۔"

(حوالہ: ایضاً)

اپنی اسی بات چیت میں، جہاں سے یہ دو اقتباس لیے گئے، جعفری نے ایک سوال یہ بھی اٹھایا تھا کہ "کسی شاعر کے رتبے کا تعین گرچہ اس کی اعلیٰ درجے کی شاعری سے ہوتا ہے" لیکن، اسی شاعر کے یہاں ایک حصہ "ضرورت والی شاعری" کا بھی ہوتا ہے۔ "وہی دریا ہے مگر اس دریا میں کہیں تنکے بھی بہہ رہے ہیں اور کہیں گلاب بھی"۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جعفری نے اپنی ترجیحات کے علاوہ، اپنے حدود کی نشاندہی بھی کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو بات سب سے زیادہ واضح طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ جعفری کی شاعری کا تانا بانا زمانے کے رنگ کی بجائے، ان کی اپنی امنگ کا تیار کردہ ہے۔ اپنی روایت سے ان کے رابطے محض علمی نہیں ہیں۔ یہ روایت اپنے آپ کو دریافت کرنے، اپنے معیار قائم کرنے اور اپنے شعور کی تربیت کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ فارسی کی شعری روایت سے استفادے میں جعفری نے ہر چند کہ سبک ہندی کے شاعروں سے شاید سروکار نہیں رکھا یا بہت کم رکھا۔ کبیر، اور حافظ، میر، غالب، اقبال کی طرف بھی، جاتے ہیں تو اس طرح کہ ان کا اپنا ایجنڈا ساتھ رہتا ہے اور اسی ایجنڈے کے مطابق وہ اپنا رشتہ اپنے ماضی سے استوار کرتے ہیں۔ لیکن ایک اہم نکتہ جو رد و قبول کے اس پورے عمل سے رونما ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ اپنی

اجتماعی تاریخ، اپنے ماضی اور روایت سے جعفری کا تعلق اپنے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند معاصرین کی بہ نسبت تمام حد بندیوں کے باوجود زیادہ وسیع ہے۔ میرا جی، میرا جی تک صرف اپنی طبیعت کی عاشقانہ لہر کے واسطے سے پہنچے تھے اور فیض کے یہاں فارسی شاعری کی روایت کا اثر بس کچھ علائم اور استعارات، اظہار کے کچھ سانچوں کی دریافت تک ہے۔ فارسی کی روایت اور مجموعی طور پر اردو شاعری کے تہذیبی ماضی سے جعفری کا رشتہ، راشد کے فارسی آمیز لہجے اور مغربی استعمار کے خلاف ان کے فکری جہاد اور اس کے عجمی سیاق کے باوجود، زیادہ بامعنی ہے اور زیادہ پھیلاؤ رکھتا ہے۔ بہ قول میرا جی، راشد طبعیتاً مغربی محاورے کے شاعر تھے۔ (میرا جی: اس نظم میں) غزل کی طرف اپنے مغائرت کے رویے کی وجہ سے اختر الایمان نے اپنی روایت اور اپنی حسیت کے مابین خود ہی ایک حد قائم کر لی تھی۔ یوں بھی، میرا جی، راشد، فیض، مجید امجد اور اختر الایمان کا شعور کچھ تو اردو کے لسانی مراکز سے دوری اور جذباتی لاتعلقی کے باعث اور کچھ اردو کی مرکزی روایت سے بے رغبتی کے باعث اپنے ماضی میں اچھی طرح پیوست نہیں ہو سکا۔ سردار جعفری اپنی تمام تر ترقی پسندی کے باوجود کلاسیکی مزاج کے شاعر ہیں اور گو کہ زیادہ شوق سے انھوں نے نظم کی صنف اختیار کی، مگر غزل کی روایت کو انھوں نے کبھی مسترد نہیں کیا اور اس کے اثر سے ان کی نظم عموماً نکل نہیں سکی۔ یہ جعفری کے اپنے جمالیاتی انتخاب کا نتیجہ بھی ہے، کسی طرح کی نفسیاتی مجبوری نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جعفری مشرقی طرز احساس اور تفکر کے امتیازی اوصاف سے کس طرح اور کیوں کام لیتے ہیں:

> "ہم آج بھی حافظ شیرازی کی زبان میں شاعری کرتے ہیں اور ہماری تمام غزلوں میں الفاظ کا ایک سیٹ (SET) ہے، کوئی پانچ سو الفاظ کا۔ انھیں سے ہم بڑے مفاہیم پیدا کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ ایک استعارہ بن گیا ہے۔"

(افکار، کراچی: سردار جعفری نمبر، گفتگو بند نہ ہو)

> "غزل سب سے زیادہ نیچرل فارم ہے شاعری کا... لیکن اچھے شاعر کے یہاں دو چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔ ایک تو اس کا مجموعی تاثر اور ایک آہنگ یہ دونوں برابر رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ متفرق شعر کے ساتھ آہنگ بدل گیا یا اس کا تاثر بدل گیا۔"

(حوالہ: ایضاً)

ظاہر ہے کہ اس انداز فکر کے مضمرات صرف لسانی نہیں ہیں۔ اس کے پیچھے زندگی کی طرف مشرق

کے مجموعی رویے، مشرقی وجدان میں لچک اور وسعت کے اوصاف کی آگہی بھی موجود ہے۔ مغربی اقوام کی پیدا کردہ ذہنی بیداری کے سیلاب میں، ہماری اجتماعی سرشت کے ساتھ سانحہ یہ پیش آیا کہ ہمیں یہ تواز بر ہو گیا کہ بہ قول طارے شاعری میں تشبیہ کا استعمال ایک مہلک شے ہے اور اسے شعری قواعد کے دائرے سے خارج کر دینا چاہیے۔ لیکن یہ بات ہم نے بھلا دی کہ کالی داس کو اُپما سمراٹ کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور یہ کہ کلاسیکی عربی اور فارسی شاعری کے محاسن کی کوئی فہرست تشبیہ سازی اور قافیہ پیمائی کے تذکرے سے خالی نہیں ہو گی۔ جوش کی شاعری کے بارے میں جعفری کی رائے مبالغہ آمیز اور جوش کے شعری ضابطوں میں جعفری کے یقین کی نوعیت قدرے جذباتی بھی ہو سکتی ہے، مگر ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ سلیم احمد نے (ترقی پسندی کے شدید ذہنی مغائرت کے ہوتے ہوئے بھی) جوش کو جوش اعظم کیوں کہا تھا۔

اسی طرح بیان کی پیچیدگی اور خیال یا تجربے کی پیچیدگی کو نئی شعریات کی ترویج و تفہیم میں کچھ ایسی قبولیت ملی کہ ہمارے تخلیقی وجدان اور ادبی مذاق کے محور ہی بدل گئے۔ نئے تجربوں، اظہار کے طریقوں، آرٹ اور ادب کی دنیا میں ہونے والی عالم گیر تبدیلیوں، نئے رویوں سے روشناس ہونا اور اپنی روحانی احتیاج کے اور ذوق کے تقاضوں کی روشنی میں انھیں اختیار کرنا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن یہ کیا کہ ہم ذہنی بیداری اور ترقی کے نام پر بڑے ادب، معنی خیز اور سچے ادب کی بابت اپنے تمام سابقہ تصورات سے بیک قلم منحرف ہو جائیں۔ ادب اور تہذیب کے ایام جاہلیت، بہت بار آور تخلیقی روشنی اور فیضان کے دن بھی ہو سکتے ہیں۔ دنیا بھر کے اعلا ادب کا قابل لحاظ حصہ زندگی کے عام اور مانوس تجربوں اور اظہار کے سہل ترین اسالیب کا گواہ ہے۔ جعفری نے عمومیت زدگی کے خطرے اپنی طویل نظموں میں خاصے بڑے فکری کینوس پر مول لیے ہیں۔ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ اظہار کی روایتی تقسیم، تخلیقی زبان اور کاروباری زبان کی درجہ بندی کے سلسلے میں ہمارے رویے بالعموم ناقص اور غلط قسم کے مفروضات پر مبنی ہیں۔ اپنے معاصرین میں جعفری کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اقبال کے بعد وہ پہلے شاعر ہیں، جس نے ایک تبدیلیوں سے دوچار اور پیچیدہ جذباتی، فکری، سیاسی، معاشرتی حالات سے بوجھل زمانے میں اپنی شاعری سے تخلیقی مقالہ نویسی (CREATIVE DISSERTATION) کا کام لیا۔ نئی دنیا کو سلام (۱۹۴۸ء) امن کا ستارہ (۱۹۵۰ء) ایشیا جاگ اٹھا (۱۹۵۰ء) شاعری کے پیرائے میں ہمارے پُر جلال اور مہیب مسئلوں کا احاطہ کرنے والی ڈاکیومنٹریز ہیں۔ پہلی عالم جنگ کے بعد کی انسانی صورت حال نے سیاسی، تہذیبی، تخلیقی سطح پر دہشت، انتشار، اجتماعی دیوانگی اور آشوب کا جو راستہ اپنایا تھا اس کا تقاضہ تھا کہ بڑے کینوس پر اس صورت حال کی تصویر مرتب کی جائے۔

ایلیٹ کی THE WASTE LAND (۱۹۲۲ء) کے پیمانے پر۔ ایلیٹ ہی کے لفظوں WIDEST POSSIBLE VARIATION OF INTENSITY (شدتِ احساس کے وسیع ترین ممکنہ تغیرات اور صورتوں) کے اظہار کی گنجائش اسی طرح پیدا کی جاسکتی تھی۔ ایک ساتھ بہت کچھ کہنے کے لیے تخلیق کے شعلے کو بھڑک کر ٹھنڈے پڑ جانے سے بچانا ضروری ہے۔ جعفری نے اپنی طویل نظموں میں جو اسلوبیاتی روش اختیار کی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ تمثیل نگاری، مصوری، موسیقی اور تفکر کے عمل کو باہم ملانے اور ایک صبر آزما اور طویل تخلیقی مہم کو سر کرنے کی تیاری میں ادب اور صحافت کی سرحدوں کو ساتھ ساتھ عبور کرنے کی کوشش نے ان نظموں میں تخلیقی تجربے کی ایک نئی سطح دریافت کی ہے۔ طرح طرح کے لفظوں، لکیروں، ہیئتوں، رنگوں اور شبیہوں کی بھیڑ، پُر شور اور سرگوشی، ساز اور رقص، سکوت اور تحرک کی مشترکہ سرگرمی نے ان نظموں کو ایک مہیب میورل کی شکل دے دی ہے۔ گویا کہ صرف سخنِ مختصر یا ایک شعلۂ مستعجل کی مدد سے یہ سفر طے ہونے کا نہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس مضمون کے اختتام کا یہ مناسب موقع ہے اور مجھے ایک شخصی اعتراف کے ساتھ اپنی بات اب سمیٹ دینی چاہیے۔ جعفری کے بارے میں اور خود جعفری سے گفتگو کے موضوعات کثیر ہیں۔ میں کثرتِ نظارہ کا شیدائی ہوں۔ یک رنگی مجھے بہت جلد تھکا دیتی ہے۔ ہمارے زمانے کے ترقی پسندوں میں نئی نسل کا مکالمہ سب سے زیادہ جعفری کے ساتھ رہا۔ اتفاق، اختلاف، محبتیں، شکایتیں اور تہمتیں، یک جہتی اور برگشتگی، کون سی ایسی کیفیت ہے جس کے تجربے سے اس مکالمے کے دوران ہم نہیں گزرے۔ ایک ایسے برق رفتار اور ہزار شیوہ زمانے میں، جب ایک دوسرے کے لیے غیر دلچسپ ہونے میں ہمیں دیر نہیں لگتی، آئے دن زندگی کے اور فکر کے طریقے بدلتے رہتے ہیں اور کچے خیال خام مال کی طرح ہم درآمد کرتے رہتے ہیں، جعفری کی سدا بہار شخصیت اپنی مختلف الجہات شاعری، اپنی دل نشیں اور توانا نثر، اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی تخلیقی جستجو اور سرگرمی کے مختلف دائروں، اپنے نثری تنوع اور پھیلاؤ، اپنی تجربہ پسندی اور اپنے کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ، ہمارے لیے آج بھی تازہ کار اور پرکشش ہے۔ جعفری کے وضع کردہ معیاروں اور ہمارے معیاروں میں عدم مفاہمت اور اختلاف کی صورتیں بھی موجود ہیں اور ان کے تمام فیصلوں کو ہم قبول نہیں کرتے، لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان جیسا کوئی اور نہیں۔ ہمارے تہذیبی ماضی، ہماری روایت، ہمارے آج کی حسیت اور ذہنی و جذباتی ماحول تک رسائی اور ان سب کے تشخص کا ایک بہت موثر وسیلہ جعفری کی شخصیت ہے۔ صرف ہم خیالوں کے ساتھ زندگی تو نہیں گزاری جاسکتی!

□□□

(ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی۔ ستمبر ۲۰۰۰ء)

شین کاف نظام

ثقافت کا سفیر

علی سردار جعفری

معین احسن جذبی نے ایک گفتگو میں علی سردار جعفری کے متعلق لکھا ہے:

"میں اسے (علی سردار جعفری کو) شاعر مانتا ہی نہیں۔ وہ ایک اچھا نثر نگار تو ہوسکتا ہے لیکن ایک اچھا شاعر نہیں۔ نہ تو وہ فطری شاعر ہے اور نہ ہی اُس کے یہاں کوئی شعریت ہے۔ میں نے اپنے کئی انٹرویوز میں یہ بات کہی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو گھسیٹ گھسیٹ کر کسی طرح نظم کرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ میں اسے شاعر نہیں مانتا۔"

اُردو تنقید کے قاری کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ علامہ اقبال کے ہمعصروں نے بھی انہیں ناظم سے زیادہ کچھ نہیں مانا تھا اور علی الاعلان کہا تھا کہ وہ سرے سے شاعر ہی نہیں ہیں اور زیادہ دُور کیوں جائیں خود جعفری صاحب نے اپنی شدت پسندی اور انتہا پسندی کے زمانے میں کئی جینوئن شعرا کو ملعون و مطعون کرتے ہوئے اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں پر شک و شبہ کا اظہار کیا تھا۔ اُن ملعونوں میں فیض بھی شامل رہے ہیں جنہیں بعد میں جعفری صاحب پسند کرنے لگے تھے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، بات یہ تھی کہ اُردو کے قاری نے نہ معاصرینِ اقبال کا کہا مانا نہ جعفری صاحب کا۔ اور مجھے یقینِ واثق ہے کہ حال و مستقبل کا قاری جذبی صاحب کے ارشاد کو بھی معاصرانہ چشمک سے زیادہ اہمیت نہیں دے گا۔

یہ سچ ہے کہ جعفری صاحب کی شاعری کا ایک حصہ طول طویل تقریروں پر مبنی اور فنی ذمہ داریوں کا نباہ نہیں کرتا لیکن اس وجہ سے اُن کی عمدہ نظموں کو بھی نظر انداز کر دیا جائے یا انہیں شاعر ماننے سے ہی انکار کر دے جائے، یہ تو سراسر زیادتی اور صریحاً ناانصافی ہے۔ علی سردار جعفری نے اگر اپنے ابتدائی عہد میں خبروں اور اداریوں سے نظمیں بنائی ہیں جس کی طرف خلیل الرحمٰن اعظمی نے

بہت واضح اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"انہوں (جعفری صاحب) نے اپنے مواد عام طور پر "قومی جنگ" میں شائع ہونے والی خبروں اور اداریوں سیاسی جماعتوں کی سالانہ کانفرنسوں کی تقریروں اور قراردادوں، عوامی لیڈروں کے بیانات اور آخر آخر جیلو نرودا، پال ایلیو، مائکافسکی کی نظموں کے تراجم سے حاصل کیے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں وجدان اور تخلیقی عناصر کی کمی شروع ہی سے کھٹکتی رہی۔" [۱]

تو انہوں نے بعض اچھی نظموں سے بھی تو اُردو کے شعری سرمائے میں اضافہ کیا ہے، انہوں نے بعض قابل قدر تجربے بھی کیے ہیں پھر ایسا بھی نہیں کہ اور لوگوں نے علی سردار کی اُن کمیوں کی طرف اشارہ نہ کیا ہو۔ مجنوں گورکھپوری نے تو اُن کے شعری مجموعے "پرواز" (مطبوعہ ۱۹۴۴ء) کے طویل مقدمہ کا اختتام ہی اِن سطور پر کیا تھا:

"اگر علی سردار جعفری اپنی شاعری میں کچھ جامعیت اور گہرائی پیدا کرلیں۔ اگر وہ زندگی کی کل حقیقتوں کو اپنے اشعار میں زیادہ جگہ دینے لگیں، اگر اُن کی فکر و بصیرت زیادہ رسا اور ہمہ گیر ہو سکے۔ اگر وہ اپنے لہجہ اور اسلوب میں اس سے بھی زیادہ نرمی اور گداختگی پیدا کرسکیں جس کی آگے چل کر ہم کو اُن سے قطعی امید ہے تو وہ اردو شاعری میں ایسی جگہ لے سکتے ہیں جو ابھی خالی ہے۔" [۲]

مجنوں صاحب کی باتوں کا علی سردار جعفری پر اثر تو ہوا مگر تاخیر سے۔ تاخیر کا سبب جاننے کے لیے ہمیں اُن کی نشو و نما اور تربیت پر غور کرنا ہوگا۔ علی سردار کی ولادت ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو ایک ایسے خاندان میں ہوئی جسے مذہبی جاگیردار گھرانہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا خاندان تھا جس کے لیے بلرام پور سے باہر کی دنیا بے معنی تھی۔ علی سردار لکھتے ہیں:

"یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کی سنی ہے۔ مَیں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا۔ سلام اور مرثیے کے علاوہ ویسے بھی مجھے بے شمار شعر یاد تھے۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ مَیں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کردیے تھے۔ اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے۔" [۳]

علی سردار کو چھوٹی عمر میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کردیا گیا کہ وہ مولوی بن جائیں اور اُن کے ساتھ ساتھ خاندان کی بھی عاقبت سدھر جائے۔ لیکن طبیعت کی آزادہ روی نے انہیں اس سعادت سے محروم کردیا۔ علی سردار جعفری بچپن ہی سے منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھتے تھے۔ مرثیہ پڑھنے کی مشق تو ہو ہی رہی تھی کہ حضرت امام حسین کی شہادت نے انہیں ایسا متاثر کیا کہ وہ خود مرثیے کہنے لگے۔ اور اس طرح مرثیہ خوانی کے بعد مرثیہ گوئی کا دور شروع

ہوا۔ مرثیوں میں وہ انیس سے متاثر ہوتے ہیں اور اُن سے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

اِک خوشہ چین ہوں باغِ جنابِ انیس کا

اُس ماحول میں جہاں مرثیے کہنا پڑھنا ثوابِ دارین حاصل کرنا سمجھا جاتا ہو وہاں سردار کے مرثیوں کا مقبول ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ پھر اُن کے یہاں شعر بھی ایسے ایسے ملتے تھے:

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

☆

آتا ہے کون شمعِ امامت لیے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ صداقت لیے ہوئے

☆

اللہ رے حسنِ فاطمہ کے ماہتاب کا
ذروں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

☆

ان مرثیوں میں سے ایک کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

آتا ہے ابنِ فاتحِ خیبر جلال میں
ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں
اِک تہلکہ ہے وادی و دشت و جبال میں
بھاگا ہے آفتاب بھی برجِ زوال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمیں درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

ممکن ہے مرثیے کہنے اور حضرت امام حسین سے عقیدت کے سبب ہی ابتدا میں اُنہوں نے اپنا تخلص حزیںؔ کیا ہو۔ بقول علی سردار یہ مرثیے اب تک بلرام پور میں محفوظ ہیں اور محرم کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ خیر ۱۹۳۳ء یعنی ۲۰ برس کی عمر تک علی سردار مرثیے لکھتے رہے اور مجلس میں داد پاتے رہے۔ اس کے بعد افسانہ نگاری کا دور شروع ہوتا ہے اور ۱۹۳۸ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ "منزل" شائع ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ء میں شروع ہوتی ہے اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علی سردار تحریک میں بطور ایک افسانہ نگار کے شریک ہوئے۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے پہلے پیار، شاعری کی طرف پلٹتے ہیں۔ بچپن میں منبر پر سلام و مرثیے پڑھنے کے سبب جو خطیبانہ انداز اُن میں پیدا ہوا وہ آخر تک ان کی شخصیت

اور شاعری کا جزو لاینفک بنا رہا۔ اُن کے خطیبانہ انداز کو اقبال اور جوش کے اثر نے اور گہرا کر دیا۔ یہاں جوش کے اثر کی صرف ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔ جوش ملیح آبادی کا ایک شعر ہے:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اور علی سردار کی نظم "بغاوت" (جو اُن کے شعری مجموعے "پرواز" میں شامل ہے) کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر بغاوت ہے خدا میرا

جوش سے اپنی عقیدت کا اظہار بھی انہوں نے ایک جگہ یوں کیا ہے:

کھول دیں سب کے لیے قفلِ درِ مے خانہ
حضرتِ جوش کو سر حلقۂ رنداں کر دے

علی سردار کا پہلا شعری مجموعہ جب منظر عام پر آیا تب اُن کی عمر ۳۱ برس کی تھی۔ یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس کے بیشتر ممبر کمیونسٹ پارٹی کے ہمدرد یا اس کے ممبر تھے۔ انقلاب سے اُن کا رومانی لگاؤ تھا اور یہ بات اُن کے ذہن نشیں کرائی جا رہی تھی کہ غیر برابری کو ختم کرنے کا واحد وسیلہ اشتراکیت ہے اور اشتراکیت کی آمد کمیونسٹ پارٹی ہی کی معرفت ممکن ہے۔ اس لیے اکثر و بیشتر ترقی پسند مصنفین و مقلدین کا پارٹی کے لیڈروں سے متاثر ہونا عین فطری تھا۔ علی سردار بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے کا انتساب ان الفاظ میں لکھا:

خلوص و احترام کے ساتھ
اپنے رفیق اور رہبر۔ پورن چند جوشی کے نام

اُس زمانے میں پی۔سی۔جوشی سے کون واقف نہیں تھا۔ وہ پارٹی کے اہم لیڈر تھے۔ پارٹی کے اغراض و مقاصد کو مقدم ماننے بتانے کے پس پشت بھی اُن کی وہ تربیت کار فرما تھی جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں ہو چکا ہے۔ چنانچہ "پتھر کی دیوار" (مطبوعہ ۱۹۵۳ء) میں وہ لکھتے ہیں:

"چونکہ میں شاعری کو بنیادی طور پر گانے یا بلند آواز سے پڑھ کر سنانے کی چیز سمجھتا ہوں اور اس سے شعور کو بیدار کرنے اور جذبات کو اُبھارنے کا کام لینا چاہتا ہوں اس لیے میں نے اپنی آزاد نظموں میں بھی یہ کوشش کی ہے کہ وہ محض کاغذ پر پڑھنے کی چیز بن کر نہ رہ جائیں۔"

"پتھر کی دیوار" کا شاعر، شاعری کے سماجی تفاعل کا قائل ہے اور وہ عرب کی اس رجزیہ روایت اور شعریات

سے خود کو جوڑتا دکھائی دیتا ہے۔ جس میں شاعری کا مقصد جذبات کو اُبھارنا اور شعور کو بیدار کرنا ہوا کرتا تھا اور اس کے لیے شعر یا تو بلند آواز سے پڑھا جائے گا یا اُونچی آواز میں گایا جائے گا تا کہ وہ مجمع میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ اور علی سردار جعفری یہ کام آسانی سے اس لیے بھی کر سکتے تھے کہ انہیں بچپن ہی سے منبر پر بیٹھ کر مرثیے پڑھنے کی مشق تھی۔ مجنوں گورکھپوری یا خلیل الرحمٰن اعظمی کی باتیں بصری شاعری کے متعلق ہیں جب کہ علی سردار تو شاعری کے سماجی تقاضوں کی تکمیل کرتے ہیں اس لیے وہ خطیبانہ لب ولہجہ سے نجات حاصل کر ہی نہیں سکتے تھے اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ علی سردار جعفری کی شاعری کا بہت بڑا حصہ سماجی تقاضوں ہی کی تکمیل کرتا ہے۔ اپنے دوستوں اور اپنی شاعری کے دفاع میں جو استدلال اُنھوں نے پیش کی ہیں وہ بھی سماجی شاعری کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔

اسی مجموعے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میری تمام تر کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے لیے اپنی شاعری کو آسان بنا سکوں۔ اس کوشش میں مَیں ان حدود کو توڑ دینا چاہتا ہوں جو بول چال کی زبان اور ''شاعرانہ'' زبان کے بیچ میں حائل ہیں۔ جہاں مَیں ان حدوں کو نہیں توڑ پاتا اور بول چال کی زبان میں اپنا مطلب ادا کرنے سے قاصر رہتا ہوں وہاں ''شاعرانہ'' زبان بھی استعمال کر لیتا ہوں۔ یہ دراصل بول چال کی زبان کا عجز نہیں بلکہ میری تربیت کا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بول چال کی زبان ہی سب سے زیادہ شاعرانہ زبان ہے لیکن جب کبھی بول چال کی زبان سے ہٹ کر ''شاعرانہ'' زبان بنائی جاتی ہے تو وہ مصنوعی ہوتی ہے۔''

جن لوگوں نے جعفری صاحب اور دوسرے ترقی پسند شاعروں کی شاعری پڑھی ہے وہ شاید اس بات سے متفق ہوں گے کہ ترقی پسند شاعری کا بہت بڑا حصہ بول چال کی زبان سے بہت دور ہے۔ اگر بالفرض محال یہ بول چال کی زبان ہے بھی تو عوام کی بول چال کی تو ہرگز نہیں۔ بہ الفاظ دیگر اسے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے لیے اپنی شاعری کو آسان بنانا نہیں کہا جا سکے گا۔ شعری زبان بول چال کی زبان نہیں ہوتی یہی تو مشکل ہے۔ میر کا یہی مسئلہ تھا کہ:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند　　پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

یہی مسئلہ بھکتی عہد اور صوفی مسلک کے شعراء کا ہے۔ جعفری صاحب کے محبوب شاعر کبیر، میر اور غالب کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ کبیر کہتے ہیں سادھو سبد سادھنا کیجیے۔ تو یہ سبد (لفظ) کون سے ہیں؟ سادھن سے کیا مراد ہے؟ یہ ایک طویل بحث ہے جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ یہاں تو صرف یہ گزارش مقصود ہے کہ ممدوح کو یہاں تک پہنچنے میں اکیس برس لگے۔ علی سردار کو حضرت امام حسین کی عظیم الشان جرأت وشہادت نے حق کا ساتھ دینے کی ہمت اور حوصلہ بخشا ہوگا۔ حضرت زینب کے کردار سے انہوں نے باطل کے آگے سر نہ جھکانے کی ہمت حاصل کی ہوگی۔ لیکن

حضرت امام حسین اور حضرت زینب کے پاس حق و باطل میں تفریق کرنے کا ایک الوہی یا آسمانی تصور تھا جب کہ علی سردار کے پاس حق و باطل میں تفریق کرنے کا معیار و محمول (CONCEPT) مارکس سے مستعار تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مزدور کی پیشانی کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اُس کی مزدوری اُس کے ہاتھ پر رکھ دو اور کارل مارکس کی فکر بھی مزدور اور مزدوری کے متعلق جس معاشی فکر سے گزرتی ہے وہ اسی نتیجہ پر پہنچ کر ختم ہوتی ہے لیکن ایک ہی طرح کے نتائج کے باوجود دونوں کے عمل (PROCESS) میں فرق ہے۔ مارکس اِس کے لیے (MEANS) کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ پہلا نتیجہ اخلاقیات کے راستے روحانیت کے سفر سے نکلا ہے جب کہ دوسرا نتیجہ مادی و معاشی فکر کا ثمر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سردار کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی لیکن اشتراکیت اُن کا اختیاری و انتخابی موضوع ہے۔ شروع شروع میں اُن کے یہاں جو شدت پسندی نظر آتی ہے وہ دراصل اُس تربیت سے انحراف و انکار کا عمل معلوم ہوتی ہے۔ وہ اُس معاشرے اور ماحول سے منکر و منحرف ہونا چاہتے ہیں جس کی بنیادیں حق پرستی، وحدانیت، روحانیت۔ اخوت اور انسانیت کے پایوں پر ٹکی ہیں جو حق و باطل میں تفریق و تمیز ان اقدار کی میزان میں کرتا ہے، جو آسمانی احکامات کے تحت معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ ان دونوں میں مماثلت بھی ہے۔ لیکن حضرت حسین کی طرف داری اور مزدور کی طرف داری میں بڑا فرق ہے۔ تربیت کا اثر اتنا گہرا ہے کہ اُن کی فکر کو ہر قدم پر کولتار کی سڑک چاہیے۔ پگڈنڈی پر چلنا یا نئی پگڈنڈی بنانا اُن کے لیے مشکل معلوم ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے انحراف و انکار نے انہیں کبیر نہیں بننے دیا۔ ویسے بھی "پیغمبرانِ سخن" میں ترتیب میرؔ، غالبؔ اور کبیرؔ ہے۔ یعنی کبیر اُن کی آخری پسند ہے۔ سخن کے ان تینوں پیغمبروں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تینوں کے یہاں انحراف و انکار بھی اسی ترتیب سے ملتا ہے۔ بہر حال حق و باطل کی شعری شناخت کے لیے انہوں نے ہر بار غیر شعری صداقت کا سہارا لیا اور اسے شعری صداقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

تفہیم و ترسیل کے لیے شاعر جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے اس میں زبان سب سے بڑا روڑا ہے۔ شعری زبان کا وہ حصہ جو ورثے میں ملتا ہے وہ اس کے اسپِ تخلیق کی باگ اکثر اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔ شاعر اسے چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ جتنے حصے کو چھڑا کر روایت کا حصہ بنا پاتا ہے وہی اُس کی اپنی زبان کا عطیہ کہلاتا ہے۔ اس لیے فلسفہ چاہے کتنا ہی عظیم اور انسانی خیر سگالی کا دعویٰ کرے وہ فن کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی کسی فلسفہ کی پیروی کرنے والی تخلیق فن کہلاتی ہے۔ شاعر جب فلسفہ کے سچ کو فن کی صداقت سمجھنے کے التباس میں گرفتار ہو جاتا ہے تو اس کی تمام ایمانداری کے باوجود لہجہ میں تصنع اور تکلف آئے بغیر نہیں رہتا۔ جس طرح فلسفیانہ صداقت فنی صداقت نہیں بن سکتی ویسے ہی فنی صداقت کی تلاش الفاظ اور ان کے انسلاک سے پیدا ہونے والی آہنگ کی روشنی میں ممکن ہوتی ہے جبکہ فلسفیانہ صداقت جملوں کے انسلاک اور منطق کے زینہ در زینہ بنتے مینار ہی سے ممکن ہے۔ علی سردار کے پاس شعری زبان کا تصور تو وہی ہے لیکن اختیاری و انتخابی راستہ دوسری طرف لے جاتا ہے۔ ایمان، مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر انہیں ... کا ... ہے ...

ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''الفاظ بجائے خود شاعرانہ یا غیر شاعرانہ نہیں ہوتے۔ یہ تو شاعر کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ لفظوں کو کیسے استعمال کرتا ہے اس لیے مَیں ہر لفظ کو استعمال کرنے پر آمادہ رہتا ہوں اپنی اس کوشش میں مجھے بعض اوقات ناکامی بھی ہوئی ہے اور مصرے بھونڈے اور بھدے ہو گئے ہیں لیکن جہاں کہیں مَیں کامیاب ہو گیا ہوں مجھے اپنی ناکامی کا صلہ مل گیا ہے۔''

ناکامی کا صلہ ملا تو ''ایک خواب اور'' ۱۹۶۵ء منظر عام پر آیا۔ جس کا انتساب ان الفاظ میں لکھا گیا ہے۔

سلطانہ کے نام

کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

رہبر ورفیق کا خواب شکستہ ہوا کہ نہیں ہمیں نہیں معلوم اور ہمیں معلوم کرنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ خواب ہر شخص کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے۔ خواب سے زیادہ ذاتی اور نجی کچھ نہیں ہوتا لیکن جب شاعر نے ایک اور خواب دیکھنے کی ضرورت محسوس کی ہے تو یقیناً اس کے کچھ معنی بھی ہونگے اور اس کا بھی تو کچھ مطلب ہوگا کہ شاعر نے اپنا کلام رفیق سے رفیقِ حیات کے نام معنون کیا ہے۔ مجموعے کی پہلی ہی نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے:

خواب اب حسنِ تصور کے اُفق سے ہیں پرے

دل کے اک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب

جس سے ظاہر ہے کہ معاملہ شکستِ خواب کا ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے علی سردار پچاس کے پار ہو گئے ہیں۔ ملک کو آزاد ہو کر منقسم ہوئے بھی مدت گزر چکی ہے۔ ملک دو جنگیں لڑ چکا ہے۔ ایک پاکستان سے اور دوسری چین سے۔ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کے پسندیدہ کانگریسی لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کا قائم کردہ حسن کا معیار ''مشکوک و مشتبہ'' ہو رہا ہے، جدیدیت کا زور بڑھ رہا ہے۔ ہجرت اور فسادات نے صدیوں کے رشتوں کی جڑیں کھوکھلی ثابت کر دکھائی ہیں۔ اقدار کے آنگن میں اُگے انسانیت اور اخوت کے اشجار کٹ پٹ چکے ہیں۔ ہر آدمی رشتوں کی اساس، اعتبار کھو چکا ہے۔ ایسے میں اگر شاعر ایک اور خواب نہ دیکھے تو کیا کرے؟ اس مجموعے کے حرفِ اول میں علی سردار لکھتے ہیں:

''خواب اور شکستِ خواب اس دَور کا مقدر ہے۔ اور نئے خواب دیکھنا انسان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کوئی طاقت کوئی اقتدار اسے محروم نہیں کر سکتا اور شاید یہی انسان اور انسانیت کے مستقبل کی ضمانت ہے۔''

مجنوں صاحب کے ''اگر'' میں چھپے امکان کی طرف علی سردار کی نظر اب جانے لگی اور ''میرا سفر'' جیسی نظم کی

ضرورت محسوس ہونے لگی اور "بغاوت" ہی کو اپنا سب کچھ قرار دینے والا فطرت کے اسرار میں اپنی ذات کا اظہار کرنے لگا:

لیکن مَیں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
مَیں پتی پتی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ میرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوق سلطانہ ہے

یہ انقلاب سے رومانیت اور رومانیت سے تصوف اور ویدانت کی طرف کا سفر ہے۔ اب تخریب کا طنطنہ ہے نہ بغاوت کی کاذب للکار بلکہ ایک نیا علی سردار ہے جو اپنے ہونے کا احساس و اعتراف یوں کرتا ہے:

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
مَیں مر کے امر ہو جاتا ہوں

اس نظم کا عنوان "میرا سفر" بھی بہت معنی خیز ہے۔ اسے تناسخ سمجھیں یا تسلسل یا پران کے ایک سے انیک ہو جانے کا عزم و ارادہ یا اپنشد کے رشی کے مطابق "نہ کوئی کہیں جاتا ہے نہ آتا ہے یہیں رہتا ہے، اور صرف روپ بدلتا ہے" یا ایک سے چوتیس کروڑ بننے کی تمثیل سمجھے۔ لیکن یہ یاد رکھنا ہوگا کہ جعفری صاحب کا سفر زمینی ہے۔ نظم کا ذیلی عنوان رومی کا یہ مصرعہ "ہمچو سبزہ بار بار روئیدہ ایم" ہے اور اس کا آغاز ہی موت سے ہے:

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے

لیکن یہ حیات بعد ممات ہے۔ جاگنے اور سونے کا یہ کھیل صدیوں سے چل رہا ہے۔ انتشار میں مخفی اتحاد شاعر

کی امرتا کا ضامن ہے۔ کائنات کی تکوین وتخلیق کی تمثیل کا انجذاب اور ایک سے انیک ہونے کی آرزو علی سردار کی وسعت کی غمازی اور اُردو کے ترقی پسند شعری سرمایے میں ان کی وقعت کی نشاندہی کرتی ہے۔

علی سردار کی ایسی نظمیں پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ اُن کی شاعری کے ساتھ اُردو تنقید نے انصاف نہیں کیا۔ اُن کی وہ شخصیت جو مذاکروں، مناظروں، نظریاتی معیاروں، جنہیں نظریے کا تعصب بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور اختلافات نے ہمیں بھی اتنا متعصب کر دیا ہے کہ ہم اُن کی تخلیقات کو متوقع توجہ سے نہیں پڑھ سکے۔ اُن کی غیر شعری شخصیت کے ایقانات سے پیدا ہوئے مفروضات کے ادعائی بیانات اور تحریک کے مفسر و مبلغ والے حصے نے اُن کی شاعری سے یا تو ہمیں بے نیاز کر دیا یا اُن کی شاعری کو زائد از ضرورت اہمیت دی گئی اور ہم یہ بھول گئے کہ اُن کے مباحثے اور محاکے چاہے جتنے ترقی پسند ہوں ان کے مزاج کلاسک ہے۔ میرؔ، غالبؔ، کبیرؔ اور میراؔ پر لکھتے وقت وہ خود کو اس روایت سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اُن کے ان مقدموں میں تنقیدی بصیرت اور تخلیقی تجسس زیادہ ملتا ہے۔ اس کا احساس انہیں بھی ہے چنانچہ ''پیغمبرانِ سخن'' کے دیباچے میں وہ خود لکھتے ہیں:

میرے لیے کبیرؔ، میرؔ اور غالبؔ کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لیے ضروری ہے۔ مَیں جس نظریہ و جمال اور نظریہ و تاریخ پر یقین رکھتا ہوں اور جو میرے اندر گزشتہ تیس سال میں رچ بس چکا ہے۔ مَیں نے اسی نظریے سے ان بزرگ شعراء کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔ یہ کلام ابدی قدروں کا حامل ہے لیکن اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہے۔''

جعفری صاحب نے دیگر مقامات پر بھی ایسے بیانات دیے ہیں۔ مثلاً افکار کراچی کے سردار جعفری نمبر میں کہتے ہیں:

''مَیں نے پرانے شعراء کا جائزہ لیا۔ اس میں غالبؔ اور میرؔ کے علاوہ کبیرؔ بھی ہیں میراؔ بائی ہے اور رومیؔ بھی ہیں، حافظ بھی ہیں۔ مَیں ان کا جائزہ اس نظر سے لیتا ہوں کہ مَیں اپنی شاعری کے لیے معیار بنا سکوں، تلاش کر سکوں اپنی شاعری کی تربیت کے لیے۔''

جن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ابدی قدروں کے آئینے میں حال کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ قدریں فنی نہیں ہیں سیاسی سماجی ثقافتی یعنی غیر ادبی قدریں ہیں۔ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اختلاف ہی سے ارتقاء ممکن ہے لیکن جب اُن کا ماننا ہی یہ ہے کہ:

''میرے لیے زمین سے زیادہ حسین، انسان سے زیادہ پُر وقار اور مستقبل سے زیادہ کوئی چیز تابناک نہیں ہے۔ ادب اور آرٹ کی سب سے بڑی جمالیاتی قدریں انہیں سے پیدا ہوتی ہیں۔''

تب یہی کہا جائے گا کہ اُن کی فنی فکر سے بحث ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اگر آپ اُن سے بحث کریں گے تو یہ مرنے اور

انڈے کی بحث ہوگی۔ عام قدروں کی طرح فنی قدریں بھی انسان ہی بناتا ہے لیکن جس طرح وہ زندگی میں ان قدروں کی حفاظت کے لیے زندگی تک قربان کر دیتا ہے، ویسے ہی فنی اقدار کے تحفظ میں بھی تو کچھ نہ کچھ قربان کرنا پڑے گا۔ پھر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ فنی اقدار میں موضوع الگ سے کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ چونکہ شاعر اس خیال کو من وعن نظم کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی سب سے بڑی قوت زبان ہی اس کی کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ اظہار میں رخنہ اندازی کرتی ہے، اسی لیے تو اس کے یہاں تکرار پیدا ہوتی ہے۔ ایسے میں ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں۔ قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ عجز کا اعتراف بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ اس کی ضرورت یہاں اس لیے پیش آئی کہ علی سردار کے ایسے بیانات ہی نے اُن کی شاعری کے جوہر کی افہام و تفہیم میں دقتیں پیش کیں اور اُن کے ہم خیالوں کو بھی یہ کہنا پڑا کہ تحریک کے ختم ہو جانے کے بعد بھی سردار کی شاعری کا رنگ نہیں بدلا۔ وہ ہنگامی شاعری ہی کو شاعری مانتے ہیں لیکن "میرا سفر" جیسی نظم کے متعلق تو یہ نہیں کہا جا سکتا۔ [۴]

ہمارے بیشتر نقاد علی سردار کی شاعری کو دو ادوار میں منقسم کرتے ہیں پہلا دور ایک "خواب اور" یعنی ۱۹۶۵ء کے پہلے کا دور ہے اور دوسرا دور اس کے بعد کا دور ہے۔ پہلے دور میں جعفری وہ کہتے ہیں جو اُن کی سیاسی سوچ اُن سے کہلاتی ہے اور دوسرے دور میں ان کے یہاں تبدیلی واقع ہوئی ہے، لیکن مکمل منحرف ہونا اس لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ لمبے عرصے تک تحریک اور اس کے سیاسی کمٹمنٹ کے مبلغ رہے۔ تحریک پر ہونے والے ہر حملے کا انہوں نے لینن کے ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے کی طرز پر جواب دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرؔ اور غالبؔ کے دیوان بھی مرتب کیے۔ کبیر بانی کی تدوین بھی کی۔ اُن کے مقدمے شاہد ہیں کہ علی سردار نے اپنی شدت پسندی اور انتہا پسندی کے عہد میں بھی اُردو کے کلاسکی ادب سے اپنا رشتہ استوار رکھا۔ آزاد نظم کو قبول نہ کرنے کے بعد انہوں نے جب آزاد نظم لکھی تو اُسے حتیٰ المقدور مقبول بنانے کی بھی جی جان سے کوشش کی اور انہیں کامیابی بھی ملی۔ انہوں نے آزاد نظم کو بھی اپنے طور پر سمجھنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ اپنے شعری مجموعے 'پتھر کی دیوار' کے حرف اول کے عنوان سے لکھے دیباچے میں لکھا:

"اس مجموعے میں... پابند شاعری بھی ملے گی اور آزاد شاعری بھی کیونکہ شاعری ہمیشہ ردیف اور قافیہ کی محتاج نہیں رہتی۔ ترکی کے شاعرِ اعظم ناظم حکمت کے الفاظ میں جس طرح ردیف اور قافیہ پر اصرار کرنا ایک طرح کی ہیئت پرستی ہے، اسی طرح محض آزاد شاعری پر اصرار کرنا بھی ایک طرح کی ہیئت پرستی ہے۔ اصل کوشش تو یہ ہونی چاہیے کہ موضوع کو بہتر سے بہتر ہیئت کا لباس عطا کیا جائے۔ اور یہ کہنا غلط ہوگا کہ کوئی ایک مخصوص ہیئت ہی سب سے زیادہ حسین ہے اس لیے مَیں پابند اور آزاد دونوں قسم کی شاعری کا قائل ہوں لیکن دونوں طریقوں میں ذرا سا فرق ہے۔ پابند نظم میں زیادہ تر مصرعوں اور شعروں کی تعمیر کو انفرادی مصرعوں کی تعمیر سے زیادہ اہم

سمجھتا ہوں، چونکہ آزاد نظم میں ردیف اور قافیوں کی جھنکار نہیں ہوتی اس لیے اس میں داخلی ترنم کا جادو بہت ضروری ہے۔ یہ ترنم خارجی بھی ہوتا ہے اور داخلی بھی، اس لیے انتخاب الفاظ کے علاوہ مصرعوں کے باہمی ربط سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ جو اپنی جگہ معنوی تسلسل کا محتاج ہوتا ہے۔ اس لیے ہر بند کو ایک مکمل تصویر ہونا چاہیے تاکہ مکمل نظم ایک بہت بڑی تصویر کی طرح ہو جسے تمام چھوٹی چھوٹی تصویریں مل کر بناتی ہوں۔ (اس کے بغیر آزاد نظم کے مصرعے الگ الگ ایک دوسرے کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے نظر آتے ہیں)"

اس کے بعد انہوں نے اپنی نظم "تلنگانہ"، "نیند" اور "یلغار" کے اقتباسات پیش کیے ہیں اور اس کے بعد لکھا ہے کہ: "پابند نظم میں ہر ہر مصرعے پر الگ الگ داد لی جاسکتی ہے۔ آزاد نظم میں یہ ممکن نہیں۔ وہاں خیال یا تصویر کی تکمیل پورے بند کی تکمیل کے ساتھ ہوتی ہے۔"

اقتباس طویل تو ہو گیا لیکن اس کے بغیر علی سردار کا مافی الضمیر واضح نہیں ہوتا۔ حالی کے مقدمے سے اُن کی بات الگ نہ سہی لیکن دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ حالی یہ بات انگریزی شعراء کے حوالے سے کہتے ہیں اور علی سردار ناظم حکمت کے حوالے سے جن کی شعریات سے اُردو کا قاری اتنا ہی ناواقف ہے جتنا حالی کے عہد کا قاری مغربی مصنفین کی شعریات سے۔ حالی اور علی سردار میں دوسرا فرق یہ ہے کہ حالی بغیر ردیف و قوافی کی نظم کی حمایت اور ترغیب دینے کے باوجود ایک نظم ایسی پیش نہ کر سکے جسے حالی کے بیان کی مثال میں پیش کیا جاسکے جب کہ علی سردار نے یہ کام کیا۔ انہوں نے آزاد نظمیں کہیں اور مشاعروں کے حوالے سے انہیں مقبول بھی بنایا لیکن علی سردار نے بھی موضوع اور ہیئت کو دو الگ الگ چیزیں بتایا ہے اور اس میں کیفیت کا ذکر بالکل نہیں کیا ہے۔ داخلی ترنم کی تعریف علی سردار نے کہیں نہیں کی ہے اور خارجی ترنم کی شناخت ارکان کی مرہونِ منت ہے۔ ان باتوں کی طرف اگر وہ غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ "داخلی ترنم" الفاظ کے انتخاب اور مصرعوں کے باہمی ربط کے سبب نیاز حیدر اور علی سردار میں کیا فرق ہے؟ اور کیوں علی سردار فیض یا دوسرے ترقی پسند شاعر نیاز حیدر جیسے شعراء سے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ تفریق اس لیے بھی اہم ہو جاتی ہے کہ موضوع اور ایقان کے اعتبار سے ان میں کوئی اہم فرق نہیں ہے۔ علی سردار ایسی باتوں کا ہیئت پرستی کا نام دے کر حاشیے پر ڈال دیتے ہیں جن کے سبب دیگر مرثیہ گویوں سے انیس اور دبیر کو امتیازی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جن نکات کے سبب انیس و دبیر سے ممتاز شاعر کہلاتے ہیں اور علی سردار خود کو اُن کے باغ کا ایک خوشہ چیں کہنے میں فخر و مباہات محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات صرف ہیئت پرستی کہہ کر نظر انداز اس لیے بھی نہیں کی جاسکتی کہ تمام مرثیہ گویوں کا موضوع ایک ہے اور مابعد مرثیہ گویوں نے ایک ہی فارم میں مرثیے کہے ہیں۔ یہ بات علی سردار کے ضمن میں اس لیے بھی اہم ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک اصل کوشش تو موضوع کو بہتر سے بہتر ہیئت عطا کرنا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا

چکا ہے وہ کلاسکی مزاج کے شاعر ہیں اس لیے روایت کے اس عنصر سے اُن کا رشتہ منقطع ہو ہی نہیں سکتا جس کا نام انہوں نے "داخلی ترنم" دیا ہے۔ اور جو مروج بحور کے متداول ارکان کی گردان یا کمی بیشی ہی سے ممکن ہے۔ اُن کی آزاد نظموں کے مطالعے سے اس قول کی تائید و تصدیق ہو سکتی ہے۔ مجھ جیسے کم فہم لوگوں کے نزدیک یہ کوئی امر اتفاقی نہیں کہ "پتھر کی دیوار" میں اُن کی تین نظمیں "پتھر کی دیوار" "میرے خواب" اور "نیند" ایک ہی ارکان کی تکرار (یا ایک ہی بحر) میں کہی گئی ہیں۔ تینوں نظموں کا آغاز منظر کشی سے ہوتا ہے۔ مجموعے کی پہلی نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

کیا کہوں بھیانک ہے   یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری   کچھ پتہ نہیں چلتا

دس صفحات کی طویل نظم کا بیشتر حصہ ہجر اور مجبور شخص کو دکھائی دینے والے منظر ہیں۔ نا اُمیدی کے سیاہ ابر آلو ماحول میں امید کی کرنیں ہیں اور شاعر کہتا ہے۔

تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش سے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکا
کون سا شرارہ کب؟
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہو جائے
انقلاب آ جائے

"میرے خواب" میں منظر کے ساتھ استفہام ہے لیکن اس استفہام میں رومان ہے اور شاعر نظم کو ان مصرعوں پر ختم کرتا ہے:

قید و بند کے جلاد
تم کو پا نہیں سکتے
لمبے لمبے ظالم ہاتھ

تم کو چھو نہیں سکتے

اے مرے حسیں خوابو!

تیسری نظم ''نیند'' (اپنے بچے کی سالگرہ پر) جس میں چونسٹھ مصرعے ہیں۔علی سردار کے مطابق پانچ بند ہیں۔۴۹ مصرعے مجبور کے سامنے پھیلے ہوئے منظر کے بیان میں صرف ہوئے ہیں۔ یہ وہ منظر ہیں جو قیدی اپنے بچے کی پہلی سالگرہ پر، اُس سے دور رہ کر دیکھتا ہے۔ سارا منظر درد و ہجر کا ہے۔ چوتھے بند کے آخری مصرعے تکرار ہیں ان ہی مصرعوں کی، جہاں سے نظم کا آغاز ہوا ہے:

رات خوبصورت ہے

نیند کیوں نہیں آتی؟

اور یہیں سے نظم میں گریز ہے۔ ان نظموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو بیانیے کے لیے یہ وزن پسند ہے اور خاص طور سے ہجر کی منظر کشی کے لیے وہ اسی وزن کا انتخاب کرتا ہے۔ تینوں نظموں میں مجبور مقید شخص ہے جس کے سامنے فطرت کے مناظر پھیلے ہوئے ہیں۔ وسوسے اور اندیشے اُن میں رنگ بھرتے ہیں اور خواہش و تمنا اُن کے تاثر کو گہرا تی ہے۔ اِن نظموں کی بناوٹ انہیں مثنوی کے قریب کرتی ہے۔ مثنوی میں کہانی کی شرکت اسے طوالت عطا کرتی ہے۔ یہاں طوالت فطرت کی منظر کشی اور شاعر یا راوی کی خواہشوں کے سبب ہے۔ یہ نظمیں معاصر ترقی پسندوں سے مختلف ہیں۔ یہ قاری میں رحم اور ہمدردی پیدا نہیں کرتیں۔ ایک کسک اور درد کی ٹیس کو جنم دیتی ہیں۔ شاید یہی شعری رویہ علی سردار کو دوسرے ترقی پسند شعراء سے مختلف و ممتاز بناتا ہے۔ اُن کا ذاتی کرب ترحیمی کا طلسم پیدا نہیں کرتا۔ ہنگامی اور موضوعاتی شاعری میں بھی اُن کے یہاں یہ وصف موجود ہے۔ ''ایک خواب اور'' سے پہلے مَیں اُن کے ایک اور مجموعے ''پیراہنِ شرر'' کا اجمالاً ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اس مجموعے کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس میں علی سردار کی شناخت بن چکے اسلوب یعنی تھوڑی دور چلنے کے بعد تقریر کرنے لگنا نہیں کے برابر ہے۔ اُن کے لہجے میں جھلاہٹ اور ضد کی جگہ ایک سنجیدگی در آئی ہے اور وہ ہند و پاک میں اچھے رشتے دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ برِصغیر کے ایک جہاں دیدہ بزرگ کی طرح فہمائش کرتے ہوئے اپنی امن پسندی اور دوستی کی تلقین کرتے ہیں۔ اب ان کی پھنکار میں للکار نہیں وقار ہے۔ تقسیم کا المیہ اُن کی تخلیق میں رچا بستا نظر آتا ہے جو قاری کو متوجہ کرتا ہے اور متاثر بھی۔ لیکن اُن کا بنیادی سروکار اپنے آدرش سے ہے اس لیے ان کی نظموں میں زیادہ دُور چلنے کی سکت نہیں۔ اُن کے یہاں تاریخ تمثیل بننے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ تشبیہہ سے آگے نہیں بڑھ سکتی کیونکہ تاریخ میں تشبیہ بننے کی قوت بھی کم ہی ہوتی ہے۔ تو وہ تمثیل و استعارہ کیسے بنے؟ پھر شاعری میں امن کا پیغام اور دوستی کا ہاتھ بڑھانا تاریخی تناظر میں جو کینوس چاہتا ہے وہ ویدویاس اور بالمیک کی سی تخلیقی طاقت کا تقاضا کرتا ہے لیکن اِن نظموں میں علی سردار کے یہاں ایک خوش آئند تبدیلی نظر آتی ہے اور یہی ''ایک خواب'' کو جنم دیتی ہے۔

''ایک خواب اور'' میں بھی علی سردار تفصیل سے تو نہیں بچ سکے ہیں (تفصیل اور تقریری انداز و اسلوب کے

لیے اُن کی نظم ہاتھوں کا ترانہ، زندگی، تین شرابی، جشنِ بادہ گساراں وغیرہ ملاحظہ ہوں) لیکن علی سردار کے یہاں عوام کی شاعری کے اچھے نمونے اس مجموعے میں موجود ہیں۔ مَیں نے اُوپر کہیں نیاز حیدر کا ذکر کیا ہے۔ اُن کی شاعری کا بڑا حصہ "عوام کے لیے شاعری" میں رکھا جا سکتا ہے جبکہ علی سردار جیسے شعرا کی شاعری کو عوام کی شاعری کے خانہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اُن کی زبان کی کلاسک، اُن کا لہجہ پُروقار اور سنجیدہ اور اُن کا انداز تحکمانہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں بھی اکثر نظموں کا اختتام اُن کی فکری خواہش اور منشا کے مطابق ہے۔ فنی تقاضوں اور مطالبوں کے مطابق نہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس مجموعہ میں علی سردار جعفری کی شاعری کا بہترین نمونہ ملتا ہے جسے ترقی پسند شاعری کا بھی بہترین شعری سرمایہ کہا جا سکتا ہے۔ مجموعہ میں اُن کی غزلوں کے اشعار بھی پہلے کے مجموعوں کے مقابلے میں گھٹے ہوئے ہیں۔ مثلاً

حسن کے جلوے عام ہیں لیکن ذوقِ نظارا عام نہیں
عشق بہت مشکل ہے لیکن عشق کے دعویدار بہت

☆

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اِک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا

☆

اسی سے تیغ نگہ آبدار ہوتی ہے
تجھے بتاؤں بڑی شے ہے جرأتِ انکار

☆

چھوڑ کر وہم وگماں حسنِ یقیں تک پہنچو
پر یقیں سے بھی کبھی وہم وگماں تک آؤ

☆

خیالِ یار کو دیجے وصالِ یار کا نام
شبِ فراق کو گیسوئے مشک بو کہیے
شکایتیں بھی بہت ہیں، حکایتیں بھی بہت
مزا تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے

☆

ہم کو یوں رایگاں نہ کر دینا
حاصلِ فصلِ ماہ وسال ہیں ہم

☆

ایسے دیوانے پھر نہ آئیں گے
دیکھ لو بے مثال ہیں ہم

☆

"ایک خواب اور" میں علی سردار جعفری کی مختصر نظمیں بھی بہت عمدہ اور متاثر کن ہیں۔ مَیں یہاں صرف دو نظمیں نقل کرتا ہوں:

غم کا ہیرا:

غم کا ہیرا
دل میں رکھو
کس کو دکھاتے پھرتے ہو
یہ چوروں کی دنیا ہے

دوسری نظم کا عنوان ہے "درد ایک چاند ہے"

درد ایک چاند ہے
ہوتا ہے جو سینے میں طلوع
غم ہے اک نشترِ نور
جو دل و جاں کے اندھیرے میں اُتر جاتا ہے

پہلی نظم پڑھتے ہوئے مجھے ژین شاعر رن زائی (RINZAI) کی ایک مختصر نظم یاد آتی ہے۔ اُس نظم کے شاعر کا علی سردار سے کوئی تعلق نہیں، نہ یہ نظم اُن سے متاثر ہے۔ اُس کے باوجود اس نظم میں مماثلت بھی ہے اور تفریق بھی اور یہی غیر مشروط اور مشروط ذہن کا تخلیقی فرق ہے۔ (RINZAI) کی نظم ہے

When you meet a man

Who is not a poet

Do not show him your poem

علی سردار اپنے تحفظ و تعصب کے باوجود اب پوری انسانی برادری کی بات کرتے ہیں۔ اب اُن کا مسئلہ صرف کمیونزم اور کمٹ منٹ نہیں رہا، انہیں مشرق و مغرب میں کچھ مشترک نظر آنے لگا ہے۔ اُن کی نظم "مشرق و مغرب" کے یہ

اشعار دیکھیے:

باغ مشرق ہو کہ مغرب ہو، ہوا ایک سی ہے
سرد یا گرم، بہر حال فضا ایک سی ہے

☆

راستے دوڑ کے اسکولوں میں مل جاتے ہیں
بچے پھولوں کی طرح گھاس میں کھل جاتے ہیں

☆

بوئے گل ایک سی ہے، بوئے وفا ایک سی ہے
میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے

ایک غزل کا مطلع ہے:

کھلے ہیں مشرق و مغرب کی گوش میں گلزار
مگر خزاں کو میسر نہیں یقین بہار

دنیا کے مزدور ایک ہوں کی خواہش اور آرزو والے شاعر کو ثقافتی سطح پر بھی دنیا میں کچھ مشترک قدریں نظر آنے لگیں اور یہ قدریں عشق کی دین ہیں۔ میرؔ۔ میراؔ، کبیرؔ اور غالبؔ کے ساتھ تصوف کی دین ہیں۔ علی سردار یہاں انقلاب سے عشق کی طرف آئے ہیں۔ علی سردار کا یہ شعری رویہ انہیں معاصر شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی ایک نظم ''پیغمبر مسیحا دست'' دیکھی جا سکتی ہے۔ ''ایک خواب اور'' کی دوسری نظم ہے ''ہاتھوں کا ترانہ'' جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اُن ہاتھوں کی تعظیم کرو اور تکریم کرو کی تبلیغ کرنے والا شاعر مجموعے کے آخر تک پہنچتے پہنچتے ''پیغمبر مسیحا دست'' کہنے لگتا ہے۔ مشینوں کے پہیوں کی روانی، شکتی کے اوتار، پتھر کو بت بنانے والے، مٹی کو سونا بنانے والے اور پتہ نہیں کیا کیا چیزیں تعمیر و تخریب کرنے والے ہاتھ جن کی تعظیم، تکریم اور اس کے بعد تسلیم کرنے کی تحریک دینے والا شاعر اس نظم کا آغاز یوں کرتا ہے:

سنا ہے آئے گا ''پیغمبر مسیحا دست''
قدیم عہد کی صورت نئے زمانے میں

یہاں ''پیغمبر مسیحا دست'' آسمانی ہو کر بھی ارضی ہے لیکن اظہار کی سطح اسطور کے حوالے سے شعری ہو گئی ہے۔ ان دونوں نظموں کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصدی شاعری بھی رمز و کنایہ کا لمس پا کر کس طرح اور کس حد تک متاثر کن ہو جاتی ہے۔ نظم اسٹینزا فارم ہے۔ یہ بند دیکھیے:

نکالے جائیں گے پھر زندگی کے معبد سے
بشر کے اشکوں کے تاجر لہو کے بیوپاری
خدا کے نام کو نیلام کرنہ پائیں گے
وہ چاہے صاحبِ تسبیح ہوں کہ زناری

علی سردار نے فٹ نوٹ میں حضرت عیسیٰ سے متعلق سارے حوالے انجیل کی روایت سے نقل کیے ہیں۔ اس نظم میں ارض کو آسمانی استعارے (عیسیٰ) سے سمجھایا گیا ہے۔ اگر دوسرے مصرعے کے فٹ نوٹ میں یہ نہیں لکھا جاتا کہ تاجر، وہ سود خور ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ نے کلیسا سے باہر نکالا تھا تو یہ معلوم ہونا مشکل ہے کہ شاعر ماضی کے حوالے سے حال کو سمجھ اور سمجھا رہا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بچپن میں جس ذاتِ پاک سے شاعر متاثر ہوا تھا وہ حق پرست، صابر و شاکر بھی تھی اور شہید بھی اور یہ سارے امتیازی اوصاف حضرت عیسیٰ میں بھی موجود ہیں۔ شاعر حال کے آئینے میں متوقع تبدیلی کے لیے ایسے ہی کسی معجزے کا منتظر ہے۔ وہی معجزہ جس کا وہ ''پتھر کی دیوار'' کے آخری مصارع میں منتظر نظر آتا ہے۔ علی سردار کے اختیاری و انتخابی راستے میں تاریخ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔ لیکن اس نظم میں انہوں نے عیسیٰ کو تاریخی شخص نہیں بنایا ہے بلکہ اُن کا مذہبی تقدس برقرار رکھا ہے۔ اُن سے منسوب واقعات کا شاعرانہ استعمال کیا ہے جس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظم ہمارے شعری سرمایہ میں عیسیٰ کے موضوع پر کہی گئی نظموں میں بلند ترین نظم ہے۔ وجہ تلمیح کا تخلیق ہونا ہے ☆☆☆

حواشی

۱۔ اُردو میں ترقی پسند تحریک ص ۱۴۳

۲۔ پرواز ص ۱۶

۳۔ لکھنو کی پانچ راتیں ص ۲۰

۴۔ ایوانِ اُردو کے علی سردار جعفری نمبر میں پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے کہ پبلو نرودا ہی کی ایک نظم سے متاثر ہو کر ان کی نظم ''میرا سفر'' لکھی گئی جو بعض اضافے اور ترمیموں کے باوجود نرودا کا ہی چربہ تھی مگر اُردو میں بے حد مقبول ہوئی۔ آج بھی ذاتی طور پر میرے لیے سردار جعفری غزل کے تین اشعار اور تین نظموں کے شاعر ہیں جن میں بلاشبہ ''تین شرابی'' اور ''میرا سفر'' نظمیں شامل ہیں۔ ایوانِ اُردو دہلی ستمبر ۲۰۰۰ء ص ۱۰

(سہ ماہی نخلستان جے پور جولائی تا دسمبر ۲۰۰۰ء)

صدیق الرحمٰن قدوائی

عہدِ عزم و پیکار کی یادگار

تخلیقِ شعر کے پُر اسرار پہلوؤں کے بارے میں نہ جانے کتنی باتیں کہی گئی ہیں۔ اپنی اپنی اٹکل سے سب ہی کچھ نہ کچھ اندازے لگا کر کسی نہ کسی حد تک اُس کے اَن دیکھے رازوں تک اگر پہنچ بھی جاتے ہوں، تب بھی فن کا ایک عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ فن ایسے رشتوں کو پروان چڑھاتا ہے جس کا اندازہ ان لوگوں کو اکثر بہت دیر میں اور بہت خاموش طور پر ہوتا ہے جو خود اس رشتے میں باہم منسلک ہیں۔ یہاں یہ بات اہم نہیں رہ جاتی کہ شاعر اور اس کے پڑھنے والے میں فاصلہ کتنا ہے۔ زمان و مکاں کے سوا نہ جانے کتنے فاصلے ہو سکتے ہیں جو دنیا کے بنائے ہوئے پیمانوں سے ناپے بھی جا سکتے ہیں۔ مگر یہ سب فاصلے کچھ انجانے طور پر غائب ہو کر بے حقیقت بھی ہو جاتے ہیں۔ غالب و میر اور دوسری زبانوں کے سب ہی بڑے شاعروں سے ہمارے رشتے کچھ ایسے ہی ناقابلِ شکست ہیں کہ ہم ان کے وجود سے خود کو اور اپنے وجود سے اُن کو نکال نہیں سکتے۔ ہم ان کے ساتھ ساتھ زندہ رہتے ہیں، پروان چڑھتے رہتے ہیں اور ہر آنے والی نسل خود ہی ان کی پائندگی کا سبب اور ثبوت بھی بن جاتی ہے۔

ان ہی فنکاروں میں ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ساتھ خارجی فاصلے خوش قسمتی سے کچھ کم ہوتے ہیں۔ کسی شاعر کے عہد میں رہنے والے اس کے قارئین جو شاعر کو سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، اُسے بھی پسند اور کبھی ناپسند کرتے ہیں، اُن کا آپس کا رشتہ ایک اور جہت بھی رکھتا ہے۔ شاعر اور اس کے سامع یا قاری ایک دوسرے پر اپنا حق بھی تصور کرتے ہیں اور اس حق کا جتانا محض جذباتی رویہ نہیں ہوتا۔ اس کا اثر تخلیق کار کی تخلیق اور قاری کے ادبی رویے پر بھی پڑتا ہے۔ یہ حق اپنے اندر بے شمار توقعات لیے ہوئے ہوتا ہے جس کی بنیاد وہ شعری و ادبی مذاق ہے جس کی ساخت اور نشو و نما میں روایت، عصری رویے، شعور، نظریات و مباحث، تہذیبی اقدار، لسانی وراثت، شخصی مزاج اور ترجیحات، غرض کہ سب ہی کچھ شامل ہوتا ہے۔

سردار جعفری کے عہد میں مجھ سا شخص جب اُن کے بارے میں ان احساسات کے ساتھ لکھنے بیٹھتا ہے تو شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر ایک رشتہ اندر ہی اندر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں معروضیت، غیر جانبداری اور غیر شخصی مطالعہ جیسے کتابی نسخے بے محل ہو جاتے ہیں۔ یوں تو ہر شاعری کے بارے میں مختلف اور متعدد رائیں ہوتی ہیں مگر سردار جعفری کے بارے میں متنازعہ رائیں اس لیے لازم ہیں کہ ان کی تخلیقی شخصیت، اشتراکی تحریک سے نظریاتی وابستگی کی بنا پر ایک دوسرے میں ضم ہوتی ہوئی لگتی ہے۔ اس وابستگی نے ان کی شاعری اور

شخصیت کو اگر متنازعہ فیہ بنادیا ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو حیرت کی بات ہوتی۔

علی سردار جعفری اب ایک عہد کی علامت بن چکے ہیں۔ ایک ولولہ انگیز، پرشور اور حوصلہ آفریں عہد میں جب چند آدرشوں کے سہارے ہم سب زندہ تھے اور ایک شاندار مستقبل کے خواب بھی دیکھ رہے تھے، مَیں ساتویں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ جب نہ صرف مَیں بلکہ میری عمر کے بہت سے طالب علموں نے سردار جعفری کو پہلی بار پڑھا تھا۔ آج یہ بہت دور کی بات لگتی ہے۔ مگر ہم نے اپنے ہوش میں، جو ہندوستان دیکھا، اس نے ہمیں اس زمین سے بہت اُوپر اٹھادیا تھا جس میں رہتے ہوئے آج ہم ہراساں ہیں۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران جن آدرشوں نے جنم لیا اور جن کے ساتھ آنے والی نسلیں پروان چڑھیں وہ ہماری ساری زندگی کا محور تھے۔ چناں چہ اس عہد کے شعروادب کے مرکز پر وہ آدرش اور ان آدرشوں کو حاصل کرنے کے لیے جذبے کی سرشاری نمایاں ہے۔

ہمارے ملک کے ہر گوشے میں اُن دنوں یہ جوش اور ولولہ ملتا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فضا میں جہاں مَیں طالب علم تھا، اُس کے قیام کے زمانے سے ہی بغاوتوں کا آہنگ گونج رہا تھا۔ میں ۱۹۴۱ء میں تقریباً سات سال کی عمر میں جب یہاں داخل ہوا تو پہلا سبق ہی وطن دوستی اور سامراج دشمنی کا ملا۔ ہر روز صبح صبح اسکول میں کلاس جانے سے پہلے ہماری تعلیم کا آغاز سارے طلبہ کے اجتماع میں اقبال کی نظموں اور آزادی سے متعلق دوسرے شاعروں کے رزمیہ نغموں سے ہوتا۔ جوش، مجاز، مخدوم اور اس وقت کے بہت سے شاعروں کے ترانے ہم نے یہیں پہلی بار سنے، جن کا ترنم آج تک ہماری یادوں میں گونج رہا ہے۔ ہر صبح کے اجتماع میں جسے ہم سب ''ترانہ'' کہتے تھے۔ گاندھی، نہرو، آزادی کی تقریروں کے تراشے سنائے جاتے تھے۔ گاندھی جی برت اور ستیہ گرہ، رہنماؤں کی قید و بند کی خبریں، حکمرانوں کی گولا باری، لاٹھی چارج اور آزادی کے سورماؤں کی دلیری کے قصے سنائے جاتے تھے۔ خود جامعہ کے اہم ارکان آزادی کی لڑائی میں پورے طور پر شریک تھے۔ میرے والد اس سارے منظرنامے میں شامل تھے۔ لہٰذا اسکول سے گھر تک ایک ہی سلسلہ تھا۔ جامعہ کی ڈگریاں کہیں منظور نہیں تھیں۔ سرکاری نوکری کے لیے جامعہ کے تعلیم یافتہ لوگ لائق نہیں سمجھے جاتے تھے۔ چناں چہ سکھایا بھی جاتا تھا کہ انگریزی سرکار کی نوکری سے زیادہ اہم عزتِ نفس اور حصولِ آزادی ہے۔ اس فضا میں آنکھ کھلی تو ہم یہی سب کچھ اپنے اردگرد دیکھنا بھی چاہتے تھے۔ یہ سبق ہماری رگ رگ میں ایسے سرایت ہوگئے تھے کہ ہمارے لیے بغاوت اور احتجاج کے نعرے ایک سحر انگیز رومانی کیفیت رکھتے تھے۔ جامعہ سے اقبال، پریم چند اور اس عہد کی بڑی شخصیتوں کا تعلق تو پہلے سے ہی تھا۔ ان کے بعد ترقی پسندوں میں سردار جعفری، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی بھی جامعہ کے اردو کے نصابات میں شامل ہوگئے تھے۔ ان لوگوں کو ہم نے صرف پڑھا ہی نہیں، آئے دن، جامعہ کی محفلوں میں آتے جاتے، اپنی تخلیقات سناتے اور بحث کرتے دیکھا اور سنا۔

''خون کی لکیر'' شائع ہوئی تو میں نے اس پر تبصرہ کیا اور جامعہ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پیش کیا۔ جامعہ میں بزرگوں کے سامنے اپنے خیالات کے بے باکانہ اظہار پر کبھی پابندی نہ تھی بلکہ اساتذہ اختلافات کے باوجود ہمت افزائی کرتے تھے۔ ظاہر ہے اس عمر میں میرا یہ مضمون بچکانہ ہی تھا۔ یاد آتا ہے کہ میں

نے سردار جعفری کے آگے جوش کو بھی بے حیثیت قرار دیا تھا کہ وہ سرکاری ملازم تھے اور اسے ہم شاعرِ انقلاب کے منصب کے خلاف سمجھتے تھے۔ پھر بہت دنوں کے بعد ہندوستان پاکستان کی جنگ کے بعد جب سردار جعفری کی کتاب "پیراہن شرر" منظرِ عام پر آئی تو میں نے اُن کی قوم پرستی کو سیاسی انحراف قرار دے کر سردار جعفری کی ساری شاعری کو ہی تہس نہس کر دیا۔ سیاسی اعتبار سے آج بھی میری رائے میں تبدیلی نہیں ہوئی مگر "پیراہن شرر" کے ساتھ اس وقت یہ پورا انصاف نہیں تھا۔ ترقی پسندوں اور پھر خود سردار جعفری نے موضوع اور ہیئت کی بحث میں موضوع کو الگ کر کے اس کی اہمیت پر کچھ اس طرح اصرار کیا تھا کہ ہم ناآزمودہ کار اس طرح کی جرائتیں کر لیا کرتے تھے جس کی آج ہمت نہیں ہوتی مگر یہ بھی ہمارے شاعر پر ہمارا حق تھا۔

نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہوں، شاعری کی آواز ہو، رہنماؤں کی تقریریں ہوں، عام بحثیں اور گفتگوئیں ہو، جلسوں جلوسوں کا شور ہو، سب کچھ گولیوں کی سنسناہٹ، نقاروں کی گونج اور نعروں کے جوش و خروش سے ہم آہنگ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہر عہد میں متعدد آوازیں فضا میں ہوتی ہیں۔ لیکن نمایاں آواز وہی ہوتی ہے جس میں ہر سطح پر لوگوں کے جذبات کی گرمی بھی شامل ہو۔ یقیناً تاریخ میں ایسے زمانے بھی آتے ہیں جب سرگوشیاں اور اشاروں میں معنی خیز باتیں کرنا بھی لازم ہو جاتا ہے۔ یہ سب مل کر ایسے لہجوں اور آوازوں کو ظہور میں لاتے ہیں جو وقت کے تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ خاموشی بھی بولتی ہوئی اور گونجتی ہوئی کوئی نہ کوئی پیغام دُور تک پہنچا دیتی ہے۔ شعر و ادب ایسے ہی لہجوں اور آوازوں سے بنتا ہے جو کسی وقت بھی عام فضا میں تشکیل پاتے ہیں۔ اُردو ادب کے مختلف ادوار کا ادب ہر زمانے کی ان آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ شہر آشوب اور ہجو سے لے کر غزل تک ہر عہد اس حقیقت کو بیان کرتی رہی ہے مگر یہاں جس زمانے کا ذکر ہے اس کی آوازیں اور ہی تھیں۔

شعر و ادب کے دیکھنے کے کئی زاویے ہو سکتے ہیں۔ اس سے دلچسپی رکھنے والے اپنے اپنے طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں اور لطف اندوزی کا سبب بیان کر سکتے ہیں۔ تنقید کے معیاروں پر ان خیالات کو پرکھ کر جس خانے میں چاہیں رکھیں مگر شعر و ادب سے لطف اندوز ہونے والوں کا تاثر بہر حال بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ شاعر اور اس کے پڑھنے اور سننے والے آپس میں کتنے ہی قریب یا دُور ہوں اگر ہم عصر ہیں تو ان کے تجربے اور شعور کے چشموں میں بہت کچھ مشترک ہونا قدرتی بات ہے۔ دونوں ایک ہی زبان، ایک ہی تہذیب سے تعلق رکھتے ہوئے بھی مذاق و مزاج، ماحول اور علم و آگہی کے اعتبار سے مختلف سطحوں پر ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان رشتے بھی کئی سطحوں پر ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ سردار جعفری سے میرا اور اس صدی کی تیسری چوتھی دہائی میں ہوش سنبھالنے والے بہت سے لوگوں کا تعلق اُن کی شاعری کے ذریعے اسی فضا میں پروان چڑھا جس نے ہم کو یکساں آئیڈیل، یکساں خوابوں اور ارمانوں میں ہم رشتہ کر دیا۔

اُردو کلچر میں نشو و نما پانے والے وہ سب لوگ جو شعر و ادب کا تخلیقی رجحان رکھتے ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی اپنے ماحول میں کلاسیکی اساتذہ کی آواز کی بازگشت سے آشنا ہو جاتے ہیں بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی بزرگوں کی طرف سے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ بچے کا شین، قاف درست ہو۔ لفظ، محاورے اور استعارے کے استعمال اور پہچان کا شعور دھیرے دھیرے جاگے۔ محفلوں میں جملہ آدابِ محفل کے

ساتھ آداب گفتگو سیکھنے کے لیے بٹھایا جانا، تتلانے کی عمر سے اُردو اور فارسی کے اچھے اشعار یاد کرانا، بیت بازی وغیرہ کے ذریعے شعری روایت مثلاً بحر، وزن، ردیف، قافیہ اور تلمیحات سے واقف کرانا یہ سب اس معاشرے کا لازمی حصہ تھا۔ تخلیقی رجحان رکھنے والے ماحول سے پورا فیض حاصل کرتے تھے اور انہیں بہت کم عمری میں شعر کہنے کا چسکا لگ جاتا تھا۔

سردار جعفری کے شعری مذاق کی نشو ونما اسکول جانے سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی اور پھر کالج اور یونی ورسٹی میں تعلیم کے دوران انگریزی زبان وادب اور دوسرے علوم کے مطالعے نے ان کے فکر وخیال کو نئی جہتوں کی طرف مائل کیا۔ لکھنؤ، دہلی اور علی گڑھ کی فضا میں سیاسی تحریک سے دلچسپی نے شاعر کی ذات میں ایک سرگرم سیاسی کارکن کو جگا دیا، جس نے اپنے عہد کے نظام سے انحراف اور احتجاج کے ساتھ ایک متبادل نظریہ حیات کے اثبات کو ان کی تخلیقی کائنات کا محور بنا دیا۔

سردار جعفری اُردو شاعری کی ساری وراثت کو قبول کرتے ہوئے بھی انیسؔ، اقبالؔ اور جوشؔ سے خاص طور پر متاثر ہونے والا امزاج لے کر آئے تھے۔ وقت کی رفتار کی ذہنی اُپج اور عملی سرگرمیوں نے اس پر اور جلا کی۔ ان شاعروں سے ان کی فطری ہم آہنگی کا سبب یہ تھا کہ ان سب لوگوں نے جس مثالی زندگی کا خواب دیکھا تھا، اُس سے صرف اپنی آنکھوں کو روشن رکھنے کے بجائے دوسروں کو اس میں شریک کرنے کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا تھا۔ انیسؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے خواب مختلف ضرور تھے مگر انہیں اپنی اپنی مثالی دنیا پر اس قدر یقین تھا کہ وہ اس کی تمنا کو اپنی ذات کے نہاں خانوں یں قید نہیں رکھ سکتے تھے۔ ان کی شاعری پیغام اور صلائے عام کی شاعری تھی۔ سردار جعفری جیسا شاعر جو سرگوشیوں کا شاعر نہیں تھا، وہ ان شاعروں سے خصوصی قرب کیے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اپنے اندر اندر گھلنے اور دل ہی دل میں رونے اور پچھتانے کے بجائے بلند آہنگی سردار جعفری کو راس آئی۔ ہمیں یاد ہے کہ ہزاروں کے مجمع میں سردار جعفری کی آواز ایک ولولہ پیدا کر دیتی تھی۔ مشاعروں میں ان کی آزاد نظمیں بھی عجیب جادو جگاتی تھیں۔ جس ماحول میں غزل کی غنائیت اور ایمائیت جگرؔ جیسے خوش نوا کے ترنم میں ڈھل کر ہر طرف چھا جاتی تھی، اس میں سردار جعفری کا بلند بانگ تحت اللفظ انداز نہ صرف مانوس ہو گیا بلکہ آزاد اور معریٰ نظم کو اگر قبول کر لیا گیا تو اس میں سردار جعفری اور کیفی اعظمی جیسے شاعروں کا بڑا دخل تھا۔ اُردو کے ادبی کلچر میں یہ معمولی اضافہ نہیں تھا۔ غزل تو ہمیشہ سے ہی حاوی رہی تھی۔ پھر جوشؔ کا تحت اللفظ انداز بھی بہت مرعوب کن تھا مگر وہ پابند نظموں کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس ماحول میں آزاد اور معریٰ نظم کو اُردو کے خوش مذاق سامعین کے کانوں سے آشنا کرنا اور اس حد تک مقبول بنانا کہ وہ اس عہد کی مانوس آواز بن جائے، اُردو تہذیب میں ایک نئی جہت تھی، جسے سردار جعفری اور ترقی پسند شاعروں کی بدولت ہمیشہ کے لیے ایک جگہ مل گئی۔ مشاعروں اور عوامی جلسوں کا جہد آزادی کے زمانے میں بہت اہم رول تھا جس سے ترقی پسندوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا کہ نظریاتی اور احتجاجی شاعری کرنے والوں کا ایک اہم مقصد عوام کے بڑے سے بڑے حلقے تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ آزاد اور معریٰ نظم کی مقبولیت کو ان ہی مشاعروں اور جلسوں نے فروغ دیا۔

نظریاتی وابستگی اور اس کی بنا پر عملی طور پر سرگرم شاعر کی زندگی اور شخصیت کے ساتھ اس کی

شاعری کا بھی نشیب وفراز سے گزرنا لازم تھا۔ آزادی کی جدوجہد ہو یا اشتراکیت کی راہ، یقین اور امید کا دامن تھامے ہوئے بھی ان پر چلنے والے ناکامیوں اور شکستوں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ چناں چہ افسردہ بھی ہوتے ہیں جو حیرت کی بات نہیں۔

خونِ سر بہہ گیا موت آگئی دیوانوں کو
بارشِ سنگ سے طوفانِ شرر سے پہلے

سردار جعفری کی شاعری میں یہ نشیب وفراز نظر آتے ہیں مگر وہ کسی خواب کو ٹوٹنے پر کبھی سپر ڈال کر اپنی ذات کے اندر سمٹ کر غائب نہیں ہو جاتے بلکہ اسے جدوجہد کی ایک لازمی منزل سمجھتے ہیں، جس کی انتہا کامرانی ہے۔ یہ رجائیت اُن کے یہاں حاوی ہے۔ اس کا بہت اچھا اظہار ان کی نظم ''پتھر کی دیوار'' ہے۔ نظم کا اختتام سردار جعفری کے شعری اسلوب کی ایک خوبصورت مثال ہے:

تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ کب
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہو جائے
انقلاب آجائے

مگر سردار جعفری کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ محض سیاسی زندگی کے اُبھرنے والے روز مرہ کے مسائل کے شاعر ہیں، صحیح نہیں۔ اشتراکی نظریہ صرف سیاسی نظریہ نہیں، بلکہ ساری زندگی اور انسانی تاریخ پر حاوی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی متعدد نظموں میں سب سے زیادہ نمایاں ''میرا سفر'' ہے جو یقیناً اس زمانے کی اُردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جائے گی۔ نظم کی پوری ساخت، اس کا ہر ہر مصرعہ اور نظم ختم ہونے کے بعد اس کا مجموعی تاثر، سردار جعفری کے کمالِ فن کو عیاں کرتا ہے۔ وہ محبت کرتے ہیں، حسن کے متلاشی ہیں اور اس پر بے طرح فدا ہو جاتے ہیں مگر ان کے اندر ایک حساس، دردمند اور ہر صورت حال میں ایک سچا فطری ردعمل رکھنے والا انسان ہے

جو کبھی جیل کی تنہائی میں جاگتی آنکھوں کے ساتھ اپنے بچے کی نیند میں شامل ہو کر اس کے ساتھ خواب دیکھتا ہے۔ کبھی اپنی ماں کے دودھ کے شہد و شبنم میں اپنی خوشبوئے زبان اور اعجاز سخن کا سرچشمہ پھوٹتے ہوئے دیکھتا ہے اور کبھی خود سردار اور سلطانہ دنیا کے سارے عشق کرنے والوں کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ اُردو شاعری میں یہ بالکل نئی آواز ہے جہاں شعریت اور نظریات وابستگی کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

حسن موسم کا ہو یا مناظر کا، اودھ کی خاک حسین کا ہو یا ممبئی کے بے رونق سڑکوں کا یا جیل کی تنہا شاموں کا، یہ سب کچھ جس شدت کے ساتھ انہیں متاثر کرتا ہے، اس کا اظہار اس نادر امیجری سے ہوتا ہے جو ان کے کلام میں جابجا بکھری ہوئی ہے۔ یہ امیجری ان کے راست، بلند بانگ اور خطابیہ انداز بیان میں جو رنگ بھرتی ہے، اس سے ان کی آواز کا تاثر دو چند ہو جاتا ہے۔ حسن اس کی آنکھوں کا رنگین پردا ابن کر ان کی نگاہ کو روکتا نہیں ہے، نہ وہ انہیں کسی خواب ناک وادی میں لے جا کر کھو دیتا ہے، بلکہ اس کی بدولت حیات و کائنات سے پیار اور امید و یقین کی راہ اور زیادہ روشن ہوتی ہے۔ فطرت کا حسن ان کے لیے خاص طور سے کشش رکھتا ہے۔ ان کا زندہ و بالیدہ احساس خود ان کی ذات کو اس منظر میں ضم کر دیتا ہے۔ وہ خود کو فطرت کے پراسرار اور دلکش مظاہرے سے الگ نہیں پاتے۔ چناں چہ "میرا سفر" کے علاوہ ان کی حال کی نظموں میں سوانحی نظم "نومبر میرا گہوارہ" اور "آبلہ پا" میں ان کا فن ایک ایسی منزل پر پہنچتا ہے جہاں وہ بے مثال مرقع تراشتے ہیں۔ مثلاً:

مجھے سورج نے پالا
چاند کی کرنوں نے نہلایا
ہر اک شئے مجھ سے تھی مانوس
مجھ سے بات کرتی تھی
درختوں کی زباں
چڑیوں کے نغمے مَیں سمجھتا تھا
ہوا میں تتلیاں پرواز کرتی تھیں
میں ان کے ساتھ اُڑتا تھا
مری مٹھی میں جگنو جگمگاتے تھے
مَیں پریوں کے پرستانوں میں جاتا تھا

اور پھر آگے چل کر اس نظم میں کہتے ہیں

میں خود فطرت تھا، فطرت میری ہستی تھی
اسی فطرت نے میرے خون میں لاکھوں بجلیاں بھر دیں

مسیں، بھیگیں، رگ و پے میں جنوں کا بانکپن آیا
مرے آگے نئے رنگوں میں دنیا کا چلن آیا
ہر اک شمشاد پیکر لے کے فردوس بدن آیا

دنیا کی مختلف زبانوں میں ہمیں ایسے رزمیے ملتے ہیں جو عالمی ادب میں یادگار ہو گئے ہیں۔ وہ تاریخ کے کسی نہ کسی اہم باب کی یاد دلاتے ہیں۔ اُردو میں ایسی تو بہت نظمیں ہیں جن سے جدوجہد آزادی کا رزم نامہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔ مگر کوئی ایسا بڑا رزمیہ جسے جہدِ آزادی کی عظمت کا نشان کہا جاسکے، نہ صرف اُردو بلکہ شاید ہماری کسی بھی زبان کی شاعری نہ دے سکی۔ مگر اس کے باوجود اُردو میں رزمیہ کے خوبصورت اور باعظمت عناصر بکھرے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں۔ ہمارے یہاں آزادی کی نظموں کا ذخیرہ خود اپنی جگہ پر اتنا شاندار تاریخی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے کہ جدید ادبی تاریخ اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ دراصل ترقی پسند تحریک اسی عہد کی علامت ہے اور سردار جعفری کی شاعری کے بغیر اس تاریخ کو مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "نئی دنیا کو سلام" اس عہد کے شعری سرمائے میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ ایسی کوئی دوسری مثال ہمیں اس زمانے میں نہیں ملتی۔ یہاں نئی دنیا خود ایک مثالی زندگی کا استعارہ ہے۔ اس میں مریم اور جاوید کے کردار اس عہد کے عام افراد کی نمائندگی کرتے ہیں مگر وہ جن منازل سے گزرے وہ انہیں مثالی کردار بناتے ہیں۔ ایک مثالی دنیا کا خواب دیکھنے والے یہ کردار اپنی تمام تر رومانیت کے باوجود اس رومانیت سے آزاد ہیں، جو روایتی اُردو شاعری میں اس سے پہلے پائی جاتی تھی۔ یہاں عورت حسن کا پیکر اور معشوقہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے بطن میں ایک بچے کو بھی پال رہی ہے جو نئی دنیا کے نئے آدرشوں کی علامت ہے اور ایک تمثیلی کردار کی تمام تر عظمت اور خوبصورتی لیے ہوئے ہے۔ یہ ایک ایسے سماجی اور انقلابی شعور کی دین ہے جو ادب میں ترقی پسندی کی بدولت آیا۔ ترقی پسندی پر ہزار تنقید کے باوجود اس کا یہ اعزاز کم نہیں کہ اس نے شعروادب کی اخلاقیات کو بدل دیا اور ہماری شاعری کی مروجہ تلمیحات کو نئے مفہوم سے آشنا کیا۔ نثر میں انگارے، ٹیڑھی لکیر اور منٹو اور بیدی کی متعدد تخلیقات اس نئے تصور کو نمایاں کرتی ہیں تو ترقی پسند شاعروں کی تخلیقات میں "نئی دنیا کو سلام" ایک نئی ذہنی اور فکری جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اپنے وسیع کینوس، تکنیکی اور شعری خوبیوں کے اعتبار سے بھی "نئی دنیا کو سلام" ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے نظریے اور اغراض و مقاصد کے پرچار کی مہم میں سردار جعفری کا نہایت اہم حصہ ہے۔ کمیونسٹ پارٹی سے اُن کے گہرے تعلق کی بنا پر وہ اُن لوگوں میں تھے جنہوں نے اُردو میں ترقی پسندی اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان رابطے کو مضبوط کیا اور جس دور میں پارٹی اور ادبی تحریک باہم ایک دوسرے کے سبب قریب آگئیں اس کی ساری کارگزاریوں کی ذمہ داری عموماً سردار جعفری کے سر ہی ڈالی جاتی ہے۔ اس دور کی ادعائیت، پارٹی کی سیاسی پالیسیوں کے مطابق ترقی پسند تحریک کے منشوروں کا اجرا اور ادیبوں اور شاعروں سے مخصوص موضوعات پر لکھنے پر اصرار اور ادبی تحریک کو ایک تنظیم کے ڈسپلن کے تحت لانے پر زور وہ چند خاص باتیں تھیں جن کی بنا پر جذبی، اختر الایمان، خلیل الرحمٰن اعظمی، منٹو وغیرہ ترقی پسند تحریک سے دور ہو گئے۔ اُس دور میں

ترقی پسند تحریک کے رہنما کی حیثیت سے علی سردار جعفری کو عموماً ہر بات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ خود سردار جعفری کے اس زمانے کی شاعری میں اسٹالن کہتا جیسی متعدد نظمیں ترقی پسندی کی اس منزل کا پتہ دیتی ہیں جس سے سردار جعفری بعد میں کوسوں دور نکل آئے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اُس دور کے اُردو ادب پر اس شور انگیز اور بلند آہنگ ترقی پسندی کا رنگ ایسا چھا گیا تھا کہ جگر جیسے عاشقانہ مزاج رکھنے والے شاعر کی غزل پر بھی اس کا عکس پڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" اسی دور کی یادگار ہے۔ اُن سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے وہ خود بھی شاید آج اپنی چند رائیں بدلنے پر آمادہ ہوں مگر اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب ترقی پسند تحریک کے ایک عہد کی اہم ترین دستاویزات میں سے ہے جس کے بغیر اس عہد کی ادبی تاریخ کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ سردار جعفری نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نثر میں ان کا اسلوب اپنی ایک خاص دل کشی رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک غیر معمولی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ یہ اُن کی یادداشتوں پر مبنی مضامین کا ایک مجموعہ ہے جو اُن کے سوانح حیات کا ایک حصہ بھی ہے اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر گزارے ہوئے خوشگوار دنوں کی یادداشت بھی ہے جس میں وہ تمام سرمستی ہے جو کسی مقصد کی خاطر خود کو وقف کر دینے والوں پر اپنی جدو جہد کے دوران حاوی رہتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے تحت شائع ہونے والے پندرہ شعری اور نثری کارناموں کے علاوہ کم از کم دو کتابیں ایسی ضرور ہیں جو اپنے اسلوب کی دلکشی اور مشمولات کی اہمیت کی بنا پر منفرد ہیں اور ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ایک سجاد ظہیر کی 'روشنائی' اور دوسری سردار جعفری کی 'لکھنؤ کی پانچ راتیں'۔ کاش کہ سردار جعفری اس سلسلے کو جاری رکھتے اور اُن کی ادبی زندگی کی یادداشتوں کی ایک دستاویز مکمل طور پر سامنے آتی۔ اس عہد کی بہت سی باتوں کے بارے میں جو اَن کہی ہیں یا جنھیں یک طرفہ سمجھا جاتا ہے اس طرح کی یادداشتوں کے ذریعے سامنے آسکتی ہیں اور سردار جعفری تو بہت سے تنازعوں کے مرکز بھی رہے ہیں اس لیے اُن کی زبان سے ان معاملات پر یقیناً نئی روشنی پڑے گی۔

سردار جعفری نے کالی داس، غالب، میر، کبیر اور میرا بائی کے کلام کے بیک وقت اُردو اور ہندی ایڈیشن شائع کر کے ہندوستانی ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کیا۔ اُردو اور ہندی کے درمیان تنازعوں کی تاریخ لمبی ہے مگر ایک مصنوعی خلیج بھی بن گئی ہے۔ جس کی بنا پر ہمارا شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔ ہمارے ادب اور فنون کا مشترک ورثہ بھی سارے برعظیم کے ادبی سرمایہ کے طور پر قبول کیے جانے کے بجائے کچھ حصہ اُردو اور صرف مسلمانوں کی ملکیت سمجھا جانے لگا اور کچھ ہندی کے راستے سے صرف ہندوؤں کی جاگیر بن گیا جب کہ وہ ہماری مشترکہ ثقافت کے بہترین نمائندے تھے۔ چناں چہ سردار جعفری نے ان ادبی شخصیات کے کلام کو نہ صرف دونوں زبانوں میں بیک وقت شائع کیا بلکہ ان پر جو تفصیلی مقدمے لکھے وہ خیالات، تجزیے اور سخن فہمی اور اسلوب غرض کہ ہر اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ ان شاعروں کے کلام کے یہ ایڈیشن جعفری صاحب نے جس سلیقے سے شائع کرائے وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

اُن کا ایک تازہ ترین منصوبہ گو کہ مکمل نہیں ہوا مگر اس کی دو جلدیں شائع ہونے والی ہیں۔ یہ کتاب 'سرمایۂ سخن' کے نام سے ہے اور اس میں اُردو شاعری کی لفظیات، تلمیحات، استعارات اور تمثیلوں کی ایک مکمل فرہنگ ہوگی۔ جس میں ہر لفظ کی پشت پر اس کی شعری روایت جو اُردو میں فارسی، عربی اور ترکی کے راستے سے آئی اس کو

بھی نشاندہی مثالوں کے ساتھ ہوگی۔ یہ اردو میں اپنے قسم کی پہلی کتاب ہے جس کو حوالے کے طور پر استعمال کیا جا سکے گا۔

مجموعی طور پر سردار جعفری کے سارے تخلیقی سفر پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ جو سلسلہ ۱۹۴۴ء میں "پرواز" کی اشاعت سے شروع ہوا تھا، وہ ہندوستان میں اشتراکی تحریک سے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شخصیت کی نشوونما کے ساتھ ہی ایک ایسی منزل پر پہنچا ہے جہاں نہ تو وہ پرانی گھن گرج ہے، نہ وہ اشتراکی ادعاییت جو "امن کا ستارا"، "اسٹالن کتھا" میں وقتی سیاسات اور ہنگامی جوش کی بدولت آئی تھی۔ آج سردار جعفری کی آواز صوفیانہ انسان دوستی سے زیادہ قریب ہے۔ انسان دوستی پر تو اُن کا عقیدہ مارکسزم کی بین الاقوامیت اور پھر اسی کے زیر اثر امن عالم کی تحریک کے ذریعے مضبوط ہوا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خصوصاً کمیونزم میں نظریاتی بکھراؤ کے بعد ان کے پاس تصوف کا لہجہ نمایاں ہونے لگا۔ اب دشمن کا چہرہ موہوم ہوا اور دوست ہر انسان میں نظر آنے لگا۔ مگر اس عہد عزم و پیکار کی پالی ہوئی کھنک آج بھی ان کے ہاں باقی ہے۔ وہ دشمن جو پہلے انقلاب کی راہ میں حائل تھا اور مد مقابل تھا آج موہوم ہے۔ اپنی عمر میں انہوں نے آزادی کے خواب بھی دیکھے اور اس خواب کو ٹوٹتا ہوا بھی پایا۔ اشتراکی انقلاب کی آرزو کے ساتھ سوویت یونین کا عروج وزوال بھی دیکھا، ترقی پسند تحریک کا ہندوستان کے ادبی منظرنامے پر حاوی ہونا دیکھا اور پھر نظریاتی بکھراؤ کے ساتھ اس کا وہ زور ٹوٹتا ہوا بھی دیکھا۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے مگر ایک نئے ادراک، نئے یقین کے ساتھ جس کی نشوونما میں ماضی کی ساری کامرانیاں اور شکستوں کا جانکاہ احساس بھی شامل ہے اور اپنی خواب آشنا آنکھوں کا اعتبار بھی:

کس سے ممکن ہے تمناؤں کے زخموں کا حساب
آستینوں کو پکاریں گے کہاں تک آنسو
اب تو دامن کو پکڑتے ہیں لہو کے گرداب
دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے انداز خطاب
در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب
سرکشی پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں
میں ترا شاعرِ آوارہ و بے باک و خراب
پھینک پھر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمت دشوار پسند

☆☆☆

(ماہنامہ آج کل نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۰ء)

قمر رئیس

سردار جعفری

اور

نیا تنقیدی شعور

جب کوئی اہم تخلیق کار تنقید کے میدان میں وارد ہوتا ہے تو اکثر اس کی نیت اور نظریات دونوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ بڑا فنکار اپنی ایک الگ بیاضِ فکر لے کر آتا ہے۔ جو ابتدا میں لوگوں کو چونکاتی ہی نہیں مشتعل بھی کرتی ہے۔ یہ فنکار جب خامۂ نقد و نظر ہاتھ میں سنبھالتا ہے تو لوگ کچھ اس طرح سوچتے ہیں:

(۱) اس کا مقصد حریفوں کو چت کرنا ہے۔

(۲) اپنے فن (شاعری) کا لوہا منوانا ہے۔

(۳) اپنی بوطیقا کا جواز پیدا کرنا ہے۔

اور دیکھا یہ گیا ہے کہ اس کی تنقید کے ابتدائی محرکات میں یہ سارے ہی اجزا کسی نہ کسی تناسب میں شامل ہوتے ہیں۔ خواہ ورڈس ورتھ ہو یا کولرج، آسکر وائلڈ ہو یا ایلیٹ۔ یا پھر اپنے یہاں حاؔلی اور فراؔق۔ سب کی تنقیدات کا ابتدائی محرک معروضی کم ذاتی زیادہ رہا ہے لیکن بتدریج ان کی تنقید ذاتی عوامل سے ارفع ہو کر فن و ادب کی زیادہ پیچیدہ اور گہری سچائیوں کی تلاش میں سرگرداں ہوجاتی ہے اور وہ بعض ایسی حقیقتوں کی دریافت پر قادر ہوتی ہے جو ایک غیر تخلیقی نقاد کی رسائیوں سے پرے ہوتی ہے۔

سردار جعفری یوں تو زمانہ طالب علمی سے ہی ادبی مسائل پر سوچنے اور لکھنے لگے تھے۔ لیکن اُن کی تنقید کا باضابطہ آغاز ۱۹۵۰ء میں اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے اولین سنہرے دور کی تکمیل کر چکی تھی اور خود جعفری اُس کے ایک نمائندہ اور ہر دلعزیز شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنا چکے تھے۔

ہر چند کہ اُس وقت اُن کی شاعری کی عمر چودہ پندرہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے جب ان کی کتاب ترقی پسند ادب شائع ہوئی تو اگر ایک طرف ترقی پسند حلقے سے باہر اسے ترقی پسند تحریک اور نظریات کا ترجمان سمجھا گیا تو دوسری طرف خود ترقی پسندوں کے مخصوص حلقے میں اسے متنازعہ دستاویز کا درجہ حاصل ہوا۔ اور یہ فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ اُس وقت تک ترقی پسند ادبی نظریات کے خط و خال واضح نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے تصورات سیال اور اختلافی تھے۔ اور ان پر بحث جاری تھی۔ لیکن تحریک کی شیرازہ بندی اور اشاعت کی خاطر یہ خطرہ تو کسی نہ کسی کو مول لینا ہی تھا۔ سردار جعفری چوں کہ ابتدا ہی سے اس تحریک کے فعال رکن تھے اور اس کی دستاویزوں اور جرائد کی تسوید و ترتیب میں وہ اہم رول ادا کرتے تھے۔ اس لیے قرعۂ فال اُن کے نام ہی پڑا اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ترقی پسند ادبی تحریک کے بنیادی یا کلیدی تصورات کی تفہیم و تعبیر کا سوال تھا انھوں نے بڑی محنت اور لگن سے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔ اس کے باوجود اگر خود جعفری کو اس کتاب کا ہیرو قرار دیا گیا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

اس کتاب پر سب سے شدید اعتراضات ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم نے کیے جو ۱۹۴۸ء تک خود بڑے جوشیلے ترقی پسند تھے۔ صرف یہی نہیں وہ سردار جعفری کے شعری اسلوب کے سب سے بڑے مقلد بھی تھے جس کا ثبوت اُن کی طویل سیاسی نظم ''آئینہ خانہ'' ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ ۵۰۔۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی قید سے رہا ہوئے تو بعض دوسرے نوجوانوں کی طرح وہ بھی ترقی پسند خیالات سے منحرف اور تائب ہو گئے۔

یہاں یہ حقیقت یاد رکھنے کی ہے۔ کہ ڈاکٹر اعظمی نے اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' میں سردار جعفری پر جو اعتراضات کیے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ان دو مضامین کے حوالے سے کیے گئے ہیں جو جعفری نے زمانۂ طالب علمی میں یعنی ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء لکھے تھے۔ اور جن میں اختر حسین رائے پوری کی طرح ایک انتہا پسندانہ رویّہ اختیار کیا گیا تھا اس لیے ان اعتراضات کی نوعیت ایسی ہی ہے جیسے آج ڈاکٹر اعظمی کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے اُن کی طالب علمی کے زمانے کی سطحی اور جذباتی شاعری سے مثالیں دی جائیں۔ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ جہاں تک جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر اعظمی کے بیشتر اعتراضات ایک سوچے سمجھے معاندانہ رویے کے غماز ہیں۔ صرف یہی نہیں انہوں نے سردار جعفری کے بعض بیانات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر اعظمی لکھتے ہیں۔

''جعفری نے اپنی ذات کا جو طلسم تیار کیا ہے وہ اس خود پسندی
اور خود فریبی کو اور بھی آگے لے جاتا ہے۔ چوں کہ وہ عوام کے لیے عوام ہی کی
زبان سے براہِ راست شاعری کرتے ہیں اس لیے اُن کو محض فیض ہی پر فوقیت
حاصل نہیں ہے بلکہ''۔

'' ہم اپنے بزرگ اساتذہ سے زیادہ خوش قسمت ہیں کہ ہمارے
سننے اور پڑھنے والوں کا حلقہ زیادہ وسیع ہے اور آج ایسے حالات پیدا ہوگئے
ہیں کہ آرٹ اور ادب زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچ سکتا ہے''۔

(ترقی پسند ادب (جعفری) صفحہ ۱۷)

جعفری نے اس اقتباس میں اُن نئے مادی حالات تعلیم کی اشاعت اور نئے ذرائع ترسیل کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں ادبی تخلیقات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اعظمی نے اسے جعفری کی نیت اور ذات پر حملہ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ کچھ یہی نوعیت اُن کے دوسرے اعتراضات کی ہے۔ بہر حال یہاں میرا مدعا ڈاکٹر اعظمی (مرحوم) کے اعتراضات کا جواب دینا نہیں بلکہ جعفری کے تنقیدی مؤقف کو سمجھنا ہے۔

جہاں تک خود جعفری کے اس کتاب میں موجود ہونے کا تعلق ہے۔ اس کے تین پہلو ہوسکتے ہیں اوّل یہ کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر جعفری نے اسے اپنی شاعری کے جواز کا ذریعہ بنایا۔ دوئم یہ کہ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے جعفری اپنے آپ کو اس مطالعے سے الگ نہیں رکھ سکے اور سوئم یہ کہ ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم رکن اور رہنما ہونے کی بنا پر انہوں نے کسی معروضی مطالعے کے بجائے اس تحریک اور اس کے نظریات کی زوردار وکالت کا فریضہ انجام دیا۔ حقیقت یہ کہ یہ تینوں ہی پہلو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور تینوں میں جزوی طور پر صداقت کا عنصر موجود ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس تصنیف کے محرکات خود جعفری کے نزدیک کیا رہے ہیں؟

''میری کتاب کا موضوع صرف نظریاتی مباحث اور ترقی پسند
تحریک کے محرکات اور رجحانات تک محدود ہے۔ اس لیے بیشتر ادیبوں اور اُن
کی تخلیقات کا ذکر صرف حوالوں اور مثالوں کی شکل میں آیا ہے۔

'حرفِ اوّل میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

''حقیقتاً میں نے نقاد کے فرائض انجام نہیں دیے ہیں۔ کیوں کہ مجھے نقاد ہونے
کا دعویٰ نہیں ہے۔ میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اس تحریک
کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا ہے جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور جس
سے میرا شروع سے بہت قریبی تعلق رہا ہے، اُس کو کاغذ پر منتقل کر دیا ہے''۔

ظاہر ہے کہ جعفری صاحب یہاں اس تحریک اور اس کے مقاصد سے اپنی ذاتی وابستگی یا کمٹ منٹ کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن اسی حرف اوّل میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اپنے اس مطالعے کو انھوں نے ''حتی الامکان سائنٹفک اور علمی رکھنا چاہا ہے''۔ یہ بھی سچ ہے کہ اُن کے تجزیے اور تبصرے تحریک کے پس منظر اس کے نظریاتی تناظر، محرکات اور رجحانات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یقیناً اُردو میں مقدمہ حالیؔ کے بعد اپنی نوعیت کی یہ پہلی تصنیف ہے۔ ہمیں یہ ماننے میں تامل نہیں کرنا چاہیے کہ اُردو میں پہلی بار نظریاتی پاس داری رکھنے والا غایتی ادب سرسید تحریک کے زیرِ اثر تخلیق ہوا اور حالیؔ نے مقدمہ لکھ کر اس کی اصولی اور جمالیاتی بنیادیں تلاش کیں۔ جعفری نے بھی یہی فریضہ انجام دیا۔ ترقی پسند تحریک چوں کہ صرف اُردو کی تحریک نہیں تھی بلکہ زیادہ ہمہ گیر قومی اور بین الاقوامی تحریکوں سے اس کا رشتہ تھا۔ اس لیے جعفری نے زیادہ وسیع ذہنی تناظر میں حقیقت نگاری کے اس رجحان یا اس نئے طرز کے غایتی ادب کی وضاحت کی ہے۔ انہوں نے اس کی سماجی معنویت کے ساتھ ساتھ اس کے جمالیاتی تلازمات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ کام انہوں نے سنجیدہ استدلال کے ساتھ کیا ہے اور تحریک سے گہری وابستگی کے باوجود کوشش کی ہے کہ تحریک کی سب سے بڑی دین یعنی عقلیت اور معروضیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس وقت تک سید احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، اختر انصاری اور ممتاز حسین نے اپنے مضامین میں جس نئے تنقیدی شعور کے نقوش اُبھارے تھے سردار جعفری نے اس کو ایک ارفع اور اصولی نظم وضبط کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ کتاب کے چوتھے باب تک یہ ساری بحث ختم ہو جاتی ہے۔ آخری دو ابواب میں ترقی پسند ادب اور اس کے رجحانات کا جائزہ ہے۔ یہاں میرا مدعا موازنہ حالیؔ وجعفریؔ ہرگز نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں ہمارے معاشرہ اور ادب کی دو بڑی تحریکوں کے پس منظر میں اور اُن کے عہدِ شباب میں لکھی گئیں۔ دونوں نے ہمارے ادب میں کچھ نئی قدروں، نئے رجحانات کی آبیاری کی۔ شعر و ادب کو بدلتی ہوئی زندگی کی ضرورتوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا۔ دونوں نے حتی الامکان مادی اور معروضی نقطۂ نگاہ پر زور دینے کے باوجود ایک طرف اپنی تحریک کی تو دوسری طرف اپنے مؤقف شعری کی ترجمانی کی (اس کے بغیر شاید وہ اپنے خیالات کو اتنے موثر اور کارگر

ڈھنگ سے پیش نہیں کر سکتے تھے) سردار جعفری کی کتاب زیادہ نزاعی اس لیے ٹھہری کہ انہوں نے مثالیں اپنے معاصرین سے دی تھیں اور ترقی پسند ادب کے جائزے میں بڑی سفاکی سے بعض کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اُن کے بعض فیصلے اگر صحیح ہیں تو بعض جارحانہ رویے کی غمازی کرتے ہیں۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کی کچھ کہانیوں کو اگر فحش، اور مریضانہ مان لیا جائے تب بھی انہیں غلاظت نگار کہنا یا انہیں بنیادی طور پر انسانوں کی محبت سے عاری بتانا تنقید کا بڑا ادعائی انداز تھا جو جعفری نے روا رکھا۔

لیکن جعفری کے تنقیدی مسلک کے بارے میں خلیل الرحمان اعظمی کا یہ بیان بھی عصبیت اور جارحیت کی دلیل ہے کہ "یہ تنقید ترقی پسندی اور شاعری دونوں کو اپنے معیار پر لانا چاہتی ہے تاکہ سب سے اُونچے منصب پر جعفری کو فائز کردیا جائے اس لیے کہ صحت مند سماجی اور نظریاتی رویوں پر اصرار صرف جعفری کی کمزوری نہیں تھی بلکہ یہ ادعائیت اس زمانہ کی عالمی ترقی پسند تنقید کا عام انداز تھا۔ اسٹالن کے دور میں سویت روس کے A.A. ZHADANOV نے اشتراکی حقیقت نگاری کا جو نظریہ پیش کیا تھا، اس نے غیر اشتراکی ملکوں کے ادب میں خاصی گمراہی پھیلائی۔ یورپ میں کرسٹوفر کاڈویل بھی انتہا پسندی کے اس میکانکی موقف کو لے کر چل رہے تھے۔ جعفری بھی اُن سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور تھے ہمارے یہاں پہلی بار ممتاز حسین نے ہنگری کے دانشور گیورگی لوکاچ کی طرح (جو سوویت یونین میں معتوب رہا) ادب کے مسائل پر راست سیاسی عوامل سے ہٹ کر فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کرنے کی طرح ڈالی۔ سردار جعفری نے بلنسکی گورکی، مورس ڈاب اور خود لینن کے ادبی نظریات سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے بیسویں صدی کے سیاسی اور تاریخی عوامل کے تجزیے سے جن ذہنی اور ادبی رجحانات کی نشان دہی کی ہے۔ اس میں ایک صاف منطقی ذہن کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ بات بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کی جمالیاتی اساس تلاش کرنے کی کوشش کی یا کم از کم اس اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اس سعی کا نقطۂ آغاز انھوں نے پریم چند کے خطبۂ صدارت کا وہ مقولہ بنایا ہے۔ جس میں انہوں نے کہا ہے --"ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا"۔ اس وقت تک دنیا کے مشہور مارکسی عالموں نے بھی اس مسئلے پر گہرائی سے غور نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں اختر انصاری نے ادب میں حسن کے تصور کو افادیت سے جوڑ کر ایک نیا اور چونکا دینے والا تصور دیا تھا۔ سردار جعفری نے پلیخانوف کے حوالے سے انسان کے ذوق و جمال کے ارتقا اور سرچشموں کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ تہذیبی ارتقا کی مختلف سطحوں اور سماج کے مختلف طبقوں کے ذوقِ جمال کے فرق کی نشان دہی بھی انھوں نے کی ہے۔ ذوقِ جمال کے اجتماعی طبقاتی کردار پر زور دینے کے باوجود انھوں نے اس

کے انفرادی پہلو کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ لکھتے ہیں۔" تہذیب و تمدن کی ایک ہی سطح پر بھی ایسے دو آدمی نہیں ملیں گے جن کے جمالیاتی احساسات یکساں ہوں۔ احساسِ جمال کی اس انفرادی شناخت کو انہوں نے متضاد سماجی عوامل میں تلاش کیا ہے"۔

اسی طرح سردار جعفری کا یہ خیال بھی ذوقِ صحیح کا غماز ہے۔ کہ" جب تک ادیب اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان مشترک جمالیاتی قدریں نہ ہوں گی، اُن دونوں کے جمالیاتی ذوق کی قدریں ملیں گی نہیں۔ تب تک نہ ادب سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے، نہ اُسے سمجھا جاسکتا ہے"۔

جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" نے کم از کم دو دھوں تک ترقی پسند ادبی نظریات کی تفہیم اور فروغ میں موثر رول ادا کیا ہے۔ پینتیس سال قبل لکھی ہوئی اس کتاب میں آج اگر گہرائی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ تو اس کا سبب یہی ہے کہ آج کی مارکسی تنقید میں زیادہ وقتِ نظر اور حلیمانہ بصیرت پیدا ہوگئی ہے۔ مارکسی تنقید اب بڑی حد تک مارکسی تصورات کے یک رخے میکانکی اطلاق سے آزاد ہوگئی ہے۔ اب گیورگی پلیخانوف، گیورگی لوکاچ اور برطول بریخت کی کم و بیش ساری تحریریں انگریزی میں دستیاب ہوجاتی ہیں۔ ان کے علاوہ دی ۔جے جیروم اڈائف سانگیز وار کونیز ڈیوڈ کریگ گراہمی اور وکٹر کیرنن جیسے مارکسی دانشوروں کی کتابیں بھی مل جاتی ہیں جو عالمی اور قومی سطح پر ادب اور تہذیب کے مسائل کی تفہیم میں ایک نئی فلسفیانہ اور تخلیقی بصیرت عطا کرتی ہیں۔ جس کے شواہد نوجوان نقادوں محمد علی صدیقی، اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر ش اختر۔ عتیق احمد، اشفاق احمد، ڈاکٹر صادق اور دوسروں کے یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ خود جعفری کے شعور اور تنقیدی رویوں میں گزشتہ پندرہ برسوں میں نتیجہ خیز اور خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ہر چند کہ اس دور میں ا نہوں نے تنقید کم لکھی ہے اور انہیں نقاد ہونے کا دعویٰ بھی نہیں لیکن اقبالؔ اور بعض کلاسیکی شعراء کے بارے میں انہوں نے جو مقالات، دیباچے لکھے ہیں وہ اس نئی بصیرت کا ثبوت ہیں۔

صد سالہ جشنِ اقبال کے موقع پر سردار جعفری نے اقبالؔ کے بارے میں اُردو اور انگریزی میں کئی مضمون لکھے، یوں تو ترقی پسند نظریات کی تشکیل میں انہوں نے فکرِ اقبال کی اہمیت کا اعتراف اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں بھی کیا ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ۵۵ء کے بعد انہوں نے اقبالؔ کو از سر نو پڑھا اور ایک بار پھر اُن کے فکر و شعور اور فن کے باریک پہلوؤں کا سراغ لگایا، جس کا ثبوت اُن کی اُس دور کی شاعری میں بھی ملتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ جوشؔ کے بجائے اس دور میں وہ اقبالؔ سے زیادہ قریب رہے ہیں۔

جعفری نے اقبالؔ کی بین الاقوامیت پر اپنے مضامین میں خاص طور سے زور دیا ہے۔اقبالؔ نے تیسری دنیا اور خاص کر اُردو اور فارسی بولنے والی اقوام کو استعماری طاقتوں کی سازشوں سے خبر دار اور بیدار ہونے کا جو پیغام دیا تھا اس کی معنویت اور ہمہ گیر اثرات کا اعتراف جعفری نے کھل کر کیا ہے۔ صرف یہی نہیں وہ اقبال کی بازیافت کے شوق میں فکرِ اقبال کے بعض ایسے منطقوں میں بھی داخل ہو گئے جن کا تعلق اساساً مابعد الطبیعاتی یا ماورائی مسائل سے ہے۔مثلاً اقبالؔ کا تصورِ وقت۔جعفری نے اسے ہندو فلسفہ (پرانوں) میں دیے ہوئے کائنات کی تخلیق کے تصور سے جوڑ کر اور ایک شاعرانہ تمثیل بنا کر پیش کیا ہے۔انہوں نے جس جوشیلی شاعرانہ نثر میں زبان و مکان کے حوالے سے اقبال کے تصورات کی شرح کی ہے ،وہ تاثراتی تنقید کا دلکش نمونہ بن جاتا ہے۔لیکن اس طرح کے مطالعہ سے علمی طور پر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔پھر ہوتا یہ ہے کہ نقاد خود شاعر (اقبال) کے طلسمِ خیال میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔

سردار جعفری کی تنقیدی دانش کا ایک نمونہ ''پیغمبرانِ سخن'' ہے جو کبیرؔ ،میرؔ اور غالبؔ تین شعرا کے بارے میں اُن کے مقالوں (اصلاً دیباچوں) پر مشتمل ہے۔۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۵ء تک انہوں نے ہندوستان کے جن عظیم کلاسیکی شعرا کے کلام کا مطالعہ بڑی کاوشوں اور دقتِ نظر سے کیا ،اس کا اثر ان کی تخلیقی فکر اور جمالیاتی حیثیت پر بھی پڑا جیسا کہ ان کے بعد کے مجموعوں ''پیرہن شرر'' اور ''لہو پکارتا ہے'' سے اندازہ ہوتا ہے۔ان شعرا کے کلام میں علاوہ دیگر عناصر کے انہوں نے اس سوال کا جواب بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کسی شاعر کا کلام لوگوں کے ذوق کی تسکین کا باعث کیوں کر بنتا ہے۔کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا اور میں نے پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ بھی نہیں اختیار کیا ہے میرے لیے کبیرؔ ،میرؔ اور غالبؔ کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لیے ضروری ہے۔میں جس نظریہ جمال اور نظریہ تاریخ پر یقین رکھتا ہوں اور جو میرے اندر گزشتہ تیس سال میں رچ بس چکا ہے۔میں نے اسی نظریے سے ان بزرگ شعرا کے کلام پر نظر ڈالی ہے ،یہ کلام ابدی قدروں کا حامل ہے۔لیکن اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہے۔۔۔۔۔عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔لیکن پھول اور پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں۔''

جس طرح مارکسی نقاد G.M.MATHEWS نے شیکسپیر کے ڈرامہ ''اتھیلو'' کا مطالعہ یورپ کی عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے تناظر میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح شیکسپیر نے لطیف تمثیلی انداز سے اس ڈرامے میں انسانی وقار dignity کے نا قابلِ تقسیم ہونے کا نظریہ پیش کیا اسی طرح جعفری نے

کبیر اور میر کی شاعری میں بھگتی اور تصوف کے مسلک کا مطالعہ تاریخی حوالوں سے کر کے انسانی مساوات کے تصور پر زور دیا ہے۔ذات پات رنگ ونسل اور سماجی اُونچ نیچ کی تفریق کے مقابلے میں کبیر نے انسانی وحدت، انسانی دردمندی اور عالمگیر محبت کی تبلیغ کی۔جس کے اثرات ہندوستانی سماج اور اس سے زیادہ ہندوستانی فکر کے ارتقاء میں نمایاں رہے ہیں۔سردار جعفری کہتے ہیں"ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔اس روشنی کی ضرورت ہے، جو اس سنت صوفی کے دل سے پیدا ہوئی تھی۔"انھوں نے کبیر کی شاعری کے جمہوری اور سیکولر کردار پر زور دیتے ہوئے ایک موقع پر لکھا ہے۔

"آج جب کہ ہندوستان کے بعض حلقے تنگ نظری کا ثبوت دے رہے ہیں اور ایک محدود تہذیبی تصور کو فروغ دینے کی فکر میں ہیں تو قومیت کے ایک ایسے تصور پر اصرار کرنے کے لئے جس کے اندر ہندوستان کے مزاج کی وسعت ہو یہ ضروری ہے کہ ایک طرف موجودہ مغربی سائنس سے استفادہ کیا جائے اور دوسری طرف اپنے ملک اور قوم کی وسیع المشربی کی روایتوں کو یاد رکھا جائے۔

"جدید عہد کی سیاسی انقلابی تحریکوں کو مزید تقویت حاصل کرنے کے لیے قرون وسطیٰ کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہیے"۔

کبیر میر اور غالب کی شاعری میں سامنتی عہد کے مسلمہ اداروں یا روایتوں اور نظریوں کی عوام دشمنی کے خلاف احتجاج کرنے یا اُن کی معنویت پر شک کرنے کی صفات ملتی ہیں جعفری نے ان پر زور دیا ہے۔انھوں نے ایک طرف اُن شعرا کی آفاق گیر محبت اور اُخوت کی اہمیت جتائی ہے،تو دوسری طرف اس مقدس نفرت کا ذکر بھی کیا ہے جو دلوں میں اضطراب پیدا کرتی ہے اور جبر و استحصال کے قلعوں کو پھونک کر خاک کر سکتی ہے بقول جعفری"سر فروشان محبت کا دل ایسے جنون سے بھی معمور ہوتا ہے جو دست جلاد سے شمشیر ستم چھین لے اور باطل کے سینے پر حرف حق لکھ سکے"۔ان شعرا کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے سماج اور انصاف کے اجارہ داروں اور ان کی حمایت کرنے والے تصورات کے خلاف بغاوت اور نفرت کی چنگاری کو ہوا دی تھی۔ان کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

جیسا کہ جعفری نے بار بار کہا ہے۔انھوں نے ترقی پسند تحریک اور اپنی شعر گوئی کے محرکات کو سمجھنے اور توانا رکھنے کے لیے یہ مقالات لکھے ہیں۔ان میں بھی اُن کی ارتقا پذیر شخصیت کے وہی پہلو روشن ہیں جو ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں، اس کے باوجود انھوں نے علمی اور معروضی نقطۂ نگاہ پر زور دے کر اُردو میں ادبی تنقید کے اس سائنسی نظریے کو تقویت بخشی جس کا آغاز ترقی پسند نقادوں نے کیا تھا۔

(ماہنامہ افکار، کراچی، سردار جعفری نمبر۔ نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء)

گوپی چند نارنگ

علی سردار جعفری: ترقی پسندی کے تاج کا نگینہ

علی سردار جعفری (۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء — یکم اگست ۲۰۰۰ء) ترقی پسندوں کے سب سے بڑے قافلہ سالار تھے۔ سید سجاد ظہیر، ملک راج آنند، فیض احمد فیض، احتشام حسین اور مخدوم محی الدین کی صحبتوں کا فیض اٹھائے ہوئے۔ پہلی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس جو اپریل ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی، اور جس کا افتتاح پریم چند نے کیا تھا، اس کی دستاویزی تصویر میں علی سردار جعفری ایک طرف کو موجود ہیں۔ شروع میں تخلص 'حزیں' تھا۔ آزادی کے بعد انھوں نے ترقی پسند ادب پر اپنی جامع کتاب لکھنے کے بعد ترقی پسندی کی نظریاتی باگ ڈور عملاً اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کتاب کے پہلے دو باب بنیادی نوعیت کے ہیں جن میں انھوں نے کاڈویل اور پھر پریم چند اور جوش سے بحث کی ہے۔ ان کے بنیادی نظریاتی تصور انقلابی رومانیت کی تشکیل انھیں بنیادوں پر ہوئی تھی۔ جوش ان کے ہیرو تھے۔ ان کی شاعری میں جو براہ راست خطابت کا میلان ہے وہ کسی حد تک جوش کی دین ہے۔ شاعری، خطابت اور نثر تینوں میں انھوں نے اپنا لوہا منوالیا۔ فعال شخصیت کا اثر یوں بھی زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے انھیں ہمیشہ نعل در آتش دیکھا، تخلیقی، سماجی، سیاسی تینوں سطحوں پر وہ برابر سرگرم رہے۔

تاریخی اعتبار سے کتنے نشیب و فراز آئے، ان کے کمٹ منٹ میں کمی نہیں آئی۔ ان کی شاعری کی امتیازی اقدار انسان دوستی، حریت پسندی اور وطن پرستی ہیں۔ ان کا ذہنی سفر سامراج کے خلاف للکار سے شروع ہوا۔ انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ عوام کے دکھ درد کی ترجمانی، کچلے دبے انسانوں کی

حمایت اور سماجی انصاف پسندی کے لیے انھوں نے ہمیشہ آواز بلند کی۔ ہندستان کی رنگارنگ تہذیب کے وہ دلدادہ تھے، اردو معاشرے کے کمزور ہو جانے کا انھیں دکھ تھا۔ فرقہ واریت اور تشدد کی انھوں نے ہمیشہ مذمت کی اور امن و آشتی کے لیے برابر آواز اٹھاتے رہے۔ ترقی پسندی کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ اس نے ہندستان کے عوام سے رشتہ جوڑا جس سے اردو کی مقبولیت میں شدید اضافہ ہوا اور اردو جو پہلے سے تحریکِ آزادی کی نقیب تھی، بعد میں اور بھی زور شور سے اس میں شریک ہوئی۔ اس زمانے میں اردو ادیبوں اور شاعروں کی حیثیت ہندستانی ادب میں ہراول دستے کی تھی۔ بائیں بازو کا نقیب ہونے کی وجہ سے اردو شاعروں نے ہندی اور دوسری زبانوں کے ادیبوں سے رشتے استوار کیے۔ سماجی مسائل پر سب میں اتفاق تھا۔ علی سردار جعفری ذاتی طور پر ہندی والوں میں خاصے مقبول رہے۔ یہ ہم آہنگی اور یگانگت اردو کی بڑی طاقت تھی جو بعد کے زمانے میں ویسی نہیں رہی۔ غالباً اسی رفاقت کے پیشِ نظر علی سردار جعفری نے اردو کے سب سے بڑے شاعر غالب کو ہندی والوں کے سامنے رکھنا چاہا۔ انھوں نے دیوانِ غالب کا ڈی لکس ایڈیشن بڑے سائز میں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں اپنے نہایت عمدہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے لیے روپیہ انھوں نے پنجاب نیشنل بنک کے لالہ یوگ راج سے حاصل کیا جو غالب اور اردو دونوں کے عاشق تھے۔ اس ایڈیشن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ہندی والوں میں غالب کی مقبولیت میں تو اضافہ ہوا ہی، علی سردار جعفری کی تنقیدی نظر کی بھی دھاک بیٹھ گئی۔

علی سردار جعفری البیلے انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص طرح کی دلنوازی اور کشش تھی جو ان کی مقبولیت میں اضافے کا باعث تھی۔

ہندستان کا بڑے سے بڑا ادبی ایوارڈ ان کو حاصل ہوا۔ غالباً پدم شری کا اعزاز انھیں اندرا گاندھی کے زمانے میں ملا تھا۔ ہندستان کا سب سے بڑا ادبی اعزاز بھارتیہ گیان پیٹھ ابھی انھیں دو برس پہلے حاصل ہوا۔ اس سے قبل سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، غالب ایوارڈ، سنت گیانیشور ایوارڈ اور مختلف اردو اکیڈمیوں کے بیسیوں اعزازات انھیں حاصل ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ ترقی پسندوں میں جیسی تنقیدی نظر علی سردار جعفری کی تھی ویسی کسی کی نہیں۔ میر تقی میر، میرا بائی اور کبیر کے انتخابات بھی انھوں نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اپنے مقدمات کے ساتھ شائع کیے۔ بعد میں ان کے یہ مضامین "پیغمبرانِ سخن" نام کی کتاب میں شائع ہوئے۔ غالب، حافظ، رومی اور اقبال کے وہ عاشق تھے۔ اساتذہ کا بیشتر کلام ان کو حفظ تھا۔ "ترقی پسند ادب" میں انھوں نے جن لوگوں کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا، ان میں اقبال اور قرۃ العین حیدر بھی تھے۔ بعد میں ان کی رائے میں تبدیلی آئی اور انھوں نے 'اقبال شناسی' شائع کی اور اقبال صدی منانے

میں بھی پیش پیش رہے۔ نظریاتی طور پر جس طرح ان کی پسند و ناپسند میں تبدیلیاں آتی رہیں اس پر کچھ لوگوں کو اعتراض تھا، لیکن یہ تبدیلیاں ان کے ذہنی سفر کا نتیجہ بھی تھیں۔ غالی ترقی پسندوں نے ان پر سمجھوتہ بازی کا الزام بھی لگایا۔ سیاست میں تو یہ ہوتا ہی ہے۔ "نومبر میرا گہوارہ" میں انھوں نے اپنے معترضین اور حاسدوں کو جواب بھی دیا ہے۔ ان کی شاعری کی ایک بڑی خوبی ان کی خوبصورت پیکر تراشی ہے جو شروع کی نظموں سے لے کر آخر تک ملتی ہے لگتا ہے کہ اپنے اظہار کی اس قوت کا جتنا فائدہ وہ اٹھا سکتے تھے اپنی مصروفیات کی وجہ سے انھوں نے نہیں اٹھایا۔ 'پتھر کی دیوار' میں شامل نظم "نیند" اس اعتبار سے بے مثل ہے۔ جیل کی سلاخوں کا منظر ہے اور رات کی کیفیت:

نیلگوں جواں سینہ
نیلگوں جواں باہیں
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم مہکتی ہیں
رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی!

ویسے ان کے ادبی سفر کا آغاز افسانوں کے ایک مجموعہ 'منزل' سے ہوا جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ پہلا مجموعہ کلام 'پرواز' کے نام سے ۱۹۴۳ء میں آیا۔ اس کے بعد 'نئی دنیا کو سلام' (۱۹۴۸ء)، 'خون کی لکیر' (۱۹۴۹)، 'ایشیا جاگ اٹھا' (۱۹۵۱ء) اور 'پتھر کی دیوار' (۱۹۵۳ء) شائع ہوئے۔ 'پتھر کی دیوار' سے ان کی شہرت میں بے حد اضافہ ہوا۔ بعد میں 'ایک خواب اور'، 'پیراہن شرر' اور 'لہو پکارتا ہے' تین مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۷۸ء کے بعد کی بہت سی نظمیں ہنوز کسی مجموعے میں مرتب نہیں ہوئیں اگرچہ صہبا لکھنوی نے کراچی سے افکار کا جو علی سردار جعفری نمبر شائع کیا تھا اس میں بعض چیزیں شامل ہیں۔

ادھر ہند پاک دوستی کے حوالے سے ساتویں دہائی میں علی سردار جعفری نے جو نظمیں لکھی تھیں ان

کی بازگشت ابھی دو برس پہلے سنی گئی جب ہندستان کے وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی امن پیش کش کے لیے لاہور گئے اور یہ نظم 'سرحد' کے نام سے بار بار چھپی اور پڑھی گئی:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے

اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے

ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے

سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

ہند پاک دوستی کے نام پر ان کی کئی نظمیں ہیں۔ ان میں رومانیت کا وفور ہے، لیکن ان کے بعض مصرعے تاریخی نوعیت کے ہیں اور اس قدر خوبصورت ہیں کہ زبانوں پر چڑھ گئے ہیں:

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش

ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر

ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر

پھر اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے

گفتگو بند نہ ہو

بات سے بات چلے

صبح تک شام ملاقات چلے

سر پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعد کی نظموں میں جو شعری مرتبہ "آبلہ پا" یا "نومبر میرا گہوارہ" کا ہے وہ دوسری نظموں کا نہیں۔ بالخصوص "نومبر میرا گہوارہ" میں سوانحی حوالے، وسیع انسانی، سماجی و قومی تناظر میں

آئے ہیں۔ان کی وجہ سے نظم کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ علی سردار جعفری کی اولین دور کی نظموں میں "پتھر کی دیوار" کے کچھ حصے، نیز "پیراہن شرر" اور "اودھ کی خاک حسین" بھی عمدہ نظمیں ہیں۔ان کے ساتھ ساتھ میں "میرا سفر" کو بھی اہمیت دوں گا۔یہ نظمیں اردو کے شعری سرمائے میں علی سردار جعفری کی یاد دلاتی رہیں گی۔بالخصوص "میرا سفر" جو رومی کے مصرع "ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، زندگی کے اس لا مختتم CONTINUUM تسلسل یا CYCLIC تصور کو پیش کرتی ہے جس میں ہندستانی روح کی تڑپ موجود ہے:

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے میری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ میرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

آخری حصہ نہایت پر اثر ہے:

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل میں
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

مزے کی بات ہے کہ یہ جوانی کی نظموں میں ہے جو ۱۹۵۶ء کے لگ بھگ شائع ہوئی اور بعد میں ہمیشہ کے لیے ان کی پُر حوصلہ طبیعت کا تخلیقی نشان بن گئی۔

علی سردار جعفری کی شاعری میں زندگی کا یہ اثبات اور زندگی کے تسلسل پر یہ ایقان اور اعلیٰ انسانی قدروں پر ان کا ایمان ایسی میراث ہے جس کی وجہ سے تاریخ کے صفحات پر ان کا نام روشن رہے گا۔

کئی بار ہندستان سے باہر کے سفر میں علی سردار جعفری کا اور میرا ساتھ رہا۔ دہلی بھی جب جب آتے تو فون ضرور کرتے اور ملنے کا وقت طے کرتے۔ کینیڈا کے ایک سفر میں فیض اور سردار جعفری دونوں تھے، سلطانہ بیگم بھی تھیں اور کئی دنوں تک قیام ٹورانٹو میں بیدار بخت کے یہاں رہا۔ روز شام کو محفل جمتی اور رات گئے تک گفتگو رہتی۔ ایک دو بار پاکستان میں بھی ساتھ ہوا۔ کراچی پریس کلب کے ایک جلسے میں مقامی شعرا نے خاصا وقت خراب کیا۔ بعد میں پوچھا گیا کہ ان شعرا کے کلام کے بارے میں رائے کیا ہے۔ سردار جعفری نے کہا "ہندستان پاکستان کے تعلقات ویسے ہی کشیدہ ہیں، میں رائے دے کر انھیں مزید خراب کرنا نہیں چاہتا"۔

شخص اٹھ جاتا ہے صرف یادیں اور کام باقی رہ جاتا ہے۔ ادھر وہ ایک مدت سے علیل تھے۔ وہ شخص جس کی آواز دہلی کی ادبی محفلوں میں اکثر گونجا کرتی تھی، مہینوں سے خاموش تھا۔ شیلا گجرال صاحبہ نے بمبئی

سے واپس آنے کے بعد فون پر بتایا کہ پہچان اور یادداشت جاتی رہی تھی۔ انھوں نے فیکس پر اپنے تاثرات بجھوائے جو ناگری سے اردو کرا کے میں نے اخبارات کو بھجوا دیے۔ دہلی کا آخری جلسہ جس میں وہ شریک ہوئے ان کی نظموں کے انگریزی ترجموں پر مبنی کتاب کی ریلیز کا تھا جنھیں بیدار بخت نے ترجمہ کیا تھا۔ گجرال صاحب موجود تھے۔ اظہار خیال کے لیے مجھ سے کہا گیا۔ کتاب سٹرلنگ نے شائع کی تھی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ سے سردار جعفری کی آخری کتاب "سرمایہ سخن" زیر اشاعت ہے، یہ غالباً وہ کام ہے جو انھوں نے نہرو فیلوشپ کے زمانے میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۸ء کے بعد کی نظموں کا مجموعہ بھی آنا چاہیے اور کلیات نظم کی اشاعت بھی ضروری ہے۔ علی سردار جعفری ہمارے ان شاعروں اور ادیبوں میں سے تھے جن کی وجہ سے اردو کا سر ہندستان کی ادبی محفلوں میں اونچا تھا۔ ان کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ آسانی سے پُر نہ ہوگا۔ افسوس:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

□□□

(ماہنامہ ایوانِ اردو، دہلی۔ ستمبر ۲۰۰۰ء)

مظہر امام

شعری اظہار اور سردار جعفری

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ علی سردار جعفری کی بنیادی حیثیت شاعر کی ہے۔ ان کی تعیینِ قدر کے لیے تقریباً پچپن سال پر محیط ان کے کلام کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ (غالباً گزشتہ دس سال میں انھوں نے کچھ نہیں کہا) ان کی اس بنیادی حیثیت پر سردست کچھ اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں۔ سردار کا پہلا مجموعہ کلام 'پرواز' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس وقت تک فیض، راشد، میراجی، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر اور اختر الایمان کے مجموعے منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ 'پرواز' ان سب کے مقابلے میں کمزور مجموعہ ہے۔ اس پر جوش کا اثر حاوی ہے۔ عنوانات سے ہی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بغاوت، سرمایہ دار لڑکیاں، دیہاتی لڑکیاں وغیرہ یا پھر اشتراکی سیاست کے تحت لکھی ہوئی نظمیں ہیں مثلاً لینن، جمہوری اسپین کی طرف سے لڑنے والے ادیبوں کی موت پر، وغیرہ۔

سردار جعفری کا شاعرانہ اعتبار ان کی تمثیلی نظم 'نئی دنیا کو سلام' سے قائم ہوا۔ ترقی پسند ادیب و شاعر ۱۹۴۴ء تک آزاد نظم نگاری کے مخالف تھے۔ لے دے کر مخدوم نے ایک نظم اس ہیئت میں کہی تھی۔ سردار جعفری نے یہ طویل نظم ۱۹۴۶ء کی آخری تاریخوں میں مکمل کی۔ ایک سال بعد شائع ہوئی۔ انھوں نے آزاد نظم کو ایک خاص جہت سے آشنا کیا اور یہ ثابت کیا کہ ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار اس صنف میں کامیابی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم کے کئی حصے بہت خوبصورت اور اثرانگیز ہیں۔ یہ اپنے وقت میں اپنی نوعیت کی پہلی نظم تھی۔ اس نظم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اسے عام طور پر سراہا گیا ہے۔

بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں کمیونسٹ پارٹی نے کئی روپ بدلے اور ان کے راست اظہار نے سردار جعفری کی شاعری کو نزاعی بنا دیا۔ پہلے آزادی کا جشن منایا گیا اور فوراً ہی اسے "فریب" سے تعبیر کیا گیا۔ 'جشنِ آزادی' کا عنوان 'خواب' سے بدل دیا گیا۔ 'خواب' اور 'فریب' دونوں نظمیں جعفری کے مجموعہ کلام

'خون کی لکیر' میں شامل ہیں جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ان دو نظموں کے علاوہ بھی 'خون کی لکیر' کی تقریباً سبھی نظمیں فوری اور ہنگامی موضوعات پر ہیں اور ان کے لہجے میں گھن گرج اور خطیبانہ آہنگ ہے۔ اسی مجموعے میں جعفری کی ایک مشہور اور 'مقہور' نظم 'رومان سے انقلاب تک' ہے جو ۱۹۴۹ء میں 'سویرا' لاہور میں چھپی تھی۔ اس عنوان کے نیچے درج ہے:

"پندرہ برس کی ترقی پسند شاعری پر تنقید"

آزاد نظم کی ہیئت میں تقریباً سوا سو لائنوں پر مشتمل ہے۔ یہ اپنے وقت کی بڑی ہنگامہ خیز نظم تھی۔ احتشام حسین نے ایک باقاعدہ مضمون اس نظم کی فکری خامیوں کو واضح کرنے اور ترقی پسند نقطۂ نظر کے انتہا پسند رویے کی تردید میں لکھا تھا۔ اس نظم کی ابتدائی سطریں ہی خاصہ گرم ہیں:

ساتھیو اب مری انگلیاں تھک چکی ہیں
اور مرے ہونٹ دکھنے لگے ہیں
آج میں اپنے بے جان گیتوں سے شرمار ہا ہوں
میرے ہاتھوں سے میرا قلم چھین لو
اور مجھے ایک بندوق دے دو
تاکہ میں اپنے نغموں میں فولاد و بارود کا زور بھر دوں
میں تمھاری صفوں میں تمھاری طرح
اپنے دشمن سے لڑنے چلوں گا

اس نظم میں ستر ہ لائنیں لگاتار 'اک طرف' سے شروع ہوتی ہیں:

اک طرف ماؤ ہے، اک طرف چیانگ ہے
اک طرف مارشل، اک طرف مالو تاف
اک طرف کالی فسطائیت، اک طرف انقلاب
اک طرف ایلیٹ، اک طرف گورکی

وغیرہ۔ اور آخر میں وہ اپنے رفیقوں سے مخاطب ہوتے ہیں:

شاعرو! ساتھیو!

کاکلوں کی گھنی چھاؤں سے

سرخ پرچم کے سائے میں آؤ

اور نئے گیت گاؤ

گاؤ مزدور کے ساز پر

گاؤ جمہور کے ساز پر

وغیرہ۔

یہ محض ایک مثال ہے۔ اس طرح کی مثالیں سردار جعفری کی ۳۸۔۱۹۳۷ء سے لے کر ۴۹۔۱۹۴۸ء تک کی شاعری میں بطور خاص خوب خوب مل جائیں گی۔ کہا گیا ہے کہ جب فیض کو زنداں کی دیواروں کے درمیان گوشۂ تنہائی میسر آیا تو ان کی شاعری پر بہار آئی۔ میں سمجھتا ہوں سردار جعفری کا جیل جانا بھی ان کے حق میں فال نیک ثابت ہوا۔ وہ اپنی اشتراکی سرگرمیوں اور اشتعال انگیز نظموں کی پاداش میں ۱۰ راپریل ۱۹۴۹ء سے اندازاً جون ۱۹۵۰ء تک آرتھر روڈ جیل بمبئی اور سینٹرل جیل ناسک میں قید رہے۔

وہ ۱۲ راپریل ۱۹۴۹ء کو سلطانہ کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"ہمیں اس لیے بھی حکومت کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ مجھے آرام پہنچا رہی ہے تاکہ تھکے ہوئے دل و دماغ کو تھوڑا سا سکون مل جائے۔ دنیا کے کئی شاہکار جیلوں میں لکھے گئے ہیں۔ میں اگر یہاں زیادہ دن رہا تو میں بھی بہت کچھ لکھوں گا جو بہت دنوں سے لکھنا چاہتا ہوں۔"

اپنی گرفتاری کے دوران میں انھوں نے چند نہایت اچھی نظمیں لکھیں مثلاً 'پتھر کی دیوار'، 'نیند'، 'اودھ کی خاکِ حسیں'۔ ان کے علاوہ 'تمھاری آنکھیں'، 'شادی کا دن' اور 'جیل کی رات' بھی جیل میں ہی کہی گئی تھیں۔

میں 'پتھر کی دیوار' کو سردار جعفری کی شاعری کا ایک خوبصورت موڑ مانتا ہوں۔ اس نظم کا یہ اقتباس دیکھیے:

پتیوں کی پلکوں پر

اوس جگمگاتی ہے

املیوں کے پیڑوں پر
دھوپ پر سکھاتی ہے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں
پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر
دودھ جذب ہو جائے

جیل ہی میں انھوں نے اپنے بیٹے کی پہلی سالگرہ پر نظم 'نیند' لکھی:

رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

اس نظم کے اقتباسات بار بار پیش کیے جاتے رہے ہیں، اس لیے میں ان کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا۔ ان نظموں کے ذریعہ پیکر تراشی کے نہایت عمدہ نمونے سامنے آئے۔ تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کا بھی برجستہ اور فطری استعمال ان کی اس وقت کی کئی نظموں میں ملتا ہے۔ ان نظموں میں سردار جعفری کا اپنا لہجہ ابھرتا ہے جو اقبال اور جوش کے اثر سے آزاد ہے۔ جعفری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے فیض اور دوسرے شاعروں کے مقابلے میں نظم کو غزل کے اثر سے نجات دلانے میں مدد دی۔ 'پتھر کی دیوار' اور 'نیند' کی بحر میں صرف دو ارکان 'مفتعلن مفاعلن' کی تکرار ہے اور اس سے ایک ایسا خوبصورت آہنگ پیدا ہوا ہے کہ اس وقت کے کئی شاعر اس سے متاثر ہوئے۔ خود میری نظم 'خواب سچ بھی ہوتے ہیں' اسی بحر اور آہنگ میں ہے۔ اور تو اور سردار جعفری کے سخت گیر نقاد کلیم الدین احمد کی چار نظمیں اسی وزن اور اسلوب میں ملتی ہیں، بلکہ بعض مصرعے بھی ہو بہو ایک جیسے ہیں۔ یہ نظمیں ان کے مجموعے '۴۲ نظمیں' میں شامل ہیں۔

خیر، یہ تو ضمنی باتیں تھیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ سردار کی گرفتاری نے ان کے شعری سفر کو ایک نئی اور بہتر جہت دی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی طول کلامی کم و بیش اسی طرح برقرار رہی۔ جذبی نے ۱۹۵۱ء میں

جب اپنا دوسرا مجموعہ چھپوایا تو اس کا نام 'سخنِ مختصر' اپنے اس طنزیہ شعر کی بنیاد پر رکھا:

یہاں ہے طولِ کلامی نثر کا سکہ
یہاں مرے سخنِ مختصر کی قیمت کیا

میں نے جیل کی دو نظموں 'شادی کا دن' اور 'جیل کی رات' کا ذکر کیا ہے۔ دونوں نسبتاً مختصر ہیں۔ سردار نے بعد میں اور کئی مختصر نظمیں لکھیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ایک مختصر سی خوبصورت نظم لکھی تھی، جسے اس زمانے میں ناقدوں نے سراہا تھا۔ اس کا ایک مصرع یاد رہ گیا ہے:

پھول سے کھل گئے تصور میں

پھر جب ان کی بلند آہنگ شاعری کا زور ہوا تو اس نظم کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا اور مجھے یاد نہیں کہ گزشتہ چالیس پینتالیس سال میں اس نظم کا حوالہ کسی مضمون میں آیا ہو۔

ان کے مجموعے 'ایک خواب اور' میں پانچ مصرعوں کی ایک خوبصورت نظم ہے۔ ایک انٹرویو میں سردار نے اسے نیوڈ پینٹنگ (NUDE PAINTING) کہا ہے، نظم دیکھیے:

نسیم تیری قبا، بوئے گل ہے پیراہن
حیا کا رنگ ردائے بہار اڑھاتا ہے
ترے بدن کا چمن ایسے جگمگاتا ہے
کہ جیسے سیلِ سحر، جیسے نور کا دامن
ستارے ڈوبتے ہیں، چاند جھلملاتا ہے

کیا فوری طور پر ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ ایک خوبصورت عریاں جسم کی تصویر ہے؟ سردار جعفری شاعری میں کیسے کیسے گل کھلانے کے اہل تھے!

مجموعہ کلام 'پتھر کی دیوار' (۱۹۵۳ء) اور 'ایک خواب اور' (۱۹۶۵ء) کے درمیان اچھا خاصہ وقفہ ہے۔ جعفری نے موخرالذکر مجموعے کے دیباچے میں لکھا ہے:

"خواب اور شکست خواب اس دور کا مقدر رہے اور نئے خواب دیکھنا انسان کا ایسا حق ہے، جس سے کوئی طاقت، کوئی اقتدار اسے محروم نہیں کر سکتا۔"

یہ سب صحیح، لیکن نہ تو شکست خواب کا مرثیہ پڑھنے سے کوئی شاعر بڑا ہو جاتا ہے اور نہ نئے خواب دیکھنے کا اپنا

حق حاصل کرنے سے۔ مسئلہ وہی شعری اظہار کا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جیل کی تنہائی نے سردار کو اپنی ذات کے اندر اترنے کا موقع دیا اور وہ خارج کو اپنے داخل کا حصہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ جدیدیت کا اصرار تو اسی پر تھا۔ نجی واردات اور نجی احساس کو انھوں نے کئی نظموں میں بڑی اثر انگیزی سے برتا۔ خاص طور پر 'میرا سفر' اور 'حسین تر' میں۔ اپنی بیوی کو سامنے رکھ کر ایسی تابناک نظمیں کہنا جعفری کا ہی حصہ ہے۔ اور یہ ساری اردو شاعری میں بالکل نیا تجربہ ہے۔ ان نظموں میں بیوی کسی فرد واحد کی شریک حیات نہیں رہتی بلکہ آج کی عورت کا استعارہ بن جاتی ہے۔

عورت کے حسن و شباب کا تذکرہ تو شاعری میں ہوتا ہی رہا ہے، لیکن عورت یا بیوی کے بڑھاپے کے حسن اور اس سے فریفتگی کا اظہار جعفری کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ ان نظموں میں جذبے کا وفور ایک ایسی لطافت پیدا کرتا ہے کہ ذہن و دل ایک اہتزازی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ 'میرا سفر' کے اقتباسات کیا، تقریباً پوری نظم بار بار حوالے میں آتی رہی ہے۔ پھر بھی کچھ ٹکڑوں کا دہرانا ضروری معلوم ہوتا ہے:

ہر چیز بھلا دی جائے گی
یادوں کے حسیں بت خانے سے
ہر چیز اٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں
لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا

اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

'میرا سفر' ۱۹۵۶ء کی تخلیق ہے۔ 'حسین تر' اس کے آس پاس کی۔ اس کا حوالہ نسبتاً کم آیا ہے، لیکن یہ واقعی اعلیٰ درجے کی تخلیقی کاوش ہے:

ہماری عمرِ رواں کی شبنم
تری سیہ کاکلوں کی راتوں
میں تار چاندی کے گوندھ دے گی

تری کتابِ رُخِ جواں پر
کہ جو غزل کی کتاب ہے اب
زمانہ لکھے گا اک کہانی
اور ان گنت جھریوں کے اندر
مری محبت کے سارے بوسے
ہزار لب بن کے ہنس پڑیں گے

پھر ایک تو ہوگی اور اک میں
کوئی رقیبِ رفیق صورت
کوئی رفیقِ رقیب ساماں
مرے ترے درمیاں نہ ہوگا
ہوس کی نظروں کو تیرے رُخ پر
جمالِ نو کا گماں نہ ہوگا
فقط مری حسن آزمودہ
نظر یہ تجھ کو بتا سکے گی
کہ تیری پیری کا حسن تیرے

شباب سے بھی حسین تر ہے

میں سمجھتا ہوں کہ سردار جعفری کی شاعری کا بہترین دور (’نئی دنیا کو سلام‘ کو چھوڑ کر) ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان ہے۔ اسی دور میں انھوں نے وہ نظمیں کہیں جو انھیں ادب میں زندہ رکھنے کا سبب بن سکتی ہیں۔

ہمارے ایک معتبر شاعر اور صحافی فرحت احساس نے ایک بہت اچھی بات کہی ہے کہ آج سردار جعفری کی شہرت اور مقبولیت کی بنیاد ان کا اصل شعری اظہار نہیں بلکہ وہ موضوعاتی نظمیں ہیں جو ہند پاک دوستی کے فروغ اور جنگ کے خلاف ماحول سازی کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر ہے ہم جیسے ادب کے قاری کے لیے کوئی حوصلہ افزا بات نہیں ہے، لیکن فرحت احساس نے اس کا ایک مثبت پہلو بھی تلاش کر لیا ہے جس سے اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے اور وہ یہ کہ ان نظموں سے اردو کے شعری سرمایے میں کوئی اضافہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے ذریعے ہمارے ملک اور برصغیر کے بعض اہم سیاسی اور تہذیبی معاملات میں اردو زبان و ادب کی سرگرم مداخلت درج ہوئی۔ یہ پڑھتے ہوئے ہمارا ذہن فوری طور پر سردار کی نظم ’کون دشمن ہے‘ کی طرف جاتا ہے جس کے یہ آخری مصرعے بار بار دہرائے جاتے ہیں:

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے

میرا خیال ہے کہ جعفری کی تازہ ترین نظمیں جو اب سے کم و بیش پندرہ بیس سال پرانی ہیں، ان میں ایک بار پھر ان کے بدلے ہوئے مزاج اور شعری اسلوب کا واضح عکس ملتا ہے۔ ان میں طرزِ اظہار کی خوبصورتی اور نفاست زیادہ ہے اور الفاظ کے دلکش در و بست سے ایک خاص طرح کے جھنکار کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ یہ نظمیں کم دستیاب ہیں، اس لیے ان کا حوالہ بھی شاذ ہی آتا ہے۔ بہر حال ان کی دو نظموں کے ایک ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

وزن: فعلن فعولن فعلن فعولن

وادی بہ وادی منزل بہ منزل
صحرا بہ صحرا، ساحل بہ ساحل

قاتل ہی قاتل ، قاتل ہی قاتل

دل سا سپاہی سب کے مقابل

اے شہسوارو !

اے شہسوارو !

(نظم: "اے شہسوارو")

وزن: فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

رہگزر رہگزر کارواں کارواں

پیاس کی سرزمیں ، پیاس کا آسماں

خواب در خواب رقصاں ہے جوئے رواں

سارباں ! اور کچھ تیز بانگِ جرس

العطش !

العطش !

العطش !

(نظم: 'العطش')

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں سردار جعفری کی حیثیت نزاعی رہی ہے۔ان کے نظریات اور ان کے طرزِ سخن پر اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ نئی نسل سے ان کا رشتہ 'محبت اور نفرت' (LOVE AND HATE) کا رہا ہے۔ سردار کو بھی اس کا احساس تھا کہ نئی نسل ان سے منحرف ہو سکتی ہے لیکن انھیں نظر انداز نہیں کر رہی ہے۔انھوں نے 'گفتگو' کے 'ترقی پسند ادب نمبر' (۱۹۸۰ء) کو تحفے کے طور پر نئی نسل کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے اپنی ایک نظم پیش کی ہے۔ یہ نظم 'نئی نسل کے نام' ہے۔اس کے کچھ خاص حصے دیکھیے:

مجھ سے نظر چرا کر کہاں جاؤ گے

اے مرے آفتابو!

راہ میں رات کی بیکراں جھیل ہے

اور اونچی ہیں لہریں

آسمان سخن کے نئے ماہتابو!

تیرگی پوچھتی پھر رہی ہے تمھارا پتہ

اے مرے شعلہ پیکر عقابو!

اپنے لوح و قلم تو دکھاؤ ذرا

سچ کہو کیا تمھارے تراشے ہوئے لفظ میں

میری آواز کا شائبہ بھی نہیں؟

میری آواز پتھر میں شعلہ ہے

شعلے میں شبنم

اور طوفاں میں طوفاں

اور تمھارے بھی سینے میں اس کی چبھن ہے

سچ کہو

آنے والے زمانے کی روشن کتابو!

مجھ سے نظریں چرا کر کہاں جاؤ گے؟

سردار اپنے آپ کو اس سے بڑا خراج اور کیا پیش کر سکتے تھے؟۔ ○○○

(ماہنامہ ایوان اردو، دہلی۔ ستمبر ۲۰۰۰ء)

آصفہ زمانی

سردار جعفری کی غزل گوئی

سردار جعفری کی غزل گوئی کے متعلق اظہار خیال کرنے سے پہلے اُردو کی روایتی غزل کی تعریف اور ترقی پسند غزل کے حدود کے متعلق چند باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتی ہوں

غزل کا روایتی فن وادب، اسلوب، ایجاز واختصار، رمز وکنایہ، مجاز وتمثیل، استعارہ وتشبیہ سے ہی مرکب ہے۔اس کے کچھ مسلمات اور اس کی ایک مخصوص فضا ہے۔عاشق ومعشوق ورقیب اس کے بنیادی اور روایتی کردار ہیں۔شدت تاثر اور بلاغت کی اعلیٰ ترین مدارج تک غزل اسی پیرایہ میں پہنچی۔

برخلاف اس کے ترقی پسند غزل میں ابہام زہر ہے۔اس میں ایسی وضاحت ضروری ہے جو سنتے ہی سمجھ میں آجائے۔اِس کے علاوہ ترقی پسند شاعری اپنے طے شدہ نتائج کو منظوم کرنے کے لیے مجبور ہے۔نیز اس کے کچھ ایسے مطالبات بھی ہیں جن میں فن کو ثانوی اور مقصد کو اولیت حاصل رہی ہے۔یہاں فرد کی انفرادی فکر پارٹی سے انحراف نہیں کر سکتی۔اِن عام شرائط کی بنا پر اکثر خالص ترقی پسند غزل 'خطابت' اور 'بیانیہ' سے آگے نہیں بڑھ سکی۔پارٹی کے موقف کے مدِنظر اصناف سخن کے اعتبار سے نظم کا پیانہ ہر لحاظ سے موزوں تھا۔چنانچہ ترقی پسند شعراء نے عموماً غزل کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسے "گردن زدنی" قرار دیا گیا۔اس کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ ترقی پسند شعراء نے غزلیں نہ کہی ہوں۔فیضؔ کی "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" کی نظمیں اتنی مقبول نہیں جس قدر غزلیں۔سوال یہ اُٹھتا ہے کہ ترقی پسند غزل کی اس حد بندی کی وجہ سے اُردو غزل کو نقصان پہنچا یا اس نے اُردو غزل کے دامن کو وسیع کیا؟ علی سردار جعفری کی غزل گوئی کے حوالے سے ہم یہاں اِن سوالات کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

سردار جعفری بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور اس میں بھی "غیر پابند" نظم میں ان کے جوہر زیادہ کھلتے ہیں۔شعوری طور پر وہ غزل کے پھیر میں پڑنا نہیں چاہتے کیونکہ یہاں اُن کی 'پاسداری' پر آنچ آنے کا خطرہ لاحق ہے۔ترقی پسند شعراء انہیں عموماً "منافق" نظر آتے ہیں۔فیضؔ پر وہ تیکھا وار کر چکے ہیں۔لیکن اسے غزل کی سحر کاری کہیے یا شجرِ ممنوعہ کی طلب گاری کہ وہ بھی اس کافر صنفِ سخن کی زلفوں کے اسیر ہو ہی گئے۔ظ۔انصاری ایک جگہ اُن کی گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دوسری پائے کی غزل سردار جعفری کی ہے۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ اپنی نثر اور تقریروں میں غزل پر آنکھیں نکالتے تھے۔ اب خود غزل لکھنے بیٹھ گئے ہیں تو سارے غمزے لائے ہیں۔"

تو آیئے سرِ دست ان غمزوں کی کناری بھی دیکھ لی جائے۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک ترقی پسند غزل کا انتخاب یہ ثابت کرتا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے اس میں زیادہ تنوع نہیں ہے۔ بھوک و افلاس و مساوات، مظلوم و جابر حکمراں طبقے کے خلاف جارحانہ انداز، غلامی کا کرب، آزادی کی خواہش، امن کا خواب جیسے نظم کے موضوعات ترقی پسند غزل کے بھی اساسی موضوعات ہیں۔ سردار جعفری کی غزل گوئی کا محراب بھی اسی سنگ و خشت سے تیار ہوا ہے۔ بھوک اور افلاس یہاں بھی سایہ فگن ہیں۔

بچے کے میٹھے ہونٹوں پر پیاس کی سوکھی ریت جمی
دودھ کی دھاریں گائے کے تھن سے گر گئیں ناگوں کے پھن میں

مساوات و اشتراکیت کی صدائے بازگشت یہاں بھی صاف سنائی دے رہی ہے ۔

سب ہوں شاداں، سب ہوں خنداں
تنہا کوئی شاد نہیں ہے

شکستگی و محرومی کا یہ احساس اور غزل کو خاص فضا سے ہمکنار کرتا ہو۔ "خواب اور شکستِ خواب" اس دور کی شاعری کا بنیادی محور ہے۔ جب یہ موضوع غزل میں بار پاتا ہے تو سردار کی یہ غزل وجود میں آتی ہے۔

شکستِ شوق کو تکمیلِ آرزو کہیے
جو تشنگی ہو تو پیمانہ و سبو کہیے
خیالِ یار کو دیجئے وصالِ یار کا نام
شبِ فراق کو گیسوئے مشک بو کہیے
شکایتیں بھی بہت ہیں، حکایتیں بھی بہت
مزا تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے
یہ حکم، کیجیے پھر خنجروں کی دلداری
دہانِ زخم سے افسانہ و گلو کہیے

کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند غزل انفرادی احساسات کے بجائے ایک طے شدہ اسلوب میں اظہار خیال کرتی

ہے لیکن آپ اس قسم کے اشعار کو کس زمرے میں رکھیں گے؟ سردار جعفری ہی کا ایک شعر پیش ہے۔

عشق کا نغمہ جنوں کے ساز پر گاتے ہیں ہم
اپنے غم کی آنچ سے پتھر کو پگھلاتے ہیں ہم

یہاں "ہم" کے ردیف میں جمع متکلم کا صیغہ ضرور استعمال ہوا ہے لیکن کیا "پتھر" کے استعارے میں انفرادی احساس اور انفرادی تجربہ نہیں بول رہا ہے؟

غیر ترقی پسند غزل اور ترقی پسند غزل میں یکسانیت کا بظاہر کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ ان کی لفظیات کلاسیکی روایت کی لفظیات ہیں۔ عصری شعور، مفہوم کی ادائیگی کا پیرایہ کس طرح تبدیل کر دیتا ہے، یہ دیکھنے کی بات ہے۔ "جنوں" میں "چاک دامانی" کا پایا جانا ازبسکہ ضروری ہے۔ اس مضمون کا روایتی شعر یوں ادا ہوتا ہے۔

اب کی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اور ترقی پسند شاعر جب اس مضمون کو ادا کرنا چاہتا ہے تو اپنی آواز کی للکار پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ تب شعر یوں ادا ہوتا ہے۔

یہ دامن و گریباں اب سلامت رہ نہیں سکتے
ابھی تک کچھ نہیں بگڑا ہے دیوانوں میں آ جاؤ
خرد والو! جنوں والوں کے ویرانوں میں آ جاؤ
دلوں کے باغ، زخموں کے گلستانوں میں آ جاؤ

سردار کی بیشتر غزلیں عموماً کسی ایک مرکزی احساس یا فکر کی تابع ہیں۔ اُن کی ایسی غزلوں کو ہم "نظم نما غزل" کا نام آسانی سے دے سکتے ہیں۔ یہ بھی کوئی نئی روایت نہیں ہے۔ غالب اور اس کے بعد اقبال کی بیشتر غزلوں کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

کلاسیکی غزل کا محبوب قاتل ہے اور سفاک ہے، بے رحم ہے۔ یہاں بھی تجاہلِ عارفانہ کی وہی رواداری ہے۔

قتل کر کے آئے ہیں اور تن کے بیٹھے ہیں
پوچھتے ہیں حیرت سے نالہ و فغاں کیوں ہے؟

روایتی غزل میں شیخ و واعظ کو ہدفِ تنقید بنانے کی روایت خاصی پرانی ہے۔ اس کے لیے کبھی کبھی طنزیہ پیرایہ بھی اختیار کیا گیا۔ سردار جعفری نے اپنے ترکش کے تیروں کو ضائع نہیں کیا ہے۔

اسی دنیا میں دکھا دیں تمہیں جنت کی بہار
شیخ جی تم بھی ذرا کوئے بتاں میں آؤ

جو ہاتھوں کی سیاست ہے جن کا فن سردار
اب اُن سے کہیے تو کیا حاجتِ رفو کہیے

یہاں غور طلب ہے اس کا معنیاتی نظام۔ شعر کی ندرت کا دارومدار اسی پر ہے۔
سردار نے غزل میں نامانوس الفاظ و تشبیہات و استعارات سے گریز کیا ہے، انہوں نے روایتی تشبیہ واستعاروں کو ترجیح دی ہے۔ میر نے کہا تھا۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

سردار کہتے ہیں۔

تمام دولتِ کونین ہے خراج اُس کا
یہ دل نہیں کسی لوٹے ہوئے نگر کی طرح

سردار ان لفظیات سے اسکی کیفیت خلق کرتے ہیں جو انہیں کا حصہ ہے
ترقی پسند شعرا نے "زندانی شاعری" کے حوالے سے غزل کو نئے تجربوں سے آشنا کیا۔ بقول فیض۔

"جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے۔ جس میں فکر ونظر کا ایک آدھ دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسیات یعنی Sensations پھر تیز ہو جاتی ہیں۔ صبح کی پو، شام کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ اور ہوائے گداز کے بارے میں وہی پہلا سا تحیر لوٹ آتا ہے۔ نزدیک کی چیزیں بہت دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک اور فردا ودی کا تفرقہ کچھ اس طرح سے مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔"

اس تجربے نے غزل میں ہجریہ شاعری کی لے کو تیز کیا ہے۔ سردار جعفری نے بھی صعوبتِ قید کو دوست یا دوں سے نکھارا ہے۔

وطن سے دور یارانِ وطن کی یاد آتی ہے
قفس کے نوجوانانِ چمن کی یاد آتی ہے

وہ فیض ہوں یا سردار جعفری، انکی شاعری میں "رات" کا استعارہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے:

صحنِ زنداں میں ہے پھر رات کے تاروں کا ہجوم
شمع کی طرح فروزاں سرِ دیوار آنکھیں

زنداں، دار و رسن اور شورِ سلاسل جیسے استعارے صدیوں پرانے مفاہیم سے ہٹا کر نئے معنیاتی نظام کے لیے برتے گئے۔

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اِک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
جانے کس رنگ سے آتی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا
راہ میں فوجوں کے پہرے سر پہ تکوروں کی چھاؤں
آئے ہیں زنداں میں بھی باشوکتِ شاہانہ ہم

منظر نامہ تبدیل ہوتا ہے تو استعارہ اپنی معنویت خود بخود بدل لیتا ہے۔ جنگ کی ہولناکی کے مدِ نظر اب شاعر پھولوں کی سُرخی کو لبِ محبوب کا استعارہ نہیں بناتا۔ اب اس کی سُرخی میں اُسے خونِ شہیداں کی جھلک نظر آتی ہے۔

موسمِ رنگ بھی ہے فصلِ خزاں بھی طاری
دیکھنا خون کے دھبے ہیں کہ گلکاری ہے

اس طرح کے علامتی اظہار کو ہم کلاسیکی غزل کی روایت کی توسیع نہیں کہہ سکتے البتہ اسے روایت کی جدت کا نام ضرور دیا جا سکتا۔

بحیثیت مجموعی یہ کہنا کہ سردار جعفری نے غزل گوئی کے میدان میں روایت سے انحراف کیا ہے، درست نہ ہوگا۔ یوں بھی آج تک غزل کا کوئی شعر ایسا نہیں کہا گیا جو غزل کا شعر بھی ہو اور ساری روایتوں سے آزاد بھی ہو۔ البتہ انھوں نے عہدِ حاضر کے شعور و احساس کو نئے معنیاتی نظام سے کچھ ایسا ہم آہنگ کیا ہے کہ غزل کے قلیل سرمایۂ کلام کے باوجود ترقی پسند غزل گو شعرا کی فہرست اُن کے نام کی شمولیت کے بغیر نامکمل رہے گی۔

ہم کو یوں رایگاں نہ کر دینا	حاصلِ فصلِ ماہ و سال ہیں ہم
ایسے دیوانے پھر نہ آئیں گے	دیکھ لو بے مثال ہیں ہم

(مجلّہ مجلسِ فروغِ اُردو ادب دوحہ، دبئی ۱۹۹۸ء)

☆☆☆

غزلیں

☆

کام اِب کوئی نہ آئے گا بس اِک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچہء قاتل کے سوا

باعث رِشک ہے تنہا روی رہروِ شوق
ہم سفر کوئی نہیں دُوریء منزل کے سوا

ہم نے دنیا کی ہر اِک شے سے اُٹھایا دل کو
لیکن اِک شوخ کے ہنگامہء محفل کے سوا

تیغ منصف ہو جہاں، دارو رسن ہوں شاہد
بے گنہ کون ہے اِس شہر میں قاتل کے سوا

جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا

☆

یاد آئے ہیں عہدِ جنوں کے کھوئے ہوئے دلدار بہت
اُن سے دور بسائی بستی،جن سے ہمیں تھا پیار بہت

ایک اِک کرکے کھلی تھیں کلیاں،ایک اِک کرکے پھول کھلے
ایک اِک کرکے ہم سے بچھڑے باغِ جہاں میں یار بہت

حسن کے جلوے عام ہیں لیکن ذوقِ نظارہ عام نہیں
عشق بہت مشکل ہے لیکن عشق کے دعوے دار بہت

زخم کہو یا کھلتی کلیاں، ہاتھ مگر گلدستہ ہے
باغِ وفا سے ہم نے چنے ہیں پھول بہت اور خار بہت

جو بھی ملا ہے لے آئے ہیں داغِ دل یا داغِ جگر
وادی وادی منزل منزل بھٹکے ہیں سردار بہت

☆

پھر شمیم گل نویدِ جاں فزا لائی ہے آج
میرے گلشن میں بہارِ رفتہ پھر آئی ہے آج

پھر اُٹھا ہے وادیِ گنگا سے ابرِ نو بہار
سمتِ راوی سے ہوائے مہرباں آئی ہے آج

آج پھر ہے اتحادِ شیشہ و ساغر کا دَور
محفلِ رنداں میں جشن بادہ پیمائی ہے آج

چشمِ ساقی تجھ میں سارا میکدہ آباد ہے
قامتِ رعنا میں موجِ مے کی انگڑائی ہے آج

کھل گئے ہیں اشتیاقِ دید میں آنکھوں کے دَر
دوستوں کی خانۂ دل میں پذیرائی ہے آج

"آ ملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک"
شور ہے محفل میں دیوانوں کی بن آئی ہے آج

پھر وہی گلیاں وہی اگلا طوافِ کوئے دوست
عشق کو مژدہ کہ پھر سامانِ رسوائی ہے آج

کون ہے جس سے سنبھالا جائے گا میرا جنوں
خود ہی پائے شوق کو زنجیر پہنائی ہے آج

ڈر رہا ہوں جان و تن کو پھونک ڈالے گی یہ آگ
میرے سینے میں جو ضبطِ غم نے بھڑکائی ہے آج

آج بے باکی میں ہے اہلِ خرد کی مصلحت
سرفروشی ہی میں اہلِ دل کی دانائی ہے آج

مسکرائے زخمِ دل، ہنسنے لگے سینے کے داغ
روحِ استبداد کیسی کیسی شرمائی ہے آج

خونِ ناحق لالہ و گل بن کے پھوٹا خاک سے
تیشہ زن کے خوں سے دشت و در کی زیبائی ہے آج

کہہ دو صیادوں سے گلچیوں کو کردو ہوشیار
فصلِ گل نے دور تک زنجیر پھیلائی ہے آج

ہاں یہی ہے روزِ محشر، ہاں یہی روزِ حساب
تیری رسوائی ہے اب یا میری رسوائی ہے آج

پھر ہے میناروں پہ رعشہ، پھر ہیں گنبد سرنگوں
پھر نوا شاعر کی ایوانوں سے ٹکرائی ہے آج

آج پھر قدموں پہ میرے جھک رہی ہے کائنات
میرے قبضے میں جہانِ نو کی دارائی ہے آج
خاک پر جھکتی نہیں، افلاک پر رکتی نہیں
جو نگہ تقدیرِ عالم کی تماشائی ہے آج
ایک ساحل ہے کہ اُبھرا ہے بھنور کی گود میں
ایک کشتی ہے کہ طوفانوں سے ٹکرائی ہے آج
رنگِ مے، حسنِ نگاراں، جشنِ گل، فصلِ بہار
ہند کی روحِ جواں شعروں میں کھنچ آئی ہے آج
جل اُٹھا نبضوں میں خوں روشن ہوئے دل میں چراغ
شاعرِ آتش نوا نے آگ برسائی ہے آج

☆

آئے ہم غالبؔ و اقبالؔ کے نغمات کے بعد
مصحفِ عشق و جنوں حسن کی آیات کے بعد
اے وطن، خاکِ وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد
نارِ نمرود یہی اور یہی گلزارِ خلیل
کوئی آتش نہیں آتش کدہء ذات کے بعد
رام و گوتم کی زمیں، حرمتِ انساں کی امیں
بانجھ ہو جائے گی کیا خون کی برسات کے بعد

ہم کو معلوم ہے وعدوں کی حقیقت کیا ہے؟
بارشِ سنگِ ستم، جامِ مدارات کے بعد
تشنگی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی سردار
بڑھ گئی کوثر و تسنیم کی سوغات کے بعد

☆

بیٹھے ہیں جہاں ساقی پیمانہء زر لے کر
اُس بزم سے اُٹھ آئے ہم دیدہء تر لے کر
یادوں سے تری روشن محرابِ شبِ ہجراں
ڈھونڈیں گے تجھے کب تک قندیلِ قمر لے کر
کیا حسن ہے دنیا میں، کیا لطف ہے جینے میں
دیکھے تو کوئی میرا اندازِ نظر لے کر
ہوتی ہے زمانے میں کس طرح پذیرائی
نکلو تو ذرا گھر سے اِک ذوقِ سفر لے کر
راہیں چمک اُٹھیں گی خورشید کی مشعل سے
ہمراہ صبا ہوگی خوشبوئے سحر لے کر
مخمل سی بچھا دیں گے قدموں کے تلے ساحل
دریا اُبل آئیں گے صد موجِ گہر لے کر
پہنائیں گے تاج اپنا پیڑوں کے گھنے سائے
نکلیں گے شجر اپنے خوش رنگ ثمر لے کر

لپکیں گے گلے ملنے سرو اور صنوبر سب
اُٹھیں گے گلستاں بھی شاخِ گلِ تر لے کر
ہنستے ہوئے شہروں کی آواز بلائے گی
لب جام کے چمکیں گے سو شعلۂ تر لے کر
افلاک بجائیں گے ساز اپنے ستاروں کا
گائیں گے بہت لمحے انفاسِ شرر لے کر
یہ عالمِ خاکی اک سیارۂ روشن ہے
افلاک سے ٹکرا دو تقدیرِ بشر لے کر

۳۰ر ستمبر ۱۹۶۵ء

☆

شمع کا، مے کا، شفق زار کا، گلزار کا رنگ
سب میں اور سب سے جدا ہے لبِ دلدار کا رنگ
تہہِ عارض جو فروزاں ہیں ہزاروں شمعیں
لطفِ اقرار ہے یا شوخیٔ انکار کا رنگ
آئی مہکی ہوئی پھر جشنِ ملاقات کی رات
جام میں ڈھلنے لگا شام کے رخسار کا رنگ
عکسِ ساقی سے دمک اٹھی ہے ساغر کی جبیں
اور کچھ شوخ ہوا بادۂ گلنار کا رنگ

اُن کے آنے کو چھپاؤں تو چھپاؤں کیسے
بدلا بدلا سا ہے میرے در و دیوار کا رنگ

اور ہے عشق کی نظروں کا نکھارا ہوا روپ
یوں تو شائستہ تھا پہلے بھی رُخِ یار کا رنگ

موجِ طوفاں بھی ہے اور جوشِ بہاراں بھی ہے
کون سا دیکھو گے تم دیدہء خونبار کا رنگ

شفقِ صبحِ شہادت سے ہے تابندہ جبیں
ورنہ آلودہء خوں تھا اُفقِ دار کا رنگ

آفتابوں کی طرح جاگی ہے انسان کی جوت
جگمگاتا ہے سرا پردہ ء اسرار کا رنگ

وقت کی روح منور ہے نوا سے میری
عصرِ نو میں ہے مری شوخیء گفتار کا رنگ

☆

(ایرانی طلباء کے نام)

خونِ ناحق سے ہوا رنگیں گلستانِ عجم
مشعلوں کی طرح روشن ہیں جوانانِ عجم

دل کی ٹھنڈک ،روح کی گرمی،نگاہوں کا سرور
شعلہ و شبنم کے پیکر ہیں حسینانِ عجم

آندھیوں کا زمزمۂ بیتاب طوفانوں کا گیت

ہیں قیامت کے مغنی نغمہ سنجانِ عجم
نوجواں سینوں پہ زخموں کے سنہری آفتاب
آخرش ظاہر ہوئے افکار پنہانِ عجم
سعدی و فردوسی وحافظ کی آتی ہے صدا
خود عجم کے درد میں پنہاں ہے درمانِ عجم
جبر کر سکتا ہے کب تک؟ عزم و ہمت کو اسیر
کھلکھلا کر ہنس پڑی، دیوارِ زندانِ عجم
خرمنِ ظلم و ستم کا آخری لمحہ ہے یہ
بن چکی ہے برق زنجیرِ غلامانِ عجم
صاحب ِ سرمایہ ہوں گے اب تہی دستانِ شرق
ہر شکستہ دل ہے اِک لعلِ بدخشانِ عجم
سرد جن سینوں میں ہے احساسِ انسانی کی آگ
ہاں اِدھر بھی ایک شعلہ دستانِ عجم
مٹ رہا ہے فرقِ سلطان و گدا، میر و فقیر
نامۂ اعمال ہے اور محشرستانِ عجم
اے گلِ خونینِ جگر چاک گریبانم نگر
جوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ عجم

(۵ نومبر ۱۹۷۸ء)

☆

کس سے پوچھیں، کون بتائے، صبح کی کب پھوٹے گی کرن
رات کی سرحد مقتل مقتل، باندھ کے نکلو سر سے کفن

لے کر پھر قندیلِ محبت، اُترو دل کے اندھیرے میں
روح کی تاریکی کو روشن کرتی نہیں سورج کی کرن

جشنِ ستم ہے ناچ رہے ہیں خنجر، تیغیں گاتی ہیں
خون آلودہ شامِ گیسو، زخم رسیدہ صبحِ بدن

کعبہ ء دل میں بیٹھے ہیں اب بھی صدیوں کے فرسودہ بُت
رنگ و نسل و شیخ و برہمن، مذہب و ملت، ملک و وطن

یہ دنیا گمراہ ہے اب تک، پھر بولو اے سنت کبیر
ایک ہی سونے کے سب گہنے ایک ہی مٹی کے برتن

ایک ہی نور ہے سب شمعوں میں، ایک ہی رس سب میووں میں
اپنے منہ کو میٹھا کر لو، کر لو آنکھوں کو روشن

ایک پرستاں کی سب پریاں، ایک گلستاں کے سب پھول
نیلے نیلے، پیلے پیلے، اودے اودے پیراہن

خون کی نہریں سینچ رہی ہیں انسانی لاشوں کے کھیت
بھوکے پیٹ کے کام نہ آئیں گے یہ زخموں کے خرمن

ہم نے تو روٹی کی خاطر تن کے ٹکڑے بیچے ہیں
تم نے آخر کس کی خاطر بیچ دیا ہے اپنا من

☆

مَیں جہاں تم کو بلاتا ہوں وہاں تک آؤ
میری نظروں سے گزر کر دل و جاں تک آؤ

پھر یہ دیکھو کہ زمانے کی ہوا ہے کیسی
ساتھ میرے مرے فردوسِ جواں تک آؤ

حوصلہ ہو تو اُڑو میرے تصور کی طرح
میری تخئیل کے گلزارِ جناں تک آؤ

تیغ کی طرح چلو چھوڑ کے آغوشِ نیام
تیر کی طرح سے آغوشِ کماں تک آؤ

پھول کے گرد پھرو باغ میں مانندِ نسیم
مثلِ پروانہ کسی شمعِ تپاں تک آؤ

لو وہ صدیوں کے جہنم کی حدیں ختم ہوئیں
اب ہے فردوس ہی فردوس جہاں تک آؤ

چھوڑ کر وہم و گماں حسنِ یقیں تک پہنچو
پر یقیں سے بھی کبھی وہم و گماں تک آؤ

اسی دنیا میں دکھا دیں تمھیں جنت کی بہار
شیخ جی تم بھی ذرا کوئے بتاں تک آؤ

☆

چشمِ بد مست کو پھر شیوۂ دلداری دے
دلِ آوارہ کو پیغام گرفتاری دے

عشق ہے سادہ و معصوم اسے اپنی طرح
جوہرِ تیغ ادا ، خنجرِ عیاری دے

جو دُکھے دل ہیں انہیں دولت درماں ہو عطا
درد کے ہاتھوں میں مت کاسۂ ناداری دے

کتنی فرسودہ ہے یہ جرم و سزا کی دنیا
سرکشی دل کو نیا ذوقِ گنہگاری دے

شاخِ گل کب سے ہے سینے میں چھپائے ہوئے گل
دیکھیں کب بادِ صبا حکمِ چمن کاری دے

اے مرے شعلۂ دل، شعلۂ شعر و دانش
رات آخر ہے اسے جشنِ شرر باری دے

چمن افسردہ ہے اے جانِ چمن! روحِ بہار!
گل کو بھی اپنے تبسم کی فسوں کاری دے

☆

ستاروں کے پیام آئے بہاروں کے سلام آئے
ہزاروں نامہ ہائے شوق میرے دل کے نام آئے

نہ جانے کتنی نظریں اُس دلِ وحشی پہ پڑتی ہیں
ہر اِک کو فکر ہے اس کی، یہ شاہیں زیرِ دام آئے

اسی اُمید میں بیتابیء جاں بڑھتی جاتی ہے
سکونِ دل جہاں ممکن ہو شاید وہ مقام آئے

ہماری تشنگی بجھتی نہیں شبنم کے قطروں سے
جسے ساقی گری کی شرم ہو آتش بجام آئے

انہیں راہوں میں شیخ و محتسب حائل رہے اکثر
انہیں راہوں میں حورانِ بہشتی کے خیام آئے

نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشیدِ تمنا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے ناتمام آئے

یہ عالم لذتِ تخلیق کا ہے رقصِ لافانی
تصور خانہ ء حیرت میں لاکھوں صبح و شام آئے

کوئی سرؔدار کب تھا اس سے پہلے تیری محفل میں
بہت اہلِ سخن اُٹھے بہت اہلِ کلام آئے

☆

وہ بہاریں وہ ہوائیں جو زمیں چمن دیں
وہی مہر و ماہ لائیں، جو اُفق کرن دیں

یہ نیا زمانہ اے دل جو وقار کھو چکا ہے
اسے اپنی سر بلندی، اسے اپنا بانکپن دیں

جو ہیں رند بھٹکے بھٹکے، جو ہیں ساقی بہکے بہکے
انہیں درسِ میکدہ دیں، انہیں ذوقِ انجمن دیں

بڑی دیر ہو چکی ہے کہ ہیں نوحہ خواں ستارے
چلو اب شبِ سیہ کو، نئی صبح کا کفن دیں
لبِ تیغ پر لہو ہے، لبِ زخم پر تبسم
یہ حیات تن برہنہ، اسے کیسا پیرہن دیں
نئی روح جسمِ خستہ کو عطا نہ ہو سکے تو
یہ کریں کہ روحِ نو کو، کوئی اِک نیا بدن دیں
نئی ابروؤں کو بجلی، نئی انکھڑیوں کو صہبا
نئی تیغ دیں نظر کو، نئی زلف کو شکن دیں
یہ زمیں مری زمیں ہے، یہ فلک مرا فلک ہے
انہیں صید کر چکی ہیں، مرے فکر کی کمندیں
اُسی بزم میں ملیں گے ابھی شعرِ تر کے ساغر
چلو بزمِ جعفریؔ میں تمہیں جامِ فکر و فن دیں

☆

کتنی آشاؤں کی لاشیں سوکھیں دل کے آنگن میں
کتنے سورج ڈوب گئے ہیں چہروں کے پیلے پن میں
بچوں کے میٹھے ہونٹوں پر پیاس کی روکھی ریت جمی
دودھ کی دھاریں گائے کے تھن سے گر گئیں ناگوں کے پھن میں
ریگستانوں میں جلتے ہیں پڑے ہوئے سو نقشِ قدم، پر
آج خراماں کوئی نہیں ہے اُمیدوں کے گلشن میں

چکنا چور ہوا خوابوں کا دلکش ، دلچسپ آئینہ
ٹیڑھی ترچھی تصویریں ہیں ٹوٹے پھوٹے درپن میں
پائے جنوں میں پڑی ہوئی ہیں حرص و ہوا کی زنجیریں
قید ہے اب تک ہاتھ سحر کا تاریکی کے کنگن میں
آنکھوں کی کچھ نورس کلیاں نیم شگفتہ غنچۂ لب
کیسے کیسے پھول بھرے ہیں گلچینوں کے دامن میں

☆

عقیدے بجھ رہے ہیں شمعِ جاں گُل ہوتی جاتی ہے
مگر ذوقِ جنوں کی شعلہ سامانی نہیں جاتی
خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے
زمینِ کوئے جاناں آج پہچانی نہیں جاتی
اگر یوں ہے تو کیوں ہے، یوں نہیں تو کیوں نہیں آخر
یقیں محکم ہے لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی
لہو جتنا تھا سارا صرفِ مقتل ہو گیا لیکن
شہیدان وفا کے رُخ کی تابانی نہیں جاتی
پریشاں روزگار، آشفتہ حالاں کا مقدّر ہے
کہ اُس زلفِ پریشاں کی پریشانی نہیں جاتی
ہر اِک شے اور مہنگی اور مہنگی ہوتی جاتی ہے
بس اِک خونِ بشر ہے جس کی ارزانی نہیں جاتی

نئے خوابوں کے دل میں شعلۂ خورشیدِ محشر ہے
ضمیرِ حضرتِ انساں کی سلطانی نہیں جاتی
لگاتے ہیں لبوں پر مہر اربابِ زباں بندی
علی سردار کی شانِ غزل خوانی نہیں جاتی

☆

امتحاں بزمِ وطن میں ہے وفاداری کا
اہرمن تخت نشیں ہے اسے یزداں کہیے
کیجیے روح کو تیار غلامی کے لیے
شوقِ آزادیٔ انساں کو گریزاں کہیے
کسی بھوکے کو بھی بھوکا نہ سمجھیے ہرگز
کوئی عریاں نظر آئے تو نہ عریاں کہیے
یہ نہ کہیے کہ حکومت ہے مصائب کا شکار
گردشِ چرخِ کہن، گردشِ دوراں کہیے
کیجیے شاعری اس طرح کہ سمجھے نہ کوئی
ظلم اور جور کو بھی نازِ حسیناں کہیے
کوئی بھی بات سمجھنے کی نہ زحمت کیجیے
قلب اور ذہن کو آئینۂ حیراں کہیے

کھینچ لیجیے رگِ الفاظ سے خونِ معنی
رقصِ بسمل کی جگہ رقصِ غزالاں کہیے
ہر درندے کو پہنا دیجیے انساں کا لباس
اور جی کھول کے انسان کو حیواں کہیے
رات دن کیجیے سرکار کی چوکھٹ کا طواف
اور اسے حاصلِ جاں، حاصلِ ایماں کہیے
شبِ تاریک کو سینے سے لگا رکھا ہے
اور اسے چشمۂ خورشید درخشاں کہیے
دیجیے خاکِ وطن سے یہ محبت کا ثبوت
کہ خس و خار کو بھی رشکِ گلستاں کہیے
کیجیے کوچہ و بازار میں لاشوں کا شمار
اور پھر ہند کو فردوسِ بداماں کہیے
سیکھیے ساز پہ آہوں کے غزل خواں ہونا
جھلملاتے ہوئے اشکوں کو چراغاں کہیے
زہر کے جام کو نوشینہ سمجھ کر پیجیے
دل میں اترے ہوئے نشتر کو رگِ جاں کہیے
اپنے ہر زخم کو اک پھول تصور کیجیے
سرخیٔ خونِ عزیزاں کو بہاراں کہیے

چارہ گر جانیے اس دور میں ہر قاتل کو
زندگی موت کو اور درد کو درماں کہیے

تن سے چھن جائے تو رہزن کو دعائیں دیجیے
چاک ہو جائے تو دامن کو گریباں کہیے

خاک پر سوئیے آکاش کے سائے کے تلے
بسترِ مخمل و کمخواب و شبستاں کہیے

دشنۂ دشمنِ ناپاک کو دیجیے بوسہ
اور اسے قیمتِ ناموسِ شہیداں کہیے

مختصر یہ ہے کہ اب سانس بھی لینا ہے حرام
تاکجا قصۂ احوالِ پریشاں کہیے

لطف تو جب ہے کہ دل دار و رسن سے کھیلے
اور اس شغل کو بازیچۂ طفلاں کہیے

۲۵ ستمبر ۱۹۴۸

☆

شکستِ شوق کو تکمیل آرزو کہیے
جو تشنگی ہو تو پیمانہ و سبو کہیے

خیال یار کو دیجے وصالِ یار کا نام
شب فراق کو گیسوئے مشک بو کہیے

چراغِ انجمنِ حیرتِ نظارہ تھے
وہ لالہ رو جنہیں اب داغ آرزو کہیے

مہک رہی ہے غزل ذکرِ زلفِ خوباں سے
نسیمِ صبح کی مانند کو بہ کو کہیے

شکایتیں بھی بہت ہیں، حکایتیں بھی بہت
مزا تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے

یہ حکم، کیجیے پھر خنجروں کی دلداری
دہانِ زخم سے افسانہ ء گلو کہیے

زبانِ تیغ سے کرتے ہیں پرسشِ احوال
اور اس کے بعد یہ کہتے ہیں آرزو کہیے

ق

ہے زخم زخم مگر کیوں نہ جانیے اُسے پھول
لہو لہو ہے، مگر کیوں اُسے لہو کہیے

سمجھیے قامتِ یارانِ کج ادا کی قبا
حنائے پائے نگارانِ تند خو کہیے

جہاں جہاں بھی خزاں ہے وہیں وہیں ہے بہار
چمن چمن میں بھی افسانہ ء نمو کہیے

زمیں کو دیجیے دلِ مدعا طلب کا پیام
فضا کو وسعتِ دامانِ آرزو کہیے

سنواریے غزل اپنی بیانِ غالبؔ سے
زبانِ میرؔ میں ہاں ہاں کبھو کبھو کہیے
مگر وہ حرف دھڑکنے لگے جو دل کی طرح
مگر وہ بات جسے اپنی گفتگو کہیے

ق

وہ جس کے فیض سے غالبؔ ہوا تھا نغمہ سرا
زبان ہے جسے دلی کی آبرو کہیے
روانی ایسی کہ گنگا کی کھایئے قسمیں
جوانی ایسی کہ جنت کی آب جو کہیے
رہے تو معجزۂ نطق کی دعا دیجے
مٹے تو آنکھ سے ٹپکا ہوا لہو کہیے
جراحتوں کی سیاست ہے جن کا فن سردارؔ
اب اُن سے کہیے تو کیا حاجتِ رفو کہیے

☆

سکوں میسر جو ہو تو کیوں کر، ہجومِ رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظامِ دار ورسن وہی ہے
فریب یہ دیدیا ہے کس نے کہ حریت کی برات آئی
ترنگی چلمن اُٹھا کے دیکھو تو ساحرِ مکرِ فن وہی ہے
ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمۂ قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے، نوائے سازِ کہن وہی ہے

☆

صبح کے اُجالے پر رات کا گماں کیوں ہے
جل رہی ہے کیا دنیا، چرخ پہ دھواں کیوں ہے
قطرہ ہائے شبنم ہیں یا لہو کی بوندیں ہیں
رنگ و نور کا دامن آج خونچکاں کیوں ہے
خُم بھرے ہیں یا خالی کچھ پتا نہیں چلتا
آج وقت کا ساقی اتنا سرگراں کیوں ہے
خنجروں کی سازش پر کب تلک یہ خاموشی
روح کیوں یخ بستہ، نغمہ بے زباں کیوں ہے
قافلے بھٹکتے ہیں منزلِ تمنا پر
عشق کیوں ہے سرگرداں، حسن بے نشاں کیوں ہے
راستہ نہیں چلتے صرف خاک اُڑاتے ہیں
کارواں سے بھی آگے گردِ کارواں کیوں ہے
کچھ کمی نہیں لیکن، کوئی کچھ تو بتلاؤ
عشق اس ستم گر کا شوق کا زیاں کیوں ہے
تم تو گھر سے نکلے تھے جیتنے کو دل سب کا
تیغ ہاتھ میں کیوں ہے دوش پہ کماں کیوں ہے
اِک جہاں میں شہرت ہے تم بڑے مسیحا ہو
پھر یہ شاہراہوں پر درد کی دکاں کیوں ہے

قتل کرکے آئے ہیں اور تن کے بیٹھے ہیں
پوچھتے ہیں حیرت سے، نالہ و فغاں کیوں ہے
فرش ہو کہ عرش اے دل یہ جبیں نہیں جھکتی
راہِ سر فروشی میں سنگِ آستاں کیوں ہے
یہ ہے بزمِ مے نوشی اس میں سب برابر ہیں
پھر حسابِ ساقی میں سود کیوں زیاں کیوں ہے

☆

کبھی خنداں، کبھی گریاں، کبھی رقصاں چلئے
دور تک ساتھ ترے عمرِ گریزاں چلئے
ذوقِ آرائش و گلکاریٔ اشکِ خوں سے
کوئی بھی فصل ہو فردوس بداماں چلئے
رسمِ دیرینۂ عالم کو بدلنے کے لئے
رسمِ دیرینۂ عالم سے گریزاں چلئے
آسمانوں سے برستا ہے اندھیرا کیسا
اپنی پلکوں پہ لئے جشنِ چراغاں چلئے
شعلۂ جاں کو ہوا دیتی ہے خود بادِ سموم
شعلۂ جاں کی طرح چاک گریباں چلئے
عقل کے نور سے دل کیجئے اپنا روشن
دل کی راہوں سے سوئے منزلِ انساں چلئے

غم نئی صبح کے تارے کا بہت ہے لیکن
لے کے اب پرچمِ خورشیدِ زرافشاں چلئے
سر بکف چلنے کی عادت میں نہ فرق آ جائے
کوچۂ دار میں سرمست و غزل خواں چلئے

☆

لُو کے موسم میں بہاروں کی ہوا مانگتے ہیں
ہم کفِ دستِ خزاں پر بھی حِنا مانگتے ہیں
ہم نشیں! سادہ دلی ہائے تمنا مت پوچھ
بے وفاؤں سے وفاؤں کا صلہ مانگتے ہیں
کاش کر لیتے کبھی کعبۂ دل کا بھی طواف
وہ جو پتھر کے مکانوں میں خدا مانگتے ہیں
جس میں ہو سطوتِ شاہین کی پرواز کا رنگ
لبِ شاعر سے وہ بلبل کی نوا مانگتے ہیں
تا کہ دنیا پہ کھلے اُن کا فریبِ انصاف
بے خطا ہو کے خطاؤں کی سزا مانگتے ہیں
تیرگی جتنی بڑھے حسن ہو افزوں تیرا
کہکشاں مانگ میں، ماتھے پہ ضیا مانگتے ہیں
یہ ہے وارفتگیِ شوق کا عالم سردارؔ
بارشِ سنگ ہے اور بادِ صبا مانگتے ہیں

☆

کوئی ہو موسم تھم نہیں سکتا رقصِ جنوں دیوانوں کا
زنجیروں کی جھنکاروں میں شورِ بہاراں باقی ہے
عشق کے مجرم نے یہ منظر اوجِ دار سے دیکھا ہے
زنداں زنداں، محبس محبس، حلقہء یاراں باقی ہے
برگِ زرد کے سائے میں بھی جوئے ترنم جاری ہے
یہ تو شکست فصلِ خزاں ہے سوتے ہزاروں باقی ہیں
خستیوں کی خشکیء دل پر ایک زمانہ ہنستا ہے
تر ہے دامن اور بہ کارِ بادہ گساراں باقی ہے
پھول سے چہرے، چاند سے مکھڑے نظروں سے روپوش ہوئے
عارضِ دل پر رنگ حنا ہے، دستِ نگاراں باقی ہے

☆

یہ بےکس و بے قرار چہرے	صدیوں کے سوگوار چہرے
مٹی میں پڑے دمک رہے ہیں	ہیروں کی طرح ہزار چہرے
لے جا کے انہیں کہاں سجائیں	یہ بھوک کے شاہکار چہرے
افریقہ و ایشیا کی زینت	یہ نادرِ روزگار چہرے
ماضی کے کھنڈر کی طرح دلکش	یہ شمعِ سرِ مزار چہرے
کھوئی ہوئی عظمتوں کے وارث	کل رات کے یادگار چہرے
غازے سے سفید، مَے سے رنگیں	اِس دَور کے داغدار چہرے

چمکے ہیں فروغِ زر کے باوصف — تابندہ ہیں خاکسار چہرے
گزرے ہیں نگاہ و دل سے ہو کر — ہر طرح کے بے شمار چہرے
مغرور انا کے گھونسلے میں — بیٹھے ہوئے کم عیار چہرے
ناقابلِ التفات آنکھیں — ناقابلِ اعتبار چہرے
شہرت کے بلند آسماں پر — چھٹتے ہوئے سے انار چہرے
پل بھر میں دھواں دھواں مگر سب — پل بھر میں فقط غبار چہرے
سونے کا چڑھا ہے پانی — پیتل کے یہ شاندار چہرے
پہنے ہیں نقابِ پارسائی — جنت کے کرایہ دار چہرے
ان سب سے حسین تر ہیں — رندوں کے گناہگار چہرے
ہنستے ہوئے نیزہ وسناں پر — وہ شبنمِ نوکِ خار چہرے
چپکے چپکے سلگ رہے ہیں — آتش کدۂ بہار چہرے
شعلوں کے مزاج آشنا ہیں — برفاب سے بے شرار چہرے
امید کی شمع سے فروزاں — شائستۂ انتظار چہرے

□□□

رفعت سروش

بہت حسین روایت ہے اب علی سردار

فضا ہے اشک بداماں، ہوا ہے سرگرداں
پہاڑ غم کا اُٹھائے ہوئے ہے ابرِ رواں
خموش بیٹھی ہیں الفاظ و نطق کی پریاں
اُداس زہرہ و پرویں، اُداس کاہکشاں
زمیں پہ آج یہ کس آسماں کا ماتم ہے
چمن میں طوطیِ شیریں بیاں کا ماتم ہے

کمند اوجِ ثریا پہ ڈالنے والا
فضا میں پیار کا ساغر اُچھالنے والا
ادب کو غم کے بھنور سے نکالنے والا
نئی سحر کے اُفق کو اجالنے والا
اُٹھا ہے انجمنِ ناز سے علی سردار
ادب کے قافلۂ شوق کا سپہ سالار

زبان کہتی ہے اب میرے ناز اُٹھائے گا کون
اُداس حرف ہے، جادو بھرا جگائے گا کون
غزل یہ سوچ رہی ہے مجھے سجائے گا کون
یہ فکر نظم کو، گیسو مرے بنائے گا کون
جو فنِ شعر کی عظمت کا رازداں تھا، گیا
جو اُردو والوں کا بیباک ترجماں تھا گیا

یہ کون مژدہ سناتا ہے، پھر مَیں آؤں گا
زباں میں چڑیوں کی بولوں گا، گیت گاؤں گا
چمن کے پھولوں میں چھپ کر مَیں گنگناؤں گا
سخن وروں کے لبوں سے مَیں مسکراؤں گا
یہ ہند و پاک کی سرحد پہ کس کا ہے سایہ
ہے انتظار ابھی کس کو ”صبحِ فردا“ کا

لطیف رنگ ہے، نکہت ہے اب علی سردار
جمالِ حرفِ محبت ہے اب علی سردار
دیارِ ہند کی عظمت ہے اب علی سردار
بہت حسین روایت ہے اب علی سردار
وہ میرؔ و غالبؔ و اقبالؔ کا تسلسل ہے
ہمیشہ چہکے گا، اپنے چمن کا بلبل ہے

(سہ ماہی گلستان جے پور، جولائی۔ دسمبر ۲۰۰۰ء)

سید محمد عقیل

علی سردار

گئے جہاں سے افسوس کل، علی سردار
کبھی جو بزمِ سخن کے تھے مالک و مختار
کلام جس کا بڑھاتا تھا خون کی گردش
جو انقلاب کی تھا ایک دولتِ بیدار
اُسی کا فیضِ سخن ہے جو آج اُردو میں
بنی ہے نظم معریٰ طلسمِ گوہر بار
وہ آج بزم سخن میں نہیں رہا باقی
بڑھایا جس نے زمانے میں شاعری کا وقار
وہ ایک نعرہء مستانہ سرفروشوں کا
ہوا تھا جس کے تکلم سے ایشیا بیدار
اودھ کی ٹھنڈی ہوائیں تھیں جس کے لہجے میں
دیارِ گنگ و جمن جس کا مرکزِ پیکار
"یہ آدمی کی گزرگاہ شاہراہِ حیات"
ہر ایک موڑ پہ جس کے ہے زندگی مدار
یہ کائنات جہاں اب بھی آدمی کے لیے
بنی ہے خوں کی لکیروں سے سنگ کی دیوار
وہ چاہتا تھا یہ 'دیوارِ گریہ' ٹوٹ گرے
کہ جس سے ہوتی ہے انساں کو زندگی دشوار
وہ چل بسا ہمیں اک خواب اور دکھلا کر
ہمارا فرض ہے اب اس کو ہم کریں ساکار
یہ فکرِ شاعرِ رنگیں نوا یہ قول ہے سچ
نہیں اس میں کسی طرح کا غلط اظہار
رہے جہاں میں ہمیشہ بلندیوں کے امیں
"علی امام، علی سرور و علی سردار"
یہ [سجع] بن گیا سردار جعفری کے لئے
"علی امام، علی سرور و علی سردار"

(سہ ماہی نیا سفر الہ آباد شمارہ ۱۶)

[سجع] بقول سردار جعفری حافظ شیرازی کے ایک قصیدے کے ایک شعر ؂

علی امام وعلی ایمن وعلی ایمان
علی امین وعلی سرور وعلی سردار

میں علی سردار اس طرح استعمال ہوا ہے کہ یہ اُن کے نام کا سجع بن جاتا ہے۔ (ادارہ)

عبدالاحد ساز

وہ اپنے دستِ جنوں میں شمع خرد اٹھائے......

یہ زندگی کا رجز۔ یہ لمحوں کے بیکراں سلسلوں کا نغمہ
یہ جذب و فکر و شعور کی چلمنوں سے چھنتے
ہوئے زمانے کی شاعری ہے
قلم سے نکلے ہوئے ستارے
اندھیرے کاغذ کے آسماں پر فسانہ نور لکھ رہے ہیں
لبوں سے پھوٹے ہوئے شرارے
شکستہ روحوں کی انجمن میں نئی توانائیوں کا
دستور لکھ رہے ہیں
یہ علم و دانش کے طاق و محراب سے مزین
جمیل نظموں کی درسگاہیں
نشیب ذلت کے کی وادیوں میں بھٹکنے والوں کے
واسطے سر بلند اشعار کی پناہیں
سفینۂ دل، خیال کا موجزن سمندر...... نگاہ کے
بادبان کی سمت آشنائی
مشاہدوں، تجربوں کے طوفاں میں یہ نظریوں کی رہنمائی
حروف اندر حروف جذبۂ جنوں کی تہذیب پل رہی ہے
کہیں یہ ذوقِ جمال پیکر تراشتا ہے

کہیں یہ سوز و گداز کی شمع جل رہی ہے
کہیں ہنر کے بدن میں افکار کی توانائی ڈھل رہی ہے
وضاحتیں ہونٹ چومتی ہیں، روانیاں گنگنا رہی ہیں
بلاغتیں لفظ کی فضا میں طلسمِ معنی جگا رہی ہیں
بدلتے موسم کی ساری سفاکیوں میں کشتِ سخن ہری ہے
یہ سوزِ تخلیق کا ترانہ، خروشِ پیہم کی شاعری ہے
وہ زندگی کی بشارتوں کا نقیب، زندہ روایتوں کا امین شاعر
دل و نظر اپنے پڑھنے والوں کے نام لکھ کر
اِک الوداعی سلام لکھ کر
ہماری محفل سے جا چکا ہے
حیات و قوت کا وہ رجز خواں
جو اپنی باتوں میں اِک دبستاں
جو اپنے قدموں میں کارواں تھا
جو اپنے لفظوں میں ایک عہدِ طلب کی
پُرشوق داستاں تھا
جو اپنے "دستِ جنوں میں شمع خرد" اُٹھائے
سفر میں اک مضطرب صدی کے
بساطِ فن پر رواں دواں تھا

(سہ ماہی نیا سفر الٰہ آباد شمارہ ۱۶)

مخمور سعیدی

مجموعۂ صد صفات اک ذات

رہ رہ کے جو یاد آ رہا ہے
وہ شخص کہاں چلا گیا ہے
آنکھیں کہ اسی کی منتظر ہیں
دل ہے، کہ اُسی کو ڈھونڈتا ہے
ہیں شام و سحر طلب میں اُس کے
ہر لمحہ اُسے پکارتا ہے
ہیں فرش و فلک ملول جس پر
یہ سانحہ کیسا سانحہ ہے
غمناک، جو لاکھوں حادثوں سے
موت اُس کی اِک ایسا حادثہ ہے
شاعر بھی، عزیزِ شاعراں بھی
کیوں ہم سے جدا وہ ہوگیا ہے
نقاد، ادیب اور محقق
کیا کہیے تعارف اُس کا کیا ہے
مجموعہ صد صفات، اِک ذات
ایسا کوئی اور کب ہوا ہے

☆

انسان کو اُس نے یہ بتایا
انسان کا احترام کیا ہے
اعجاز نما تھا اُس کا لہجہ
شعلہ، کبھی پھول بن گیا ہے
ہر جنبشِ خامۂ سخن میں
اِک محشرِ نغمہ و نوا ہے
ہر شعر ہے شعر شور انگیز
ہنگامہ فکر و فن بپا ہے
کلیوں کی چٹک میں اُس کی آواز
پھولوں کی زباں سے بولتا ہے

☆

یادوں میں ہماری ہے وہ زندہ
خوابوں میں ہمارے جاگتا ہے
موجود اِسی انجمن میں ہے وہ
سردار کہیں نہیں گیا ہے

☆

یاد آتی ہیں اُس کی کتنی باتیں
سناٹا سا دل پہ چھا گیا ہے
یہ بزمِ مشاعرہ ہے اور وہ
صدرِ بزمِ مشاعرہ ہے
یہ ایک مذاکرہ ہے اور ہال
تقریر سے اُس کی گونجتا ہے
یہ ہاتھ میں اُس کے جامِ مے ہے
جرعہ جرعہ وہ پی رہا ہے
یہ لالہ رُخوں کی انجمن میں
وہ قصہ دل سنا رہا ہے
اسرار و رموز فکر و فن کے
ذہن و دل میں اُتارتا ہے
اِک کیفِ دوام کی فضا میں
وہ آج بھی سانس لے رہا ہے

☆

نفرت تھی اُسے اس اہرمن سے
انساں کا لہو جو چوستا ہے
دشمن تھا وہ اُس نظامِ زر کا
جو آدمی خور اژدہا ہے
لیکن یہ خبر اُسے نہیں تھی
وہ سائے میں جس کے جی رہا ہے
پیغمبرِ خیر وہ نہیں ہے
خود بدی کا ایک دیوتا ہے

☆

مخمور صمیمِ قلب و جاں سے
اب اُس کے لیے یہ دعا ہے
تا حشر سکوں سے رہے وہ
تا حشر جو مضطرب رہا ہے
وہ اس سے سوا کا مستحق تھا
دنیا نے جو کچھ اُسے دیا ہے

(ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی، ستمبر ۲۰۰۱ء)

Regd.No.45755/85

Registered with the Registrar of Newspapers in India

Telephone:2247619

اردو کا واحد حوالہ جاتی مجلہ

ALAMI URDU ADAB 2001 عالمی اردو ادب

(The only reference journal in Urdu)

۲۰۰۱ء

(Foreign)US Dollars.20. (Inland)Price : Rs.250/-

Place of printing: Sajeev Offset Printers ,Delhi.110051

سردار جعفری نمبر

Sardar Jafri Number

Statement about ownership and other particulars

FORM IV

بابت فارم ۴

(As required by rule of Press Registrar'Act) رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق

1.Alami Urdu Urdu ۱۔عالمی اُردو ادب

2.Place of publication Delhi-110051 ۲مقام اشاعت: جے۔۶ کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱

3.periodicity of publication Half yearly ۳۔وقفہ اشاعت: ششماہی

4,5&6.Printer,Publisher and Editor's Name: Nand Kishore Vikram ۴،۵۔۶ پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر: نند کشور وکرم

5.Nationality Indian ۷۔قومیت: ہندوستانی

6.Address: J-6 Krishan Nagar Delhi 110051 ۸۔پتہ: جے۔۶ کرشن نگر، دہلی ۱۱۰۰۵۱

میں نند کشور وکرم اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ اندراجات درست اور صحیح ہیں

I N. [illegible] shore V[illegible] am hereby decla[illegible] [illegible] are true to the best of my knowledge a[illegible]

[illegible]nd kishore Vikram

طابع و ناشر نند کشور وکرم

[illegible] جے۔۶ کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱ سے شائع کیا